
ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
اکتوبر 2017
معراج رسول

سسپنس ڈائجسٹ

CPNE MEMBER APNS

مدیرِ اعلیٰ : عذرا رسول
مدیرہ : یمنیٰ احمد
نائب مدیر : اطہر حسین

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان 0333-2256789
سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین 0333-3285267

جلد 47 • شمارہ 10 اکتوبر 2017 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پرنٹر و پبلشر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
... حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

کسی طرح

کیوں یہ میری پیٹھ سے لگا کیا سوچ رہا ہے؟ سامنے آکے بیٹھ...... کہ جی ہی بہلے۔ جانے کیا ہو گیا ہے کہ جی نہیں لگ رہا۔

ہاں بھائی بڑی وحشت ہے، بڑی بیزاری ہے۔ ہم اپنے آپ میں بُری طرح آن پھنسے ہیں۔ یہ اپنے آپ میں محبوس ہونے اور اپنے آپ سے تنگ آجانے کا آزار بڑا ہی جان لیوا ہے۔ جی میں آتا ہے کہ اپنی ہڈیاں پسلیاں ایک کردوں، اپنا ٹینٹوا چبا جاؤں۔ اپنی ذات کے حبس میں سانس لینا تو ایسا ہے جیسے جانکنی میں زندہ رہنا۔ او آزادی آخر تو کس سوچ میں ہے۔ تو بھی تو کچھ بول! یہی کہ اس طرح آخر کیسے گزرے گی؟

یہی تو میں بھی سوچتا ہوں، چاہے ہمارے اندر جنت کی ہوائیں ہی کیوں نہ چل رہی ہوتیں اور ہمارے وجود میں جنت کے چشمے ہی کیوں نہ بہہ رہے ہوتے پھر بھی اپنی ذات کی قید دوزخ سے کم نہ ہوتی۔ جبکہ ہمارا اندرون تو خود سب سے بڑا دوزخ ہے۔ آخر وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی ذات میں بند رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے باہر سے بھلا کیا سروکار...... اور یہ بڑے جانے ہوئے اور مانے ہوئے لوگ ہوتے اہل۔ ان سے زیادہ یہ بات جاننے والے کم ہی ہوں گے کہ نفس کی سب سے اچھی حالت کون سی ہے اور سب سے بُری حالت کون سی ہے؟ یہ تو [illegible] لے اڑا اور تو نے کن ہکواسیوں کی بات شروع کردی جو اپنی ذات میں بند رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھلا ہمیں اپنے باہر سے کیا [illegible] اپنے اندر ہوتے ہی کب ہیں جو باہر نکلیں۔ کھوکھلے، تو ان بے حسوں اور بے حیاؤں کی باتیں کر کے میرا جی نہ جلایا کر۔ [illegible] اب ان بدروحوں کا نام لیا۔ یہ زندگی کے گورستانوں میں منڈلاتے پھرتے ہیں کہ بدی کی کوئی لاش کھود کے نکالیں اور اسے اپنے اوپر منڈھ کر بستیوں میں آئیں اور روگ پھیلائیں۔ یہ تُو نے اچھی کہی کہ یہ لوگ اپنی ذات میں رہتے ہیں۔ کیا تو نہیں جانتا کہ بدذاتی...... بے ذات ہوتی ہے۔

ہاں یہ ہے کہ یہ باہر سے بھاگتے ہیں اور لاشوں میں اپنے لیے ٹھکانے ڈھونڈتے ہیں۔ ذات میں رہنا بھی کوئی مذاق تو نہیں ہے۔ کیا یہ کوئی آسائش ہے؟ اس سے کڑی آزمائش اور کیا ہوسکتی ہے کہ آدمی اپنی پسلیوں میں پھنسا سسک رہا ہو۔ اگر انسانوں میں سے کچھ انسان اس آزمائش میں پڑ گئے ہوں تو کیا انہیں اس پر خوش ہونا چاہیے؟

جب تو یہ کہتا ہے کہ میں اپنی پسلیوں میں پھنسا ہوا ہوں یا اپنی اوجھڑی میں گٹھری بنا پڑا ہوں تو کیا اپنے آپ کو یا کسی اور کو کوئی خوش خبری سناتا ہے؟ کیا بہت دم گھٹ رہا ہے؟ ہاں، سچ مچ جان پر بنی ہوئی ہے۔ بس یہی میرا بھی حال ہے۔ یہ کیسا ہونا ہے، یہ تو بہت ہی عذاب ناک ہونا ہے۔ نہ ہونے کا آرام شاید بہت بڑا آرام ہوتا ہوگا۔ ہاں شاید...... اتنا نشہ کہ ہوش ہی نہ رہے۔ خون کے گھونٹ پی اور جی۔ نہیں بھائی نہیں۔ اب زبان اور محاورے کی چاشنی کچھ مزہ نہیں دیتی۔ میں تو کہتا ہوں کہ بول ہی مت، بس چپکا ہی رہ۔ ہاں تو نے ٹھیک کہا۔ اب تو اپنی کوئی بات بھی اچھی نہیں لگتی۔ جب اپنا آپا ہی بُرا لگنے لگے تو پھر کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ بھلا تو اپنے آپ کو کیسا لگتا ہے؟ میں اپنی صورت تک سے بیزار ہوں۔ میں اپنے اس گمان تک سے اکتا چکا ہوں کہ میں ہوں جو نہ ہونے کی طرح ہے، وہ آخر ہے بھی کیوں۔ تو نے میرا جی خوش کردیا۔ اگر جاں کنی، جاں کنی کا جی خوش کرسکتی ہو۔ دمسازی اور غمگساری اسے کہتے ہیں۔ بس یہی کچھ میرا بھی عالم ہے۔ بُرے مارے گئے، ہاں بُرے مارے گئے۔ باہر کی ہوا اب کیسی ہوگی؟ ویسی ہی ہوگی جیسی تھی۔ جیسی چھوڑ کر ہم اپنے اندر بھاگ آئے تھے۔ بھاگ آئے تھے یا کھدیڑے گئے تھے۔

ہاں یوں کہہ لے، ہوا بھی یہی تھا۔ پر ایک بات اور ہے اور وہ یہ ہے کہ باہر کی ہوا کا کیا کہنا۔

ہاں بھئی! باہر کی ہوا کا بھلا کیا کہنا۔ باہر کی فضا کا بھلا کیا کہنا۔ اندر تو رائگانی ہی رائگانی ہے۔ ندامت ہی ندامت ہے۔ ہم جو تھے، ہم میں سے بھلا کون کون رائگاں گیا ہوگا۔ جنہیں رائگاں نہ جانا چاہیے تھا، وہی بُری طرح رائگاں گئے ہوں گے اور انہی کو اپنے رائگاں جانے کا دکھ بھی ہوگا۔ کیسے کیسے لوگ رائگاں گئے۔ رائگانی کے ان شہروں میں کیسی کیسی امنگیں پچھتاوؤں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ ایک بات ہے۔ کیا بات؟

باہر کی ہوا تھی بھی کچھ ایسی کہ ایسا نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا؟ باہر کی گھٹن بھی اندر کی گھٹن سے کچھ کم تو نہ تھی اور یہ کہ فضا میں قہر تھا اور ہوا میں زہر۔ ہوا کا وہ زہر اور فضا کا وہ قہر ضمیر کی ہلاکت اور ذہن کی ہزیمت تھا۔ ہم نے حکمت کو ہوس ناکی بنتے دیکھا اور دلیل کو دلالی۔ قیادت نے قزاقی کا پیشہ اختیار کیا اور قانون نے نقب زنی شعار کی۔ پھر ہو کیا؟ کیا ہم اپنے اندر اسی طرح کراہتے رہیں؟ میں تو کہتا ہوں کہ اندر کی ہلاکت سے باہر کی ہلاکت ہزار گنا بہتر ہے۔ اندر کی زندگی بھی موت ہے اور باہر کی موت بھی زندگی۔ کسی بھی طرح اپنے آپ سے باہر نکلنا چاہیے، کسی بھی طرح۔

☆☆☆

آپ کے خط

عزیزانِ من!

السلام علیکم!

اکتوبر 2017ء......کا دلفریب شمارہ آپ کے ہاتھوں کی زینت ہے۔ پرچے کی اشاعت تک اسلامی کیلنڈر کے حساب سے نئے سال کا آغاز محرم الحرام سے ہو چکا ہوگا......اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ نیا سال اپنے دامن میں تمام عالم کے لیے خیر اور امن و آشتی لے کر آئے (آمین) ......کیسے جناب گزشتہ قیامت خیز موسمِ برسات میں عید کیسی گزری...... ماشاء اللہ ہمارے بااختیار طبقے کے دعوؤں اور وعدوں کی نہ صرف قلعی کھل گئی بلکہ ہر آنکھ نے دیکھ لیا کہ طوفانی بارشوں میں منہدم دیواروں تلے دبنے اور کرنٹ لگنے سے کتنے ہی گھروں میں ماتم بپا ہو گیا جبکہ گندے پانی سے بھری ان ٹوٹی پھوٹی سڑکوں اور بدانتظامی کے باعث بھرے ہوئے ندی نالوں نے عوام کو کتنی اذیتوں سے دوچار کیا، لیکن جناب یہاں کون ہے ایسا، جو عوام کی پریشانیوں اور فکروں میں دبلا ہوگا......مگر صد شکر کہ جیسے تیسے کر کے نہ صرف عید منائی گئی بلکہ برسات کے خطرناک تیوروں کا بھی کسی نہ کسی طور سامنا کر لیا گیا۔ جانے آسمان قہر و غضب میں گرج برس رہا تھا یا عوام کی بے بسی پر رو رہا تھا یہ تو ایک طرف رہا جبکہ دوسری جانب عالمی منظر نامے پر نظر ڈالی جائے تو برما میں بسنے والی روہنگیا کمیونٹی پر ہونے والے ظلم و ستم نے ہر حساس دل کو خون کے آنسو رلا دیا ہے، جنہیں اپنے ہی وطن میں شہریت سے محروم کر کے بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ جنگِ آزادی 1857ء کے بعد انگریزوں نے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو بھی برما میں ہی جلاوطن کیا تھا جہاں ان کی آخری آرام گاہ بھی ہے لیکن اب مقامی برمی اکثریت روہنگیا کمیونٹی کو تارکین وطن قرار دیتی ہے۔ صرف مذمتی بیانات اور احتجاجی سیاست سے یہ سنگین مسئلہ حل نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لیے انسانی ہمدردی پر مشتمل کچھ عملی اقدامات کی بھی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ صرف امتِ مسلمہ بلکہ تمام عالم پر اپنا رحم فرمائے اور اپنی حفاظت میں رکھے۔ (آمین)۔ اسی فکر و الم اور دعاؤں کے سنگ اب داخل ہوتے ہیں اپنی محفل میں جہاں نئے نئے اذہان اپنے اپنے نظریات لیے حاضر ہیں۔

✠ بلقیس خان مانسہرہ سے تبصرہ کر رہی ہیں۔ ”والدہ کی طویل ترین بیماری خاندان میں برپا ہونے والی غمی و خوشی، موسم کی گرم ظریفی اور کچھ ملکی حالات نے تبصروں کی حد تک نااہل کر دیا۔ کچھ دوستوں کی خامشی نے حوصلہ توڑا۔ جیسے رضوان تنولی کا تغافل، نادر سیال، معراج محبوب عباسی، سرفراز چودھری، سجاد خان، مظہر سلیم ہاشمی، انور یوسفزئی، محسن علی طالب، پری زے خان، شکیل کاظمی، سعدیہ بخاری، میمونہ ہاشمی اور مرحا گل وغیرہ......اس وغیرہ میں اور بھی بہت سے احباب ہیں، نادر سیال کے لیے ازحد پریشان ہوں۔ وہ پہلے بھی اپنے علاقے کے بالارستوں کے جبر کا شکار ہوئے تھے۔ باقاعدہ لکھنے والے قدرت اللہ نیازی بھی اب خال خال نظر آنے لگے ہیں۔ (جی جناب بتائیے اس کی وجہ) ماہ ستمبر کے سرورق پر حسینہ سبز ہلالی پرچم تلے انصاف والوں سے انصاف کی منتظر نظر آئیں۔ ذاکر صاحب آپ کو عذرا آپی، معراج رسول صاحب اور ادارے کے تمام محنتی ارکان کو گزرا 14 اگست اور آنے والی عید الاضحیٰ مبارک ہو۔ جون ایلیا کے غمزدہ سوال کیا شام اداس ہے؟ سے دامن بچاتے اداریے پر طائرانہ نظر ڈالتے ساری باتوں سے اتفاق کرتے جب محفل میں پہنچے تو ڈاکٹر نائلہ نصر کا پہلی ہی بار اٹھا قلم ”پہلے آیئے اور پہلے پایئے“ کی عملی تفسیر ثابت ہوا۔ تبصرہ مکمل اور مفصل رہا۔ مبارک باد۔ ڈاکٹر صاحبہ کے پسندیدہ مصنفین منظر امام، ڈاکٹر شیر شاہ سید، ناہید سلطانہ اختر، اسما قادری اور طاہر جاوید مغل ہمارے بھی پسندیدہ لکھاری ہیں۔ خدا انہیں سلامت رکھے اور یہ کارواں یونہی چلتا رہے۔ زریان سلطان کی تاکا جھانکی اچھی لگی۔ طاہرہ گلزار حسب سابق لمبے چوڑے نامے کے ساتھ حاضر تھیں۔ دوست محمد خان ہم دوستوں کے دوست ہیں، آپ نے یاد کیا اور ہم حاضر۔ باغی سے آغاز کیا۔ محمد طاہر عمیر کی دوسری قسط بھی باکمال رہی لیکن آشتی کی بے وفائی نے طبیعت کرکری کر دی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کے حساس قلم سے نکلی اور سادہ پیرائے میں بیان کی جانے والی سچی کہانیاں سیدھا دل پر اثر ڈالتی ہیں۔ جب تک ڈاکٹر صاحب جیسے دردمند دھرتی پر موجود ہیں درد بنتا رہے گا، چشم نم رہے گی، دل دکھتا رہے گا، احساس زندہ رہے گا۔ بے ضمیر میں بیٹا باپ سے زیادہ بے ضمیر نکلا۔ حسام بٹ کے وقت کی پاکستان شفنگ بے مزہ کر گئی۔ اب دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے؟ غلطی، چوتھا درویش، بازارِ حسن، دہشت زدہ، سوانگ، آرٹسٹ، اگر خوب تھیں تو آصفہ ضیا احمد کی حقدار بہت خوب رہی۔ چند و ٹیکسی والا تو بڑا اگریٹ نکلا۔ ناہید سلطانہ اختر کی ذرا سی بات نے یوں جانے دل میں چھید کر دیے۔ لوگ اتنے تنگ دل کیوں ہو تے ہیں؟ پہلے صفحات پر سانجھ علی اختر کی بہترین کاوش ہے۔ اس ڈر سے کہ کہیں تبصرہ شائع ہونے سے نہ رہ جائے، سانجھ کے صرف 6 یا 7 صفحات ہی پڑھ سکی ہوں۔ اشعار اور قصہ یوسف علیہ السلام کو ابھی پڑھنا ہے۔ وزیر محمد خان کی نگارشات اور لطائف دلچسپ ہوتے ہیں۔ اطہر ...ن اور تفسیر عباس بابر عالمی معلومات لیے شکر ہے خدا کا، کسی طرح نظر تو آئے۔ (اب آپ کی حاضری بھی تواتر سے ہونی چاہیے...... یادداشت ...ن' ملو لار ...نے کے لیے رابطہ ضروری ہے)۔“

✠ ریاض بٹ، حسن ابدال سے شاملِ محفل ہیں۔ ''میں عرصہ تیس سال سے سسپنس پڑھ رہا ہوں۔ کافی عرصے میں خطوط کی محفل میں شریک ہوتا رہا ہوں پھر میں نے اپنے آپ کو صرف محفل شعر و سخن اور کترنوں تک محدود کرلیا۔ اس کی وجہ مصروفیات بھی ہیں اور لکھنے لکھانے کا شغل بھی ہے۔ اشعار اور انتخاب تو بندہ جب ٹائم ملے لکھ کر ایڈوانس رکھ سکتا ہے لیکن تبصرہ تو پورا رسالہ پڑھ کر ہی لکھا جاسکتا ہے لیکن اس بار سرورق نے مجھے دوبارہ اس محفل کی راہ دکھادی ہے۔ سرورق دیکھ کر خود بخود لبوں پر یہ نغمہ آ گیا۔ اس پرچم کے سائے تلے ہم ایک ہیں۔ سانجھی اپنی خوشیاں اور غم ایک ہیں...... لیکن مجھے بڑے دکھ سے یہ لکھنا پڑ رہا ہے کہ کیا واقعی ہم ایک ہیں؟ ہمیں تو صرف پاکستانی ہونا چاہیے اور اس پر فخر کرنا چاہیے۔ ہمیں آج اس اتحاد کی ضرورت ہے جو بحیثیت قوم ستمبر 1965ء میں نظر آیا تھا۔ خون دینے والوں کی لائنیں دیکھ کر سر فخر سے بلند ہوگیا تھا...... اور یہ اسی اتحاد، ملی جذبے کا کمال تھا کہ ہماری مسلح اور جری افواج نے اپنے سے کئی گنا فوج کے دانت کھٹے کردیے تھے...... جو لاہور کو فتح کرنے کا خواب لے کر آئے تھے۔ ہماری نئی پود ہمیں پاگل سمجھتی ہے...... وہ یہ نغمہ گنگنانے سے اجتناب کرتے ہیں ہم لائے ہیں طوفان سے کشتی نکال کے، اس ملک کو رکھنا میرے بچوں سنبھال کے...... بلکہ ان کے لبوں پر یہ نغمہ ہوتا ہے۔ دیدی تیرا دیور دیوانہ...... اب تو ہمارے چل چلاؤ کا وقت ہے۔ اس ملک کی باگ ڈور اب تم نے ہی سنبھالنی ہے۔ بہن نائلہ نصر کا خط پہلے نمبر پر ہے۔ واقعی وہ صدارت کی ہی حقدار تھیں۔ گلاب، موتیا، رات کی رانی اور چنبیلی کی خوشبو میں بسا ان کا خط قابلِ تعریف بھی ہے اور قابلِ غور بھی۔ آپ نے کہانیوں کے سلسلے میں جن پوائنٹس کی طرف اشارہ کیا ہے...... وہ حقیقت پر مبنی ہیں۔ محمد زریان سلطان کا خط بھی محفل کی جان ہے۔ آپ کی سوچ اور خیالات ارفع و اعلیٰ ہیں۔ بہن طاہرہ گلزار نے بھی بڑا مدلل اور سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ تقریباً ہر پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ ویل ڈن زرین آفریدی بہن' آپ کا خط بھی کسی [illegible] نہیں ہے۔ کہانیوں پر تبصرہ اچھا ہے۔ آگے بڑھے تو بہن اوشا راٹھی کا تبصرہ آیا۔ چلیں' آپ کے بھیا نے تبصرہ نہیں لکھا تو کیا ہوا۔ آپ [illegible] بہت کا حق ادا کردیا مگر اب یہ انٹری مستقل بنیادوں پر ہونی چاہیے۔ کہانیوں کی طرف آنے سے پہلے شعر و سخن اور کترنوں کی [illegible] محفل بھی ہر ماہ خوب سجتی ہے۔ سارے اشعار اور انتخاب قابلِ تعریف ہیں۔ یہاں دلچسپی کی ایک بات عرض کرنا چاہوں گا کہ [illegible] سال بعد میں محفل [illegible] اور [illegible] بکھری کترنوں سے آؤٹ ہوا اور اس کی کوئی وجہ بھی ہوگی۔ (ہماری جانب سے ایسا کچھ نہیں ہوا [illegible] محفل [illegible]) تاریخی اوراق سے کشید کرتا تاریخی کہانی سانجھ کا تانا بانا بڑے موثر انداز میں اختر علی نے بُنا ہے اور [illegible] بات وہی ہے کہ انگریزوں اور ہندوؤں کے چنگل سے ہمیں آزادی ویسے [illegible] ملک دیا تھا۔ تنویر ریاض کی ادھورا خواب بھی پسند آئی۔ بے ضمیر بھی ثمر عباس کی ایک قابلِ [illegible] مرزا امجد بیگ صاحب ہمیشہ کی طرح نمبر لے گئے۔ باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ (آپ نے کافی عرصے بعد محفل میں شرکت کی بہت شکریہ۔ ایک بات آپ سے اور آپ کے توسط سے ہمارے ایک اور کرم فرما ہیں وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ سے۔ بعض اوقات ایک ہی ماہ میں ہمیں آپ کی طرف سے اقتباسات اور اشعار کے کئی لفافے موصول ہوتے ہیں تو جناب عرض یہ ہے کہ آپ ایک ہی لفافے میں رکھ کر بھیج سکتے ہیں۔ کسی تردد میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں وقت پر جو بھی خطوط موصول ہوتے ہیں، کوشش کرتے ہیں کہ رسالے کی زینت بن جائیں)۔''

✠ ادریس احمد خان ناظم آباد کراچی سے خط لکھ رہے ہیں۔ ''خوبصورت رنگوں سے سجا ستمبر کا ''سسپنس'' موصول ہوا۔ ٹائٹل بھی بہت خوب تھا جس کے لیے ذاکر صاحب کو مبارک باد۔ انشائیہ بھی اپنی اہمیت کا احساس دلا رہا تھا۔ سرفہرست ڈاکٹر نائلہ نصر تھیں۔ دیگر دوستوں کے ساتھ طاہرہ گلزار کی بھی بھرپور شرکت نظر آرہی تھی۔ سب سے پہلے ابتدا علی اختر کی ''سانجھ'' سے کی اور جنگِ آزادی کی خونچکاں داستان سے آگاہی حاصل ہوئی مگر افسوس صد افسوس میر جعفروں اور میر صادقوں نے منافقت کی۔ ہمیں بعد میں جو آزادی ملی، وہ ہندو بنیے اور انگریز مکار دونوں کی ملی بھگت سے وہ ثمرات جو صحیح معنوں میں مسلمانوں کو ملتے، وہ نہ ملے۔ مکار ذہنوں نے راتوں رات پاکستان کے نقشے بدل دیے جس کے نتیجے میں لاکھوں انسانوں کا قتلِ عام ہوا مگر انشاء اللہ پاکستان رہتی دنیا تک قائم و دائم رہے گا، آمین۔ جتنا تفصیل سے لکھا تاریخ کے گوشے گوشے سے روشناس ہوئے۔ ادھورا خواب بہتر کہانی تھی۔ اس کے بعد محمد طاہر عسیر کی ''باغی'' تھی جس نے آخری سطر تک سنسنی پھیلائے رکھی۔ امید ہے یہ سلسلہ دلچسپی سے چلتا رہے گا اور اپنی اہمیت منوائے گا۔ باغی کے بعد ڈاکٹر شیر شاہ سید کی مکافات پڑھی۔ ان کی ہر کہانی منفرد رنگ لیے ہوتی ہے اور دیر تک یاد رہتی ہے۔ ''بے ضمیر'' بھی پسند آئی جس میں ماں باپ سے زیادہ بچہ بہت حساس تھا جس نے بے حسی کی زندگی کو اچھا نہیں سمجھا اور اپنی نفرت کا اظہار ڈینئل کو مار کر کیا۔ ''بازارِ حسن'' اچھی لگی۔ شعر و سخن کی محفل میں منتخب اور پسندیدہ اشعار نے مزہ دیا۔ شاہ زین رضوان کی کہانی دہشت زدہ بھی بہت پسند آئی۔ حسام بٹ صاحب کی ''وقت'' بھی کامیابی سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ ''آرٹسٹ'' دوسروں کی نظروں میں کبھی کبھی بیکار مشغلے بھی کارآمد ہوجاتے ہیں جیسا کہ بینک ڈکیتی میں کیتھرائن نے اپنی عادت کی بنا پر ڈاکو کو خطرے سے دوچار کردیا اور اس [illegible] بنادیا۔ ''غلطی'' بھی بہتر کہانی تھی۔ چالاک سے چالاک مجرم بھی کہیں نہ کہیں ایسی غلطی کر جاتا ہے جو اس کے گلے کا پھندا بن جاتا ہے۔ [illegible] یوسف علیہ السلام کی داستانِ حیات بھی بہت سبق آموز، دل کو ایمان کی روشنی سے منور کرنے والی سوانح حیات ہے۔ ''حقدار'' بھی [illegible] میں شامل رہی۔ سوانگ میں ایک بہروپیے نے حقیقت کا رنگ بھرنا چاہا مگر حقیقت آشکار ہوگئی جو اس کو پابندِ سلاسل کرنے سے نہ روک

سکی۔ آخری صفحات کی کہانی محترمہ ناہید سلطانہ اختر کی ذرا سی بات تھی۔ ذرا سی بات نے بڑے طوفانوں کا در وا کیا اور رشتوں کو رشتے داروں سے دور کر دیا۔ سازش کے ذریعے دلوں اور رشتوں کو دور کر دینے والے بھی کبھی خوش نہیں رہتے۔ دنیا میں ذلیل و خوار تو رہتے ہی ہیں، اللہ کے دربار کی حاضری جب ہوتی ہوگی تو اس کا عذاب دنیا سے ہزاروں گنا بدتر ہوگا۔ کترنیں بھی دلچسپی کا محور ہیں۔ (آپ کی محبتوں کا بے حد شکریہ)۔"

✠ طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے۔ "تمام دوستوں اور ادارے والوں کو عید مبارک ہو۔ میری دعا ہے اس عید پر ہمارے لیے خوشیاں نہیں تو کوئی دکھ بھی نہ آئے۔ 24 ستمبر سے نیا اسلامی سال بھی شروع ہوگا۔ میری دعا ہے کہ اللہ اس نئے سال میں تمام مسلمانوں اور خاص کر ہم پاکستانیوں کے لیے بہت بہت خوشیاں، کامیابیاں اور کامرانیاں لائے۔ آمین۔ انشائیہ میں اس بار جون ایلیا بیگانگی کے ساتھ ملے۔ واہ جون ایلیا صاحب! کیا کیا تلخ حقیقتیں سامنے لاتے ہیں لیکن کیا فائدہ یہ بیگانگی در بیگانگی تو ہمارے ساتھ ساتھ قبر تک جائے گی۔ یہ تو ازل سے ہو رہا ہے کہ ہنر مند کا ہنر دوسرے کھاتے رہے ہیں۔ واہ اس بار میرے ہی شہر پشاور سے ڈاکٹر نائلہ نصر حاضر ہیں۔ ویلکم ڈیئر پخیر راغلے۔ صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ ہمارا معاشرہ وہ ہے کہ کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ محمد زریان سلطان دعائیں تو بہت لائے ہو بھائی لیکن کبھی آپ نے خود اس ملک کے لیے کچھ صحیح کرنے کی ہمت کی ہے؟ شکر ہے کوئی تو ہم سے متفق ہوگیا کہ پہلے کی تحریریں دوبارہ شائع ہوں۔ بہت پیارا اور خوبصورت تبصرہ ویلڈن زریان۔ زرین آفریدی تبصرہ تو اچھا کرتی ہیں لیکن بہت سوں کو مکھن بھی خوب خوب لگاتی ہیں...... اوشا راٹھی ڈیئر ویلکم اب آتی رہنا۔ اب تو اطہر حسین بھی آنے لگے ہیں۔ تبصرہ اچھا کرتے ہو، خوشی ہوئی۔ رمضان پاشا بھائی خوشی ہوئی کہ آپ کو میرا بھائی کہنا اچھا لگا۔ آپ بہت اچھا تبصرہ کرتے۔ بنو ماہد احمد اللہ آپ کے بیٹے کو جنت میں اعلیٰ مقام دے اور آپ کو صبر عطا کرے، آمین۔ پہلے منظر امام کی تحریر جو تھا درویش پڑھی۔ بڑی ہنسی بھی آگئی یہ درویش تو اپنے سیاستدانوں سے بھی دو ہاتھ آگے نکلا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید ہمیشہ ایسے ہی انمول اور حیرت انگیز تحریریں لاتے ہیں۔ مکافات بھی ایسی ہی تحریر ہے۔ پرانے لوگوں کی پاکیزہ محبتیں بھی پرانے صاف ستھرے کراچی کی طرح ہے۔ کیا ہوا کہ نیلوفر پارسی تھی۔ نکاح کے بعد مسلمان ہو جاتی لیکن مراد جیسے مار آستین کسی کا بھلا دیکھ ہی نہیں سکتے اور خود اپنے بیٹے کے ساتھ گھٹیا کام میں ایسے ساتھ دیا جیسے یہ ثواب کا کام تھا اور جنت ملنی تھی۔ سلیم انور اس بار آرٹسٹ جیسی تحریر لائے جس میں کیتھرائن نے اپنی مصوری کی مدد سے بینک لوٹنے والے کی تصویر بنا کر نشاندہی کی، لاجواب تحریر۔ جمال دستی کی تحریر سوانگ اچھی تحریر ڈاکٹر فشر نے تو چلو ڈاکٹر کا روپ دھارا، ہمارے معاشرے میں لوگ کیا کچھ کرتے ہیں۔ دوسروں کو تکلیف دینے کے لیے کیا سوانگ بھرتے ہیں، ویلڈن جمال دستی...... ناہید سلطانہ اختر کی تحریر ذرا سی بات اس معاشرے کے منہ پر طمانچہ ہے۔ ساجد جیسا بے حس باپ کہ بیٹی کو اپنا خون نہ مانا۔ یہ تو اللہ کا کرم کہ علینہ کو راحیل جیسا سچا اور کھرا محبت کرنے والا شوہر ملا اور اتنے اچھے سسرالی ملے۔ بہت اچھا کیا کہ علینہ نے ڈی این اے کرانے کا کہا اور بے شرم ساجد اور شاہینہ کے رشتے داروں کے منہ پر سچ کا جوتا مارا، ویلڈن ناہید صاحبہ۔ طاہر عمیر کی تحریر باغی کامران تو چونکا گیا لیکن کم از کم مجھے نہیں۔ جواد کی بڑھتی ہوئی کامران کے لیے محبت نے پہلی قسط میں مجھے چونکا دیا تھا کہ جواد اور آشتی وہ نہیں جو نظر آ رہے ہیں۔ کامران حد سے زیادہ جذباتی ہے۔ سوچتا کم ہے اور عمل زیادہ کرتا ہے۔ کامران بے وقوف ہے۔ ان بڑے مگرمچھوں کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ حسام بٹ کی تحریر وقت اس قسط میں تو صرف علی کو ایک اچھا دوست عظیم ملا جس نے پورے کراچی کی منظر نگاری کی۔ کھانوں سے لے کر پولیس کی جادوگری تک دکھایا۔ عظیم کے گھر ڈنر بھی کیا، بس آخری لمحوں میں سسپنس بڑھا دیا کہ عظیم نے اس کو خوشخبری دی... ایک نمبر کا پتا چلا کہ تم کسی سلمیٰ خاتون کی کھوج میں ہو باقی آئندہ۔ اس بار تو بیگ صاحب کافی دلچسپ کیس لے کر حاضر تھے۔ مزہ آ گیا کہ آخر قانون بھی کوئی چیز ہے۔ آصف جیسے گھٹیا اور بے حس مرد کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ پلیز ادارے والے میرے یہ الفاظ نہ کاٹیں تمام ملزمان اور مجرم دن میں ایک بار درود مستغاث پڑھیے۔ (ہم نے آپ کی بات کا بھرم رکھتے ہوئے آپ کے یہ الفاظ نہیں کاٹے...... اب خوش)۔"

✠ اوشا راٹھی کا مٹھی سندھ سے تبصرہ۔ "زندگی دھوپ چھاؤں کا مرقع ہے۔ یہ دکھ سکھ سے عبارت ہے۔ انسان تا حیات کسی بھی صورت خوشی و غم سے دامن بچا سکتا ہے اور نہ ہی ان سے پیچھا چھڑا سکتا ہے۔ میری خوشی کا بھی ٹھکانا نہ رہا جب اپنا خط محفل کی زینت بنے دیکھا۔ سب سے پہلے تو مجھے ان صاحب یا صاحبہ کا تعارف چاہیے جو ہمارے تبصروں کے جواب میں جملے لکھتے ہیں یا ہمارے خطوں کا جواب دیتے ہیں۔ (کیوں آپ نے کوئی سزا دینی ہے کیا...... مدیرہ کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے بھلا)۔ انشائیہ میں جون ایلیا ہمیں بہت شاندار باتیں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ تو باتیں سمجھ میں آ جاتی ہیں، کچھ سر سے گزر جاتی ہیں۔ بیگانگی میں بتایا کہ حق دار کو اس کا حق نہیں ملتا۔ مطلب جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ اداریہ میں تو پیاری یمنیٰ جی لاجواب کر دیتی ہیں۔ اوسم ہوتا ہے اداریہ (بہت شکریہ پسند کرنے کا)۔ ہم بھی اپنے خیالات کے گدھے، اوہ سوری گھوڑے دوڑاتے ہوئے بزمِ دوستاں میں پہنچے تو ڈاکٹر نائلہ نصر کو او پی ڈی میں دیکھا لیکن ڈاکٹر کا گرمیوں کی چھٹیوں میں کیا کام۔ شاید ابھی ڈاکٹر بننے کے مراحل میں ہیں۔ بہرحال تبصرہ سپر تھا۔ صدارت مبارک۔ محمد زریان نے بھی اچھا لکھا۔ طاہرہ گلزار آنٹی ادارے کی قینچی بھی آپ کی ہم عمر ہے اور آپ ہی سے پیار ہے۔ اگر یہ اپنا کام نہ کرتی تو باقی کے تبصرہ نگار بیچارے بلیک لسٹ میں پڑے ہوتے۔ زرین آفریدی جی بھی کلاسک تبصرہ کرتی ہیں۔ ساتھ ناہید یوسف بھی۔ رمضان پاشا انکل اور ادریس احمد خان صاحب کے علاوہ باقی نئے تبصرہ نگار بھی متاثر کن لکھ رہے

ہیں۔ صادق آباد والے اعوان صاحب اپنا نام محفل میں دیکھ کر خوش ہو گئے ہوں گے۔ ان کا شکوہ بھی دور ہو گیا ہوگا۔ سسپنس کلاسک کا انتظار ہمیں بھی ہے۔ اس بار ڈائجسٹ پڑھنے کی ابتدا سلسلہ وار کہانیوں سے کی کیونکہ اگست کے شمارے کی وقت دو دن پہلے ہی ختم کی اور پھر ستمبر کا ڈائجسٹ آ گیا۔ اس طرح حسام بٹ صاحب کی وقت پڑھنے کا تسلسل نہیں ٹوٹا۔ مبارک باد حسام بٹ صاحب، بہت ہی اوسم داستان لکھ رہے ہیں۔ اسد علی پاکستان آ گیا اور آتے ہی عظیم جیسا اچھا دوست مل گیا جس نے ماں کو تلاش کرنے کا سراغ بھی دے دیا۔ باغی محمد طاہر عمیر جی تو کافی منجھے ہوئے رائٹر لگ رہے ہیں۔ کامران چودھری بھی زبردست ہیرو ہیں۔ اپنے والد سے بغاوت بھی صحیح کر رہے ہیں۔ میں اکثر ڈائجسٹ کا مطالعہ لیٹ نائٹ کرتی ہوں جب ہر طرف خاموشی اور بے فکری ہو۔ مرزا امجد بیگ جی کی امیدوار پڑھی۔ کیس اپنی جگہ زبردست رہا مگر اس کیس کے ایک کریکٹر آصف کی بونگیوں نے بہت ہنسایا اور انجوائے کیا۔ ہیئرنگ کے دوران مرزا جی نے اس پر جو جملے کسے اور اس کے جواب پر ہنس ہنس کر میری آنکھوں میں پانی آ گیا۔ میری ماں میرے کمرے میں آ کر پریشان ہو گئیں کہ ان کی بیٹی آدھی رات کو کیوں ہنس رہی ہے کہیں اس پر کوئی جن تو نہیں آ گیا۔ (ارے ارے کیا غضب کر رہی ہیں۔ اس طرح تو اپنا دوست سسپنس کہیں بدنام نہ ہو جائے، خیر کوئی بات نہیں)۔ علی اختر کی سانجھ عزیزن بائی پر یہ مثال فٹ آتی ہے کہ وہ ایک پارس پتھر کے مانند تھی۔ وہ ایک طوائف، کئی شریف زادیوں پر سبقت لے گئی۔ ویلڈن علی اختر صاحب۔ ذرا سی بات میں ناہید سلطانہ اختر جی نے پھر ایک بار معاشرتی برائی کو واضح کیا۔ انا پرست لوگ دوسروں کی زندگی میں زہر گھولتے وقت اوپر والے کی طاقت کو بھول جاتے ہیں۔ شاہینہ بیچاری کی پوری زندگی دکھ میں گزری۔ غلطی میں اعتزاز سلیم نے پیسے کی لالچ میں اندھے لوگوں کا برا انجام بتایا۔ جناب شیر شاہ سید جی میرے پیارے شہر کراچی کو اتنے دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں کہ دل چاہتا ہے میں اس زمانے میں کراچی دیکھتی اور اس دور میں پیدا ہوتی۔ میری ہونے والی سسرال بھی کراچی میں رہتی ہے۔ مستقبل میں کراچی میرا بھی ہوگا۔ (اوہو...... یہ کی ہے ناپتے کی بات...... آیئے ہم منتظر ہیں)۔ اکثر مسلمان لڑکے، ہندو، پارسی اور عیسائی لڑکیوں کے عشق میں مبتلا ہو جاتے ہیں مگر اپنا نہیں سکتے۔ یہ بہت بڑا المیہ ہوتا ہے جو پوری زندگی دکھ سے بھر دیتا ہے۔ اپنی اماں سے ٹرام کی سواری کے متعلق معلومات بھی کی۔ اب میٹرو نے ٹرام کی جگہ لے لی۔ بازار حسن محمد الیاس جی دوستوں کی کہانی اچھی رہی۔ ان کے حالاتِ زندگی پڑھ کر بہت ہنسی بھی آئی، زبردست۔ اشعار کی محفل میں اپنا شعر اعزازی صف میں دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ بہت شکریہ۔ کترنیں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ محفل شعر و سخن پوری کی پوری بہت زبردست۔ ناہید یوسف جی، وزیر خان، مہتاب احمد، یمنیٰ جاوید، صبا حمید، زرین آفریدی، لبنیٰ وکیل، نوشتہ گلزار، صبا سحر کے انتخاب لاجواب رہے۔ (سسپنس دوستی کا بے حد شکریہ)۔"

✠ زرین آفریدی حیدر آباد سندھ سے محفل میں شرکت کر رہی ہیں۔ "زندگی...... یہ متضاد کیفیات کے مجموعے کا نام ہے۔ دکھ اور سکھ کی کہانی ہے، کھونے اور پانے کا فسانہ ہے۔ ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ جشن آزادی کی خوشی دوبالا کرنے 14 اگست کو ہی مل گیا۔ شاباش ہے اسٹاف و ادارہ سسپنس ڈائجسٹ کو کہ وہ ہماری خوشی و جذبات کا خیال کرتے ہیں۔ شکریہ...... عذرا رسول صاحبہ اور یمنیٰ احمد صاحبہ۔ ٹائٹل خوش رنگ اور دلکش تھا۔ (پسندیدگی کا شکریہ)۔ انشائیہ میں جون ایلیا صاحب بیگانگی میں بتا رہے ہیں کہ جو بہت کچھ ہے، وہی سب کچھ ہے۔ برائی، اچھائی پر حاوی ہوتی جا رہی ہے۔ ہم کرنا کچھ اور چاہتے ہیں لیکن ہو کچھ اور جاتا ہے۔ اداریہ زمینی حقائق بیان کر رہا تھا۔ ویلڈن۔ دوستوں کی محفل میں ڈاکٹر نائلہ نصر صدارت پر تھیں۔ تبصرہ بھی بہت اچھا تھا۔ مبارک باد۔ شیر شاہ سید میرے بھی فیورٹ رائٹر ہیں۔ محمد زریان سلطان دوسرے نمبر پر رہے۔ طاہرہ گلزار آنٹی کا دو سوا سی گز کا خط، تبصرہ کم آپ بیتی زیادہ لگتا ہے۔ ادشارا تھی محفل میں اچھا اضافہ ہیں۔ ویلکم۔ ناہید یوسف، مہتاب احمد، رمضان پاشا اور ادریس احمد خان کے علاوہ نئے تبصرہ نگاروں کے خیالات و الفاظ اچھے رہے۔ ہسٹری میرا فیورٹ سبجیکٹ ہے۔ اس لیے سب سے پہلے تاریخی کہانی ہی میری توجہ کا مرکز بنتی ہے۔ علی اختر صاحب کی سانجھ، ایک طوائف زادی کی بے مثال داستان، سچ کہتے ہیں کبھی کبھی یہ کھوٹے سکے بہت کام کے ہوتے ہیں۔ عزیزن بائی کی جنگِ آزادی کی سانجھ میں حصہ داری اس کو امر کر گئی۔ بہت خوب۔ ادھورا خواب میں جناب تنویر ریاض صاحب نے مارتھا کے سچے خواب بتا کر کافی متاثر کیا۔ باغی کی دوسری قسط پڑھی۔ بہت زبردست۔ ایسی تیز ٹیمپو والی بے باک تحاریر بہت ... ہیں۔ داستان میں ایسا ماحول پیش کرتے ہیں کہ جیسے ہم فلم دیکھ رہے ہوں۔ ویلڈن صاحب باغی۔ حسام بٹ صاحب کی وقت کی قسط نمبر ... کی تو حیرت کا جھٹکا لگا کہ کتنی جلدی وقت گزر رہا ہے۔ واقعی وقت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے۔ اسد علی پاکستان آ کر اپنا ... پورا دن عظیم کے ساتھ خرمستیاں کرتا رہا، رات تک سلمیٰ مطلب اس کی ماں تک پہنچنے کا سراغ مل ہی گیا لیکن مجھے لگتا ہے اس کی ماں ... ہے۔ ویسے گلوریا جینز کی کیپوچینو کافی بہت مزیدار ہے۔ اب پاکستان میں اسد علی کے ایکشن کا انتظار ہے۔ ویلڈن حسام بٹ صاحب ... جناب مرزا امجد بیگ صاحب، اس بار تو ان کا کیس بہت ہی زبردست رہا۔ موقع پرست لوگ رشتوں کا تقدس بھی بھول جاتے ... ہماری بھولی ... یہ کے ساتھ لوگوں نے بہت برا کیا۔ اعتزاز سلیم کی غلطی بھی اچھی رہی۔ دولت کے لالچی کبھی سکھی اور خوش نہیں رہ سکتے۔ وہ ... کے لیے بھی عذاب جاں ہوتے ہیں۔ رضوانہ ساجد صاحبہ نے اللہ سائیں کے جلیل القدر پیغمبر کی سوانح حیات کے سبق آموز پہلو سے ... جزاک اللہ خیر۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید صاحب ہمیشہ کی طرح پُرسکون و حسین کراچی کا منظر پیش کرنے میں کامیاب رہے۔ پارسی نیلوفر ... لڑن سراد کی بے وفائی، بہت درد دے گئی۔ مراد کے اپنے بیٹے نواز بخش نے جو کیا وہ واقعی مکافاتِ عمل ہی تھا۔ ناہید سلطانہ اختر

صاحب کی ذرا سی بات کتنی اذیت ناک بات ثابت ہوئی۔ انا پرستوں کی ذلالت کی انتہا تھی۔ شاہینہ کا شوہر بھی بہت ہی نیرو مائنڈ بندہ تھا۔ بغیر تحقیق وصفائی کے اتنا بڑا قدم اٹھالیا۔ یہ اچھا ہوا کہ علینہ کو بہت اچھا سسرال اور شوہر ملا ویلڈن ناہید سلطانہ اختر صاحبہ۔ اس بار سراسلے تمام نئے اور بہترین تھے۔ محفل شعروسخن بھی عروج پر تھی۔ تینوں اعزازی شعر واقعی بہت بہت زبردست تھے۔ میرا ووٹ بھی سسپنس کلاسک کے حق میں ہے۔ حج اور عیدالاضحیٰ کی بہت مبارک باد۔ (بہت شکریہ۔ آپ سب کی رائے کا ہم بے حد احترام کرتے ہیں۔ سسپنس کلاسک کے حوالے سے آپ کا ووٹ ہم نے محفوظ کرلیا ہے)۔''

✠ رمضان پاشا کا خط گلشن اقبال کراچی سے۔ ''ستمبر 2017ء کا سسپنس کا سرورق بہت خوب تھا۔ یوم آزادی کی مناسبت سے ذاکر صاحب نے بڑا اچھا ٹائٹل بنایا۔ لہراتا ہوا قومی پرچم اور قومی ترانہ گاتی ہوئی ایک 30 سالہ خاتون کے کان کی بالی میں بھی چاند تارا بہت خوب (ماشاء اللہ بہت گہری نگاہ ٹکائی ہے آپ نے سرورق پر)۔ فہرست بالکل سادہ تھی۔ جشنِ آزادی کے شایانِ شان نہیں تھی۔ البتہ انشائیہ قابل غور اور فکر انگیز تھا۔ اس بار اشعار کی محفل میں چھپے تمام ہی اشعار قابل داد تھے، صرف اس عاجز کا شعر نہیں چھپا تھا، خیر کوئی بات نہیں میرا شعر سسپنس کے مزاج سے متصادم ہوگا! (اشعار اگر معیاری اور اساتذہ کے کلام سے منتخب کریں تو اچھا ہے)۔ منظر امام صاحب کی کہانی چوتھا درویش میں کوئی مزہ نہیں تھا۔ کہانی حقدار نے حق ادا کردیا یعنی ہمارے پیسے وصول ہوگئے۔ حسام بٹ کی کہانی وقت یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ یہ کہانی لکھ کر بٹ صاحب کو کیا کیا انعام ملے گا۔ باغی نے بھی دل میں تہلکہ مچار کھا ہے۔ ذرا سی بات کہانی بہت ہی دبنگ اور پُراثر تھی۔ امیدوار بیگ صاحب اس بار بھی اپنا کیس جیت کر ہی رہے۔ وہ ہارتے کب ہیں۔ حسبِ معمول عدالتی کارروائی میں مزہ آیا۔ دہشت زدہ پسند نہیں آئی۔ مکافات پڑھ کر اپنی جوانی کے دن یاد آ گئے۔ ٹرام، سولجر بازار، کیماڑی، ماما پارسی اسکول وغیرہ، کتنا اچھا تھا اس وقت کراچی اور اب؟ جانے دیجیے! آرٹسٹ بی بی نے جو پورٹریٹ بنایا ہے۔ اس کی کاربن کاپی سے ڈاکوؤں کا تیا پانچہ کیا جاسکتا ہے۔ بے ضمیر یہ فیملی خیرات پر گزارہ کرتی ہے، تعجب ہے امریکا جیسے ملک میں ایسے لوگ بھی رہتے ہیں۔ (ایسے لوگ ہر جگہ ہر معاشرے میں کسی نہ کسی روپ میں موجود ہوتے ہیں)۔ ادھورا خواب نے بھی خوب لطف بہم پہنچایا۔ غلطی ہائے زود پشیماں کا پشیماں ہونا، بیگم صاحبہ نے ایسی غلطی کی کہ سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ (آپ کا تبصرہ من وعن چھپے گا تو پھر باقی قارئین کے من بھی من من بھر کے ہوجائیں گے۔ ذرا سوچیے تو پھر کیا ہوگا)۔''

✠ محمد قدرت اللہ نیازی خانیوال سے تبصرہ کررہے ہیں۔ ''سرورق پاکستان کے جھنڈے سے سجا پیارا لگا تاہم سرورق پر موجود حسینہ کے نافہم تاثرات نے سرورق کی خوبصورتی ماند کردی۔ انشائیہ میں جون ایلیا کڑوی حقیقتیں بیان کرتے نظر آئے۔ ہم اپنی ذات میں ایک نہیں رہے، ہم میں دراڑیں پڑ گئی ہیں اور احساس کی سمتیں اجڑ گئی ہیں، استعاروں کا استعمال رہا۔ اداریہ سادہ الفاظ میں حقیقت بیان کرگیا کہ ہر سال مسائل پر صرف بحث ہی ہوتی ہے مگر نتائج ہمیشہ صفر نکلتے ہیں۔ میرے خیال میں اس کی وجہ اخلاص کی کمی ہے۔ کسی کو مسائل کے حل کے لیے عمل کی شرط یاد ہی نہیں رہی۔ ڈاکٹر نائلہ نصر کا تبصرہ زبردست تھا۔ ان سے متفق ہوں کہ آج ہم نے نکاح کو دشوار بنایا ہوا ہے جو بے راہ روی کی بہت بڑی وجہ ہے۔ ادارے کو نوازے گئے مشورے بھی قابل عمل ہیں۔ کرسی صدارت کی مبارک ہو۔ محمد زریان سلطان نائب کے فرائض سرانجام دیتے نظر آئے۔ ادارے نے پرانی تحریریں شائع کرنے کا عندیہ دے کر قارئین کی اکثریت کو پُرجوش کردیا ہے۔ زریان سلطان آپ کی تائید کرتے ہیں کہ مرحوم مصنفین کی تحریریں شائع کرکے ان کو خراج تحسین پیش کیا جانا چاہیے۔ طاہرہ گلزار کا کوئی بھی تبصرہ گلوے شکووں کے بغیر پڑھنے میں نہیں آیا۔ اس بار گلے شکوے خوب کام آئے اور ایک مختصر کہانی جتنا تبصرہ شائع ہوگیا۔ آپ کی پکار میں موجود تڑپ مجھ سمیت کئی تبصرہ نگاروں تک پہنچ گئی ہے اس لیے حاضر ہیں۔ (ماشاءاللہ...... موسٹ ویلکم) اوشا راٹھی محفل میں خوش آمدید۔ ناہید یوسف! شوہر بیوی بچوں کی زندگی کے ہیرو ہوتے ہیں، اتنی توجہ تو ان کا حق بنتا ہے۔ وقت پر آپ نے بہت تلخ انداز میں لب کشائی کی تاہم آپ سے متفق ہیں کہ لفاظی، فلسفہ اور ہر واقعے کی غیر ضروری تفصیل زیادہ ہے۔ دوست محمد خان! واقعی سسپنس ہاتھ میں آتے ہی انسان سب معروفیات چھوڑ کر اس میں گم ہوجاتا ہے۔ محفل میں موجود اپنائیت تمام قارئین محسوس کرتے ہیں آپ کو سارے ہی تبصرے شاندار لگے حالانکہ ایسا ہوتا نہیں ہے لیکن فیملی کی حمایت تو کرنا ہی ہے نا۔ زاہد احمد خان! آپ کے بیٹے کی ناگہانی موت پر بہت رنجیدہ ہیں۔ اللہ آپ کو صبر جمیل دے۔ عبدالکبیر تو بے شک جنت کا شہزادہ ہی ہے۔ یہ بھی درست فرمایا کہ ایک سے بڑا ایک غم ہے جہاں میں بس اللہ کی نعمتوں کی شکرگزاری کی جائے تاکہ نعمتوں میں اضافہ ہو۔ ناشکری نعمتوں میں کمی کا سبب بنتی ہے۔ اللہ ہم سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھے آمین۔ عطاءاللہ اعوان کے لیے خصوصی شفقت دیکھ کر اندازہ ہورہا ہے کہ طاہرہ گلزار کی طرح کا ... ہوگا۔ سب سے پہلے نئے سلسلے باغی نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ باغی کے ڈائیلاگز میں ایک بے ساختہ پن نظر آیا۔ کئی بار ڈائیلاگز غیر ... محسوس ہوئے جو دلچسپی پیدا کرنے کا باعث بنے۔ جواد پر تو شک پہلے تھا لیکن آشتی جس کو آتش کہنے کو دل کرتا ہے، اس پر کامران ... میں بھی اندھا اعتماد تھا۔ سچ کہا آشتی نے کہ تم مرد بھی نا کتنے بے وقوف ہوتے ہو۔ کوئی لڑکی تم سے ہنس کر بات کرلے تو تم اس کے ... اندھے ہو کر خود کو تباہ کرلیتے ہو۔ کچھ تشنگی ہیروں کے بارے میں محسوس ہوئی کہ کامران صرف بتاتا ہے کہ ہیرے جواد کی بہن نازو ... اور آشتی کہتی ہے کہ جواد! ہم نے ہیرے تو حاصل کرہی لیے ہیں، سوال یہ ہے کہ ہیرے کب حاصل کیے؟ دوسرا سلسلہ وقت

پڑھتے ہوئے کافی دقت ہوتی ہے اس لیے اس کو اس وقت پڑھا جاتا ہے جب کوئی اور تحریر باقی نہ بچی ہو اس لیے اس پر تبصرہ ادھار رہا۔ ناہید سلطانہ اختر آخری صفحات پر ذرا سی بات کے ساتھ موجود ہیں۔ ہمیشہ کی طرح ان کی تحریر اصلاحی اور دل گداز تھی۔ اللہ ان کو اس کا اجر دے اور سب کی بچیوں کے نصیب اچھے کرے اور خود کو عقلِ کل سمجھنے والے ساجد جیسے انسانوں سے محفوظ رکھے۔ اعتزاز سلیم کی غلطی ایک سرپرائز انٹری تھی۔ وہ جتنی جلدی تبصرہ نگاری سے کہانی نگاری کی طرف آئے ہیں اس نے ہمیں بھی کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ محفل شعر و سخن اور کترنیں بھی کافی بہتر ہیں۔ (محفل میں شرکت اور رسالے سے محبت کا بے حد شکریہ)۔‘‘

⌘ رانا بشیر احمد ایاز رحیم یار خان سے شریک محفل ہیں ’’کبھی تم میں ہم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو‘‘۔ سسپنس سے تقریباً چار پانچ مہینے دوری کے بعد دوبارہ سے محفل میں آمد کی اجازت چاہتے ہیں۔ (بصد خوشی اجازت ہے) ستمبر کا شمارہ بیس اگست کو وصول کیا۔ سبز ہلالی پرچم سے سجا ٹائٹل آنکھوں کے ساتھ دل کو بھی بہت بھایا۔ سرورق کی دوشیزہ کانوں میں چاند ستارہ نما جھمکا پہنے پتا نہیں منہ کیوں کھولے بیٹھی تھی۔ دانت میں درد ہو گا شاید۔ مجموعی طور پر ٹائٹل ذاکر انکل کی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ خطوط کی محفل میں سب سے پہلے ڈاکٹر نائلہ نصر صاحبہ ایم ایس بی نظر آئیں۔ بہت مبارکاں ڈاکٹر صاحبہ۔ کافی عمدہ تبصرہ رہا آپ کا۔ باقی تبصرہ نگاروں میں باجی طاہرہ گلزار تفصیلی تبصرے کے ساتھ قیام پاکستان پر روشنی ڈالتے ہوئے کافی بہترین تجاویز سے ادارے کو نواز رہی تھیں۔ کاش کہ ادارہ ان کی باتوں پر کان دھرلے۔ نئی نسل کے لیے 90 کی دہائی کے سلسلہ وار ناول شائع ہونا چاہئیں۔ باقی دوستوں میں اطہر حسین، زرین آفریدی، محمد زریان سلطان، ناہید یوسف اور مہتاب احمد بھی اپنے تبصرے کے ساتھ نمایاں تھے اور محفل میں سے کسی نے ہمیں بھول کر بھی یاد نہیں کیا۔ (واقعی یہ تو زیادتی ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ باقاعدگی سے حاضری لگتی رہنی چاہیے) چلو کوئی گل نئیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے باغی پڑھی۔ موصوف نئے قلم کار لگتے ہیں مگر کہانی کو اچھے انداز میں آگے لے کر چل رہے ہیں۔ اپنے کرائم رپورٹر صاحب کی عقل گھاس چرنے گئی ہے۔ آشتی کی محبت میں گرفتار ہو کر اپنے باپ سے بغاوت کر لی اور اپنی ہی آستین کے سانپ جواد کو نہ پہچان سکا۔ آشتی اور جواد مار آستین نکلے۔ باقی کہانی میں ہلکا پھلکا مذاق بہت زبردست ہے۔ دوسرے نمبر پر وقت دیکھا۔ اسد علی ائرپورٹ پر مشکل کا شکار ہو گیا مگر عظیم اور ارباب اس کے لیے فرشتہ ثابت ہوئے۔ خاص طور پر عظیم تو ایک نہایت ہی مخلص اور ہمدرد انسان کے روپ میں سامنے آیا ہے اور تو اور علی کی والدہ کا بھی تقریباً پتا چل گیا ہے۔ کہانی میں انٹرسٹنگ موڑ آ گیا ہے۔ منظر امام چار درویشوں کے ساتھ تشریف لائے اور چھا گئے۔ منظر امام صاحب کی تعریف کرنا گویا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ اس لیے ’’چوتھا درویش‘‘ پر نو کمنٹس۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید پرانے کراچی کی یادیں تازہ کرتے نظر آئے۔ کافی زبردست تحریر تھی۔ مرزا امجد بیگ صاحب ’’امیدوار‘‘ ڈھونڈتے نظر آئے۔ حسب سابق بیگ صاحب نے اپنے ترکش سے خوب تیر برسا کر اپنی مؤکلہ کو کامیاب کرایا۔ محمد الیاس کی بازارِ حسن نہایت بچگانہ سی رہی۔ کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکی۔ اعتزاز سلیم کی غلطی انسپکٹر شہزاد سے چھپی نہ رہ سکی اور بیان دوبارہ پڑھ کر انسپکٹر نے اصل مجرموں کی گردن دبوچ کر سارا مال واپس نکلوا لیا۔ ویری گڈ جی۔ آصفہ ضیا احمد حق کو حق دار تک پہنچانے کی پوری کوشش کی۔ کافی فلمی کہانی رہی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ تیسرے حصے کا شدت سے انتظار ہے۔ آخری صفحات پر ناہید سلطانہ اختر موجود تھیں۔ انتہائی افسوس کے ساتھ کہ وہی روایتی کہانی ظالم مرد اور صابر عورتیں۔ لگتا ہے مصنفہ تصویر کا ایک رخ دیکھتی ہیں۔ محفل شعر و سخن میں زرین آفریدی، زوہیب احمد ملک، ناہید یوسف، تحریم صدیقی، شافیہ خان کے اشعار زبردست رہے۔‘‘

⌘ اشفاق شاہین کی لاہور سے آمد۔ ’’اس بار سسپنس بہت جلدی مل گیا۔ سرورق ٹھیک ہی تھا۔ پرچم کے ساتھ حسینہ سرورق منہ کھولے شاید عید الاضحیٰ کے گوشت کا انتظار کر رہی ہے۔ خیر ہم بھاگے اپنی محفل کی طرف۔ ایک جھٹکا سا لگا۔ اتنی محنت سے اور بروقت خط لکھ کر سپر دلیٹر بکس کیا تھا۔ اس بار محکمۂ ڈاک ہاتھ کر گیا اور اتنا لیٹ کہ لیٹ کمرز میں بھی ڈھونڈنے سے اپنا نام نہ مل سکا۔ سچ اس بار دل بہت رنجیدہ ہوا۔ (یقیناً اس بار آپ کا دل شاد آباد ہو گا...... آپ کا خط واقعی بہت دیر سے ملا جس کی وجہ سے محفل میں جگہ نہ پا سکا جس میں آپ نے سسپنس کلاسک کی حوصلہ افزائی کی۔ شکریہ)۔ ڈاکٹر نائلہ نصر شاندار انٹری کے ساتھ کرسیِ صدارت پر براجمان تھیں، ویلکم اور مبارک باد بھی۔ طاہرہ گلزار، زرین آفریدی، ناہید یوسف، دوست محمد خان اور زاہد خان کے خطوط بہترین تبصروں سے مزین محفل کی رونق بڑھاتے نظر آئے۔ ادریس خان، رمضان پاشا، عطا اعوان، مہتاب احمد، اوشا راٹھی اور زریان سلطان کی حاضری نے بھی محفل میں چار چاند لگا دیے۔ دوڑتے ہیں تبصرے کی طرف۔ سب سے پہلے باغی کی طرف لپکے، شاندار۔ اپنے ٹرانس میں لے لیا باغی نے۔ ایکشن سے بھرپور۔ کیا کچھ نہ دیکھنا پڑا باغی پتر کو جس پر سب سے زیادہ بھروسا کیا، انہی نے دغا دی۔ ویسے سچ ہے کہ مرد بہت جلدی بھروسا کر لیتا ہے حالانکہ بطور صحافی اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن بہرحال وہ پہلے انسان تھا۔ اب پھر کائی دوراہے پر ہے کہ کیا کرے۔ مشن پورا کرے یا لوٹ جائے دیکھیں...... انتظار رہے گا۔ وقت کی رفتار بہت سست رہی۔ ماں کی تلاش میں لایعنی واقعات نے دلچسپی بہت کم کر دی۔ اینڈ پر ذرا بہتر ہوئی اور امید ہے کہ اس کی تلاش لاحاصل نہیں رہے گی۔ ذرا سی بات ناہید سلطانہ اختر نے آخری صفحات کا حق ادا کر دیا۔ شاہینہ، علینہ اور ان سے بھی بڑھ کر راحیل کا والد، ایسے بے لوث کردار معاشرے میں ناپید ہیں، بہت پسند آئی۔ باقی کہانیاں ابھی باقی ہیں۔ محفل شعر و سخن میں انتخاب لاجواب اور بہترین خصوصاً مظہر بلال، اوشا راٹھی اور صبا حمید کا انتخاب کمال تھا۔‘‘

٭ محمد صفدر معاویہ کا تبصرہ خانیوال سے۔ ''سرورق جھنڈے کے علاوہ کوئی خاص تاثر نہیں دے سکا۔ بیگانگی جون ایلیا صاحب ساری زندگی دل کے درد کو لفظوں میں پروتے رہے چاہے وہ شاعری کی شکل میں ہو یا ناول کی صورت۔ وہ ہمیشہ اندھیری راہوں میں روشنی کے بیج بوتے رہے۔ اب جس کی مرضی وہ روشنی پالے۔ آپ کا اداریہ پڑھا۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ، آزادی کا حال نہ پوچھیے 13 اور 14 اگست کو جوش وخروش کے ساتھ جو طوفانِ بدتمیزی برپا تھا بس اللہ کی امان۔ دوستوں کی محفل میں آئے تو ڈاکٹر نائلہ نصر صاحبہ ایک خوبصورت تبصرے کے ساتھ کرسیٔ صدارت پر قابض تھیں اور وہ بھی پہلی کوشش میں بہترین تبصرہ تھا آپ کا، ویلکم آتی رہیے گا اب۔ محمد زریاب سلطان کا بھی خوبصورت تبصرہ اور خوبصورت رائے اچھی لگی۔ زرین آفریدی بھی اپنے خوبصورت انداز کے ساتھ اپنا تبصرہ لے کر آئیں۔ اوشا راٹھی ویلکم کرتے ہیں آپ کو۔ اطہر حسین صاحب کی بہترین تبصرہ نگاری، ناہید یوسف صاحبہ کا بہترین تبصرہ رونق محفل تھا۔ کہانیوں میں شروعات کیں اولین صفحات پر علی اختر کی سانجھ سے۔ نوجی عزیزن بائی بہادری اور ذہانت کی ایک عمدہ مثال تھیں کہ انہوں نے انگریز سامراج سے چھٹکارے کے لیے اپنی جان تک وار دی۔ واقعی ایسے ہیرو تاریخ کے اوراق میں دب کر رہ گئے۔ ایسے اور کئی گمنام ہیرو ہوں گے جو تحریکِ آزادی میں ایک نمایاں کردار ادا کر کے گئے۔ تنویر ریاض کی ادھورا خواب بھی بہترین تحریر تھی۔ مارتھا کو ماں کے بعد باپ سے بھی جدائی سہنا پڑی۔ منظر امام صاحب چوتھا درویش لے کر آئے۔ ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتی مختصر تحریر اچھی لگی۔ طاہر عمیر صاحب کی باغی کا دوسرا حصہ پڑھا۔ وہ ہو گیا جس کا سوچا بھی نہ تھا۔ جواد تو آستین کا سانپ نکلا اور پھر آشتی نے کیا کیا جھوٹ گھڑے۔ سچ کہتے ہیں عورت کے مکر وفریب کے آگے بڑے بڑے شہ سوار مار کھا جاتے ہیں۔ آخر میں کہانی ایک اہم موڑ پر رک گئی۔ آئندہ کا انتظار ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی بہترین تحریر مکافات پڑھی۔ واقعی میں بڑا فرق ہے پہلے والے انسانوں میں اور آج کے انسانوں میں۔ پہلے والے غیر مسلم کی بھی عزت کرتے تھے۔ ثمر عباس کی بے ضمیر بھی اچھی تحریر تھی۔ مرزا امجد بیگ نے امیدوار میں جویریہ صاحبہ کا مقدمہ ایسے طریقے سے لڑا کہ آصف کا وہ حال ہوا کہ دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ ہم تو شگفتہ کو امیدوار سمجھ رہے تھے، آخر میں نکلا مظہر جو کھیو۔ محمد الیاس کی بازارِ حسن بھی بہترین تحریر تھی جو انسانوں کے چھپے کرتوت عیاں کرتی نظر آئی۔ محفل شعر وسخن بھی اچھی رہی۔ شاہ زین رضوان کی دہشت زدہ بھی اچھی رہی۔ اس دفعہ وقت پڑھ کے مزہ آ گیا کیونکہ اپنے ملک کی تو بات ہی اور ہے۔ آتے ہی عظیم جیسا دوست مل گیا۔ ساتھ کراچی کے علاقوں کا احوال بھی چلتا رہا اور آخر میں اپنے مشن کے قریب بھی پہنچ گیا۔ آرٹسٹ سلیم انور کی مختصر پر بہترین تحریر۔ اعتراز سلیم کی غلطی بھی عمدہ رہی۔ رضوانہ ساجد صاحبہ بہترین قصوں میں سب سے بہترین قصہ حضرت یوسف علیہ السلام کی حالاتِ زندگی لے کر آئیں۔ ہر قدم پر حضرت یوسف علیہ السلام پختہ رہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنا بندۂ خاص بنایا۔ مطلب نبوت سے سرفراز کیا۔ ایسے حالات او رواقعات پڑھ کر کئی لوگوں کی زندگی سنور جاتی ہے۔ آصفہ ضیا احمد کی حق دار بہترین اسٹوری رہی۔ حق آخر میں حقدار کے پاس پہنچ گیا۔ سوانگ جمال دستی کی مختصر پر اچھی تحریر۔ ناہید سلطانہ اختر ذرا سی بات لے کر آئیں۔ عورت کی عزت تو کانچ کی طرح نازک ہوتی ہے۔ سوچنے والے نے ذرا بھی نہ سوچا تھا کہ اس کی اس غلطی کی وجہ سے شاہینہ کی پوری زندگی برباد ہو گئی مگر لعنت ہے ساجد پر جس نے بغیر تحقیق کے ایک عورت کے دامن کو داغدار کر دیا طلاق دے کر پر شاہینہ نے سچ بول کر علینہ کا رشتہ کیا اور پھر ہر الزام سے سرخرو ہو کر نکلی۔ (آپ کی توجہ اور پسند کا بے حد شکریہ)۔''

٭ خلیق ربانی انجم، رجڑ چارسدہ سے شریکِ محفل ہیں۔ ''ستمبر 2017ء کا سسپنس ملا جو بہترین تھا۔ فہرست پر نظر ڈال کر آپ کے خط میں چھلانگ لگا کر خطوط کی محفل میں پہنچے تو صفحہ 14 پر اپنا خط دیکھ کر دل کو خوشی ملی کہ سسپنس کے صفحات پر میرا خط بھی اشاعت کے قابل ٹھہرا۔ جس کے لیے شکریہ۔ آپ کے خط کے بعد باغی کے دوسرے حصے میں پہنچے اور ایک باغی کی کتھا پڑھنا شروع کی۔ پڑھتا گیا اور بڑھتا گیا اور لاسٹ میں پہنچ کر (جاری ہے) کے انتظار کی سولی پر چڑھ گیا۔ اس کے بعد محمد الیاس کے بازارِ حسن میں پہنچے اور بازارِ حسن سے دو دو ہاتھ کرنے کے بعد حسام بٹ کی وقت سے ہوتے ہوئے رضوانہ ساجد کی حضرت یوسف علیہ السلام پڑھ ڈالی۔ ویسے مجھے طاہر جاوید مغل، الیاس سیتاپوری، ڈاکٹر ساجد امجد، مرزا امجد بیگ، ملک صفدر حیات بہت پسند ہیں جو سسپنس ڈائجسٹ کے پرانے لکھنے والے ہیں۔ یہ بات دل کو لگتی ہے کہ دو تین تین صفحات کا ایک سلسلہ شروع کر دیں جن میں دنیا کی بڑی شخصیات کے متعلق معلومات ہوں یا سسپنس ڈائجسٹ کے لکھاریوں کے متعلق بائیوگرافی ہو۔ سسپنس ڈائجسٹ بلکہ جاسوسی پبلی کیشنز کے بینر تلے جتنے ڈائجسٹ شائع ہوتے ہیں ان سب کے لکھاریوں کے بارے میں ایک خصوصی نمبر کا اہتمام کرنا چاہیے۔ (آپ کی تجویز کو نوٹ کر لیا گیا ہے۔ کوشش کریں گے آپ کی تجاویز پر عمل بھی کیا جا سکے۔ رسالے کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ)۔''

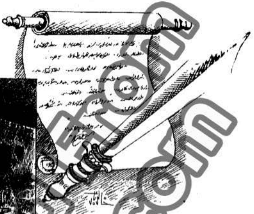
٭ انعم کمال کا پچھلے شمارے پر تبصرہ حیدرآباد سے۔ ''سسپنس کا اور ہمارا رشتہ یوں تو کافی پرانا ہے مگر خط لکھنے کی جسارت نہیں کر پاتے۔ پھر سوچا کوشش کر ہی لی جائے۔ سب سے پہلے تمام قارئین واہلِ وطن کو ہماری طرف سے جشنِ آزادی مبارک اللہ اس پاک وطن کو سلامت رکھے آمین۔ ہمارا فرض بنتا ہے کہ ملک کی ترقی کے لیے ہر شخص خواہ وہ کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتا ہو، اپنا کردار ادا کرے۔ آج کل ویسے ہی ہمارا ملک مشکلات کا شکار ہے۔ آزادی بہت بڑی نعمت ہے۔ خدارا اس کی قدر کیجیے۔ سسپنس میں ہماری سب سے پسندیدہ کہانی تاریخی ہوتی ہے۔ اس لیے بڑے ہی ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی سیوا سے سنبھا تک پڑھی۔ مرہٹوں کے ظلم سے خلقِ خدا پریشان تھی۔ بالآخر بادشاہِ وقت عالمگیر کے ہاتھوں انجام کو پہنچے۔ بہت لاجواب تحریر تھی۔ اس کے بعد فہرست پر نگاہ دوڑائی...... مگر یہ کیا؟ طاہر جاوید مغل کا نام کہیں نظر

نہیں آیا۔ اچانک ہمیں اداسی نے گھیر لیا۔ طاہر جاوید مغل کی کہانیاں اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کے اندازِ تحریر کا تو ایک زمانہ معترف ہے۔ خیر، اس امید پر کہ آئندہ ماہ ان کا نام فہرست میں نظر آئے گا، آگے بڑھے۔ ناہید سلطانہ اختر کی خواب سراب کا مطالعہ کیا۔ ناہید سلطانہ نے صفحات کا حق ادا کر دیا۔ بہت ہی شاندار کہانی تھی۔ اس طرح کی کہانیاں ہمیں ایک سبق دیتی ہیں۔ منظر امام کی سہارا بھی مختصر مگر سبق آموز کہانی تھی۔ نیا سلسلہ باغی یوں تو رائٹر کا نام جانا پہچانا نہیں مگر کام لاجواب ہے۔ بہت ہی تیز رفتار اسٹوری ہے۔ کامران چودھری نے معاشرے کی خرابیوں کو بے نقاب کرنے کا مصمم ارادہ کیا ہوا ہے اور اس راہ میں وہ اپنے خونی رشتوں پر بھی ہاتھ ڈالنے سے گریزاں نہیں ہے۔ ویلڈن طاہر عمیر صاحب۔ ملک صفدر حیات کی طاقتور کچھ خاص تاثر قائم نہ کر سکی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی سوانح حیات پر مبنی تحریر پڑھ کر روح تروتازہ ہو گئی۔ بے شک ہمیں اسلامی تاریخ کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ راہنمائی حاصل ہو۔ زویا اعجاز کی زنداں بہتر کہانی تھی۔ محبت کرنے کی پاداش میں چودھریوں نے ثنا سے نہ صرف محبوب چھین لیا بلکہ اسے دہری اذیت سے دوچار کیا اور وہ ذہنی توازن کھو بیٹھی۔ کہانی پڑھ کر بہت اداس ہو گئے۔ وقت حسام بٹ صاحب کی اچھی کہانی ہے مگر کہانی کی رفتار اچانک سست ہو گئی ہے تاہم لگتا ہے کہ جلد ہی کہانی میں تیزی آنے والی ہے کیونکہ ہیرو صاحب اپنی والدہ کی تلاش میں پاکستان آن پہنچے ہیں اور آتے ساتھ ہی مشکلات نے ان کا استقبال کیا ہے۔ اینڈ بہت زبردست رہا۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ تنویر ریاض کی دخل در معقولات لاجواب کہانی تھی۔ ایک قتل کا سراغ لگانے کے چکر میں الٹا قتل اسی کے گلے میں پڑ گیا۔ بابر نعیم کی ناکام کوشش مزہ نہ دے سکی۔ بورنگ کہانی تھی۔ شاکر لطیف کی مغرب و مشرق زبردست کہانی تھی۔ ہمیشہ کی طرح مشرق نے اپنی روایت قائم رکھی اور غلط اقدام اٹھانے سے گریز کیا۔ زبردست شاکر صاحب۔ علی اختر کی احساس بھی اپنا تاثر قائم نہ کر سکی۔ البتہ شیر شاہ سید کی وہ دل کہاں سے لاؤں نے میدان مار لیا۔ محبت کی داستان اور پرانے کراچی کی منظر کشی لاجواب رہی۔ سلیم انور کی ذہانت بس ٹھیک تھی۔ ثمر عباس کی دہری خوشی اچھی کہانی تھی۔ عمارہ خان کی کمٹمنٹ بھی بورنگ کہانی رہی۔ خطوط کی محفل میں تمام دوستوں کے خطوط اچھے تھے۔ محفل شعر و سخن پڑھ نہیں پائے اس لیے اس پر تو تبصرہ۔ مجموعی طور پر سسپنس نے بہت محظوظ کیا۔ باقی تبصرہ اگلے ماہ کریں گے، امید ہے ہمارا خط ردی کی ٹوکری کی نذر نہیں ہوگا۔"

✠ کرن عمران گلشن اقبال کراچی سے گزشتہ شمارے پر تبصرہ کر رہی ہیں۔ "بہت عرصہ ہوا سسپنس کو پڑھتے ہوئے مگر کبھی لکھنے کی جسارت نہیں کی۔ (مگر کیوں بھئی۔ ہم نے ایسا کیا قصور کر دیا)۔ بہرحال اس بار ایک نئی کہانی باغی پڑھی تو سوچا قلم اٹھا لوں۔ اچھے انداز میں شروع ہونے والی ایک خوبصورت داستان ہے جسے محمد طاہر عمیر نے دلچسپ پیرائے میں لکھا۔ دوسری کہانی آخری صفحات پر ناہید سلطانہ اختر کی خواب سراب بہت ہی عبرت اثر کہانی پڑھنے کو ملی۔ بے شک اب معاشرے میں اتنا بگاڑ پیدا ہو گیا ہے کہ والدین جو کبھی اپنی اولاد پر آنکھ بند کر کے بھروسا کیے رہتے اور اپنی ذمے داریوں کو پورا کرنے میں مگن رہتے تھے، اب انہیں اپنی ذمے داریوں کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ سخت نگرانی کرنے کی بھی بے حد ضرورت رہتی ہے۔ ایک بات سمجھ نہیں آئی ناہید جی کہ جو بچی اتنی فرمانبردار اور خوش اخلاق تھی، اچانک اس کا ذہن کیسے پلٹا کھا گیا؟ حضرت یوسف علیہ السلام کا سلسلہ اگرچہ پہلے بھی پڑھ چکے ہیں مگر ہر بار اچھا لگتا ہے۔ کافی سبق آموز واقعات ہیں۔ تاریخی صفحات پر اب ہر بار ایک نئی اور تازہ کہانی نظر آ رہی ہے۔ بڑے تسلسل سے ڈاکٹر ساجد امجد کا ساتھ مل رہا ہے۔ سیوا سے سنیا تک میں بھی ڈاکٹر صاحب نے ان کی زندگی کا منظر نامہ بہت خوب صورت پیرائے میں لکھا۔ ویلڈن۔ اس ماہ کی سب سے خوب صورت اور مختصر کہانی سہارا بہت متاثر کن رہی۔ منظر امام کا یہ کمال ہے کہ مختصر تحریر میں بڑی بات کہہ جاتے ہیں اور پھر ڈاکٹر شیر شاہ سید کا تو کیا ہی کہنا۔ ہمیشہ دل میں چبھتی اور کسک پیدا کر دینے والی تحریر لاتے ہیں جسے پڑھنے کے بعد انسان کافی دیر تک اس کے سحر میں گم رہتا ہے۔ وقت بھی حسام بٹ کا سلسلہ دھیرے دھیرے دلچسپی پیدا کرتا جا رہا ہے۔ علی پاکستان آ گیا ہے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ ملک صفدر حیات کی تفتیش طاقتور کے عنوان سے پڑھنے کو ملی۔ اگر یونہی سنہرے اصولوں پر انصاف بآسانی ملتا رہے تو ہر معاشرہ اپنی مثال آپ بن جائے۔ زویا اعجاز کی زندان اور شاکر لطیف کی مغرب و مشرق نے بھی کافی لطف دیا اور سلیم انور کی ذہانت بھی توجہ حاصل کر گئی۔ محفل شعر و سخن اور کترنیں تو سسپنس کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں مجموعی طور پر رسالہ شاندار رہا۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

احمد خان مری بلوچ، میر پور خاص۔ اطہر حسین، کراچی۔ ناہید یوسف، اسلام آباد۔ مہر خان، حیدر آباد۔ مہتاب احمد، حیدر آباد۔ ثاقب [illegible] نائلہ رحمان، نواب شاہ۔ سنبل علی، ملتان۔ عاصمہ احمد، سرگودھا۔ عظیم احمد، جھنگ سٹی۔





شامِ شب

ڈاکٹر ساجد امجد

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

یوں تو مغلیہ عہد کی تاریخ بہت طویل ہے اور اس کے ہر پہلو کا احاطہ کرنا ناممکن نہیں تو آسان بھی نہیں ہے۔ اسی تسلسل کی ایک اور کڑی میں اورنگزیب کے بیٹے اعظم شاہ اور شاہ عالم کے کردار سے بھی انکار ممکن نہیں ہے... اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اقتدار کا فسوں اپنے سحر سے کسی کو آزاد نہیں ہونے دیتا... بس مقدر کی یاوری چاہیے پھر... دیکھتے ہی دیکھتے پانسے پلٹتے چلے جاتے ہیں اور کبھی بیٹے باپ کے مقابل، کبھی باپ بیٹوں سے متنفر اور خوفزدہ اپنے ہمدردوں اور مصاحبوں کے درمیان بیٹوں کے خلاف سازشوں اور اندیشوں میں گھرا ہوا... عہد کوئی بھی ہو تاریخی منظرنامہ کرداروں کے ردوبدل کے ساتھ تقریباً یکساں صورتِ حال دکھاتا ہے۔ تخت و تاج کے لیے سب کی کاوشیں اور رنجشیں ایک جیسی سازشوں کا جال بنتی رہیں اور جب زندگی کی شام ان کے محلوں میں اتری تو انسان کی اوقات وہی دو گز زمین اور کفن کے سوا کچھ نہ رہا۔

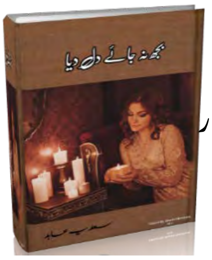


عہدِ وفا



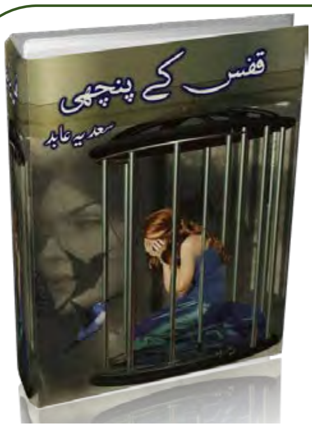
ایمان پریشے کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا مُنفرد ناول، مُحبت کی داستان جو معاشرے کے رواجوں تلے دب گئی، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

بُجھ نہ جائے دِل دیا



سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، مُحبت، نفرت، عداوت کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

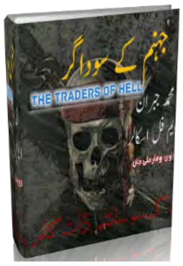
قفس کے پنچھی



سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، علم و عرفان پبلشرز لاہور کے تعاون سے جلد، **کتابی شکل** میں جلوہ افروز ہو رہا ہے۔

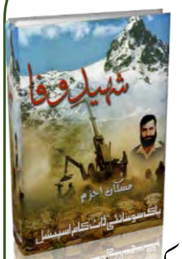
آن لائن پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

جہنم کے سوداگر



مُحمد جبران (ایم فِل) کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ایکشن ناول، پاکستان کی پہچان، دُنیا کی نمبر 1 ایجنسی آئی ایس آئی کے اسپیشل کمانڈو کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

شہیدِ وفا



مُسکان احزم کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ناول، پاک فوج سے مُحبت کی داستان، دہشت گردوں کی بُزدلانہ کاروائیاں، آرمی کے شب و روز کی داستان پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

آپ بھی لکھیے:

کیا آپ رائٹر ہیں؟؟؟۔ آپ اپنی تحاریر پاک سوسائٹی ویب سائٹ پر پبلش کروانا چاہتے ہیں؟؟؟
اگر آپکی تحریر ہمارے معیار پر پُورا اُتری تو ہم اُسکو عوام تک پہنچائیں گے۔ **مزید تفصیل کے لئے یہاں کلک کریں۔**

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام، پاکستان کی سب سے زیادہ وزٹ کی جانے والی کتابوں کی ویب سائٹ، پاکستان کی ٹاپ 800 ویب سائٹس میں شُمار ہوتی ہے۔

قید خانے کی بیرونی دیواروں پر ابھی سورج کی کرنوں کا پوری طرح تسلط نہیں ہوا تھا کہ چند سواروں کی نگرانی میں اورنگ زیب عالم گیر کا محرم راز خواجہ سرا قید خانے کے بھاری بھرکم دروازے کے سامنے آ کر ٹھہر گیا۔ پہرے داروں نے شناخت کے بعد دروازہ کھول دیا۔ پہلے دروازہ کھلنے کی آواز آئی پھر سورج کی روشنی نے قید خانے میں قیام کیا۔ قیدی نے اپنی کوٹھری سے باہر جھانکا اور پھر ایک گوشے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ اس وقت کون آ سکتا ہے اور اب کیا نئی افتاد آنے والی ہے؟ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ خواجہ سرا اس کے سامنے پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں خوان پوش تھا جو اس نے قیدی کے سامنے رکھ دیا۔ قیدی نے خواجہ سرا کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا اور تھال پر ڈھکے خوان پوش کو الٹ دیا۔ تھال میں ایک قلم دان اور کچھ ضروری سامان رکھا تھا۔ اس نے قلم دان کھولا لیکن گھبرا کر ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ اس میں اور سامان کے ساتھ ایک چاقو بھی رکھا تھا۔ قیدی کے لیے یہ چاقو ہی گھبراہٹ کا باعث بنا تھا۔

''شاید یہ چاقو غلطی سے آ گیا ہے کیونکہ چھری یا چاقو قیدیوں کے پاس بھیجنا خلافِ ضابطہ ہے اور ظاہر ہے میں قیدی ہوں، خواہ میری اصلیت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔'' قیدی نے کہا۔

''یہ چاقو غلطی سے نہیں آیا بلکہ ازراہِ مہربانی بادشاہ نے یہ چاقو اپنے ہاتھ سے قلم دان میں رکھا تھا اور مجھے بتا بھی دیا تھا۔'' خواجہ سرا نے عرض کیا۔

اس وضاحت کے بعد قیدی نے وہ چاقو اپنے پاس رکھ لیا۔ خواجہ سرا نے اجازت طلب کی اور وہاں سے اٹھ آیا۔

یہ قیدی کوئی اور نہیں بادشاہ اورنگ زیب کا چہیتا بیٹا شہزادہ محمد معظم شاہ عالم تھا۔ یہ بدنصیب شہزادہ گولکنڈہ کے محاصرے سے برابر قید میں تھا۔ قلعہ گولکنڈہ فتح ہو چکا تھا لیکن چھ سال گزرنے کے باوجود شہزادے کو رہائی نصیب نہیں ہوئی تھی۔

اور اب یہ مہربانی! بادشاہ اسے تحفہ بھیج رہا تھا لیکن بطور آزمائش۔

بادشاہ نے وفادار خواجہ سرا کو حکم دیا تھا۔

''تم دیکھتے رہنا کہ قلم دان پانے کے بعد شہزادہ کیا کرتا ہے۔ اگر وہ قلم دان کھولنے کے بعد چاقو رکھنے میں تامل کرے تو تم اس سے کہنا کہ بادشاہ نے عمداً یہ چاقو بھیجا ہے اور اگر وہ اس کو بلا تکلف رکھ لے تو تم اس سے کچھ نہ کہنا اور چپ چاپ لوٹ آنا۔''

خواجہ سرا نے واپس آنے کے بعد ساری کیفیت عرض کی۔ بادشاہ جواب میں صرف یہ کہہ سکا۔

''ہم اپنے فرزندوں کی غیرت کو خوب جانتے ہیں۔''

وہ رات بادشاہ نے ٹہلتے ہوئے گزاری تھی۔ اسے اب شہزادے کی وفاداری پر کوئی شک نہیں رہ گیا تھا۔ صبح ہوئی اور وہ اوراد و وظائف سے فارغ ہوا تو اس نے قلم دان طلب کیا اور ایک حدیث جس کا مضمون یہ تھا کہ حافظِ قرآن کو اگرچہ وہ حبس دوام کا سزاوار ہو، عمر قید نہیں دی جا سکتی...... لکھ کر شہزادے کے پاس بھیج دی۔

شہزادے کو یہ خط موصول ہوا تو اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ بادشاہ اس کی رہائی کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس نے کوئی بات ظاہر کیے بغیر جواب میں ایک دوسری حدیث لکھ کر بادشاہ کے پاس روانہ کر دی جس کا مفہوم یہ تھا کہ حافظِ قرآن کو حبس دوام کی سزا نہیں دی جا سکتی مگر باپ باوجود احترام حفظ کلام اللہ بیٹے کو ہمیشہ کے لیے قید میں رکھ سکتا ہے۔

شاہ عالم کا جواب پڑھ کر بادشاہ کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ اسے بیٹے کی فرمانبرداری پر فخر ہو رہا تھا۔ یہ احساس بھی شدت اختیار کرنے لگا تھا کہ شاہ عالم پر یہ الزام غلط تھا کہ اس نے مرہٹوں سے ساز باز کر رکھی ہے۔ شاہ عالم کے خلاف سازشوں کا جال بچھایا گیا تھا جس میں بادشاہ الجھ گیا اور شاہ عالم سے ہتھیار رکھوا لیے۔ اس وقت سے لے کر اب تک وہ گرفتار چلا آ رہا تھا۔ اس کی سزا میں روز بہ روز اضافہ ہوتا چلا آ رہا تھا۔

بادشاہ بے جا پور میں تھا کہ اسے شاہ عالم اور اس کے بیٹوں کی رہائی کا خیال آیا۔ اس نے شاہ عالم سے پہلے اس کے بیٹوں یعنی اپنے پوتوں کی رہائی کے احکام جاری کیے۔ ان دونوں کے لیے بادشاہی شامیانے سے متصل خیمے لگائے گئے۔ چند دنوں بعد دونوں کے منصب بحال ہو گئے۔ شہزادہ معزالدین کو فوج اور توپ خانہ دے کر کوکن کے باغیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا گیا اور شہزادہ عظیم کو بادشاہ نے اپنی پیشی میں متعین و مامور کر کے اسے اختیار دیا کہ وہ بادشاہ کی طرف سے کاغذات پر دستخط کر سکتا ہے۔

بیٹوں کی رہائی کے بعد بادشاہ کا مکمل ارادہ ہو گیا تھا کہ شاہ عالم کی رہائی کا حکم صادر کرے گا لیکن سازشیں برابر کام کر رہی تھیں۔ بادشاہ کے کان بھرے جا رہے تھے کہ اگر شاہ عالم کو رہائی مل گئی تو وہ مرہٹوں سے ساز باز کرے گا۔

اس طرح اس کی رہائی کا وقت ٹلتا رہا۔ اسی اثنا میں یہ خبر آئی کہ مرہٹوں نے رام راجا کو جو سنبھا کا بھائی تھا اور قید

میں پڑا ہوا تھا، گدی پر بٹھا دیا ہے۔ پرچہ نویسوں نے اطلاع دی۔

''رام راجا نے اپنے سرداروں کی جوئی کر کے اپنے باپ اور بھائی کی روش پر شہروں اور قلعوں کی تاخت و تاراج کے لیے انہیں بھجوا دیا ہے۔''

عالم گیر اس وقت بے جاپور میں تھا۔

شاہ عالم کا خیمہ قیدیوں کی بارک میں تھا۔ بادشاہ نے اس کا خیمہ بادشاہی شامیانے کے متصل لگانے کا حکم دیا اور اسے مجرا کے... لیے آنے کی اجازت دے دی۔ کبھی کبھی اس کے لیے خاصہ سے ناشتا اور پھل بھی بھجواتے رہے۔

بادشاہ کی اس مہربانی نے لشکر میں یہ خبر عام کر دی کہ بادشاہ نے شہزادے کو رہائی بخش دی ہے۔

یہ خبر یا افواہ سنتے ہی مخالف امرا میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ سازشوں نے زور پکڑا۔ بادشاہ کو ہراساں کرنے کے لیے یہ خبر اڑا دی گئی کہ شہزادہ اعظم شاہ، شاہ عالم پر مہربانیوں کو شک کی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور عنقریب ''بنکاپور'' (جہاں وہ تعینات تھا) میں شورش برپا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ممکن ہے وہ مرہٹوں سے بھی ساز باز کر لے۔

ان خبروں میں کوئی صداقت نہیں تھی لیکن بادشاہ نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ اعظم شاہ کو بنکاپور سے بلا لیا جائے۔ بادشاہ نے ایک حکم نامے کے ذریعے اسے بنکاپور سے دوسرے علاقے ''داکن گیرہ'' جانے کی ہدایت کر دی۔ اعظم شاہ بدنیت نہیں تھا اس لیے اس نے فوراً اس ہدایت پر عمل کیا۔ اس دوران اسے یہ خبر بھی موصول ہو چکی تھی کہ شاہ عالم کی رہائی عمل میں نہیں آئی ہے۔

داکن گیرہ کا علاقہ لشکر شاہی کے راستے میں واقع تھا لہٰذا جب اعظم شاہ اپنی فوج لے کر نکلا اور شاہی لشکر گاہ کے قریب پہنچا تو یہ خبر پھیل گئی کہ اعظم شاہ کے دل میں بے ایمانی آ گئی ہے اور وہ حملہ آور ہونے کے لیے آ رہا ہے۔ اعظم شاہ کے کانوں تک یہ خبریں پہنچیں تو وہ سخت فکر مند ہوا۔ اس نے اپنی صفائی کے لیے ایک عریضہ بادشاہ کی خدمت میں روانہ کیا۔

''میں قدم بوسی کے لیے حاضر ہونے کا اشتیاق رکھتا ہوں لیکن لشکر میرے ساتھ ہے۔ اگر آپ میری نیت پر بھروسا کریں تو میں لشکر سمیت لشکر والا میں داخل ہو جاؤں؟''

بادشاہ نے اسے بھی اس کی چال سمجھا اور جواب میں ارشاد فرمایا۔

''ہم بھی تمہیں دیکھنے کا اشتیاق رکھتے ہیں مگر تمہارا لشکر میں آنا خلاف مصلحت ہے۔ اس لیے ہم شکار کے لیے نکل رہے ہیں۔ تم بھی چار پانچ سو سواروں کو لے کر نکلو اور حاضر خدمت ہو جاؤ۔''

اس خط کے روانہ ہونے کے بعد بادشاہ نے شکار کے لیے مختصر خیمہ باہر نکالنے کا حکم دیا اور ہدایت کی کہ خیمہ ایسے نشیب میں لگایا جائے کہ وہاں سے لشکر نظر نہ آئے۔ خفیہ آدمی بھی مقرر کر دیے گئے کہ راستوں کی نگرانی کریں۔ شہزادے کے لشکر کی ناکابندی کر دیں اور دولت خانے کی بھی سخت نگرانی کرتے رہیں۔

جب دولت خانہ شاہی پر جو شکار کے نام سے نصب کر دیا گیا تھا، سواری پہنچی تو شہزادے کے پاس حکم پہنچا۔

''دولت خانہ بہت مختصر لگایا گیا ہے اس لیے تم پر لازم ہے کہ تم اپنے ساتھ تین سو سوار سے زیادہ آدمیوں کو نہ لاؤ۔''

ابھی شہزادہ حسب الحکم تین سو سواروں کو لے کر نکلا ہی تھا کہ ایک اور حکم آ گیا کہ وہ صرف دو سو سواروں کی جمعیت کو لے کر آئے۔ اس نے سو آدمی اور کم کر دیے۔ ابھی کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک چیلا ان سواروں کو بھی آدھا کرنے کا حکم لے آیا۔ دولت خانے تک پہنچتے پہنچتے آدمیوں کو کم کرنے کے پیغامات مسلسل آتے رہے، یہاں تک کہ جب وہ دولت خانے کے قریب پہنچا تو شاہی چیلے نے پیغام پہنچایا۔

''شکار نشانے پر ہے، وہ بھڑک کر نکل جائے گا اس لیے شہزادہ زیادہ ہجوم کو ساتھ نہ لائے۔ صرف تین محافظوں کو اپنے ساتھ لے لے اور باقی تمام آدمیوں کو لوٹا دے۔''

شہزادہ اعظم شاہ کو خطرے کی بو محسوس ہوئی لیکن اب وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے صرف دو محافظ تھے۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا اور وہ خود کو دام بلا میں گرفتار دیکھ رہا تھا۔ ایک امیر مختار خاں جو بادشاہ کی نظروں میں وفادار کا درجہ رکھتے تھے، آگے بڑھے اور شہزادے کا ہاتھ تھام لیا۔

''عالم پناہ کا حکم ہے کہ آپ محافظوں کو وہیں چھوڑیں اور بادشاہ کے روبرو حاضر ہو جائیں۔''

شہزادے نے ابھی محافظوں کو چھوڑ کر قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ دوسرا حکم آ گیا۔ ''شہزادے سے کہو ہتھیار اتار دے اور بادشاہ کے حضور غیر مسلح حاضر ہو۔''

یہ سنتے ہی شہزادہ جھجک گیا۔ اس کے قدم جہاں تھے وہیں رک گئے مگر مختار خاں اسے تسلی دلاسا دے کر اپنے ساتھ بادشاہ کے حضور لے گیا۔

باپ کی خدمت میں پہنچنے کے بعد شہزادہ آداب و تسلیمات بجالایا اور بادشاہ کا تین مرتبہ طواف کر کے نذرانے گزارے۔ بادشاہ نے بڑی شفقت اور مہربانی سے شہزادے کو سینے سے لگالیا اور شکار پر تیراندازی کا حکم دیا پھر شہزادے کو اپنے ساتھ ہی تسبیح خانے میں لے جاکر اسے بیٹھنے کا حکم دیا پھر اس سے مخاطب کیا۔

''ہم نے تمہیں قید کرلیا تھا مگر اب رہا کردیا۔ قید کی خبر تمہارے آدمیوں تک پہنچ چکی ہوگی اور وہ سب نہایت مغموم اور مایوس ہوں گے اس لیے اب تم جلد ہی واپس چلے جاؤ۔''

شہزادہ رخصت ہونے لگا تو خلعت اور جواہرات عطا فرمائے۔

☆☆☆

مرہٹہ سردار سنبھا کے قتل کے بعد رام راجا کی طرف سے بہت سے نامی گرامی مرہٹہ سردار بادشاہی لشکروں کو تنگ کرنے اور چھاپے مارنے کے لیے چاروں طرف منتشر ہو گئے تھے اور چھاپے مارتے پھر رہے تھے۔ ان میں سنتھا نامی سردار سب سے زیادہ خطرناک تھا۔ اس کے پاس پندرہ بیس ہزار جنگی سواروں کی فوج موجود تھی اور دوسرے مرہٹے بھی اس کی مدد کرتے رہتے تھے۔ وہ شہری آبادیوں کو تاخت وتاراج کرتا پھر رہا تھا۔

یہ ساری خبریں بادشاہ کو مل رہی تھیں جن سے بادشاہ سخت کبیدہ ہو رہا تھا۔ اس نے نامی گرامی امرا کو ایک بڑی فوج کے ساتھ روانہ کیا کہ اس کافر کی سرکوبی کریں۔

شاہ عالم جو ابھی رہا نہیں ہوا تھا، تلملا کر رہ گیا۔ اس نے یہ موقع غنیمت جان کر بادشاہ سے درخواست کی کہ اسے بھی اس معرکے میں بھیجا جائے لیکن شاید ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ اس کی درخواست نامنظور ہوئی۔

امیر قاسم خاں، غنیم سے مقابلے کا ارادہ کر کے فوج کو تیار کر چکا تھا اور اپنا پیش خانہ آگے روانہ کردیا تھا۔ روح اللہ خاں بھی قدم بہ قدم آگے بڑھ رہا تھا کہ ہرکاروں نے خبر دی کہ دشمن کی فوج کا ایک دستہ پیش خانہ پہنچ چکا ہے اور لوٹ مار میں لگا ہوا ہے اور بادشاہی فوج کو پریشان کررکھا ہے۔ قاسم خاں نے یہ خبریں سن کر سرداروں کی کمک پر جانا چاہا مگر ہر طرف لڑائی چھڑ گئی تھی۔ یہ جنگ غروب آفتاب تک جاری رہی۔ بہادر لشکریوں نے مردانگی تو بہت دکھائی لیکن بار برداری اور مال واسباب سب غارت ہو گیا۔

دشمن کا خوف ایسا تھا کہ تمام سرداروں نے شب خون کے خیال سے ہاتھیوں پر رات بسر کی اور فوج کے سواروں نے گھوڑوں کی باگیں تھامے رات گزاردی۔

صبح ہوتے ہی مرہٹے بےخوف ہو کر چڑھ دوڑے۔ ادھر بھی کیا کمی تھی۔ بادشاہی فوج نے بھی جوہر دکھائے لیکن مرہٹوں کا پلڑا بھاری رہا۔ شاہی فوج کی ایک بڑی جماعت کام آگئی۔

تین دن تک شاہی فوج مرہٹوں کے گھیرے میں رہی۔ نہ کھانے کو کچھ تھا نہ پینے کو۔ ایک کھیل تک اڑ کر منہ میں نہیں گئی۔ جب حالات بہت تنگ ہوئے تو یہ طے کیا گیا کہ تعلقہ وندیری کی گڑھی میں پناہ لی جائے۔ یہ گڑھی قاسم خاں کی عمل داری میں تھی۔

رات کے اندھیرے میں سناٹے کی چادر کو تارتار کرتے ہوئے یہ سپاہی گڑھی کی طرف بڑھے۔ یہ دیکھ کر سب حواس باختہ ہو گئے کہ مرہٹوں نے اس گڑھی کو بھی چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے۔ گھوڑوں کی باگیں کھینچ کر جو سپاہی جہاں تھا، وہیں ٹھہر گیا اور دن نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔

دن نکلا تو بھوکے سپاہی شیروں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ مرہٹے بھی دانت تیز کیے بیٹھے تھے۔ دن بھر لڑائی ہوتی رہی۔ آخر بادشاہی فوج گڑھی کے نیچے شام کے وقت پہنچ گئی۔ رات ہوئی تو گڑھی والوں نے گھاس اور دانہ بھیجا۔ وہ بھی خاص خاص آدمیوں کو مل سکا۔ تین چار روز تک لشکر گڑھی کی دیوار کی پناہ میں مورچابندی کر کے دشمن کے حملوں کو روکتا رہا۔

گڑھی کے دروازے کھل نہ سکتے تھے۔ قلعے کے بنیے، بقال اور باشندے دیوار پر سے ہی غلہ اتارتے تھے۔ اب جس کے جو ہاتھ آجائے۔

چوتھے پانچویں روز مرہٹوں کو یہ اطلاع ملی کہ بادشاہ کی طرف سے کمک آنے والی ہے۔ خان جہاں بہادر کا بیٹا ہمت خاں ایک بڑا لشکر لے کر مدد کو آنے والا ہے۔

یہ خبر ایسی نہیں تھی کہ جس کا انتظار کیا جاتا۔ ہمت خاں کی بہادری سے سب واقف تھے۔ مرہٹہ سردار سنتھا نے نصف فوج کو یہاں چھوڑا اور بقیہ نصف کو لے کر ہمت خاں کا راستہ روکنے کے لیے چلا گیا لیکن جب ہرکاروں نے اطلاع دی کہ ہمت خاں کے مقابلے کے لیے رام راجا نے ایک فوج بھیج دی ہے تو وہ مطمئن ہو گیا اور گڑھی کی طرف لوٹ آیا۔

اس کے لوٹنے سے پہلے اس کی غیرحاضری کا فائدہ اٹھا کر قاسم خاں، روح اللہ خاں اور دوسرے امیروں نے خفیہ مشورہ کر کے گڑھی میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔

''وہ تو سب ٹھیک ہے۔'' روح اللہ خاں نے کہا۔ ''گڑھی کے اندر داخل ہونا کچھ اتنا آسان نہیں ہے۔''

''میں یہ سوچ کر ہی کہہ رہا ہوں۔ دروازے سے داخل ہونا اتنا آسان نہیں لیکن ایک جگہ میں ایسی دیکھ آیا ہوں جہاں رسیاں ڈال کر اوپر چڑھا جاسکتا ہے۔''

''دروازہ تو پھر بھی کھولنا پڑے گا؟''

''وہ بعد کی بات ہے۔ ہمیں فی الحال یہ کرنا ہے کہ لشکر میں کسی کو خبر نہ ہو کہ ہمارے ارادے کیا ہیں۔''

''وہ کس لیے؟''

''اگر یہ خبر عام ہوگئی تو دروازے پر بے پناہ ہجوم ہوجائے گا۔ اگر دشمن کو خبر ہوگئی تو ہمیں ایک اور جنگ کا سامنا ہوگا۔''

''پھر کیا ہوسکتا ہے؟''

''لشکر میں یہ خبر عام کردو کہ ہم سازوسامان اندر بھیج رہے ہیں تاکہ سبک بار ہوکر دشمن پر حملہ کرنے کے لیے باہر نکلیں۔''

یہ سب باتیں ہوچکیں تو قاسم خاں گشت کے بہانے نکلا اور رسیاں ڈلوا کر دیوار پر چڑھ گیا اور قلعے میں پہنچ گیا۔

اس احتیاط کے باوجود روح اللہ خاں اور صف شکن خاں ہجوم میں دھکے کھاتے ہوئے اندر داخل ہوسکے کیونکہ دروازے پر بے پناہ ہجوم ہوگیا تھا۔

مرہٹوں کو معلوم ہوا تو انہوں نے گڑھی کا محاصرہ کرلیا۔ اب حال یہ تھا کہ کوئی دروازے سے باہر نہیں آسکتا تھا۔ محاصرہ اتنا سخت تھا کہ دیوار سے جھانکنا بھی موت کو دعوت دینا تھا، بندوقوں کو خوراک پہنچانا تھا۔

محاصرہ روز بہ روز سخت ہوتا جارہا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا، غذا کے مسائل پیدا ہورہے تھے۔ جب اس محاصرے کو ایک ماہ گزر گیا تو حالت بہت نازک ہوگئی۔ غذا کی قلت شدید ہوگئی۔ باربرداری کے جانور ہلاک ہونے لگے تھے لہٰذا ذبح کرکے کھالیے گئے۔ جو غلہ گڑھی کے انباروں اور کنوؤں میں جمع کرلیا گیا تھا، وہ بھی ختم ہوگیا۔

سب سے زیادہ خراب حالت خود قاسم خاں کی تھی۔ وہ افیون کھانے کا عادی تھا۔ یہاں کھانے کو نہیں تھا، افیون کہاں ملتی۔ اس کی حالت بگڑنے لگی اور بالآخر وہ مرگیا۔ اس کی موت کے بعد سب کے حوصلے جواب دے گئے۔ امراء اور سرداروں کو اپنی موت نظر آنے لگی۔ اب اپنی ضد پر قائم رہنا خودکشی کے برابر تھا۔ سب نے یہی طے کیا کہ مرہٹوں سے امان طلب کی جائے۔ اس کے تاوان میں وہ جو کچھ طلب کریں، انہیں دے دیا جائے۔ اس کے عوض وہ انہیں کپڑوں کے ساتھ نکلنے کا موقع دے دیں۔

بات چیت کے لیے ایک ایسے آدمی کی تلاش ہوئی جس کے ساتھ مرہٹہ سرداروں کے پاس جایا جاسکے۔ اتفاق سے ایک دکنی زمیندار فوج میں تھا۔ وہ سنتھا کو جانتا تھا۔ اس نے پیش کش قبول کی اور مغل امراء کو سنتھا کے پاس لے جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ روح اللہ خاں اور دوسرے سردار اس زمیندار کے ساتھ باہر نکلے اور مرہٹوں کے کیمپ میں پہنچ گئے۔

سنتھا گلے میں قیمتی مالا ڈالے، ہاتھوں میں کنگن پہنے ننگے بدن ایک شاندار کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے دو چیلے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ بادشاہی وفد کو دیکھ کر سنتھا کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

''آؤ مہاراج! آج ہماری یاد آپ کو کیسے آگئی؟'' سنتھا نے روح اللہ خاں سے پوچھا۔

''مہاراج! انہیں ان کی مجبوری یہاں کھینچ لائی ہے۔ یہ آپ سے کچھ بات کرنے آئے ہیں۔'' روح اللہ کے بجائے زمیندار نے جواب دیا۔

''ان کی جھکی ہوئی گردن بتارہی ہے کہ کوئی بات ضرور ہے۔ بہرحال بتاؤ کیا بات ہے؟'' اس موقع پر روح اللہ نے بولنا ضروری سمجھا۔

''آپ کے محاصرے کی وجہ سے ہمارے لشکر کی حالت بہت بری ہے۔ میرے لوگ فاقے کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ آپ کا بھی بہت وقت ضائع ہورہا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ محاصرہ اٹھالیں تاکہ ہم گڑھی سے نکل جائیں۔''

''تجویز تو آپ کی اچھی ہے لیکن......''

''آپ فکر نہ کریں۔ اس کے بدلے آپ جو کہیں گے میں دینے کو تیار ہوں۔'' روح اللہ نے کہا۔

''آپ کے ساتھ جو ہاتھی گھوڑے ہیں، ان کے علاوہ میں ایک لاکھ ہون سے (جو ساڑھے تین لاکھ روپے کے مساوی تھا) کم نہیں لوں گا۔ جی چاہے تو سودا کرو، جی چاہے تو نہ کرو۔''

زمیندار نے اس وقت سخت نمک حرامی کی۔ سنتھا کے کان میں کہا۔

''یہ کیا بات تو نے کہی۔ کوئی اور سخت مطالبہ کر۔''

سنتھا فوراً اپنی بات سے پھر گیا اور معاوضہ بڑھادیا۔

''تمام سرداروں سے میں سات لاکھ ہون لوں گا۔ ہر شخص جان کی امان کا اظہار کرتے ہوئے اپنے اپنے حصہ رسدی کے مطابق دستاویز لکھ کردے دے اور رقم کی وصولی تک اپنے کسی عزیز یا اپنے عمدہ اور معزز آدمی کو بطور یرغمال میرے پاس چھوڑ دے۔ میرے آدمی گڑھی کے

دروازے پر متعین ہوں گے جو سرداروں کو تو بدن کی پوشاک اور سواری کے ایک گھوڑے کے ساتھ اور دوسروں کو صرف بدن کے معمولی کپڑوں کے ساتھ چھوڑنے جائیں گے۔ باقی جو کچھ زر نقد، ہاتھی گھوڑے وغیرہ ہوں گے وہ ضبط کر لیں گے۔

حالات ہی ایسے تھے کہ یہ کڑی شرط تسلیم کرنی پڑی۔ بادشاہی خزانے کی ساری رقم جو فوج کے ہمراہ دی گئی تھی اور امیروں کا اپنا روپیہ اور جواہرات تاخت و تاراج ہو گیا۔ اس جنگ اور محاصرے میں سنتھا کے ہاتھوں میں پچاس ساٹھ لاکھ سے زیادہ کی رقم پہنچ گئی۔

اس حادثۂ عظیم کی اطلاع جب بادشاہ تک پہنچی تو وہ استار نجیدہ اور کبیدہ خاطر ہوا کہ ان امیروں کو حاضری سے منع کر دیا اور ان میں سے ہر ایک کو مختلف صوبہ جات میں متعین کر دیا تاکہ وہ اس کی نظروں سے دور رہیں حالانکہ اس شکست میں ان امیروں کا کوئی قصور نہیں تھا۔

ابھی سنتھا اس عظیم فتح کا جشن منانے بھی نہیں پایا تھا کہ اسے ہمت خاں کی یلغار کی خبر ملی جو بادشاہی فوج کے محصور ہو جانے کی خبر سن کر یلغار کرتا چلا آ رہا تھا۔ ہمت خاں اس بات سے بے خبر تھا کہ شاہی فوج اور سنتھا کے درمیان معاہدہ طے پا گیا ہے۔ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ شاہی لشکر گڑھی میں محصور ہے۔

سنتھا نے ہمت خاں کے مقابلے پر پہنچ کر اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصے کو پیچھے چھوڑا اور دوسرے حصے کو لے کر ہمت خاں کے مقابلے پر پہنچ گیا۔ یہ مرہٹوں کا پرانا طریقۂ جنگ تھا۔

ہمت خاں کی بہادری ضرب المثل تھی۔ اس وقت بھی اس نے جم کر مقابلہ کیا۔ مرہٹے بڑی تعداد میں جہنم رسید ہوئے اور بالآخر سنتھا کو شکست کھا کر بھاگنا پڑا لیکن اس نے ایک منصوبے کے تحت اس طرف بھاگنا شروع کیا جہاں اس کی بقیہ فوج چھپی ہوئی تھی۔ ہمت خاں اس منصوبے سے بے خبر فتح کے جوش میں سنتھا کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ مرگِ ناگہانی اس کی تاک میں تھی۔ سنتھا اسے لے کر دشوار گزار جنگل میں داخل ہو گیا۔ اس نے اس جنگل میں جگہ جگہ درختوں پر اپنے برقندازوں کو بٹھا دیا تھا لہٰذا جیسے ہی ہمت خاں کی سواری اس مقام پر پہنچی، اچانک درختوں سے آگ برسنے لگی۔ ایک گولی اس کی پیشانی پر لگی اور وہ سانس لیے بغیر اسی وقت شہید ہو گیا اور تمام باربرداری ہاتھی اور کارخانے جو ہمت خاں کے ہمراہ تھے، سب سنتھا کے ہاتھ پڑ گئے۔

حالات بڑی تیزی سے عالمگیر کے خلاف ہو رہے تھے۔ پے در پے دو شرمناک ناکامیاں ہو چکی تھیں۔ امراء اس کا ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے۔ شہزادہ اعظم شاہ پر اسے اعتبار نہ رہا تھا۔ شہزادہ کام بخش بھی شوخیاں دکھا رہا تھا۔ ایسے میں اسے شاہ عالم کی یاد آئی جو سات سال سے قید میں پڑا ہوا تھا۔ اس نے وفادار امراء کا ایک اجلاس بلایا اور فوری حکم صادر کیا کہ شاہ عالم کی نظر بندی ختم کر دی جائے۔

شہزادہ شاہ عالم کو بہت سی رعایتیں پہلے ہی ملی ہوئی تھیں۔ اسے اجازت تھی کہ وہ کبھی کبھی مجرے کے لیے حاضر ہو سکتا ہے لیکن رہائی کے بعد جو ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو عالم ہی دوسرا تھا۔ اورنگ زیب نے آگے بڑھ کر اسے بے تابانہ گلے لگایا اور اپنی مسند پر اپنے برابر بیٹھنے کا حکم دیا۔

''میں تمہارے سامنے تمہارے بھائیوں کی برائی کر کے تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ سب میرے مرنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم ان کی حرکتوں سے سبق حاصل کرو گے۔''

جب تک شاہ عالم قید میں تھا، بادشاہ کی توجہات شہزادہ اعظم شاہ پر زیادہ رہی تھیں اور اعظم شاہ اپنے آپ کو مستقبل کا ولی عہد سمجھنے لگا تھا مگر اب جو بڑے بھائی کی رہائی عمل میں آ گئی اور بادشاہ نے اسے مطلق العنان بنا کر پہلے سے بھی زیادہ اس پر مہربانی کا اظہار کیا تو اعظم شاہ کے سینے پر سانپ لوٹنے لگا اور روز بہ روز اس کے غصے میں اضافہ ہوتا رہا۔ شہزادہ کام بخش کے وجود کو تو وہ اہمیت ہی نہیں دیتا تھا لیکن بڑے بھائی کی رہائی نے اسے چوکنا کر دیا۔ بڑے بھائی کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ یہ جذبہ ایسا تھا جسے وہ چھپا نہ سکا۔ اورنگ زیب اس کی اس کیفیت کو بغور دیکھ رہا تھا۔ دونوں بھائیوں کی اس رقابت کو ختم کرنے کا بس ایک راستہ تھا کہ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے۔ اس نے شاہ عالم کو بہادر شاہ کا لقب عطا فرما کر اکبر آباد کے بندوبست اور وہاں کے مفسدوں کی سرکوبی کے لیے مستقل انتظام کے ساتھ بااختیار بنا کر رخصت کر دیا۔

کچھ عرصے بعد شاہ عالم کو صوبہ کابل کے بندوبست پر مامور کر دیا۔

بیٹوں کے نفاق کا سامنا صرف اورنگ زیب کو ہی نہیں تھا، مرہٹہ سردار بھی اسی صورتِ حال سے گزر رہے تھے۔ ان سرداروں میں بھی نفاق کے آثار تھے۔ اورنگ زیب نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس نے ایک مشہور امیر غازی الدین خاں فیروز جنگ کو بے جاپور

سے چار پانچ منزل پر سنتھا کی تنبیہ کے لیے مقرر کر دیا۔

غازی الدین خاں بھوکے شیر کی طرح شکار کے انتظار میں دبکا بیٹھا تھا کہ ہرکاروں نے اطلاع پہنچائی کہ سنتھا پچیس ہزار کا لشکر لے کر آٹھ کوس پر آ گیا ہے۔

وہ شکار پر جھپٹنے کے لیے تیاری پکڑ ہی رہا تھا کہ اس کا بیٹا اور بعض امیر اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ فوج کا ایک بڑا حصہ ان امیروں کے ساتھ چلا گیا اور اس کے پاس فوج بہت کم رہ گئی۔ سنتھا جیسے بہادر دشمن سے لڑنا کوئی مذاق نہیں تھا۔ اپنے لشکر کی قلت کو دیکھتے ہوئے اس نے لڑائی کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس وقت اس نے یہی مناسب سمجھا کہ بے جا پور کی طرف واپس پلٹ جائے۔

یہ وقت بڑا نازک تھا۔ غازی الدین خاں بے جا پور کی طرف واپس جا رہا تھا۔ دوسری جانب سنتھا بے جا پور کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اس نازک موقع پر مرہٹہ سرداروں کے باہمی نفاق نے بازی پلٹ کر رکھ دی۔ سنتھا کا حریف دوسرا بڑا مرہٹہ سردار دھنا جادو موقع کی تلاش میں تھا اور یہ موقع اسے مل گیا۔ سنتھا کسی خطرے سے بے نیاز بے جا پور کی طرف بڑھا جا رہا تھا کہ دھنا جادو کے لشکر نے پشت کی جانب سے اس پر حملہ کر دیا۔

سنتھا نہایت ظالم شخص تھا لہٰذا اس کے بڑے بڑے سردار بھی درِ پردہ دھنا جادو سے ملے ہوئے تھے۔ جب سنتھا دونوں جانب سے گھر گیا تو بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے جنگ سے ہاتھ اٹھایا اور اپنی کوہستانی پناہ گاہ کی طرف بھاگ گیا۔

غازی الدین خاں قریب ہی تھا۔ اسے جب سنتھا کے فرار کی خبر ملی تو اس نے سنتھا کے تعاقب کے لیے اپنے لشکریوں کا رخ موڑ دیا۔

بدنصیب سنتھا دونوں جانب سے خطرے میں گھرا ہوا تھا۔ اس کے تعاقب میں ایک طرف سے بادشاہی فوج تھی تو دوسری طرف سے دھنا جادو کی فوج۔ اس دوطرفہ تعاقب سے گھبرا کر سنتھا کی فوج منتشر ہو گئی اور سنتھا اپنی فوج سے الگ ہو گیا۔ اس وقت رکنا یا اپنی فوج کو تلاش کرنا دانش مندی نہیں تھی۔ اس کا جس طرف منہ اٹھا، بھاگتا چلا گیا۔ اس پریشانی کے عالم میں اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ وہ اپنے دشمن سردار ناکو نا میاں کے علاقے میں ہے۔

وہ اس وقت اس خوش فہمی میں تھا کہ اسے کسی نے پہچانا نہیں ہے۔ وہ بھاگتے بھاگتے تھک گیا تھا۔ اس نے گھوڑا ایک درخت سے باندھا اور خود درخت کے نیچے لیٹ کر آرام کرنے لگا۔ اسی وقت ایک شخص کا اس طرف سے گزر ہوا۔ وہ آدمی اسے دیکھ کر رک گیا۔

''بھائی تم کون ہو...... پردیسی معلوم ہوتے ہو؟''

''ہاں بھائی۔ میں پردیسی ہوں، بڑی دور سے چلا آ رہا ہوں۔ ذرا آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا تھا۔''

''یہ تو بڑی بے مروتی کی بات ہے کہ کوئی پردیسی ہمارے گاؤں میں آئے اور یوں درخت کے نیچے بھوکا پیاسا لیٹا رہے۔ یہاں سے اٹھو اور گاؤں کی چوپال میں چل کر لیٹو۔ جل پانی کا موقع تو دو۔''

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ میں کچھ دیر آرام کے بعد چلتا بنوں گا۔ میں ذرا جلدی میں ہوں۔''

سنتھا ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ اس آدمی کے ساتھ جائے لیکن وہ شخص پیچھے ہی پڑ گیا تھا۔ سنتھا کو اس کے ساتھ جانا پڑا۔

سنتھا چوپال میں جا کر بیٹھا تو بہت سے لوگ اس سے ملنے آئے۔ ان ملنے والوں میں ناکو نا میاں بھی تھا جو اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ مزید اطمینان اس وقت ہو گیا جب اس نے سنتھا کے ہاتھوں میں قیمتی کڑے دیکھے۔ وہ جن قدموں سے گیا تھا، انہی قدموں سے لوٹ آیا۔ گھر میں گھستے ہی اس نے دروازہ بند کیا اور بیوی کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''مل آئے مہمان سے؟''

''وہ مہمان نہیں، میرا دشمن ہے جسے بھگوان نے خود بخود میرے پاس بھیج دیا ہے۔''

''کیا مطلب؟ کون سا دشمن؟''

''چند سال پہلے اسی سنتھا نے میرے بھائی کو ہاتھی کے نیچے ڈلوا دیا تھا۔ میں اس دن سے اس کے لیے دل میں غبار لیے بیٹھا ہوں۔ آج یہ موقع ہے کہ وہ اکیلا ہے اور میرے علاقے میں ہے۔ بس میں تمہیں اطلاع دینے آیا تھا۔ کہیں وہ نکل نہ جائے۔''

''احتیاط سے جانا۔ وہ اکیلا ہے لیکن اس کا نام سنتھا ہے۔ وہ اکیلا بھی بہت سوں پر بھاری ہوتا ہے۔''

''میں بھی ناکو نا میاں ہوں۔ وہ اکیلا ہے مگر میں بہت سوں کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔''

ناکو نا میاں نے جلدی جلدی ہتھیار باندھے اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ چوپال میں آ کر اسے معلوم ہوا کہ وہ نکل چکا ہے۔ ناکو نا میاں نے سر پیٹ لیا کہ شکار ہاتھ سے نکل گیا لیکن غصہ ایسا تھا کہ اکیلا ہی اس کے تعاقب میں نکل گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد اسے سنتھا نظر آ گیا۔

ناکونا میاں نے اپنی رفتار دھیمی کرلی۔ کچھ دور اور چلنے کے بعد اس نے دیکھا کہ سنتھا رک گیا ہے۔ ایک نالا قریب بہہ رہا تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو درخت کے ساتھ باندھا اور کپڑے اتارنے لگا۔ ناکونا میاں حیرت سے دیکھ رہا تھا وہ کیا کررہا ہے۔ اب صرف ایک لنگوٹ سنتھا کے بدن پر تھی۔ اب پوری بات ناکونا میاں کی سمجھ میں آگئی۔ سنتھا نہانے کے لیے نالے میں اتر رہا تھا۔ اب وہ نہاتا تھا۔ اس کے ہتھیار کنارے پر رکھے ہوئے تھے۔ ناکونا میاں نے اپنا گھوڑا وہیں چھوڑا اور تلوار ہاتھ میں لے کر دبے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ نالے کے قریب پہنچ گیا اور ایک درخت کی آڑ لے کر بیٹھ گیا۔ سنتھا کچھ دیر نہاتا رہا اور پھر باہر نکلنے کے لیے نالے کی دیوار کے قریب آ گیا۔

ناکونا میاں آگے بڑھا اور جیسے ہی سنتھا نے نالے سے باہر آنے کے لیے گردن اوپر کی، ناکونا میاں نے ایک ہی وار میں اس کا سرتن سے جدا کردیا۔ اس نے سنتھا کی لاش کو تو وہیں چھوڑا اور اس کا سر گھوڑے کے پیچھے ''توبرہ'' (وہ تھیلا جس میں گھوڑے کا دانہ ہوتا ہے) میں ڈال دیا اور بھاگم بھاگ گھر پہنچا۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔

''بھاگ بھری! میں نے اپنے بھائی کا بدلہ لے لیا۔ سنتھا جیسے موذی کا سر کاٹ کرلے آیا ہوں۔''

''تونے تو یہ کمال کردیا۔ کہاں ہے اس کا سر؟ میں بھی تو دیکھوں۔ بڑے بڑے سورما جس کا نام سن کر کانپتے تھے وہ ہے کیسا۔''

''گھوڑے کے پیچھے ''توبرہ'' میں پڑا ہوا ہے۔ ابھی اٹھاتا ہوں۔''

''تم اس کے سر کا کروگے کیا؟''

''دھنا جادو اس کا دشمن بنا ہوا ہے۔ اسی کے پاس لے جاؤں گا۔''

''اس بکھیڑے میں کیوں پڑتے ہو۔ اسے یہیں کسی گڑھے میں پھینک دو۔''

''دھنا جادو مجھے اس کارنامے پر انعام دے گا۔ اگر میں نہیں گیا تو انعام سے محروم رہ جاؤں گا۔''

بیوی بھی خوش ہوگئی۔ دونوں میاں بیوی [illegible] سوار ہوئے اور دھنا جادو کی طرف چل دیے۔ [illegible] سرپٹ دوڑے چلے جارہے تھے۔ اتفاق [illegible] توبرہ گھوڑے پر سے گرگیا۔ جب وہ دھنا [illegible] قریب پہنچے تو پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دیکھتے [illegible] کہیں گر چکا تھا۔

''بھاگ بھری! سنتھا کا سر کہیں گر گیا ہے۔'' ناکونا میاں نے گھوڑے کی باگیں کھینچتے ہوئے کہا۔

''تونے یہ کیا کہہ دیا...... کہاں گرگیا؟''

''شاید راستے میں۔''

''گھر سے لائے بھی تھے؟''

''لایا تھا۔''

''یہ تو غضب ہوگیا۔ ہم تو انعام سے بھی گئے۔ اب گھوڑا موڑو۔ شاید کہیں پڑا ہوا مل جائے۔ کٹا ہوا سر بھلا کس کے کام کا۔''

ناکونا میاں نے گھوڑا موڑا اور جس راستے سے آیا تھا، اسی پر چل دیا۔

غازی الدین خاں سنتھا کے تعاقب میں تھا۔ اتفاق سے اس کے سپاہی اسی راستے پر آگئے اور انہیں سنتھا کا کٹا ہوا سر پڑا مل گیا۔ انہوں نے دیکھتے ہی پہچان لیا اور اسے لے کر غازی الدین خاں کے پاس پہنچ گئے۔

جنگ کیے بغیر سنتھا کا سر اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے اس خداداد فتح پر شادیانے بجائے۔ سنتھا کے سر کو لشکر میں تشہیر کرانے کے بعد بادشاہ کے پاس بھجوادیا۔

بادشاہ نے بھی اس عطیہ الٰہی کا شکر ادا کیا اور حکم دیا کہ سنتھا کے سر کو لشکر میں اور دکن کے شہروں میں گشت کرایا جائے۔

سنتھا کا سر کٹا تھا۔ مرہٹوں کے تمام سرداروں کے سر نہیں کٹ گئے تھے۔ ان کے تمام سردار جن میں دھنا جادو سب سے پیش پیش تھا، لوٹ مار میں مصروف تھے۔ دکن کے تمام شہران کی دست برد سے برباد ہورہے تھے۔ بادشاہ نے ان کے کامل استیصال کے لیے ضروری سمجھا کہ وہ قلعے جو مرہٹوں کی پناہ گاہ بنے ہوئے ہیں، انہیں فتح کرلیا جائے۔

اس مہم کے لیے بادشاہ نے عام اعلان کردیا اور سختی سے تاکید کردی کہ کوئی شخص بھی عورتوں اور بچوں کو ساتھ لے کر نہ چلے لیکن اس پر پوری طرح عمل نہ ہوسکا۔ اس لشکر میں چوری چھپے سپاہیوں کے اہل خانہ بھی شامل ہو ہی گئے۔

تیاریاں مکمل ہوئیں۔ کوچ کا حکم ہوا۔ بیس دن کے سفر کے بعد ایک مقام پر پڑاؤ ڈالا گیا۔ شہزادہ اعظم شاہ کو بھی طلب کرلیا گیا۔

اس منزل سے مرہٹوں کی پناہ گاہ بہت قریب تھی۔ ارادہ یہی تھا کہ اس قلعے پر قبضہ کرکے رام راجا کو گرفتار کرلیا جائے گا لیکن معلوم ہوا کہ شاہی فوج کے کوچ کی خبر سن کر رام راجا صوبہ برار کی طرف چلا گیا ہے اور وہاں قصبوں اور شہروں کو تاراج کررہا ہے۔

شاہی لشکر میں دیوگڑھ کا ایک زمیندار بھی شامل تھا۔ یہ زمیندار اپنے ہم وطنوں سے لڑ جھگڑ کر دربارِ شاہی میں حاضر ہو گیا تھا اور بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اورنگ زیب نے اس کا نام بلند بخت رکھ دیا تھا۔ اس مہم میں بھی وہ اسے اپنے ساتھ لایا تھا۔

بلند بخت نے جب سنا کہ رام راجا صوبہ برار میں ہے تو اس کی ازلی فطرت پلٹ آئی۔ اس نے بادشاہ کے احسانات کی یہ قیمت چکائی کہ ایک روز لشکر سے چپکے سے فرار ہو گیا اور رام راجا کے ساتھ جا کر مل گیا۔ اسے شاید یہ امید ہو چلی تھی کہ رام راجا کے ساتھ مل کر اپنے مخالفوں سے بدلہ لے سکے گا اور اپنی جاگیر پر دوبارہ قبضہ کر لے گا۔

اس کے نکلتے ہی خبر گرم ہونے میں دیر نہیں لگی۔ بادشاہ نے شہزادہ بیدار بخت کے نام حکم جاری کیا کہ وہ زمیندار کی سرکوبی کے لیے ایک فوج لے کر جائے۔

بیدار بخت نے اپنا لشکر چھوڑا اور تیز رفتار سواروں کے ساتھ تعاقب کے لیے روانہ ہو گیا۔

شہزادے کی روانگی کے بعد بادشاہ نے دیر نہیں لگائی۔ اب اسے ان اہم ترین قلعوں پر قبضہ کرنا تھا جو مرہٹوں کی پناہ گاہ کے طور پر کام آتے تھے۔ اس نے پڑاؤ کے مقام سے کوچ کیا اور محض تین چار کوس کے فاصلے پر ایک قلعہ نظر آ گیا۔ بادشاہ نے قلعے کا محاصرہ کرنے کا حکم دے دیا۔

''ہمارا خیمہ اس مقام پر لگایا جائے جو قلعے سے قریب تر ہو۔'' بادشاہ نے حکم جاری کیا۔

''حضور! اس طرح تو آپ کی جان کو خطرہ ہوگا۔ اگر قلعے کے اندر سے گولہ باری ہوئی تو آپ کا خیمہ اس کی زد میں ہوگا۔''

''یہ بھی تو سوچو اس جرأت کے دشمن پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ جب ہمارا خیمہ قلعے کے قریب ہوگا تو دشمن پر ہمارا رعب طاری ہوگا۔''

بادشاہ کا یہ قیاس غلط نہیں تھا۔ دشمن نے بادشاہ کی اس جرأت کو دیکھا تو محصوروں پر خوف طاری ہو گیا۔ حواس باختہ ہو کر نہایت عاجزی کے ساتھ جان کی امان کی درخواست کی اور قلعہ سپرد کرنے پر راضی ہو گئے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ قلعے سے جو بھی باہر آئے اس کے ہتھیار چھین لو اور اسے نکل جانے دو۔

یہ قلعہ بادشاہی قبضے میں آ گیا۔ بادشاہ نے اس قلعے کا نام ''کلید فتح'' رکھا۔

اب شاہی لشکر کا رخ قلعہ ستارہ کی طرف تھا۔ یہ وہ اہم قلعہ تھا جہاں مرہٹہ سردار رام راجا پناہ لیا کرتا تھا۔ ان دنوں وہ صوبہ برار میں لوٹ مار میں مشغول تھا لیکن یہ قلعہ ایک اونچی چٹان پر ستارے کی طرح چمک رہا تھا۔ بادشاہی خیمہ قلعہ ستارہ کے مقابل ڈیڑھ کوس کی مسافت پر لگا دیا گیا۔ قلعے کے اطراف دوسرے تمام بادشاہی امیروں نے اپنے مورچے جما دیے۔

ابھی گولہ باری سے فرصت نہیں ملی تھی کہ ایک خبر نے اس محاصرے کو جشن میں بدل دیا۔ جاسوسوں نے خبر پہنچائی۔

''رام راجا جو برار کی طرف بھاگ گیا تھا، وہاں سے اپنے کوہستان میں واپس آنے کے لیے روانہ ہوا تھا کہ راستے میں طبعی موت مر گیا۔ اس کے ہمراہی سرداروں نے اس کی بڑی بیوی تارا بائی کو رام راجا کی جگہ گدی نشین کر دیا ہے۔''

بات خوشی کی تھی۔ ایک بڑا دشمن خود بخود راہ سے ہٹ گیا تھا۔ پورے لشکر میں شادیانے بجائے گئے۔ یہ تاثر عام تھا کہ ایک بے دست و پا عورت مرہٹوں کو سنبھال نہیں سکے گی اور مرہٹوں کا قلع قمع ہو جائے گا۔

رام راجا کی اچانک موت نے ایسا حوصلہ دیا کہ قلعہ ستارہ کی فتح کی کوششیں اچانک تیز ہو گئیں۔

قلعہ ستارہ کی ایک دیوار کے گر جانے اور ایک بڑی تعداد میں ہلاکتیں ہو جانے کے سبب قلعہ دار پریشان تھا۔ رام راجا کی موت کی خبر سن کر اور بھی بدحواس ہو گیا۔ اس نے درخواست کی کہ اگر جان و آبرو کی امان مل جائے تو میں قلعے کی چابی حوالے کر دوں گا۔

بادشاہ نے اس کی درخواست قبول کر لی۔

اس یقین دہانی کے بعد قلعہ دار نے چابیاں بادشاہ کے قدموں میں رکھ دیں۔ تین ہزار سے زیادہ مرد اور عورتیں قلعے سے نیچے اتر آئے۔

ستارہ کی تسخیر کے بعد بادشاہ نے ایک اور قلعہ ''پرلی'' کے محاصرے کا ارادہ کر لیا۔ ابھی محاصرے کے چند ہی دن گزرے تھے کہ قلعہ دار نے امان طلب کرنے کے لیے برہمنوں کو بھیجا۔ بادشاہ نے ان کی درخواست قبول نہیں کی اور محاصرہ سخت کر دیا۔

لشکر کا سپہ سالار فتح اللہ خاں برابر حملے کر رہا تھا۔ ان حملوں نے محصورین کا ناطقہ بند کر دیا تھا لیکن بدقسمتی سے بارش کا موسم آ گیا۔ یہ علاقہ ایسا تھا جہاں پانچ ماہ تک مسلسل بارش ہوتی رہتی تھی۔ شاہی لشکر کی پریشانیاں روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھیں۔ ندی نالوں کی طغیانی نے رسد پہنچنے کے ذرائع بھی مسدود کر دیے۔ پریشانی انتہا کو پہنچ گئی۔ غذائی

...ی ایسی قلت ہوئی کہ آدمی اور مویشی سب جاں بلب ہو گئے۔

یہ حالت دیکھ کر اہلِ قلعہ کے حوصلے بڑھ گئے۔ وہ باہر نکل کر حملے کرنے لگے لیکن شاہی لشکر نے بھی ہمت نہیں ہاری اور پے درپے حملے کر کے محصورین کا ناطقہ بند کر دیا۔ انہیں اتنا مجبور کر دیا کہ وہ امان طلب کرتے ہوئے قلعے سے نکل آئے۔

قلعے کے لوگ ڈیڑھ ماہ کے محاصرے کے بعد اہل و عیال کے ساتھ بدن کے کپڑوں میں قلعے سے نکل گئے۔

☆☆☆

مرہٹوں کی طرف سے بے فکر ہوجانے کے بعد اورنگ زیب دیگر علاقوں اور قلعوں کی فتح میں مشغول ہوگیا۔ اس کی راہ میں اب کوئی رکاوٹ نہیں رہ گئی تھی۔ اس نے کئی اہم قلعے فتح کر لیے۔

اس وقت وہ قلعہ راج گڑھ کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ قلعہ مرہٹوں کی پہلی پناہ گاہ تھا اور دشوار گزار پہاڑی پر بنا ہوا تھا۔ پھر یہاں درندے زہریلے جانور اور سانپ بہ کثرت پائے جاتے تھے۔ قلعے کی وسعت ناقابلِ بیان تھی۔ پیمائش کرانے پر معلوم ہوا کہ بارہ کوس تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کا ہر طرف سے محاصرہ ناممکن تھا۔ یہ انتظام ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ محصورین کو کسی راہ سے بھی غلہ نہ پہنچ سکے۔

قلعے کے اطراف دو پہاڑیاں اور بھی تھیں۔ ان پر بھی بلند عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں جنگ کا ساز و سامان بھی تھا۔ محصورین نے ان پہاڑیوں پر سے گولہ باری شروع کر دی۔ بھاری بھاری پتھر بھی گرانے لگے۔ مرحلہ دشوار تر تھا لیکن فتح اللہ خاں کی بہادری اور لشکر کی ثابت قدمی نے یہ مشکل آسان کر دی۔ مسلسل حملوں اور قلعہ شکن توپوں کی مدد سے بادشاہی نشان قلعے کے پہلے دروازے پر بلند کر دیے گئے۔ مرہٹوں کی ایک بڑی تعداد فرار ہوتے ہوئے ماری گئی۔ عاجز آ کر قلعے کے نگہبان نے جان کی امان کی درخواست پیش کر دی۔

شاہی لشکر کسی روک ٹوک کے بغیر قلعے میں داخل ہو گیا۔

☆☆☆

رام راجا کی بڑی بیوی تارابائی نے رام راجا کی موت کے بعد اپنے تین سالہ بیٹے کو باپ کا جانشیں بنا کر سارے اختیارات سنبھال لیے۔ خیال یہ تھا کہ ایک کمزور عورت رہ گئی۔ وہ سرکش مرہٹوں پر قابو نہیں پاسکے گی اور مرہٹوں کی لوٹ مار ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گی لیکن تارابائی نے ہر خیال کو غلط ثابت کر دیا۔ اس نے اختیارات سنبھالتے ہی اپنے مقبوضہ علاقے کی آبادکاری اور بادشاہی ملک میں لوٹ مار کا پہلے کی طرح سلسلہ شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی دن میں مرہٹے پہلے کی طرح دکن کے چھ صوبوں کو پامال کرتے چلے گئے۔ احمد آباد کی سرحد سے صوبہ مالوہ تک کا علاقہ بالکل پامال ہوگیا۔ احمد آباد اور اجین کے اطراف ایسی تباہی مچائی کہ ویرانی کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔

ان کامیابیوں نے مرہٹوں کے حوصلے بڑھا دیے۔

رام راجا کی بیوہ تارابائی ان کامیابیوں سے سرشار ہو رہی تھی۔ دہنا جادو اس کا دستِ راست بنا ہوا تھا۔ وہ اس فکر میں تھی کہ قلعہ ستارہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا جائے۔ جب تک ایسا نہیں ہوجاتا اس کا قلعہ ستارہ کے قریب رہنا ضروری تھا۔ اس نے اجین سے چند کوس کے فاصلے پر ایک بلند پہاڑ پر قلعے کی بنیاد رکھ دی۔ تعمیر کا کام تیزی سے شروع ہو گیا۔ کچھ دنوں کے لیے اس نے تمام سرداروں کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ اپنے اپنے لشکروں کو ساتھ لے کر حاضر ہو گئے۔ اس تیاری کا مقصد یہ تھا کہ اگر بادشاہ کی فوجیں اس تعمیر کو روکنے کے لیے آگے بڑھیں تو ان کے اس قدم کو روکا جا سکے۔

بادشاہ اپنے بکھیڑوں میں گھرا ہوا تھا۔ شہزادوں کی رقابتیں سامنے آ رہی تھیں۔ لشکر کے لوگ بھی دکن میں رہتے رہتے تنگ آ گئے تھے۔ بادشاہ کا اپنا بڑھاپا بھی ان تکالیف سے گھبرانے لگا تھا۔ البتہ یہ اطمینان تھا کہ مرہٹوں کی تباہ کاریاں اب کم ہو گئی تھیں لیکن اس کا سبب کسی کو معلوم نہیں تھا۔ دور دراز مقام پر بلند پہاڑوں کے پیچھے کیا ہو رہا ہے، کوئی نہیں جانتا تھا۔

اس ویرانے میں مرہٹہ سرداروں کا آنا جانا لگا ہوا تھا۔ انہی میں ایک ہنونت رائے بھی تھا۔ یہ سردار نوجوان بھی تھا، خوب صورت بھی اور بہادر بھی۔ اسی لیے رام راجا کی بیوہ تارابائی جو اب مرہٹہ سرداروں کو یکجا رکھے ہوئے تھی، ہنونت رائے کو بہت عزیز رکھتی تھی اور اکثر اس کے مشوروں پر عمل کرتی تھی۔ اس روز بھی اسے کسی مشورے کے لیے بلایا تھا۔ اس وقت کوئی اور سردار وہاں موجود نہیں تھا اس لیے اسے خلوت ہی میں بلا لیا اور باتیں کرنے لگی۔

”یہ تو تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ قلعہ ستارہ جو ہمارا حاکم نشیں قلعہ تھا، مغلوں کے قبضے میں چلا گیا ہے۔ اب اطلاع ملی ہے کہ قلعہ پرلی پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا ہے۔ اب وہ یقیناً قلعہ پرنالہ کی طرف بڑھیں گے۔“

''اطلاعات اسی طرح کی مل رہی ہیں۔''

''اسی لیے میں نے تمہیں بلایا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ ایک ایک کر کے ہمارا ہر قلعہ دشمن کے قبضے میں چلا جائے۔ اب تم بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''ہماری غلطی یہ تھی کہ ہم نے اس قلعے کی تعمیر کے لیے اپنی سرگرمیاں وقتی طور پر روک دیں۔ اس سے شاہی لشکروں کو آگے بڑھنے کا موقع مل گیا۔''

''پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے تھا؟''

''اپنے پرانے قلعوں میں سے کسی ایک کو اپنی قوت کا مرکز بناتے۔ اب تو ہم منتشر ہو کر رہ گئے ہیں۔ سرداروں میں نااتفاقی کی کہانیاں بھی سننے میں آ رہی ہیں۔''

''میں نے بہت سے نااہل سرداروں کو تبدیل کر دیا ہے۔''

''یہ بھی آپ کی غلطی تھی۔ وہی نااہل سردار اب ہم سے انتقام لینے کے لیے سازشوں کے جال بُن رہے ہیں۔ اپنے چھوٹے چھوٹے جتھے بنا لیے ہیں اور لوٹ مار کرتے پھر رہے ہیں۔''

''اب تو خیر جنہیں نکال دیا انہیں واپس نہیں لیا جا سکتا۔ کوئی ایسی ترکیب بتاؤ کہ ہم مغلوں کے بڑھتے ہوئے قدم روک سکیں۔''

''اس کی ترکیب یہی ہے کہ ایک معمولی سی جمعیت اس قلعے کی حفاظت کے لیے رکھیں، باقی سب کو قلعہ پرنالہ بھیج دیں کیونکہ ''پرلی'' کی فتح کے بعد مغل لشکر پرنالہ کی طرف بڑھے گا۔''

''ایک خبر یہ بھی آئی ہے کہ بادشاہ نے اپنے چھوٹے بیٹے اعظم شاہ کو اجین کی صوبہ داری پر مقرر کر کے رخصت کر دیا ہے۔''

''یہ کوئی ایسی بری خبر نہیں۔ بادشاہ نے اسے انتظامی سہولت کے لیے وہاں نہیں بھیجا ہے بلکہ بادشاہ اس سے ناراض ہے۔ اسے خود سے دور رکھنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔''

''وجہ کوئی بھی ہو۔ اجین میں اس کا رہنا ہمارے لیے خطرناک ہے۔''

''بالکل نہیں۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ ایسے کہ ہم باپ سے اس کی ناراضی کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ چاپلوسی اور خوشامد سے ہم اسے اپنا ہمراز بنا سکتے ہیں۔ اگر ہم اسے بادشاہت کی امید دلا دیں تو وہ باپ کے خلاف ہی تلوار اٹھا لے گا۔''

''تمہیں یقین ہے؟''

''بادشاہ کی عمر اسی (80) سال سے اوپر کی ہو چکی ہے۔ شہزادے اس کی موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس کے مرنے کے بعد شہزادوں میں رسّا کشی شروع ہو جائے گی۔ بڑا بیٹا تو کابل میں ہے۔ قریب تر اعظم شاہ ہے۔ اگر ہم اس کی طرف ہاتھ بڑھائیں تو وہ اپنی قوت میں اضافے کے لیے ہمیں خوش آمدید کہے گا۔''

''لیکن یہ مشکل کام سرانجام کون دے گا؟''

''اس کے لیے میں حاضر ہوں۔''

''ہم تمہیں کسی مشکل کام میں الجھا کر خود سے دور کرنا نہیں چاہتے۔'' یہ کہتے ہوئے تارابائی کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جسے کوئی مرد بھی بہ آسانی نظرانداز نہیں کر سکتا۔ ہنونت رائے بھی ایک لمحے کو سٹپٹا کے رہ گیا تھا۔

''میں بہت دن سے باہر نہیں نکلی ہوں۔ تعمیراتی کام کا جائزہ بھی نہیں لیا ہے۔ آؤ باہر چل کر دیکھتے ہیں، کام کتنا ہو گیا ہے۔'' تارابائی نے کہا۔ ''تم بیٹھو میں ابھی تیار ہو کر آتی ہوں۔''

اسے گئے ابھی چند ہی لمحے ہوئے تھے کہ رام راجا کی چھوٹی بیوی چندابائی کمرے میں داخل ہوئی۔ ہنونت رائے نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن یہ سمجھنے میں اسے دیر نہیں لگی کہ یہ رام راجا کی دوسری بیوی ہے۔ کم سن اتنی تھی کہ اسے بیوی یا بیوہ کہتے ہوئے سوچنا پڑے۔ حسین اتنی کہ تارابائی اس کے پاؤں کی گرد بھی نہیں تھی۔ وہ اسے دیکھ کر بے اختیار اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''رانی جی! میرا نام ہنونت رائے ہے۔ مجھے یہاں تارابائی نے بلایا ہے۔''

''آپ کو جو بلاتا ہے چلے آتے ہیں؟'' چندابائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تارابائی رام راجا کی نشانی ہے۔''

''نشانی تو میں بھی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''آپ کی جوانی تارا بھائی کے لائق نہیں۔'' چندابائی یہ کہہ کر غائب ہو گئی۔ ہنونت رائے اس پراسرار جملے کا مطلب سوچتا رہ گیا۔

تارابائی اسے لے کر باہر نکلی۔ نشیب میں ایک طرف دو گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ ایک پر تارابائی سوار ہو گئی دوسرے پر ہنونت رائے سوار ہو گیا۔

وہ راستے بھر لگاوٹ کی باتیں کرتی رہی لیکن ہنونت رائے کا ذہن چندابائی کے جملے میں اٹکا ہوا تھا۔ ''تمہاری جوانی تارابائی کے لائق نہیں۔''

☆☆☆

علا ... لی کی فتح کے بعد اورنگ زیب عالمگیر نے
علا ... نا ... ی مہم کا قصد کر لیا تھا لیکن مفتوحہ قلعوں پر فوج کشی
... بے شمار آدمی تلف ہو گئے تھے۔ اس کمی کو پورا
... لیے اورنگ آباد، حیدر آباد، احمد آباد اور
... سرداروں کو حکم دیا گیا کہ ان میں سے ہر ایک کم
... ایک ہزار سواروں کو بھرتی کر کے حضور شاہ میں روانہ
... ے۔

ان سواروں کے آنے تک بادشاہ کو انتظار کرنا تھا۔
بادشاہ نے یہ وقت گزارنے کے لیے ایک مقام
''اس پورہ'' کا رخ کیا۔ یہ نہایت سرسبز علاقہ تھا۔ پھل دار
... ات تھے اور پانی بھی وافر مقدار میں تھا۔ اجازت ملتے
... شاہی لشکر نے خواص پورہ پہنچ کر خیمہ گاہ قائم کر دی۔
خواص پورہ میں لشکر ایک کم آب نالے کے کنارے
... ہوا تھا جس کے اطراف خشک ریگ زار نکل آیا تھا۔
... ش کا موسم گزر چکا تھا اس لیے یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا
... نالے میں طغیانی آ سکتی ہے۔ یہاں غذائی اشیا کی
... وانی تھی لہٰذا آرام سے بسر ہونے لگی لیکن طوفانِ بلا تاک
... تھا۔ دور دراز کے پہاڑوں میں سخت بارش ہوئی اور
... ے پانی اتر کر سیلاب کی شکل میں بڑھا۔
رات کا کچھ حصہ گزرا تھا کہ نالے نے دریا کی شکل
... ار کر لی۔ کنارے چھلک اٹھے۔ نالے کے کنارے پر
... لشکر گاہ تھی۔ نالہ کب بھر گیا، کب اس نے سیلاب کی شکل
... ار لی، کچھ پتا نہ چلا۔ آنکھ تو اس وقت کھلی جب یہ خوفناک
... ب لشکر گاہ پر پہنچ گیا۔ لوگ نیند میں تھے۔ جب تک
... پانی سر سے گزر گیا۔ خیمے پانی میں تیر رہے تھے۔
... تیر رہے تھے۔ بادشاہ نے یہ شور سنا تو نا گہاں یہ خیال
... ن نے لشکر گاہ پر شب خون مارا ہے۔ وہ گھبرا کر اٹھا
... پھسل گیا اور ایسی سخت چوٹ آئی کہ اٹھنے کے قابل
... چوٹ ایسی سخت تھی کہ آخر تک پاؤں میں لنگ رہا)
... باہر کھڑے پہرے داروں نے بادشاہ کو باہر لانے
... تے بچانے کے لیے اندر جھانکا تو اسے زمین پر
... ا وہ تکلیف کی شدت سے کراہ رہا تھا۔
بادشاہ کو سیلاب کی بابت بتایا گیا۔
... دولت خانہ شاہی تک پہنچ گیا تھا کہ اچانک
... ٹ گیا۔ صبح ہوئی تو پانی اتر چکا تھا لیکن اس تباہی
... بڑے نامی گرامی امراء کا سارا مال و اسباب
... ا تھا

☆☆☆

ہنونت رائے ہر دوسرے تیسرے دن تارا بائی سے ملنے آ رہا تھا لیکن اس کی آنکھیں چندا بائی کو ڈھونڈتی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی اسے کامیابی بھی ہو جاتی تھی اور چندا بائی کی ایک جھلک دیکھنے کو مل جاتی تھی لیکن وہ اس سے زیادہ کا متمنی تھا۔ تارا بائی کی موجودگی میں اسے یہ موقع نہیں مل سکتا تھا۔ وہ چندا بائی کے بارے میں کچھ پوچھ کر تارا بائی کو کسی شک میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ایک خاص منصوبے کے تحت تارا بائی کو ترغیب دلائی کہ وہ اپنے مقبوضہ قلعوں کا دورہ کر کے مرہٹہ سرداروں کی ہمت بڑھائے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ گزرنے والے قافلوں سے جو چوتھ وصول کیا جاتا ہے، وہ بھی آپ تک پورا نہیں پہنچ رہا ہے لہٰذا سرداروں کو اس کے بارے میں بھی سرزنش کرے۔ تارا بائی نے اس خیال سے کہ وہ بھی اس کے ہمراہ ہو گا، فوراً ہامی بھر لی۔

''تم میرے ساتھ رہو گے، میری اس سے زیادہ خوش قسمتی کیا ہو گی۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں لیکن مصلحت اس کی اجازت نہیں دیتی۔''

''کیوں...... ایسا کیا ہے؟''

''آپ کے بہت سے سردار مجھ سے پُرخاش رکھتے ہیں۔ مجھے آپ کے ساتھ دیکھ کر طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔ اس کام کے لیے دھنا جادو بہت مناسب رہے گا۔ وہ آپ کا وفادار بھی ہے۔''

''ہنونت رائے!'' تارا بائی کی آواز جذبات سے مغلوب ہو رہی تھی۔ ''میں تم سے پریم کرنے لگی ہوں۔ تمہیں دیکھے بنا ایک دن بھی نہیں رہ سکتی۔ تم کرپا کرتے ہو کہ دوسرے تیسرے دن آ جاتے ہو۔ تم ساتھ نہ گئے تو نہ جانے کب دیکھنے کو ملو۔''

''میں آپ کے لائق تو نہیں لیکن پریم کا تیر میرے سینے میں بھی پیوست ہے۔ مجھے اظہار کی جرأت نہیں ہوتی تھی اور آپ نے کہہ دیا۔''

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں؟''

''اس کے لیے ہمیں کسی مضبوط سہارے کی ضرورت ہو گی اور وہ ہے شہزادہ اعظم شاہ۔ آپ مجھے موقع دیں کہ میں اسے شیشے میں اتار سکوں۔ آپ سے شادی کرنے کی صورت میں پوری مرہٹہ برادری ہمارے خلاف ہو جائے گی۔ ایسے میں شہزادہ اعظم شاہ ہمیں پناہ دے سکے گا۔''

''میں راج پاٹ سب چھوڑنے کو تیار ہوں۔''

''آپ اپنے مقبوضہ قلعوں کے دورے پر نکل جائیں اور میں اجین جا کر اعظم شاہ کے چرنوں میں بیٹھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جیسے ہی بات بنتی ہے، میں آپ کو لے کر یہاں سے نکل جاؤں گا۔''

اسے واقعی یہاں سے نکلنا تھا لیکن تارا بائی کے ساتھ نہیں، چندا بائی کے ہمراہ۔

رانی تارا بائی قلعہ پرنالہ کی طرف نکل گئی۔ اس کے ساتھ مرہٹوں کا ایک بڑا لشکر اس کی حفاظت کے لیے تھا۔

ہنونت رائے دو تین دن کا وقفہ دے کر تو تعمیر قلعے میں تھا جہاں تارا بائی نہیں بلکہ چندا بائی اس کے استقبال کے لیے موجود تھی۔

''واہ جی! تم تو بڑے چلتر نکلے۔ تارا بائی کو کس ترکیب سے یہاں سے چلتا کیا ہے۔''

''میری جوانی اس کے لائق نہیں تھی۔'' ہنونت رائے نے آنکھ دبا کر کہا۔

''اور نہیں تو کیا۔ میں نے غلط تھوڑی کہا تھا۔'' چندا بائی نے بھی اٹھلاتے ہوئے جواب دیا۔

''اب کم از کم مہینے بھر تک ہمیں کوئی ملنے سے نہیں روک سکتا۔''

''اس کے بعد کیا ہوگا؟'' چندا بائی نے اس کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''میں اس کا بھی انتظام کر رہا ہوں۔ تارا بائی کے آنے سے پہلے میں تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ باہر پہرا موجود ہے۔ تارا بائی یقیناً پہرے داروں سے کہہ کر گئی ہوگی کہ مجھ پر نظر رکھیں۔''

''یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔''

''اگر ہم یہاں سے نکل بھی گئے تو ہم ہفتوں چلتے رہیں گے مگر مرہٹوں کے علاقے سے نہیں نکل سکیں گے۔ پکڑے گئے تو مجھے اپنا نہیں تمہارا دکھ ہوگا۔ یہاں سے نکلے تو مغلوں کا ڈر...... آخر ہم جائیں گے کہاں؟''

''اورنگ زیب کا بیٹا شہزادہ اعظم شاہ اجین کا صوبہ دار ہے۔ بادشاہ سے اس کی ناراضی ہے۔ وہ یقیناً مرہٹوں سے دوستی کا خواہاں ہوگا۔ میں اس کے قریب جانے کی کوشش کروں گا۔ وہ ہمیں پناہ دے گا۔''

''اس کے صلے میں وہ کیا کچھ طلب کرے گا، جانتے ہو؟''

''تمہاری خاطر اگر چند قلعوں پر اس کا قبضہ کرا دیا جائے تو سودا برا نہیں۔''

''پھر جلدی کرو۔ ایسا نہ ہو وقت ہاتھ سے نکل جائے۔''

اس نے وہ رات وہیں گزاری اور صبح ہوتے ہی اجین کا کہہ کر قلعے سے نکل گیا۔

☆☆☆

بادشاہ نے صحت یاب ہوتے ہی قلعہ پرنالہ کی مہم پر جانے کا ارادہ کیا۔ اس کی صحت اب بھی ٹھیک نہیں تھی۔ وہ لنگڑا کر چل رہا تھا۔ اس کے مشیروں نے اسے ابھی مزید انتظار کرنے کو کہا لیکن اس نے کسی کی نہیں سنی۔

ایک مرتبہ پھر زمین دہلنے لگی۔ شاہی لشکر رواں دواں تھا۔ راستے میں کئی جگہ مرہٹوں نے چھاپے مارے لیکن شاہی فوج نے انہیں مار بھگایا۔

اس قافلے نے ایک مقام مرتضیٰ آباد پہنچ کر قیام کیا۔

صوبہ داروں کی جانب سے کمک ابھی تک نہیں پہنچی تھی پھر رفتہ رفتہ یہ کمک پہنچنے لگی مگر احمد آباد کے صوبہ دار شجاعت خاں کی طرف سے معذرت کا خط آ گیا۔ اس نے صاف لکھ دیا تھا کہ احمد آباد کے لوگ دور دراز کی مہم پر جانے سے معذور ہیں۔

شجاعت خاں کو یہ گھمنڈ تھا کہ وہ اپنی خدمات کی بدولت بادشاہ کی نظر میں قدر و منزلت اختیار کر چکا ہے اس لیے بادشاہ اس کا عذر قبول کر لے گا اور شاید ایسا ہو بھی جاتا لیکن اتفاق سے اسی روز صوبہ احمد آباد کے تعلقے گودرہ کے فوج دار کا خط پہنچ گیا۔

''اس وقت جبکہ بادشاہ اسلام جہاد پر کمربستہ ہیں اور کفار کے قلعوں کی تسخیر کا ارادہ کر چکے ہیں، اس خانہ زاد کے لیے چین سے بیٹھنا دشوار ہے۔ میں آپ کے حکم کے بغیر تو کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر آپ حکم فرمائیں اور مجھے اس لائق سمجھیں تو جتنی بھی جمعیت اکٹھی ہو سکے، لے کر حاضر ہو جاؤں۔ اس طرح جہاد کا ثواب بھی مل جائے گا اور حضور کی قدم بوسی کا اعزاز بھی۔''

بادشاہ نے دونوں عریضوں کو پڑھا۔ اسے شجاعت خاں پر بڑا غصہ آیا۔ جب مراد خاں آ سکتا ہے تو شجاعت خاں کیوں نہیں؟ اس نے شجاعت خاں کے نام عتاب نامہ روانہ کر دیا۔

''افسوس صد افسوس کہ ہم نے تم پر بے پایاں عنایات کیں اور تمہیں ادنیٰ مراتب سے اعلیٰ مراتب پر پہنچایا۔ اس کے باوجود تمہارا رویہ یہ ہے کہ اس وقت جبکہ مابدولت جہاد اور کافروں کی سرکوبی کے لیے تیار ہو گئے ہیں، تم ایک ہزار سواروں کو بھی سرکاری خرچ پر روانہ کرنے میں لایعنی عذر اور لیت و لعل کر رہے ہو۔ تم غضب سلطانی سے

...لوف معلوم ہوتے ہو۔ اس رویے کو بہ جز بے ...ائی آخر کس بات پر محمول کیا جائے۔ جو لوگ اس بارگاہ ...بیت یافتہ اور خانہ زاد ہیں اور اس آستانے سے ...عد رکھتے ہیں (مراد خاں) وہ ازخود اس بارگاہ پر ...اری دینے کے لیے التماس کر رہے ہیں۔ تمہیں بھی ...لہ ایک فوج حضور معلیٰ میں روانہ کرو۔"

ایک دوسرا خط مراد خاں کے نام تحریر ہوا۔

"تم ایک ہزار سواروں کو اس وعدے پر کہ ان کو اسی ...بے میں منصب اور جاگیر عطا ہوگی، تیار کر لو اور چھ ماہ کی ...واہ پیشگی دے کر اپنے ہمراہ لے آؤ۔"

محمد مراد خاں نے خط موصول ہوتے ہی گرز بردار کو انعام دے کر رخصت کیا اور فوج ترتیب دینی شروع کر دی۔ جب شجاعت خاں کو اس کا علم ہوا تو اس نے ان جمعداروں کو جو بھرتی کر رہے تھے، دھمکی آمیز پیغام دے کر بھرتی سے روک دیا لہٰذا مراد خاں بہ مشکل پانچ سو سوار بھرتی کر سکا۔

جب یہ افراد مرتضیٰ آباد پہنچ گئے تو بادشاہ نے شہزادہ بیدار بخت اور دوسرے امیروں کو قلعے کا محاصرہ کرنے کے لیے آگے بڑھایا۔

انہی دنوں یہ خبر آئی کہ رام راجا کی بیوہ تارابائی قلعہ پرنالہ میں موجود ہے۔ اس پر جوش مزید بڑھ گیا۔ ہر امیر چاہتا تھا کہ اس کی بہادری کی شہرت بادشاہ کے کانوں تک پہنچے۔

بادشاہی فوج نے محاصرہ کرنے کے بعد مورچابندی اور گولہ باری کے انتظامات کر لیے۔ گولہ باری سے قلعے کے بعض حصے منہدم ضرور ہو گئے مگر کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔

قلعے والے کچھ دنوں تو برداشت کرتے رہے پھر انہوں نے بھی گولے برسانے شروع کر دیے۔ بادشاہی لشکر ان گولوں کی آڑ میں مورچے آگے بڑھاتا رہا۔

ایک روز کہ ابھی سورج نکلنے کو تھا، مرہٹوں نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا۔ وہ پہاڑی سے اترے اور لشکر کے ...کنارے پہنچ کر مویشیوں کو جو وہاں چر رہے تھے، چرا لیا ...ان کو پہاڑی پر لے جانے لگے۔ بس یہی قدم ان کے ...مصیبت بن گیا۔ محمد مراد خاں کا بیٹا اور بھانجا جو اس ...جاگ رہے تھے، اٹھے اور ایک جماعت ساتھ لے کر ...پلے کو پہنچ گئے۔ مرہٹے یہ دیکھ کر گھبرا گئے اور بھاگ ...نے ہوئے۔ شاہی بہادروں نے ان کا تعاقب شروع ... قلعے والوں نے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی اور بڑے ...پتھر پھینکنے لگے لیکن بہادروں نے ان کا تعاقب نہیں چھوڑا۔ اس راہ میں کئی لوگ شہید بھی ہو گئے لیکن تعاقب جاری رہا اور وہ یورش کرتے ہوئے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے اور وہاں بادشاہی لشکر کے جھنڈے گاڑ دیے۔

یہ منظر ایسا تھا کہ کوئی شخص بھی آفرین کے نعرے بلند کرنے سے باز نہ رہ سکا۔

بادشاہ نے فتح کے نشانوں کا پہاڑی پر خود مشاہدہ کیا۔

اسی اثنا میں محمد مراد خاں کا پیغام پہنچا کہ مزید کمک اور مورچابندی کا سامان پہنچایا جائے۔ اس پیغام پر بادشاہ نے اپنے دو امیروں روح اللہ خاں اور حمید الدین خاں کو کمک پر جانے کا حکم دیا۔

محمد مراد خاں کی اس کامیابی پر امرائے شاہی حسد سے جلنے لگے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کامیابی کا سہرا مراد خاں کے سر بندھے اور وہ بادشاہ کی نظروں میں سرخرو ہو۔ ان میں روح اللہ خاں اور حمید الدین خاں بھی شامل تھے۔ یہ دونوں بادشاہ کے حکم کے مطابق پہاڑی کے دامن میں پہنچ ضرور گئے مگر انہوں نے وہاں ٹھہر کر مراد خاں کے نام پیغام بھیجا۔

"تم نے بے جا اقدام کیا اور جلد بازی سے کام لیا ہے۔ اب تم ہمیں اپنی مدد کے لیے بلا رہے ہو۔ اب ہم کسی بھی مدد سے قاصر ہیں۔ اگر تم اور تمہارے ہمراہی ازخود مورچے قائم کر سکتے ہیں تو مبارک ورنہ مورچے قائم نہ ہونے کا عذر کر کے نیچے اتر آؤ۔ سب کو مصیبت میں نہ ڈالو۔"

مراد خاں کسی صورت نیچے اترنے کو تیار نہیں تھا۔ پیغام آتے رہے، پیغام جاتے رہے۔ روح اللہ خاں نے اس کی طرف سے مایوس ہو کر بادشاہ کی خدمت میں لکھا۔

"اگرچہ مراد خاں نے حقِ نمک ادا کیا ہے۔ اس کی بہادری کو سلام لیکن اس جگہ مورچابندی ممکن نہیں۔ رات کے وقت وہاں ٹھہرنا ممکن نہیں رہے گا۔ اگر وہاں کیمپ لگا تو بڑے نقصان کا اندیشہ ہے۔ ان سب مشکلات کے باوجود مراد خاں نیچے اترنے کو تیار نہیں۔ اس سے کہیں نیچے اتر آئے اور شاہی لشکر کو بدنامی و رسوائی سے بچالے۔ اس کی ضد سب کو لے ڈوبے گی۔ فتح کے لیے مناسب وقت کا انتظار کیا جائے۔"

بادشاہ اس خط کی عبارت سے متاثر ہو گیا اور محمد مراد خاں کے نام اپنے ہاتھ سے خط لکھ کر بھجوایا۔

"ایسی بے جا جرأت جس سے ندامت اٹھانی پڑے، آخر کیوں کی جائے۔ جلد پہاڑ سے اتر آؤ۔"

مراد خاں کی جاں نثاری بادشاہ کی نظروں میں قابلِ اعتراض

ہو گئی اور اسے پہاڑ سے نیچے اترنا پڑا۔

جلد ہی بادشاہ کو صحیح صورتِ حال کا علم ہو گیا تھا لیکن اس نے صرف اتنا کیا کہ مراد خاں کو تسلی دلاسا دے کر اس کے مراتب میں اضافہ کر دیا۔

اس عارضی فتح پر قلعے کے مکینوں کو تشویش تھی۔ وہ یہ سوچنے لگے تھے کہ کسی دن قلعہ فتح ہو جائے گا۔ تارا بائی قلعے میں موجود تھی۔ اس کی موجودگی مرہٹوں کی ڈھارس بندھائے ہوئی تھی لیکن یہ خدشہ بھی تھا کہ تارا بائی کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ بعض کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ کبھی مصالحت پر تیار نہیں ہو گی۔ مسلسل محاصرے نے مرہٹوں کو عاجز کر دیا تھا اور اب وہ صلح کی راہیں ڈھونڈ رہے تھے۔ تارا بائی کا حال یہ تھا کہ وہ برجوں اور فصیلوں کا جائزہ لیتی پھرتی تھی۔ اس کی وجہ سے سپاہیوں کو بھی جاگنا اور چوکنا رہنا پڑتا تھا۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اس صورتِ حال سے خود بھی تنگ آ چکی ہے لیکن اپنی کمزوری ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ بالآخر ایک روز اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ اس نے قلعے میں موجود تمام اہم لوگوں کو طلب کیا اور انہیں خطرے سے آگاہ کیا۔

''محاصرے کو ڈھائی ماہ گزر چکے ہیں۔ شاہی لشکر کھلے میدان میں ہیں اور ہم پہاڑ پر محصور ہیں۔ اب تک ہمارے پاس رسد پہنچ رہی تھی۔ لشکر کے چھاپا ماروں نے رسد کے راستے بھی مسدود کر دیے ہیں۔ اب ہمارے سامنے صرف ایک راستہ ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم بھوک سے مرنے لگیں، باہر نکلیں اور پہاڑ سے نیچے اتر کر شاہی افواج سے مقابلہ کریں۔ مجھے تم لوگ خود سے الگ نہیں پاؤ گے۔ میں سب سے آگے رہوں گی۔''

ہر طرف سے اس کی بہادری پر تعریفوں کے ڈونگرے برسنے لگے لیکن قلعہ دار نے ہاتھ جوڑ لیے۔

''رانی جی! اگر آپ کی یہی صلاح ہے تو ہم سب کٹ مرنے کو تیار ہیں لیکن آپ کی زندگی ہمیں عزیز ہے۔ آپ مرہٹوں کا مان ہیں۔ ہم قلعے سے باہر نکلیں گے ضرور لیکن آپ ہمارے ساتھ نہیں ہوں گی۔''

''تمہاری رانی تمہیں اکیلے نہیں چھوڑے گی۔''

''آپ کے آنجہانی پتی رام راجا نے کئی مرتبہ یہ طریقہ اپنایا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے میں قلعے میں تنہا بیٹھی رہوں اور غنیم قلعے پر قبضہ کر لے۔''

''آپ قلعے میں نہیں ہوں گی۔''

''یہ بھی تم نے خوب کہی۔ یہ کیونکر ہو گا؟''

''آپ کو قلعہ پون گڑھ میں منتقل کر دیا جائے گا۔ اگر قلعہ پرنالہ پر قبضہ ہو گیا تو شاہی فوجیں اس میں مگن ہوں گی، قلعہ پون گڑھ کی طرف ان کا دھیان بھی نہیں جائے گا۔''

قلعہ پرنالہ اور قلعہ پون گڑھ دونوں ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان محض ایک پہاڑ تھی۔ اس پہاڑی کے حصے کے حقیقی حال معلوم نہیں ہو تھا۔ شاہی فوج اس سے بالکل بے خبر تھی۔ شاہی فوج کی ساری توجہ قلعہ پرنالہ کی جانب تھی۔

قلعہ پرنالہ کے محاصرے کو دو ماہ سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔ اب آر یا پار کی گھڑی تھی۔ شاہی لشکر نے ایک زبردست حملہ کیا۔ زینے لگا کر لوگ قلعے پر چڑھ گئے لیکن، اتنا آسان نہیں تھا۔ اس راہ میں بہ کثرت لوگ شہید ہو گئے اس کے باوجود کامیابی نہ ہو سکی۔ کامیابی ہوئی تو صرف اتنی کہ محصورین پر خوف طاری ہو گیا۔ یہی وقت تھا جب تارا بائی کو قلعہ پون گڑھ میں منتقل کرنے کا بندوبست کیا گیا۔ اسے ایک سفید گھوڑے پر بٹھایا گیا اور سفید جھنڈا اس کے ہاتھ میں دے دیا گیا تاکہ اگر کسی کی نظر پڑ بھی جائے کوئی یہ سمجھے کہ امان طلب کرنے کے لیے کوئی قلعے سے باہر آیا ہے۔

تارا بائی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر قلعے کی عقبی دیوار تک گئی۔ اس کے بعد اسے سیڑھی کے ذریعے دیوار پر چڑھنا تھا۔ اس سے پہلے دو مرہٹہ جانباز دیوار کے اوپر پہنچ گئے۔ تارا بائی کے اوپر پہنچتے ہی ان دونوں جانبازوں نے سیڑھی اوپر کھینچ لی۔ اسی سیڑھی کے ذریعے تارا بائی دوسری طرف اتر گئی۔ دونوں مرہٹہ جانباز بھی اس کے ساتھ نیچے اترے۔ اب تارا بائی قلعے کے باہر تھی لیکن پہاڑ سے نیچے نہیں اتر سکتی تھی کیونکہ اس جگہ سے پہاڑی کٹی ہوئی تھی اور ایک گہری کھائی کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ وہ تینوں دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ ایک جگہ پہنچ کر پہاڑی کا کٹاؤ ختم ہو گیا اور ڈھلان آ گئی۔ یہاں سے نیچے اترا جا سکتا تھا۔ اس میدان کے دوسرے کنارے پر پہاڑی تھی، اس پہاڑی کے اوپر قلعہ پون واقع تھا۔

''رانی جی! آپ یہاں ٹھہریں۔ ہم میں سے ایک جائے گا اور قلعے سے آپ کے لیے تازہ دم گھوڑا لے آئے جو آپ کو اوپر تک پہنچنے میں مدد دے گا۔''

اس مرہٹے کو ایک ایسے راستے کا علم تھا جس کے ذریعے پہاڑی پر آسانی سے چڑھا جا سکتا تھا۔ اس کے

پہاڑی پر چڑھنے اور واپس آنے میں آدھا گھنٹا
بھی زیادہ وقت لگ گیا۔ وہ واپس آیا تو اس کے
فاصل گھوڑا تھا۔

''ہم قلعے سے باہر نکل آئے ہیں۔ ہمارے پاس
بھی ہیں تو کیوں نا ہم پون گڑھ کے بجائے اپنے قلعے
چلیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے، وہ قلعہ یہاں سے
نہیں۔'' تارابائی نے ان مرہٹوں سے کہا۔

''رانی جی! ہم قلعے کی پشت پر ہیں۔ یہاں سے کچھ
فاصلے پر دشمن کی فوج ہے۔ سامنے کی پہاڑیوں کی وجہ
ہم انہیں نظر نہیں آ رہے ہیں لیکن جونہی ہم آگے بڑھیں
تو ان کی گولیوں کی زد پر ہوں گے۔''

''پھر تو ہم پون گڑھ سے کبھی نہیں نکل سکیں گے۔''

''پون گڑھ سے نکلنے کی ایک ہی صورت ہوسکے گی۔
دشمن محاصرہ اٹھا کر چلا جائے یا قلعہ پرنالہ کی فتح کی
میں اس طرف سے غافل ہوجائے۔''

تارابائی کے سامنے اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں
منصوبے کے مطابق قلعہ پون گڑھ میں پناہ لے۔

ایک گھوڑے پر وہ دونوں مرہٹے سوار ہوئے،
گھوڑے پر تارابائی اور پہاڑی عبور کر کے قلعہ پون
پہنچ گئے۔

تارابائی کہہ کر گئی تھی کہ مقابلہ کرتے رہنا۔ میں قلعہ
پون گڑھ پہنچتے ہی دھنا جادو سے رابطہ کروں گی۔ کمک پہنچتے
ہمارا دفاع مضبوط ہوجائے گا۔

تارابائی کے جاتے ہی قلعہ دار نے اس کی نصیحت
بھلا دی اور نامہ و پیام کا سلسلہ شروع کردیا۔ اس مراسلت کا
نکلا کہ قلعہ دار نے شہزادہ محمد کام بخش سے خفیہ طور پر
رقم وصول کر کے امان کا قول نامہ طلب کرلیا اور جواب
دونوں قلعوں کی چابیاں بھجوادیں اور قلعوں کو خالی کرنے
لیے مہلت طلب کرلی۔

دونوں مستحکم قلعے بادشاہ کے ہاتھ آگئے۔

تارابائی کو اس ہزیمت کا علم ہوا تو نہایت سیخ پا ہوئی
اس کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ
قلعے میں جا کر پناہ گزین ہوجائے۔

اس نے ایک آدمی دھنا جادو کی طرف دوڑایا اور خود
کی طرف لوٹ گئی۔

☆☆☆

یاقوت محرم خاں، شہزادہ کام بخش کا اتالیق رہ
دونوں کے درمیان کشیدگی اور رنجش رہتی تھی۔

ایک واقعے نے اس رنجش کو طول دے دیا۔ شہزادہ، بادشاہ سے ملاقات کر کے واپس ہو رہا تھا۔ محرم خاں اس کے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا کہ اچانک ایک تیر کسی طرف سے آیا اور محرم خاں کے پیٹ میں پیوست ہو گیا۔ اتفاق یہ ہوا کہ محرم خاں کا ہاتھ اس کے پیٹ پر تھا جس کی وجہ سے تیر خطرناک ثابت نہ ہو سکا۔ صرف اتنا ہوا کہ ہاتھ زخمی ہوا اور تیر کی نوک سے پیٹ بھی زخمی ہو گیا۔ پورا تیر پیٹ میں پیوست نہیں ہوا۔ محرم خاں اسی زخمی حالت میں بادشاہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے چبھا ہوا تیر بادشاہ کو دکھایا۔

''محرم خاں! تمہاری یہ حالت کس نے بنائی؟''

''شہزادے کے ہمراہیوں میں سے کسی ایک نے۔''

''محرم خاں، تم جانتے ہو کیا کہہ رہے ہو۔''

''حضور! شہزادہ کام بخش اور میں ایک ساتھ باہر نکلے تھے۔ شہزادے کے ہمراہی ان کے ساتھ تھے اور پھر یہ تیر چل گیا۔''

''یہ کیسے مان لیا جائے کہ یہ حرکت شہزادے کے ساتھیوں کی ہے اور شہزادہ یہ کیوں چاہے گا؟''

''شہزادہ حضور مجھ سے پرخاش رکھتے ہیں اور میری ہتک کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا اوباشوں میں ہے۔ ان کے دوستوں سے یہی توقع ہو سکتی ہے۔''

بادشاہ کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ پھر محرم خاں کو شاہی طبیب کے حوالے کر کے اس معاملے کی تحقیق کے لیے آدمی مقرر کر دیے۔

تفتیش کے بعد معلوم ہوا کہ شہزادے کے ساتھ پانچ لوگ تھے۔ ان میں ایک شہزادے کا دودھ شریک ''ہدو'' بھی تھا۔ ان پانچوں کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ جب انہیں پوچھ گچھ کے لیے بلایا گیا تو وہ چار تو بہ آسانی حاضر ہو گئے لیکن ہدو نامی شہزادے کا دودھ شریک بھائی گستاخی اور بدتمیزی پر اتر آیا۔ شہزادہ بھی بڑھ چڑھ کر اس کی پشت پناہی کرنے لگا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہی قصوروار ہے۔

یہ تمام باتیں بادشاہ تک پہنچ رہی تھیں، بالآخر بادشاہ نے حکم دیا کہ ''ہدو'' کو گرفتار کر کے ہمارے حضور پیش کیا جائے۔

بادشاہ کے اس حکم کی تعمیل نہ ہو سکی کیونکہ ''ہدو'' بھاگ کر شہزادے کی پناہ میں چلا گیا۔ شہزادے نے بھی اسے خود سے جدا کرنا مناسب نہ جانا اور لیت و لعل سے کام لینے لگا۔ بادشاہ نے شہزادے کے نام حکم روانہ کیا کہ ''ہدو'' کو فوراً خود سے جدا کر کے کوتوال کے حوالے کر دو اور اسے اپنے لشکر سے خارج کر کے اس کا گھر بار ضبط کر لو۔

شہزادہ نہ تو بادشاہ کا حکم ٹال سکتا تھا اور نہ ہدو کو حوالے کرنے کو تیار تھا۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ اسے یہاں سے فرار کرا دے۔ اس نے خفیہ طور پر یہ منصوبہ بنایا کہ ضروری ساز و سامان دے کر اسے اپنی کسی جاگیر پر بھیج دیا جائے۔

محرم خاں کے کانوں میں اس کی بھنک پڑ گئی اور اس نے یہ بات بادشاہ تک پہنچا دی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ باہر نکلتے ہی اسے گرفتار کر لو اور شہزادہ ہر روز کی طرح مجرا تسلیمات کے لیے حاضر ہو جائے۔ کام بخش نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیغام بھجوا دیا۔ ''میں اپنے بھائی ''ہدو'' کو خود سے ہرگز جدا نہیں کروں گا۔'' یہ ایسا گستاخانہ جملہ تھا کہ اگر معاملہ شہزادے کا نہ ہوتا تو وہ ملزم کے قتل کے احکام بھیجتا۔ معاملہ شہزادے کا تھا اس کے باوجود بادشاہ نے حکم دیا کہ کوئی بھی صورت ہو، ہدو کو شہزادے سے جدا کر کے کوتوال کے حوالے کر دو۔ بادشاہ نے ایک امیر حمید الدین خاں کو شہزادے کے پاس بھیجا۔ حمید الدین خاں نے وہاں پہنچ کر حکم کی تعمیل کرنی چاہی تو شہزادے نے اپنی کمر سے کٹار نکالی اور حمید الدین خاں پر حملہ کرنا چاہا۔ حمید الدین خاں نے کمال ہوشیاری سے یہ وار بچا لیا اور اپنے آدمیوں کو آواز دی جو باہر کھڑے تھے۔ ان کے آتے ہی شہزادے پر قابو پا لیا گیا اور ''ہدو'' کو اس سے جدا کر کے قید خانے میں بھجوا دیا گیا۔

بادشاہ نے دوسرا حکم جاری کیا کہ شہزادے کو ایک خیمے میں قید کر دیا جائے اور اسے اس کے منصب سے بھی معزول کر دیا گیا۔

☆☆☆

قلعہ پرنالہ فتح ہو چکا تھا۔ مرہٹہ سرداروں کی بیخ کنی کے لیے ابھی مزید فتوحات کی ضرورت تھی۔ قریب تر قلعہ ''قلعہ کھیلنا'' کے نام سے مشہور تھا۔ یہ قلعہ قریب ضرور تھا لیکن دشوار گزار راستے کے سبب وہاں تک پہنچنا امر محال تھا جبکہ اب شہزادہ کام بخش بھی متحرک نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کمزوری کے باوجود بادشاہ بضد تھا کہ قلعہ کھیلنا کو فتح کیا جائے۔ اس نے قابلِ اعتبار امراء کا اجلاس طلب کیا۔ ان امراء میں فتح اللہ خاں سب سے نمایاں تھا۔ بادشاہ نے یہ مہم اسی کے حوالے کی۔

اس سفر پر روانگی کے وقت کسی کو گمان تک نہیں تھا کہ کیسی جان لیوا دشواریاں پیش آ سکتی ہیں۔ اونچے نیچے

لیے عذاب بنے ہوئے تھے۔ ہر طرف اور جھاڑیوں کی موجودگی نے چلنا دوبھر کر ان سپاہیوں کے بدن پر بڑے بڑے آبلے تھے جن میں ناقابلِ برداشت سوزش اور جلن چلنا تو قطعی ناممکن تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو دن کا دن میں طے ہوا اور یہ قافلہ ایک گھاٹی پر پہنچا۔ اسی شہزادہ بیدار بخت بھی اپنے لشکر کے ساتھ آ گیا۔ بیدار بخت باغیوں کی سرکوبی کے لیے گیا ہوا تھا۔ اور مشکلیں انتظار کررہی تھیں۔ ایک روز آسمان ایسے گہرے بادل اٹھے کہ دن میں رات ہوگئی اور پھر شدید بارش ہوئی۔ پانی اتنا جمع ہوگیا کہ ایک خیمے سے دوسرے خیمے تک جانا دشوار تھا۔

کیچڑ خشک ہونے تک کوچ کرنا محال تھا۔ یہ لشکر ایک ماہ تک یہیں پڑا رہا۔

لشکر نے علم بلند کیا اور کوچ کرتا ہوا ایک سرسبز و شاداب علاقے میں پہنچا۔ یہاں درخت بہ کثرت تھے جو پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ کھیلنا پہاڑ اس مقام سے تین کوس کے فاصلے پر تھا۔ فتح اللہ خاں کو حکم ہوا کہ اس مقام سے کھیلنا پہاڑ کے دامن تک کا راستہ ہموار کرادے۔

فتح اللہ خاں راستہ ہموار کرنے نکلا اور ایک ماہ کا کام دنوں میں مکمل کردیا۔ راستہ ایسا ہموار ہوگیا کہ سو سوار ساتھ گزر سکتے تھے۔

سخت محنت کے بعد قلعہ کھیلنا بھی فتح ہوگیا۔

قلعہ کھیلنا کی فتح اس حال میں ہوئی تھی کہ سخت بارش ہو رہی تھی۔ ندی نالے خوب چڑھے ہوئے تھے۔ بادشاہ نے تجویز دی تھی کہ برسات کا موسم یہیں گزارا جائے اور بارش کے بعد یہاں سے رخصت ہوا جائے مگر بادشاہی امرا مزید قیام پر راضی نہیں تھے۔ بالآخر امراء کے اصرار پر بادشاہ نے بھی کوچ کے لیے قدم اٹھا دیا۔ یہاں ہی اندازہ ہوگیا کہ غلطی ہوئی ہے۔ ندی نالے تھے۔ پہاڑوں سے پانی اس شدت سے بہہ رہا تھا کہ گھوڑے ڈوب ڈوب جاتے تھے۔ اس پر راستے دلدل بن گئے تھے۔ دس دن میں تین کوس کا فاصلہ طے ہوا اور وہ بھی اس حال میں کہ اسی کیچڑ میں لوٹ کر رات بسر ہوجاتی۔

یہاں تک بھی غنیمت تھا۔ اب ایک ایسا نالا سامنے تھا جو ذریعے بھی بہ مشکل عبور کیا جاسکتا تھا۔ جتنے ہاتھی تھے بادشاہ اور امراء کی باربرداری میں لگا دیے گئے تھے۔ لشکر کے عام آدمیوں کے لیے کوئی ذریعہ نہیں تھا، بادشاہ نے حکم دیا کہ امراء کے ہاتھی نالے پر مقرر کردیے جائیں۔

یہ لوگ اللہ اللہ کرکے پار اتر تو گئے لیکن دوسرے کنارے پر چپّا بھر زمین بھی ایسی نہیں تھی جہاں خیمے لگائے جاسکیں۔ کھلے آسمان تلے پڑے رہے۔ جو نالا عبور نہ کرسکے تھے، ان کا بھی یہی حال تھا جنہوں نے نالا عبور کرلیا تھا، وہ بھی مشکل میں تھے۔ سورج کا نام ونشان نہیں تھا جو کیچڑ خشک ہوتی۔

کافی دنوں بعد سورج نے صورت دکھائی۔ خوشی ایسی تھی کہ پورا لشکر چیخ اٹھا۔ اتنا غل مچا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

جب سورج نکلے کئی دن ہوگئے تو بادشاہ نے کوچ کا ارادہ کیا۔ لشکر نے چودہ کوس کا فاصلہ طے کیا اور قلعہ پرنالہ پہنچ کر چھاؤنی ڈال دی۔ اب لشکر کو آگے بڑھنا تھا لیکن خبروں نے دل دہلا دیا۔ اطلاع ملی کہ دریائے کرشنا میں زبردست طغیانی آئی ہوئی ہے پھر بھی امید پر سفر طے کرتے ہوئے دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر ایک نئی آفت سامنے تھی۔ یہاں گنتی کی چند ٹوٹی پھوٹی کشتیاں کھڑی تھیں۔ انہیں کشتیوں کا نام دینا بھی زیبا نہیں تھا۔ چند تختے تھے جنہیں جوڑ دیا گیا تھا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، یہ تو پھر کشتیاں تھیں۔ ان تختوں پر لوگ ٹوٹ پڑے۔ ہر شخص سوار ہونے کے لیے سبقت لے جانے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کوشش میں بے شمار لوگ غرق ہوگئے۔ کئی کشتیاں ڈوب گئیں۔ کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ رک کر کسی کو ڈوبنے سے بچاتا۔

اٹھارہ دن میں دریا عبور کیا اور لشکر بہادر گڑھ پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر قیام کرنا ضروری تھا تاکہ لشکر آرام کرکے آسودہ ہوجائے اور ضروری ساز وسامان تیار کرلیا جائے۔ لشکر کے لوگ خوش تھے کہ اب مصیبتیں رفع ہوئیں لیکن بادشاہ کی طرف سے حکم جاری ہوگیا۔

بادشاہ نے قلعہ کندانہ کی تسخیر کے لیے کوچ کا حکم دے دیا۔ لشکری جس مصیبت سے گزر کر یہاں تک پہنچے تھے، اس کے بعد یہ حکم ان کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا لیکن بادشاہ کے حکم سے روگردانی بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ مرتے کیا نہ کرتے، کوچ کرنا پڑا اور قلعہ کندانہ پہنچ گئے اور قلعے کا محاصرہ کرلیا۔

یہ محاصرہ تین ماہ تک جاری رہا۔ بادشاہی لشکر کے امیروں اور افسروں نے آخر کار قلعہ دار کو کافی رقم دے کر قلعہ خرید لیا اور کندانہ بادشاہی قبضے میں آ گیا۔

☆☆☆

قلعہ پرنالہ کی تسخیر کے بعد تارا بائی اپنے نوتعمیر قلعے کی طرف روانہ ہوگئی تھی اور یہ دیکھ کر حیران بھی ہوئی تھی کہ پہاڑ کی چوٹی پر یہ قلعہ "تارا" بنا چمک رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں چاند بن کر چمکنے لگیں۔ اب صرف اسے یہ دیکھنا تھا کہ اس کے بنائے ہوئے منصوبے پر عمل ہوسکا یا نہیں۔

ایک چھوٹا سا لشکر اس کے ساتھ تھا جس کی راہنمائی دہنا جادو کر رہا تھا۔ اس نے لشکر وہیں چھوڑا اور دہنا جادو کے ہمراہ قلعے میں داخل ہوئی اور ایک یقین کے ساتھ قلعے کے اس حصے کی طرف گئی جو رام راجا کی دوسری بیوی چندا بائی کے استعمال میں تھا۔ وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اسے معلوم ہوگیا کہ چندا بائی اس قلعے کے لیے خواب بن گئی ہے۔ تصدیق ہوتے ہی وہ لوٹ آئی اور دہنا جادو کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔

"تیر بالکل صحیح نشانے پر لگا ہے۔ جو میں نے سوچا تھا وہی ہوا۔"

"کیا کہہ رہی ہو رانی جی۔"

"چندا بائی قلعہ چھوڑ کر چلی گئی ہے اور یہی میں چاہتی تھی۔"

"چندا بائی کہاں چلی گئی ہے اور آپ یہ کیوں چاہتی تھیں؟"

"وہ یقیناً ہنونت رائے کے ساتھ گئی ہے۔ اب رہا سوال یہ کہ میں کیوں چاہتی تھی کہ وہ چلی جائے، اس کا جواب مشکل نہیں۔ دہنا جادو! چندا بائی کوئی اور نہیں رام راجا کی دوسری بیوی تھی۔ کسی بھی وقت میرے مقابلے میں آسکتی تھی۔ میں نے اسے راستے سے ہٹا دیا۔"

"اب میں سمجھا۔"

"تم اب بھی کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ میں نے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں۔ چندا بائی سے میری جان بھی چھوٹ گئی اور مرہٹے اس کے دشمن بھی ہوجائیں گے۔ جہاں ملے گی ماری جائے گی۔"

"تم نے یہ معرکہ سر کیسے کیا؟"

"ہنونت رائے ایک ہوشیار سردار ہے۔ میں اسے مشوروں کے لیے طلب کیا کرتی تھی۔ میں دیکھ رہی تھی کہ وہ آتا میرے پاس ہے لیکن اس کی آنکھیں چندا بائی کو ڈھونڈتی رہتی ہیں۔ انہی دنوں اس نے مجھے قلعہ پرنالہ جانے کا مشورہ دیا۔ میں یہ مشورہ کبھی نہ مانتی لیکن میں سمجھ گئی کہ وہ قلعے کو خالی دیکھنا چاہتا ہے تاکہ چندا بائی سے آسانی سے مل سکے۔ جب ہنونت رائے نے میرے ساتھ جانے سے انکار کردیا تو مجھے پورا یقین ہوگیا کہ وہ چندا بائی سے ملنے آیا کرے گا۔ اسی لیے قلعہ خالی کرانا چاہتا ہے۔ میں قلعہ پرنالہ چلی گئی۔ اس کے بعد کیا ہوا، وہ تم دیکھ ہی رہے ہو۔ چندا بائی قلعے میں نہیں ہے۔ وہ اسے لے کر بھاگ گیا ہے۔ مجھے فکر ہے تو بس یہ کہ چندا بائی اتنی بھولی نہیں ہے۔ اس نے قلعے میں رکھا خزانہ خالی کردیا ہوگا۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ قلعے میں سے مال و دولت اپنے ساتھ لے کر نہیں گئی۔ اب دیکھتی ہوں کہ کیا لے کر گئی، کیا چھوڑ گئی۔ اس نے مرہٹوں کی عزت کو بٹا لگایا ہے۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو۔"

"سوال یہ ہے کہ ہنونت رائے کہاں گیا ہوگا؟"

"وہ شہزادہ اعظم شاہ کی باتیں کیا کرتا تھا۔ وہ یقیناً اسی کے پاس اجین گیا ہوگا۔ اس کی وہاں موجودگی مرہٹوں کے لیے نقصان دہ ہوگی۔ کسی طرح بھی ہو اسے تلاش کرو۔"

"رانی جی! آپ نے چندا بائی سے انتقام لینے کے لیے مرہٹوں کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔"

"میں اس خطرے سے نمٹنا جانتی ہوں۔"

"مرہٹے اس وقت منتشر ہیں۔ ہمارے بہت سے قلعے ہمارے ہاتھ سے چلے گئے ہیں۔ ایسے میں ہنونت رائے کا شاہی حلقے میں شامل ہوجانا فکرمندی کی بات ہے۔ وہ چندا بائی کو رام راجا کا جانشین بنانے کا اعلان کرسکتا ہے۔ بہت سے سردار اس کے ساتھ مل سکتے ہیں۔"

"تم کس دن کام آؤ گے۔ تمام سرداروں کو پیغام بھجوادو کہ چندا بائی باغی ہوگئی ہے۔ اس کا کھوج لگاؤ اور رانی بائی کے سامنے پیش کرو۔"

دہنا جادو یہ کہہ کر اٹھ گیا کہ وہ ویسا ہی کرے گا جیسا رانی بائی نے کہا ہے۔

☆☆☆

شجاعت خاں صوبہ دار احمد آباد کو بادشاہ نے معاف کردیا تھا لیکن اپنی بے عزتی کا شدید صدمہ تھا۔ یہ بات اس وقت کی ہے جب قلعہ پرنالہ کی فتح کے موقع پر بادشاہ نے تمام صوبہ داروں کو ایک ایک ہزار سوار کمک کے طور پر بھیجنے کا حکم جاری کیا تھا۔ شجاعت خاں نے معذرت کرلی تھی۔ بادشاہ نے اس کے نام عتاب آمیز خط تحریر کیا تھا۔ بعد میں غلط فہمی دور ہونے پر اسے معافی مل گئی تھی۔

اسی صدمے میں شجاعت خاں کا انتقال ہوگیا۔ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی کہ اسے شجاعت خاں کا جانشیں بنادیا جاتا۔ بادشاہ نے احمد آباد کا صوبہ شہزادہ اعظم شاہ کے سپرد کردیا۔

اعظم شاہ کا اتنی جلدی احمد آباد پہنچنا مشکل تھا۔ اس نے احمد آباد میں اپنا نائب مقرر کر دیا اور خود چلنے کی تیاری کرنے لگا۔

مرہٹہ جاسوس چندا بائی کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ انہوں نے یہ تمام صورتِ حال دہنا جادو تک پہنچا دی۔ دہنا جادو پندرہ سولہ ہزار مرہٹے لے کر احمد آباد سے سات آٹھ کوس کے فاصلے پر آ کر ٹھہر گیا۔ احمد آباد کا صوبہ اس وقت کسی صوبہ دار کے بغیر خالی پڑا تھا۔ اس وقت حملہ کرنا بہت آسان تھا۔

دہنا جادو نے اپنے طریقۂ جنگ کے مطابق دو تین ہزار اسپ سواروں کو آگے بڑھایا اور باقی فوج کو ان کی مدد کے لیے تیار رہنے کا حکم دے دیا۔

احمد آباد کی فوج نے آگے بڑھ کر ان کا مقابلہ کیا۔ اس وقت اعظم شاہ کا مقرر کردہ نائب احمد آباد میں موجود تھا۔ لشکر بھی کوئی بڑا نہیں تھا لیکن مقابلے پر آنے والے سواروں کو مار بھگایا۔

ان کے بھاگتے ہی فوج نے فتح کا نقارہ بجوا دیا اور واپس ہو گئے۔ لشکر گاہ پہنچتے ہی سب نے ہتھیار اتار دیے۔

باقی ماندہ مرہٹہ فوج جو ٹیلوں اور غاروں میں چھپی ہوئی تھی، شاہی فوج کو بے خبر دیکھتے ہی حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا اچانک تھا کہ شاہی لشکر میں بھگدڑ مچ گئی۔ لڑے بغیر ہی بھاگنا شروع کر دیا مگر بھاگتے تو کہاں؟ دریائے نربدا میں طغیانی آئی ہوئی تھی۔ کوئی گھاٹ بھی پایاب نہیں رہا تھا۔

آگے پانی تھا پیچھے مرہٹے۔

اسی وقت ہنونت رائے ایک چھوٹے سے لشکر کے ساتھ احمد آباد کی حدود میں داخل ہوا اور اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ احمد آباد پر حملہ ہوا ہے۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ وہ ٹیلوں اور غاروں میں چھپ کر موقع کا انتظار کرے۔

دراصل وہ ان دنوں اعظم شاہ کی پناہ میں تھا اور اعظم شاہ نے اسے بطور ہراول احمد آباد کی طرف بھیجا تھا اور خود پیچھے چلا آرہا تھا۔

دہنا جادو شاہی لشکر گاہ کے باہر پڑاؤ ڈالے بیٹھا تھا۔

ہنونت رائے نے صرف ایک دن انتظار کیا۔

دوسرے دن کا سورج طلوع ہونے سے قبل اس نے اپنی پگڑی اتار دی تاکہ دور سے یہ نہ پہچانا جائے کہ وہ کوئی مرہٹہ ہے اور گھوڑے پر سوار ہو کر لشکر گاہ کی طرف دوڑ پڑا۔ لشکر گاہ میں اس وقت بھی سخت افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ اس لیے کہ اس نے پگڑی اتار دی تھی لیکن لشکر گاہ میں پہنچتے ہی اسے بعض لوگوں نے پہچان لیا اور جاسوس سمجھ کر گرفتار کر لیا۔ اس نے درخواست کی کہ اسے نائب صوبہ دار خواجہ حمید الدین کے پاس لے جایا جائے۔ وہ اپنے آنے کا مقصد اسی کے سامنے بیان کرے گا۔ اسے غیر مسلح کر کے خواجہ حمید الدین کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

ہنونت رائے نے اقرار کیا کہ وہ مرہٹہ ہے۔ یہ بھی بتایا کہ ان دنوں وہ اعظم شاہ کی ملازمت میں ہے۔

”شہزادہ اعظم شاہ بھاری ساز و سامان کے ساتھ احمد آباد سے چل پڑا ہے لیکن اسے آنے میں کچھ دیر لگے گی۔ شہزادے نے پیغام بھجوایا ہے کہ اس کے آنے تک دہنا جادو کو مصالحت کی پیشکش میں الجھائے رکھو۔ اگر وہ فوری مصالحت کرتا ہے تو ٹھیک ورنہ وفود کے تبادلے کے ذریعے اتنا طول دے دو کہ میں وہاں پہنچ جاؤں۔ میرے ساتھ ایک چھوٹا سا لشکر بھی ہے جسے میں کسی وقت لشکر گاہ تک پہنچا دوں گا۔ اپنے ساتھ اس لیے نہیں لایا کہ غلط فہمی میں کوئی جنگ چھڑ سکتی تھی۔“

خواجہ حمید الدین نے اس کی باتیں غور سے سنیں۔ مزید سوالات بھی کیے اور مطمئن ہو کر ایک امیر سلطان حسین کو طلب کیا۔ اس وقت جنگ کرنے کی طاقت ہی کہاں تھی۔ سلطان حسین فوراً مصالحت کے لیے تیار ہو گیا۔

دہنا جادو اپنے پڑاؤ سے ایک سوار کو شاہی لشکر گاہ کی طرف جاتا ہوا دیکھ چکا تھا۔ وہ یہ سمجھا کہ شہزادہ اعظم شاہ اکیلا چلا آیا ہے اور اس کا لشکر بس آتا ہی ہوگا۔ اس میں یہ تاب نہیں تھی کہ شہزادے کا مقابلہ کرتا۔ ممکن تھا کہ وہ خود مصالحت کے لیے ہاتھ بڑھاتا کہ سلطان حسین خاں اس کے کیمپ میں پہنچ گئے اور مصالحت کی درخواست کی۔ وہ حیران تھا کہ شہزادے کے آجانے کے باوجود مصالحت کی باتیں کی جارہی ہیں۔ اس نے اسی میں عافیت سمجھی کہ صلح کر لی جائے۔ سلطان حسین نے شرط رکھی کہ وہ مذاکرات کے لیے لشکر میں آئے اور نائب صوبہ دار سے ملاقات کرے۔ اس نے اس وقت تو یہ بات مان لی لیکن دوسرے دن خطرے کا احساس کر کے اپنے وعدے سے مکر گیا۔ اب اس نے یہ شرط رکھی کہ شہزادے کی طرف سے تمام صاحبِ اختیار مرہٹہ سرداروں کے نام تسلی آمیز پیغام جاری کر کے انہیں شہزادے کے حضور طلب کیا جائے۔ ہمارا لشکر آپ کی چھاؤنی کے قریب رہے گا اور شہزادہ یا اس کا نمائندہ پانچ چھ کوس کے فاصلے پر ان سرداروں سے ملاقات کرے۔ جب گفتگو طے ہو جائے گی تو ہم شہزادے کے توسط سے بادشاہ

ئے منور سلام کے لیے حاضر ہو جائیں گے۔
سلطان حسین نے جان بوجھ کر یہ ظاہر نہیں کیا کہ شہزادہ ابھی احمد آباد پہنچا ہی نہیں ہے۔ یہ بہانہ کر کے لوٹ آئے کہ شہزادے سے مشورہ کر کے جواب دیں گے۔
مشورہ طول پکڑتا رہا اور دو دن گزر گئے۔ بس اتنا وقت بہت تھا۔ شہزادہ اعظم شاہ اجین سے احمد آباد پہنچ گیا۔
دھنا جادو یہ خبر ملتے ہی ہاتھ ملتا رہ گیا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے سنہری موقع ہاتھ سے نکال دیا۔ وہ یہ سمجھتا رہا کہ اعظم شاہ لشکر میں ہے اور وہ مصالحت کے لیے تیار ہو گیا۔
اب مصالحت کے سوا اس کے پاس کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔
شہزادے کے احمد آباد پہنچتے ہی اس کے سامنے دھنا جادو کی شرط رکھ دی گئی۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ وہ مخالفت کرے گا لیکن اس نے یہی بہتر سمجھا کہ اس وقت جنگ کو ٹال دیا جائے۔ اس نے یہ شرط مان لی لیکن سرداروں کے نام خط لکھنے کے لیے بادشاہ کی منظوری ضروری تھی۔ دھنا جادو سے کہہ دیا گیا کہ حتمی جواب بادشاہ کی منظوری کے بعد دیا جائے گا۔
بادشاہ نے بھی اس تجویز کو پسند کیا اور شہزادے کو سرداروں کے نام خطوط لکھنے کی منظوری دے دی لیکن ابھی یہ خطوط تحریر بھی نہیں ہوئے تھے کہ بادشاہ کا دوسرا حکم آ گیا۔
''مرہٹوں سے کچھ بعید نہیں کہ کسی سازش کے تحت پچاس ساٹھ ہزار سواروں کو چھاؤنی کے قریب لے آئیں اور مذاکرات کے لیے شہزادے کو بلا کر اغوا کر لیں لہٰذا سلطان حسین کو تارابائی کے پاس بھیج کر مصالحت کی اس شرط کو پسِ پشت ڈال دو۔''
بادشاہ کا یہ اندیشہ اس وقت درست ثابت ہوا جب سلطان حسین تارابائی کو جواب پہنچا کر آ رہا تھا اور مرہٹوں نے اس کا راستہ روک لیا اور نہایت سخت لڑائی لڑنی پڑی۔ اگرچہ مرہٹوں کی تعداد بہت زیادہ تھی مگر سلطان حسین نے ان کو مار بھگایا اور ہر جگہ مرہٹوں سے لڑتا بھڑتا لشکر گاہ میں حاضر ہو گیا۔
یہ وہ وقت تھا جب بادشاہ بے جاپور میں بیٹھا قلعہ تورنا کی فتح کے لیے کوچ کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ یہ قلعہ راج گڑھ سے چار کوس کے فاصلے پر تھا۔ راج گڑھ فتح ہو چکا تھا۔ اب قلعہ تورنا باقی تھا۔

سلطان حسین نے لشکر میں حاضر ہوتے ہی بادشاہ کے حضور درخواست بھیجی کہ باریابی کی اجازت دی جائے۔ بادشاہ کی طرف سے جواب آ گیا کہ پہلے وہ قلعہ تورنا پر مورچابندی میں حصہ لے اور کچھ کارگزاری دکھانے کے بعد حاضری کے لیے آئے۔
بادشاہ نے سلطان حسین کو پیغام بھیجنے کے بعد تورنا کی تسخیر کے لیے لشکر روانہ کر دیا۔ حکم ملتے ہی لشکر نے کوچ کیا اور قلعہ تورنا سے دو کوس کے فاصلے پر قیام کیا۔
شہزادہ اعظم شاہ احمد آباد ہی میں رہا کیونکہ مرہٹوں کی طرف سے اب بھی خطرہ تھا۔ اس نے ایک چھوٹے لشکر کے ساتھ سلطان حسین کو قلعہ تورنا کی طرف روانہ کر دیا۔
جب تک وہ پہنچا، محاصرے کے احکام صادر ہو چکے تھے۔
سلطان حسین نے تورنا پہنچتے ہی اپنے مورچے قائم کر لیے۔ اس کے کانوں میں اب تک بادشاہ کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ''قلعہ تورنا پر مورچابندی میں حصہ لے کچھ کارگزاری دکھائے اس کے بعد باریابی کے لیے حاضر ہو۔'' اسی کارگزاری کو دکھانے کے لیے اس نے ایسی جگہ اپنے مورچے قائم کیے جہاں مسلسل گولہ باری ہو رہی تھی اس نے اس گولہ باری کی پروانہ کرتے ہوئے بیس گز تک اپنے مورچے آگے بڑھا لیے۔ اس کوشش میں اس کے بہت سے آدمی کام آ گئے۔ اسی وقت بہادری دکھانے اور بادشاہ کی نظروں میں سرخرو ہونے کا ایک موقع ہاتھ آ گیا۔ دشمن کے کم از کم اسّی (80) آدمی غلہ لے کر پہاڑ پر جانے کی فکر میں تھے۔ انہیں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ اس جگہ سلطان حسین اپنے مورچے قائم کر چکا ہے۔ وہ لوگ جیسے ہی مورچوں کے قریب آئے، سلطان حسین کے آدمیوں نے ان لوگوں کو گرفتار کر لیا اور غلہ ضبط کر لیا۔
اس کارنامے کی خبر ہرکاروں کے ذریعے فوراً بادشاہ تک پہنچ گئی۔ بادشاہ نے بھی اپنا وعدہ پورا کیا اور حکم دیا کہ وہ یہ غلہ اپنے آدمیوں میں تقسیم کر دے پھر اسے حضور میں طلب کر کے سہ صدی منصب پر دو صدی کا اضافہ عطا کیا۔
ابتدا میں یہی سوچا گیا تھا کہ اکثر قلعوں کی طرح اس قلعے کو بھی خرید لیا جائے اور وعدہ وعید کر کے قلعے پر قبضہ کر لیا جائے لیکن بعض امراء اور خاص طور پر امان اللہ خاں اور سلطان حسین کی رائے سے یہ طے کیا گیا کہ قلعے کو لڑ کر حاصل کیا جائے۔ امان اللہ خاں کی دلیل نہایت مضبوط تھی۔
''اب مرہٹے کمزور پڑنے لگے ہیں۔ اگر اس وقت ہم نے بات چیت سے مسائل حل کرنے کی کوشش کی تو

مرہٹے اسے ہماری کمزوری سمجھیں گے۔ اس وقت ہمیں انہیں شدید زخمی کر دینا چاہیے۔''

''یہ نہ ہو کہ مرہٹے ہم پر حاوی ہو جائیں؟''

''ہنونت رائے ہمیں پہلے ہی بتا چکا ہے کہ سرداروں میں پھوٹ پڑ چکی ہے۔''

''آپ لوگ ماؤلیہ قوم کی بہادری سے واقف ہوں گے۔ اس قوم کی ایک جماعت جو قلعہ گیری کے فن میں بڑی شہرت رکھتی ہے، ہمارے ساتھ مل گئی ہے۔ اس میں بھی ہنونت رائے کی کوششوں کا دخل ہے۔ یہ قوم ہماری مدد کرے گی۔''

سلطان حسین نے بھی امان اللہ خاں کی تائید کی اور حملہ کرنے کے حق میں اپنا فیصلہ دے دیا۔

رات کا ابتدائی حصہ تھا۔ چاند ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ طرفین میں شدید گولہ باری ہو رہی تھی۔ ہر طرف دھواں پھیلا ہوا تھا۔ ایسی خطرناک صورتِ حال میں کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ امان اللہ خاں ماؤلیہ قوم کی جماعت کے ساتھ آگے بڑھنے کی جرأت کرے گا لیکن یہ لوگ توپوں کی گھن گرج میں دبے پاؤں اس راستے پر چلتے رہے جس کی نشاندہی ہنونت رائے نے پہلے ہی کر دی تھی۔ وہ اس علاقے کے چپّے چپّے سے واقف تھا اور اب شاہی لشکر کی مدد کر رہا تھا۔

امان اللہ خاں اور ان کے ساتھی پہاڑ کے اوپر پہنچ گئے اور مقررہ اشارہ اور علامت دکھا کر دوسروں کو بھی اوپر بلا لیا۔ اس کے بلاوے پر پچیس مسلح جوان اور ایک نفیری نواز کو لیے ہوئے وہاں جمع ہو گئے۔ جب حملہ آور دستے کے آدمی ادھر پہنچ گئے تو...... نفیری نواز نے نفیری بجائی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بہادر دوڑتے ہوئے قلعے کی فصیل پر چڑھ گئے اور محصورین پر اچانک حملہ کر دیا۔

نائب صوبہ دار حمید الدین خاں بھی رسیوں اور زینوں کی مدد سے اوپر پہنچ گیا۔ محصورین اس اچانک حملے سے ایسے حواس باختہ ہوئے کہ اپنا دفاع کرنا بھول گئے۔ حملہ آور فوج نے ان کو تلوار کی دھار پر رکھ لیا۔ اتنا خون بہا کہ مرہٹے امان امان چلاتے ہوئے بھاگنے لگے۔ بعض تو پہاڑ سے گرے اور دم توڑ گئے۔ آہوں اور سسکیوں کے درمیان فتح کے بگل بجنے لگے، شادیانے بجائے جانے لگے۔ مرہٹے بھاگ رہے تھے۔ جو نہیں بھاگ سکتے تھے، ہتھیار پھینک کر عاجزی سے اطاعت قبول کرنے لگے۔

قلعہ تورنا مراسلت سے نہیں، تلوار کی نوک پر فتح ہوا۔

☆☆☆

رانی بائی اپنے کمرے میں اس طرح ٹہل رہی تھی جیسے جنگل کی آزاد شیرنی کو پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو اور اسے ابھی پنجرے میں رہنے کی عادت نہ پڑی ہو۔ یہ تاثر بھی ملتا تھا کہ اسے کسی کا شدت سے انتظار ہے۔ اسے واقعی کسی کا انتظار تھا۔ یہ اس وقت کھل گیا جب اسے دہنا جادو کے آنے کی اطلاع ملی۔ اس کے آتے ہی تارا بائی اس پر برس پڑی۔

''کیا اس لیے میں نے تمہیں مرہٹوں کا سردار بنایا تھا کہ تم نے احمد آباد کو ہاتھ سے نکال دیا؟''

''یہ آپ کس طرح کہہ سکتی ہیں۔ میں نے تو مصالحت کے لیے ایسی شرط رکھی تھی کہ لڑے بغیر ہم اپنا مقصد حاصل کر سکتے تھے۔ اب یہ ہماری بدقسمتی کہ مغلوں کے بادشاہ نے ہماری تجویز کو رد کر دیا۔''

''تمہارا پلہ بھاری تھا۔ اس کے باوجود تم نے مصالحت کے لیے وقت کیوں دیا؟''

''ہمیں یہ غلط فہمی ہوئی کہ شہزادہ اعظم شاہ لشکر میں پہنچ چکا ہے۔''

''میری اطلاع کے مطابق وہ بعد میں وہاں پہنچا تھا۔''

''ایک سوار وہاں آیا تھا۔ اس سے ہمیں دھوکا ہو گیا۔''

''قلعہ تورنا بھی ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ مرہٹوں نے وہاں بھی بزدلی دکھائی۔''

''جب گھر کے لوگ ہی گھر کے بھیدی بن جائیں تو یہی ہوتا ہے۔''

''کھل کر کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''آپ نے چندا بائی کو یہاں سے فرار کرا کے سخت غلطی کی ہے۔''

''وہ عورت ذات کیا کر سکتی ہے؟''

''آپ یہ کیوں بھولتی ہیں کہ اس کے ساتھ ایک مرد بھی ہے جس کا نام ہنونت رائے ہے۔''

''ہنونت رائے!'' تارا بائی یوں چونک گئی جیسے کوئی بھولی ہوئی آفت یاد آ گئی ہو۔

''جی ہنونت رائے۔ قلعہ تورنا کے محاصرے میں اسے دیکھا گیا ہے۔ لشکر والوں کو وہی خفیہ راستوں سے آگاہ کر رہا تھا ورنہ ان کا اوپر پہنچنا مشکل تھا۔''

''تم اب بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو۔ اس کا مطلب تو صاف ظاہر ہے کہ جس ہنونت کو تم ڈھونڈتے پھر

… اعظم شاہ کے پاس ہے۔ چندا بائی بھی وہیں …"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"میں ہنونت رائے کی بربادی دیکھنا چاہتی ہوں۔ … ے قدموں پر لا کر جھکا دو۔ اگر وہ زندہ رہا تو … نام ونشان تک مٹ جائے گا۔"

"میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہنونت رائے کو … قابل نہیں چھوڑوں گا کہ وہ سازشیں کرتا پھرے۔ اسے … شاہ کی نظروں سے گرادوں گا۔"

"یہی ہم سب کے حق میں اچھا ہوگا۔ جال پھیلا دو … پھانسنے کے لیے۔"

دھنا جادو یہ اطلاع دینے آیا تھا کہ اب مغل بادشاہ … کی طرف بڑھے گا۔ اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ … قوم کا علاقہ ہے لیکن اس وقت اگر ہم نے ان کا … دیا تو یہ اتحاد مغلوں کی آئندہ ناکامی کی صورت میں … لیکن اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ ہنونت رائے کا تذکرہ … آیا۔ رانی بائی کا مزاج اتنا بگڑ گیا کہ وہ ہر تجویز کی … کرسکتی تھی۔ اس نے اس تذکرے کو چھوڑا اور قلعے … آیا۔

☆☆☆

ایک سال گزر گیا تھا۔ مرہٹوں کی اب کمر ٹوٹ گئی … لوٹ مار کے چند واقعات کے سوا اب کوئی بڑا واقعہ … نہیں آرہا تھا کہ اچانک ایک نیا محاذ کھل گیا۔ اس پر … طور پر قابو پانا ضروری تھا ورنہ ڈر تھا کہ مرہٹے اس سے … کر دوبارہ طاقت ور ہوجائیں گے۔

… برسوں پہلے بیدڑ قوم کا زمیندار پیم نایک شاہی حملوں … عاجز ہوکر امان طلب کر کے حاضر دربار ہوگیا تھا اور … اہل وعیال کو کنکیرا کے مقام پر منتقل کردیا تھا۔ اس کے … بعد اس کا بھتیجا پریا نایک حاضر دربار ہوکر … حالا یا تھا۔ اس نے مختلف فتوحات میں شاہی لشکر … رہ کر اعتبار پیدا کرلیا۔ جب اس نے دیکھا کہ … اعتبار پیدا ہوگیا ہے تو اس نے بادشاہ سے عارضی … اجازت چاہی۔

"اگر اجازت ہو تو اپنے آباؤاجداد کے مسکن کنکیرا … اپنا ساز وسامان درست کرلوں پھر جہاں بھی طلبی … جاؤں گا۔"

… شاہ کے دل میں اس کا اعتبار قائم ہوگیا تھا لہٰذا … دی۔ اس کے دل میں کچھ اور تھا۔ اس نے

"کنکیرا" پہنچتے ہی مستقل ٹھہرنے کا فیصلہ کرلیا۔ واپسی کا ارادہ ترک کردیا اور پہلے سے بنے ہوئے احاطے کو مضبوط کر کے اچھا خاصا قلعہ بنالیا۔ کافی سامانِ جنگ بھی جمع کرلیا اور چودہ پندرہ ہزار پیادوں کی فوج منظم کرلی۔

اس علاقے کے لوگوں کی تیراندازی بہت مشہور تھی۔

ضروری بندوبست کے بعد وہ دور ونزدیک کی آبادیوں میں لوٹ مار مچانے لگا۔ بادشاہ کو خبر ہوئی تو پہلے تو اسے خطوط لکھ کر باز رہنے کی تلقین کی لیکن جب وہ باز نہ آیا تو ایک فوج اس کی طرف بھیجی۔ آدمی ہوشیار تھا۔ اس نے مقابلے پر آنے کے بجائے عاجزی کا مظاہرہ کیا اور بھاری مال ودولت دے کر فوج کو واپس کردیا اور بدستور لوٹ مار میں مشغول رہا اور فصیل کو مستحکم کرنے، فوج جمع کرنے اور چھوٹی بڑی توپیں فراہم کر کے اپنی طاقت میں اضافہ کرنے لگا۔

بادشاہ مرہٹوں سے نمٹنے میں مشغول تھا اس لیے اس طرف پوری توجہ نہ کرسکا۔

حالات نے ایک کروٹ اور بدلی۔ پیم نایک کا بیٹا جگنا جو اس علاقے کا وارث تھا، بادشاہ کے حضور میں آگیا۔ بادشاہ نے اسے منصب عطا کیا اور حقِ وراثت کی بنا پر اسے زمینداری کی سند عطا کردی۔ اس نے سند حاصل کرتے ہی ایک فوج لی اور پریا نایک پر حملہ کردیا تاکہ علاقہ اس سے خالی کرالے لیکن شکست کھا گیا اور قلعے میں داخل نہ ہوسکا۔

اس کے بعد بادشاہ نے شہزادہ محمد اعظم شاہ کا تقرر کیا۔ جب بادشاہی فوج نے اس کے اطراف کے سارے علاقے کو تاخت وتاراج کردیا تو وہ شہزادے کی خدمت میں حاضر ہوگیا اور نہایت عاجزی سے امان طلب کی اور بادشاہ کے حضور نذر کے سات لاکھ روپے کی پیشکش کی۔ شہزادے کو بھی نقد رقم پیش کی اور وعدے وعید کر کے بادشاہی غضب سے نجات حاصل کرلی مگر شہزادے کے رخصت ہوتے ہی پھر وہی حرکتیں شروع کردیں۔

اس کے بعد بھی اسے راہِ راست پر لانے کے لیے کوششیں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ قلعہ تورنا کی فتح کا وقت آگیا۔

قلعہ تورنا کی فتح کے بعد جب بادشاہ قلعوں کی فتوحات کے لیے پونا کی طرف آیا ہوا تھا، ایک مقام پر چھاؤنی قائم کردی اور یہاں تقریباً سات ماہ تک قیام کیا۔ اس اثنا میں اس ضلع کے دو تین غیر معروف قلعے بھی فتح کرنے تھے۔ یہاں رہ کر اس کے کانوں میں پریا نایک کی فتنہ پردازی کی خبریں کثرت سے پڑنے لگیں۔ آخر بادشاہ

نے سارے کام چھوڑ کر پیش خانہ شاہی کو کنکیرا کی طرف نکالنے کا حکم دیا۔

☆☆☆

اعظم شاہ نے ہنونت رائے کی خدمات کے صلے میں چندا بائی اور ہنونت رائے کو ایک شاندار رہائش گاہ عطا کردی تھی۔ ہنونت رائے کو مرہٹوں سے خطرہ ضرور رہتا تھا لیکن اعظم شاہ کی پناہ میں آنے کے بعد وہ مطمئن بھی ہو گیا تھا۔ وہ چندا بائی کے ساتھ ہنسی خوشی رہ رہا تھا۔ اس کے گھر کے سامنے ہر وقت پہرا رہتا تھا۔ اس پہرے کے باوجود ایک دن ایک درویش آیا جس کے ہاتھ میں عصا تھا۔ ایک چادر اس کے کاندھے پر پڑی ہوئی تھی۔

پہرے داروں نے اسے دروازے پر ہی روک دیا لیکن وہ بضد تھا کہ ہنونت رائے سے مل کر جائے گا۔ آخر بہت تکرار کے بعد ہنونت رائے کو خبر پہنچائی گئی۔ ہنونت رائے جوگیوں اور فقیروں کا بہت معتقد تھا۔ اس نے جو سنا تو بے قرار ہو گیا اور اس فقیر کو طلب کرلیا۔

وہ فقیر، درویش یا جوگی جو کوئی بھی تھا، خاموشی سے آکر بیٹھ گیا۔ پوچھنے پر بھی کچھ نہ بولا پھر خود ہی گویا ہوا۔

”مجھے میرے گرو نے تمہارے پاس بھیجا ہے کہ میں تمہیں کیمیا کا علم سکھادوں تاکہ تمہاری امارت میں اضافہ ہو اور بھی کچھ علوم ہیں جو تمہیں سکھاؤں گا۔“

”میں پوچھ سکتا ہوں تمہیں مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟“

”ہمدردی مجھے نہیں میرے گرو کو ہے۔ انہوں نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ ان پر سب روشن ہے۔ وہ تو یہ بھی جانتے ہیں کہ تمہارے آنگن میں کھیلنے کے لیے کوئی بالک بھی نہیں ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“

”تو پھر تم یہ علم سیکھنے کے لیے تیار ہو؟“

”میرے فائدے کی بات ہے تو میں کیوں تیار نہ ہوں گا۔“

”تمہارے پاس کچھ اشرفیاں اور سونا ہے؟“

”کتنی اشرفیاں اور سونا درکار ہوگا۔“

”یہ تو تمہارے اوپر ہے۔ جتنا مال دو گے اس کا پچاس گنا بنادوں گا اور تمہیں بھی سکھادوں گا۔ اکیلے میں بناتے رہنا۔ خبردار اپنی بیوی کو کچھ نہ بتانا۔ عورتیں پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں۔ اس راز کو راز نہیں رہنے دیں گی۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ میں اس پر ظاہر نہیں ہونے دوں گا۔“

”تو پھر ٹھیک ہے، ہم کل سے یہ کام شروع کردیں گے۔ ایک چھوٹی دیگ منگوا کر محل کی چھت پر پہنچادو۔ یہ کام وہیں مناسب رہے گا۔“ ہنونت رائے نے دیگ چھت پر پہنچادی اور فقیر کے رہنے کا بندوبست کردیا جہاں اسے رات گزارنی تھی۔ دوسرے دن اس نے اشرفیاں اور سونا طلب کیا اور دیگ میں ڈال دیا۔ اسی کے ہم وزن تانبے کے پیسے اور ٹکڑے اس دیگ میں ڈال دیے اور بھی کچھ سامان اور مسالے منگوالیے۔ ہر چیز اس کے اشارے پر حاضر کردی گئی۔ اس نے تمام چیزیں دیگ میں ڈال دیں اور دیگ کا منہ مٹی سے بند کردیا اور ایک گڑھا کھود کر بہت سے کوئلے دیگ کے ساتھ دفن کردیے۔ مغرب سے پہلے آگ جلائی گئی۔ جب رات کا ایک حصہ گزر گیا تو اس دیگ سے بڑی ہیبت ناک آوازیں نکلنے لگیں۔ وہ حیلہ باز درویش نہایت گھبراہٹ کے عالم میں ہاتھ ملنے اور افسوس کرنے لگا۔

”خیر تو ہے، آپ اتنے پریشان کیوں ہوگئے اور یہ دیگ سے آوازیں کیسی آرہی ہیں۔“

”اس عمل میں کوئی فرق رہ گیا ہے۔“

”اب کیا ہوگا؟“

”اب اس کا توڑ یہی ہے کہ اس پر کسی کم سن لڑکے کا خون چھڑکا جائے۔“

ہنونت رائے یہ سنتے ہی گھبرا گیا۔ ”اس وقت یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی لڑکا مل جائے اور اگر مل بھی جائے تو میں اسے ہرگز قتل نہیں کروں گا۔“

”تمہیں بچہ لانے کو کون کہہ رہا ہے۔ بچہ میں لاؤں گا لیکن اس کے لیے کچھ رقم درکار ہوگی۔“ ہنونت رائے نے کچھ زرِ سرخ نکال کر فقیر کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس نے رقم جیب میں ڈالی اور فقیر کو پچھلے دروازے سے باہر نکال دیا۔ کچھ دیر بعد وہ فقیر ہانپتا کانپتا ایک بچے کو لے کر آ گیا۔ اس ظالم نے اس معصوم کو دیگ پر ذبح کردیا۔ جب اس کے خون کے قطرے آگ پر پڑے تو دیگ سے آوازیں نکلنا بند ہوگئیں۔ اس نے بچے کی لاش کو کوڑے کرکٹ میں چھپادیا کہ کل اسے ٹھکانے لگادے گا۔ فقیر نے کہا۔ ”اب سب ٹھیک ہوگیا۔ صبح تک دیگ سونے سے بھر جائے گی۔“ وہ دونوں نیچے اتر آئے۔ ہنونت رائے اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔

ابھی دن پوری طرح نکلا نہیں تھا کہ کوتوال کے آدمی نقارہ بجاتے ہوئے دروازے پر آگئے۔ ہنونت رائے نے کوتوال کے آدمیوں سے آنے کا سبب پوچھا۔

”تمہارے پاس جو فقیر ٹھہرا ہوا ہے اسے ہمارے

لا رہا۔''
''کیوں؟''
''کیونکہ وہ ایک بچہ اٹھا کر لے آیا ہے۔ اس کے والدین نالش کر رہے ہیں۔'' ہنونت رائے یہ سن کر گھبرا گیا۔ خوشامد درآمد پر اتر آیا۔ رشوت کی پیشکش بھی کی کہ کسی طرح معاملہ دب جائے لیکن فقیر باہر نکل آیا اور ہنونت رائے کو ڈانٹنے لگا۔
''تم کیوں رشوت دے کر گناہ گار ہوتے ہو۔ انہیں ایک دمڑی بھی نہ دو اور مجھے ان کے حوالے کر دو۔''
ہنونت رائے اسے روکتا رہ گیا لیکن اس نے خود کو سپاہیوں کے حوالے کر دیا۔
''جہاں لے جانا چاہتے ہو لے جاؤ۔ میں جواب دوں گا۔'' سپاہی اس فقیر کو لے کر چلتے بنے۔
فقیر کے چلے جانے کے بعد ہنونت رائے کوتوالی گیا کہ جا کر دیکھے تو سہی کہ فقیر پر کیا گزری۔ وہاں جا کر ہنونت رائے یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ نہ کوئی فریادی نظر آیا نہ ظالم۔ ابھی کچھ دیر پہلے پیش آنے والے واقعے کا وہاں کسی کو علم تک نہیں تھا۔ وہاں کوئی یہ ماننے کو بھی تیار نہیں تھا کہ کوتوال کے آدمی ہنونت رائے کی ڈیوڑھی پر گئے تھے۔
ہنونت رائے حیران پریشان واپس چلا گیا۔ راستے بھر سوچتا آرہا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ جادو تھا شعبدہ تھا یا کیا تھا۔ یہی سوچتے سوچتے وہ گھر آگیا۔ گھر پہنچتے ہی اسے دیگ کا خیال آیا۔ اس بچے کا خیال آیا جس کا خون دیگ پر چھڑکا گیا تھا اور لاش کوڑے کرکٹ میں چھپادی گئی تھی۔ وہ سیدھا وہاں پہنچا۔ کوئلے ہٹا کر دیگ نکالی۔ دیگ میں تانبے کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ سونا اور اشرفیاں غائب تھیں۔ ہنونت رائے سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ فقیر شعبدہ باز تھا۔ مجھے بے وقوف بنا کر میری ساری دولت لوٹ کر چلتا بنا۔
یہ بات ہی ایسی تھی کہ کسی کو بتا نہیں سکتا تھا۔ چندا بائی کو بتا کر اسے پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ دولت جانے کے غم نے اسے بیمار کر دیا۔ دو تین دن تک شہزادے کو سلام کرنے بھی نہ جا سکا۔ کسی کو کچھ معلوم نہ ہو سکا تھا اس لیے کسی نے کچھ بھی نہیں کی۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے سوچتا رہتا تھا کہ وہ فقیر آخر کون تھا۔ کوتوالی سے آنے والے آدمی کون تھے۔ وہ فقیر کس کے ساتھ چلا گیا اور کہاں چلا گیا۔ یہ کیسی شعبدہ بازی تھی جس نے مجھے برباد کر دیا۔ وہ سوچتا تھا لیکن کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

اس پر غنودگی طاری تھی۔ کوئی اسے آواز دے رہا تھا۔ اس نے ہمت کر کے آنکھ کھولی۔ چندا بائی اس کے سرہانے کھڑی تھی۔
''سرکاری کارندے آئے تھے۔ شہزادہ حضور نے آپ کو طلب کیا ہے۔ شاہی فوجیں کسی مہم پر جانے کی تیاری کر رہی ہیں۔ شاید اسی لیے بلانے آئے ہوں۔''
''تم میری حالت دیکھ رہی ہو۔ میں کس طرح جا سکتا ہوں۔''
''میں نے آپ کی بیماری کا کہہ دیا تھا لیکن ہمت کر کے آپ چلے جائیں تو اچھا ہے۔''
''میرے لیے پالکی کا بندوبست کر دو۔ پیدل تو میں نہیں جا سکتا۔''
چندا بائی اس کے پاس سے ہٹ گئی۔ غالباً پالکی کا بندوبست کرنے گئی تھی لیکن جاتے ہی پلٹ آئی۔
''کوئی فقیر باہر کھڑا ہے۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ پہرے دار اجازت مانگ رہے ہیں۔''
''کہاں ہے وہ؟ اسے جلدی میرے پاس بھیجو۔''
''اس وقت ٹال دیتی ہوں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پھر کبھی آجائے گا۔''
''نہیں، یہ غضب مت کرنا۔ وہ میرے لیے بہت اہم ہے۔ اسے جلدی بلاؤ۔''
''آخر یہ ہے کون؟''
''تمہیں اس سے کیا سروکار۔ جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ اسے جلدی بلاؤ۔'' وہ اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چندا بائی چلی گئی۔
چندا بائی کے چلے جانے کے کچھ دیر بعد وہ فقیر کمرے میں داخل ہوا اور خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گیا۔ ہنونت رائے کے دل میں کہنے کو بہت کچھ تھا لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے ہونٹ سل گئے ہیں۔ آخر اس خاموشی کو فقیر نے توڑا۔
''تمہیں یقیناً یہ دکھ ہے کہ تمہاری دولت ضائع ہوگئی۔''
''نہیں۔ مجھے یہ دکھ ہے کہ میں نے تم پر اعتبار کیا اور تم نے مجھے دھوکا دیا۔''
''میں نے تمہیں کوئی دھوکا نہیں دیا۔ تمہاری دی ہوئی اشرفیوں سے دگنا وزن کا سونا بن چکا ہے اور محفوظ ہے۔''
''میں نے دیگ دیکھ لی ہے۔ اس میں تانبے کے ٹکڑوں کے سوا کچھ نہیں۔''
''تمہیں دیگ چاہیے تھی یا سونا؟''

''مجھے سونا درکار ہے۔''

''تمہاری کسی سے دشمنی ہے؟''

''تارا بائی میری سب سے بڑی دشمن ہے مگر اس معاملے سے دشمنی کا کیا تعلق ہے؟''

''ہے ہنونت رائے ہے۔ تارا بائی نے کئی مرہٹہ سرداروں کو تمہارے خلاف کر دیا ہے۔ یہ اسی دشمنی کی وجہ ہے کہ تمہاری دولت بھی تم سے دشمنی کر گئی لیکن میرے قابو میں ہے۔ مخالف سردار بھی تم سے معافی مانگنے اور تمہارے ساتھ مل کر تارا بائی کا اقتدار ختم کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اب چندا بائی رام راجا کی جانشین ہوگی۔''

''یہ سب کچھ میری سمجھ سے تو باہر ہے۔''

''ابھی یہ سب کچھ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ بس تم میرے ساتھ چلو۔ تمہاری دولت تمہاری منتظر ہے۔''

''مجھے کہاں جانا ہوگا؟''

''کہیں دور نہیں، احمد آباد سے باہر ایک جنگل میں۔''

''یہاں کیوں نہیں؟''

''تم کیا سمجھتے ہو، مرہٹہ سردار یہاں آ کر تم سے ملیں گے۔ وہ سب تم سے مل کر تارا بائی کو راستے سے ہٹائیں گے اور تم تمام مرہٹہ سرداروں کی راہنمائی کرو گے۔ تمہاری راہنمائی میں ان قلعوں کو دوبارہ حاصل کیا جائے گا جو ہاتھ سے نکل گئے ہیں۔''

''میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں لیکن میں سخت بیمار ہوں۔''

''اب تم بیمار نہیں ہو۔''

ہنونت رائے نے واقعی محسوس کیا کہ اس کے بدن میں جان آ گئی ہے۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''میں تیار ہوں۔''

''واپسی میں سونا لے کر آنا ہے۔ کیسے لاؤ گے؟''

''میں نے پالکی منگوائی ہے۔ دو کے بجائے چار مزدور لگا لوں گا۔ سونا آ جائے گا۔''

''مزدور بھروسے کے ہیں؟''

''مزدور بے زبان ہوتے ہیں۔ انہیں کسی سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔''

''پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔ اس وقت تم میرے ساتھ چلو۔ واپسی میں کرائے کی کوئی گاڑی کر لینا۔ کسی کو معلوم ہی نہیں ہوگا کہاں گئے تھے اور کیا لے کر آ گئے۔''

ہنونت رائے حیران پریشان اس کے ساتھ چل پڑا۔ سوچ رہا تھا کہ شاید پیدل جانا پڑے لیکن باہر وہ گھوڑا بندھا ہوا تھا جس پر سوار ہو کر وہ درویش آیا تھا۔ وہ درویش کے ساتھ گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد اسے احساس ہوا کہ درویش ایک ماہر گھڑ سوار ہے۔ حیرت کی بات ہی تھی کہ بظاہر درویش نظر آنے والا شخص گھوڑے کو نہایت مہارت سے دوڑا رہا تھا۔ اس تبدیلی پر اس کے کان کھڑے ہوئے تھے لیکن کیا کر سکتا تھا۔ خاموش بیٹھا رہا۔

شہر سے نکل کر چند کوس چلنے کے بعد جنگل شروع ہو گیا۔ ہنونت رائے کے لیے یہ راستہ اجنبی نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس جنگل میں ذرا آگے جا کر مرہٹوں کا ایک قلعہ ہے جو اب ویران پڑا ہے۔ شاید درویش کی منزل وہی ہو کیونکہ وہ کہہ چکا تھا کہ کچھ مرہٹہ سردار اس سے ملنے کے لیے بے قرار ہیں۔ اس کا اندازہ ٹھیک نکلا۔ وہ اس قلعے کے سامنے جا کر رک گیا اور ایک مخصوص آواز نکالی۔ اس آواز کے جواب میں دوسری جانب سے بھی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی چار مرہٹہ سردار قلعے سے باہر آ گئے۔ یہ چاروں ہنونت رائے کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ وہ ان کے ناموں سے واقف تھا۔ ان چاروں نے بڑے تپاک سے ہنونت رائے کو گلے لگایا۔ ہنونت رائے کا دل اس وقت بڑا ہو گیا کہ یہ اہم ترین سردار اس کے زیر نگرانی رہیں گے اور وہ ان کے لشکر کو ساتھ لے کر تارا بائی کا تختہ الٹ سکتا ہے۔ اس کی بیوی چندا بائی، رام راجا کی بیوہ ہونے کی حیثیت سے مرہٹوں کی سردارِ اعلیٰ ہوگی۔ ابھی اسے خوش ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اس نے دھنا جادو کو قلعے سے باہر آتے ہوئے دیکھا۔ کیا وہ بھی تارا بائی کے خلاف ہو گیا ہے؟ ہنونت رائے ایک لمحے کو خوش ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی چھٹی حس بیدار ہو گئی۔ دھنا جادو کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ دیکھ کر اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

''سوبھان! لے آئے ہنونت رائے کو۔'' دھنا جادو کی آواز گونجی۔

سوبھان کے نام پر ہنونت رائے نے درویش کی طرف چونک کر دیکھا اور اپنی عقل پر ماتم کرنے لگا۔ سوبھان کو وہ جانتا تھا لیکن اس نے حلیہ ایسا تبدیل کر لیا تھا کہ وہ اسے پہچان نہ سکا۔ اب سب کچھ اس کی سمجھ میں آ چکا تھا۔ اسے لالچ کے جال میں پھنسا کر اغوا کر لیا گیا تھا۔ اسے اپنا انجام صاف نظر آ رہا تھا لیکن آدمی جی دار تھا، آگے بڑھا اور سوبھان کے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیا اور پھر دوسرے ہی لمحے سب نے مل کر اسے رسیوں سے جکڑ دیا اور گھوڑے کی پیٹھ پر لاد دیا۔

"جلدی چلو۔ تارابائی کے لیے اس سے بڑی خوش خبری اور کیا ہو سکتی ہے۔"

☆☆☆

شاہی افواج قلعہ کنکیرا کی طرف رواں دواں تھیں۔ اس وقت بیجاپور کی صوبہ داری پر فیروز جنگ کا بیٹا قلیچ خاں مامور تھا۔ کنکیرا کے نواحی پرگنے اسی کی جاگیر میں تھے مگر ان پرگنوں میں پریانایک کی تاخت و تاراج کی وجہ سے اس کا عمل دخل نہیں رہا تھا۔ بادشاہ نے اسے بھی طلب کرلیا۔ دوسرے فوج داروں کے نام بھی طلبی کے احکام صادر ہوئے۔ شہزادہ اعظم شاہ بھی اپنے لشکر کے ساتھ روانہ ہوا لیکن ہنونت رائے اس میں شامل نہیں تھا۔ اعظم شاہ نے اسے مفرور قرار دے کر اس کی تلاش میں گرز بردار روانہ کردیے تھے۔

قلعے کے اطراف لشکر جمع ہوگیا۔ خود عالمگیر بادشاہ نے قلعے سے ایک کوس پر اپنی خیمہ گاہ قائم کردی۔

دونوں طرف سے تیاریاں ہونے لگیں۔ شاہی لشکر نے قلعے پر فوج کشی کے لیے تیاریاں کیں اور پریا برج اور فصیل کو مستحکم کر کے اپنی فوج کو اکٹھا کرنے میں مشغول ہوگیا۔

پریانایک نے اپنی مدد کے لیے تارابائی کو بھی خطوط لکھے تھے لیکن مرہٹوں کی آمد سے پہلے ہی (جن سے اس کا اتحاد ہوچکا تھا) چند ہزار سواروں اور توپ خانہ لے کر قلعے سے نکلا اور بادشاہی لشکر کے مقابلے پر آگیا۔ دونوں طرف سے توپوں کے دہانے کھل گئے۔ بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ طرفین سے کافی آدمی مارے گئے۔

اس روز طلوعِ آفتاب کے وقت شاہی فوج کے چند امیر طلایہ گردی پر نکلے ہوئے تھے۔ وہ ایک ٹیکری کے قریب سے گزرے۔ یہ ٹیکری اسی آباد قلعے کا ایک حصہ تھی اور اس وقت وہاں کوئی محافظ نہیں تھا۔ ان بہادروں نے بڑی تیزی سے حملہ کیا اور ٹیکری پر قبضہ کرلیا اور وہاں مورچے قائم کرلیے۔ اسی وقت قلعے کے اندر اور باہر سے دشمن کی فوجیں سیلاب کی طرح بڑھیں اور بہادروں کے قدم اکھاڑ دیے مگر اسی وقت کمک پہنچ گئی اور جم کر لڑائی ہوئی اور بالآخر اس ٹیکری پر قبضہ ہوگیا۔

اب قلعہ فتح کرنا آسان ہوگیا تھا لیکن اسی وقت مرہٹوں کے ایک زبردست لشکر کے آنے کی اطلاع ملی۔

دوسرے دن دھنا جادو دو تین سرداروں کے ساتھ آٹھ نو ہزار سوار اور بے حد و شمار پیادہ فوج لے کر نمودار ہوا۔

یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ دھنا جادو اور دوسرے سرداروں نے اس قلعے کو محفوظ سمجھ کر اپنے اہل و عیال اور مال و اسباب کو یہاں پہنچا دیا تھا۔ اب ان کو قلعے سے نکالنے اور کمک کا احسان جتانے کے لیے پہنچ گیا تھا۔ جب پہنچ ہی گیا تھا تو حقِ اتحاد تو ادا کرنا تھا۔ آتے ہی بادشاہی فوج کے سرداروں کو اپنی طرف متوجہ کر کے لڑائی شروع کردی۔ اس لڑائی کی آڑ لے کر دھنا جادو نے دو تین ہزار سواروں کو قلعے کے قریب پہنچا دیا۔ قلعے سے مرہٹوں کے اہل و عیال قلعے کی پیدل فوج کے ساتھ باہر نکل آئے۔ مرہٹے ان کو تیز رفتار گھوڑوں پر سوار کر کے وہاں سے نکال لے گئے۔

مرہٹوں کی اصل غرض پوری ہوگئی تھی۔ ان کے افراد صحیح سلامت نکل آئے تھے۔ اب وہ بادشاہی فوج سے بڑی جنگ کر کے خود کو خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔

دھنا جادو پریانایک کے پاس پہنچ گیا۔

"ہم دونوں متحد ہو کر بھی شاہی فوجوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے لہٰذا مصلحت اسی میں ہے کہ تم اطاعت کرلو اور موروثی ملک کو بچالو۔"

پریانایک غرور کے نشے میں مست تھا۔ اس نے اس کی بات نہیں مانی۔

"تمہارا مشورہ یقیناً میری بھلائی کے لیے ہوگا لیکن یہ قبل از وقت ہے۔ میں اتنی جلدی ہار ماننے والا نہیں جبکہ بہادر مرہٹہ میرے ساتھ ہیں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میرے ساتھ جو دوسرے سردار ہیں، وہ نہیں مانیں گے اور مجھے مجبوراً ان کا ساتھ دینا پڑے گا۔"

"اس کی تم فکر مت کرو۔ میں انہیں منالوں گا۔"

پریانایک نے بڑی ہوشیاری سے ان کے پاس نقد رقم اور کھانے پینے کی چیزیں ضیافت کے طور پر بھجوائیں اور روزانہ کا خرچ مقرر کردیا۔ اس کے بعد بھی منت سماجت سے مرہٹوں کو ساتھ دینے پر آمادہ کرتا رہا۔

مرہٹوں نے بھی سوچا کہ مفت کا مال مل رہا ہے۔ ہمارا کیا جاتا ہے، پڑے رہتے ہیں۔

لالچی مرہٹے لشکر در لشکر آتے رہے۔ جھڑپیں ہوتی رہیں۔ لوگ شہید اور زخمی ہوتے رہے۔ جب پریانایک عاجز آگیا تو اس کے شیطانی دماغ نے ایک سازش تیار کی۔ اس کی نظر تاجر عبدالغنی کشمیری پر گئی۔ یہ وہ شخص تھا جس کا تجارتی سلسلہ مرہٹوں کے لشکر سے بادشاہی لشکر تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ شخص دونوں لشکروں تک سامانِ تجارت پہنچایا کرتا تھا۔ پریا سے بھی اس کے روابط تھے۔ اسی خرید و فروخت کے سلسلے میں اس کی آمد و رفت رہا کرتی تھی۔ ایک دن

جوتا جر عبدالغنی قلعے میں آیا تو منصوبے کے مطابق پریا نے اسے ایک خط دیا کہ یہ خط واقعہ نگار ہدایت کیش کو جا کر دے دے۔ اس خط میں ندامت کا اظہار کر کے مصالحت کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ عبدالغنی قلعے سے نیچے آیا اور وہ پرچہ واقعہ نگار کے حوالے کر دیا۔

''میں ایسے ہی چکر لگاتے ہوئے قلعے کے نیچے چلا گیا تھا اور وہاں نماز پڑھنے لگا تھا کہ قلعے والے مجھے گرفتار کر کے اندر لے گئے۔ پریا نے حالات دریافت کرنے کے بعد یہ کاغذ مجھے دیا کہ آپ کو پہنچادوں۔'' واقعہ نگار نے یہ پرچہ بادشاہ کے پاس پہنچا دیا۔ بادشاہ نے پرچہ دیکھ کر حکم دیا کہ پریا سے کہو اپنی شرائط پیش کرے۔ تاجر قلعے کے اندر گیا اور شرائط لے کر آ گیا۔

''میرا بھائی سوم شنکر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوگا۔ اسے خلعت، گھوڑا اور ہزار منصب سے نوازا جائے اور اسے یرغمالی کے طور پر رکھ لیا جائے اور اپنا قلعہ دار مقرر کر کے چند آدمیوں کے ساتھ قلعے میں بھیج دو۔ وہ یہاں آ کر بندوبست سنبھال لے۔ میرے قلعہ دار کو قلعے سے نکلنے کے لیے ایک ہفتے کی مہلت دے دی جائے۔''

بادشاہ نے یہ شرائط قبول کر لیں اور تمام کام حسبِ شرائط انجام دے دیے۔

بادشاہ کے نمائندے کے قلعے میں داخل ہونے کے بعد شادیانے بجائے گئے۔ اس کے ساتھ ہی قلعے والے بادشاہی قلعہ دار کی تسلی کے لیے ناکارہ سامان اور عورتوں کو باہر لے جانے کی تیاری کرنے لگے۔ سہ پہر تک قلعے دار کو پریا کے حاضر ہونے کی اطلاعات دیتے رہے مگر شام ہوتے ہوتے یہ اطلاع دی کہ پریا کو سخت بخار چڑھ گیا ہے۔

تیسرے دن یہ خبر اڑا دی کہ پریا کا بخار ہذیان میں تبدیل ہوگیا ہے اور وہ اول فول بک رہا ہے۔ چوتھے دن یہ خبر اڑا دی گئی کہ پریا نے خودکشی کر لی ہے یا وہ مرہٹوں کے لشکر میں چلا گیا۔ بہر حال وہ قلعے میں نہیں ہے۔ اس کی ماں سب کو دکھانے کے لیے آہ وزاری کرنے لگی۔ پھر اس نے بادشاہ کے پاس درخواست بھیجی کہ بیٹے کے بارے میں تحقیق ہونے تک مجھے قلعے میں رہنے دیا جائے۔ تحقیق ہونے کے بعد وہ قلعہ خالی کر دے گی۔ میرے چھوٹے بیٹے سوم شنکر کو جو آپ کے پاس یرغمال ہے، قلعے میں بھیج دیں کیونکہ جہاں جہاں خزانہ دفن ہے، اس کا علم سوم شنکر کے سوا کسی کو نہیں۔ وہ آپ کے بھیجے ہوئے قلعہ دار کو بتا دے گا اور میں باقی مال و اسباب کے ساتھ قلعے سے نکل جاؤں گی۔

بادشاہ اس مکروفریب میں آ گیا اور سوم شنکر کو قلعے میں ماں کے پاس بھیج دیا۔ جب سوم شنکر واپس آ گیا تو کچھ دن تو ٹال مٹول کرتا رہا اور پھر شاہی قلعہ دار کو قید کر لیا۔ بادشاہ سے یہ حال چھپا نہ رہ سکا مگر اس نے نہایت تحمل سے کام لیا اور کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اسی اثنا میں چند بہادر امراء کے آنے کی اطلاع ملی جو اپنے اپنے لشکروں کے ساتھ آ رہے تھے۔

اس دوران بہادروں کے لشکر پہنچ گئے۔ جلدی اتنی تھی کہ تسلیمات بجالائے بغیر محاذ پر پہنچ گئے۔ پہلے وہ اس مقام پر پہنچے جہاں پریا کے آدمیوں نے شاہی لشکر کو محبوس کر رکھا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی انہوں نے دشمن پر حملہ کر دیا۔ تازہ دم فوج آتی رہی اور دشمن پر حملے کرتی رہی۔

یہ حملے جاری تھے کہ عقب سے گرد اڑتی نظر آئی۔ خبر اڑ گئی کہ مرہٹوں کی فوج قلعہ والوں کی مدد کو آ گئی۔ ایک امیر نصرت جنگ اس خبر کو سن کر اپنی فوج کو مرہٹوں کو روکنے کے لیے نکال لے گیا۔ بس اتنی مہلت بہت تھی۔ دشمن نے اس سے فائدہ اٹھا کر اپنے قدم جما لیے۔ پھر ایسی جنگ ہوئی کہ طرفین کے ہزاروں لوگ کام آ گئے۔ چار پانچ دن تک یہ معرکہ کارزار گرم رہا۔

شاہی لشکر نے چند کنوؤں اور باؤلیوں پر جن سے دشمن کے آدمیوں اور جانوروں کو پانی پہنچتا تھا، قبضہ کر لیا۔ اب تک بادشاہی لشکر پیاسا مر رہا تھا اب دشمن کی فوج پانی کے لیے ترسنے لگی۔

دشمن کا زور کچھ ٹوٹا تو شاہی لشکر نے عمارتی لکڑیاں اور درختوں کے تنے کاٹ کاٹ کر جمع کیے اور ان کی آڑ لے کر آگے بڑھتے چلے گئے۔ چیونٹی کی چال چلتے چلتے شیر بن گئے اور ان کے مورچے قلعے کی فصیل کے نیچے تک پہنچ گئے۔

میدانِ جنگ کا حال دیکھ کر آرزوئے شہادت لیے بادشاہ بھی میدانِ جنگ میں پہنچ گیا۔ یہ ایک غیر معمولی صورتِ حال تھی۔ بادشاہ کی موجودگی میں جہاں لشکرِ شاہی میں نیا ولولہ آ گیا، وہیں دشمن پر لرزہ طاری ہو گیا۔

بادشاہ کی سواری گولہ باری کی زد میں پہنچ چکی تھی۔ وہ بڑی پامردی سے فوجوں کو ہدایات دے رہا تھا۔

شاہی لشکر میں ایسا جوش تھا کہ جانوں کی پروا کیے بغیر قلعے پر چڑھ دوڑے۔ محصورین بھی غافل نہیں تھے۔ انہوں نے بھی اندر اور باہر سے لشکر پر حملہ کر دیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ طرفین میں سے ایک آدمی بھی زندہ نہیں بچے گا۔ بیدڑ قوم کی بہادری کا سکہ بیٹھا ہوا تھا لیکن شاہی لشکر کی جی داری بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ شاہی سواروں کو گھوڑوں کے ساتھ اوپر

میں دشواری ہو رہی تھی۔ وہ گھوڑوں سے کود پڑے اور پیدل ہو کر ان پر یورش کر دی۔ آخر کافروں کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ لشکریوں نے ایک کوس سے زیادہ فاصلے تک ان کا تعاقب کیا۔ جو میدانِ جنگ میں بچ گئے وہ بھاگتے ہوئے مارے گئے یا زخمی ہوئے۔

قلعہ کنکیرا اب اورنگ زیب کے قدموں میں تھا۔ بہادروں نے آگے بڑھ کر پہاڑ کے اوپر قلعے کے دروازے کے قریب اپنے جھنڈے گاڑ دیے۔

امیدیں ختم ہوئیں تو بچاؤ کی فکر ہوئی۔ قلعے والوں نے قلعے کے دروازے اور اطراف میں بندوقچی مقرر کر دیے تاکہ کچھ دیر کے لیے لشکر کی پیش قدمی رک جائے اور انہیں فرار کا موقع مل جائے۔ جلدی جلدی زیورات سمیٹے، بیوی بچوں کو ساتھ لیا اور خفیہ راستوں سے باہر نکل گئے۔ ان لوگوں نے نکلتے وقت مندر اور قلعے کی اکثر عمارتوں کو آگ لگا دی۔ جب آگ کے شعلے بلند ہوئے تو ظاہر ہو گیا کہ قلعے والے فرار ہو گئے ہیں لیکن آگ کی شدت انہیں اندر جانے سے روک رہی تھی۔ جب آگ کی شدت میں کچھ کمی آئی تو امیر داؤد خاں ایک جمعیت کو لے کر آگے بڑھے اور اوپر چڑھ گئے۔ قلعہ خالی پڑا تھا۔ چند زخمی جو بھاگ نہیں سکے تھے، ادھر ادھر پڑے تڑپ رہے تھے۔

داؤد خاں نے ایک زخمی کی گردن پر تلوار کی نوک رکھ کر پوچھا۔ ''شاہی قلعہ دار محتشم خاں کہاں ہے؟''

''آپ اگر وعدہ کریں کہ مجھے بچا لیں گے تو میں بتاتا ہوں۔'' اس زخمی نے کہا۔

''ہم اتنے ظالم نہیں کہ تمہیں یہاں مرنے کے لیے چھوڑ دیں۔ بس یہ بتاؤ کہ محتشم خاں کہاں ہے، زندہ ہے یا شعلوں کی نذر ہو گیا۔''

زخمی نے ایک عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ ابھی اس عمارت تک آگ نہیں پہنچی تھی اگر ذرا بھی دیر ہو جاتی تو محتشم خاں جل کر خاک ہو جاتا۔ سپاہی اندر داخل ہوئے تو محتشم خاں وہاں موجود تھا لیکن اس حال میں کہ اس کا ایک پاؤں زنجیر کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ کسی سپاہی کی تلوار کے ایک ہی وار نے زنجیر کاٹ دی اور وہ ادھوری زنجیر لیے باہر نکل آیا۔

اسے اور چند زخمیوں کو بروقت بچا لیا گیا۔

قلعے کی فتح اور وہاں کے زمینداروں کو تسلی دینے اور اپنی وفاداری کی تحریر لینے کے بعد برسات کا موسم بسر کرنے اور فوج کے آرام کے لیے قصبہ دیوگانو کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ قصبہ دریائے کشنا کے کنارے واقع تھا۔

☆☆☆

تارا بائی کسی زخمی ناگن کی طرح پھنکار رہی تھی۔ دھنا جادو فاتحانہ انداز میں ٹہل رہا تھا۔ ہنونت رائے کسی مجرم کی طرح زمین پر دوزانو بیٹھا تھا۔ پھر اچانک تارا بائی نے دھنا جادو کو کمرے سے باہر بھیج دیا۔ تارا بائی ہنونت رائے سے مخاطب ہوئی۔

''ہنونت رائے!'' تارا بائی زور سے دہاڑی۔

''جی رانی جی۔''

''میں نے تجھ سے کہا تھا، میں تجھ سے پریم کرتی ہوں۔''

''ہاں کہا تو تھا۔''

''کہا تھا تو تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ مرہٹہ عورت جب کسی سے پریم کا اقرار کرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے خود کو برہنہ کر دیا۔ میں نے تیرے سامنے خود کو برہنہ کر دیا۔ اب میں تجھے یہ کہنے کے لیے زندہ نہیں چھوڑوں گی کہ تو نے مجھے برہنہ دیکھا ہے۔''

''رانی جی! میں قسم کھاتا ہوں کہ کسی کے سامنے یہ ذکر نہیں کروں گا کہ آپ نے مجھ سے یہ بات کہی تھی۔''

''تو نہ کہہ مگر جب تجھے دیکھوں گی تو مجھے لگے گا تیرا رُواں رُواں چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں کبھی آپ کے سامنے نہیں آؤں گا۔''

''یہی تو میں کرنے جا رہی ہوں کہ تو کبھی میرے سامنے نہ آئے۔''

''رانی جی! میں آپ سے رحم کی بھیک مانگتا ہوں۔''

''رحم کی بھیک اس چندا بائی سے مانگو جسے تم نے میری جگہ دی ہے۔ اسے آواز دو کہ مرہٹہ سرداروں کو لے کر میرے مقابلے پر آئے۔''

''اسے تو معلوم بھی نہیں کہ میں کہاں ہوں۔''

''اسے یہ تو معلوم ہو گا کہ تم اسے لے کر بھاگ گئے تھے۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گا کہ بھاگنے والی اور بھاگنے والے کی سزا کیا ہے۔''

''میں اس کے جواب میں یہی کہوں گا کہ ہم دونوں پر رحم کرو۔''

''میں اتنا رحم ضرور کروں گی کہ تمہیں آسان موت دوں۔''

تارا بائی نے کہا اور اسے تنہا چھوڑ کر کمرے سے نکل گئی۔ غالباً دھنا جادو سے مشورے کے لیے گئی تھی۔ اس کے نکلتے ہی ہنونت رائے نے کمرے میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ اسے اپنے مطلب کی چیز نظر آ گئی۔ میز پر ایک خنجر رکھا ہوا

تھا۔ تارا بائی کی نظر نہیں پڑی تھی ورنہ وہ اسے کبھی وہاں نہیں رہنے دیتی۔ ہنونت رائے خاموشی سے اٹھا، خنجر اٹھایا اور اپنے سینے میں اتار لیا۔ ایک دبی سی چیخ نکلی اور وہ فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ تارا بائی واپس آئی تو اس نے ہنونت رائے کو خون میں لت پت فرش پر پڑے دیکھا۔ اس کے پیچھے پیچھے دھنا جادو بھی آیا تھا۔ وہ بھی اس منظر کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

"رانی جی! یہ آپ نے کیا کر دیا؟"

"میں تو اسے اچھا خاصا چھوڑ کر گئی تھی۔ میرا خنجر یہاں رکھا تھا۔ یہ خنجر اس نے خود اپنے سینے میں اتارا ہے۔ یہ ٹھنڈا ہو چکا ہے۔ اب اس کی لاش ٹھکانے لگانے کا انتظام کرو۔"

دھنا جادو نے جھک کر اس کی نبض دیکھی اور مایوسی سے گردن جھٹک دی۔

"دیکھ کیا رہے ہو..... اٹھو اور اس کی لاش کو قلعے کی دیوار سے نیچے پھینک دو۔"

تارا بائی کو اس کی موت کا افسوس نہیں تھا۔ دکھ تھا تو یہ کہ وہ اپنے ہاتھ سے اسے موت کی نیند نہ سلا سکی۔ اب اس کی سب سے بڑی دشمن چندا بائی تھی لیکن وہ اس کی دسترس سے دور تھی۔

یہ کام بھی دھنا جادو ہی کر سکتا تھا اور اس وقت وہ اسے یہی سمجھا رہی تھی۔

☆☆☆

بادشاہ دریائے کشنا کے کنارے دیوگانو کے مقام پر ٹھہرا ہوا تھا کہ بیماری نے اس کے بدن کو جکڑ لیا۔ جوڑوں کا درد شدت سے اٹھا۔ یہیں اسے خبر ملی کہ اس کا ایک قلعہ "کندانہ" مرہٹوں کے قبضے میں چلا گیا ہے لیکن اس وقت وہ ہلنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ اس مہم کو اس نے کچھ دنوں کے لیے ٹال دیا۔

وہ اپنی بیماری کو چھپاتا رہا تاکہ انتشار پیدا نہ ہو لیکن ایک بار غشی طاری ہوئی تو قریبی لوگوں پر بیماری ظاہر ہوگئی لیکن اس سے پہلے کہ انتشار پھیلتا، اس کے بدن میں رفتہ رفتہ جان آتی گئی اور وہ رو بہ صحت ہوگیا۔

جب اچھی طرح صحت مند ہوگیا تو کوچ کیا اور ایک پُرمشقت سفر کے بعد پیرگاؤں پہنچ گیا۔ پھر بہادر گڑھ پہنچ کر رمضان کی وجہ سے چالیس دن کے قیام کی منظوری دے دی۔

رمضان کا مہینا گزرا تو اس نے لشکر کو قلعہ بخشندہ کی تسخیر کے لیے روانہ کیا اور خود احمد نگر کی طرف کوچ کر گیا۔ یہیں اسے قلعہ بخشندہ کی فتح کی خبر ملی۔

شہزادہ اعظم شاہ جو احمد آباد میں متعین تھا، باپ کی بیماری کی خبر سن کر پریشان ہوگیا۔ اس نے عرضداشت بھیجی کہ وہ بیماری کا سن کر پریشان ہوگیا ہے اور اس نے حضور میں پہنچنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ مجھے بھی احمد آباد کی ہوا موافق نہیں آرہی ہے۔

بادشاہ اس کی نیت کو سمجھ گیا۔ وہ شاید یہ سمجھ رہا ہے کہ میں اس دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں، وہ اس وقت میرے قریب رہنا چاہتا ہے تاکہ تخت پر قبضہ کر سکے۔

بادشاہ نے اس کی عرضی کے جواب میں لکھا۔

"انسان کو ہر جگہ کی آب و ہوا موافق آجاتی ہے بجز ہوائے نفس۔" اس بلیغ جملے میں بہت کچھ چھپا ہوا تھا لیکن اعظم شاہ اپنی ضد پر ڈٹا رہا اور عرضی پر عرضی بھیجتا رہا۔ جب بادشاہ بہت تنگ آگیا تو اس نے شہزادے کو صوبہ مالوہ پر تبدیل کر دیا۔ حکم نامہ اتنا سخت تھا کہ اسے تعمیل کرنا پڑی۔

شہزادے نے اجین جانے کی تیاری شروع کر دی۔ اس تیاری میں وہ ہنونت رائے یا چندا بائی کو بھول ہی گیا۔

چندا بائی نے سنا کہ شہزادہ مالوہ جا رہا ہے تو وہ گھبرا گئی۔ اس نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ وہ شہزادے سے مل کر اپنی بپتا سنائے لیکن اسے نہیں ملنے دیا گیا۔ شہزادہ مالوہ کی طرف روانہ ہوگیا۔

چندا بائی عجیب دوراہے پر کھڑی تھی۔ مرہٹوں کے پاس جاتی .... تو ماری جاتی۔ اعظم شاہ کی پناہ بھی چھن گئی تھی۔

شہزادے کے رخصت ہوتے ہی اس سے اس کا مکان خالی کرا لیا گیا۔ وہ سڑک پر کھڑی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کہاں جائے۔

وہ اپنی دانست میں پیدل ہی مالوہ کی طرف چل دی۔

عرصہ دراز بعد اجین میں ایک بڑھیا نظر آئی جو خود کو رام راجا کی بیوی کہتی تھی اور لوگ ہنستے ہوئے گزر جاتے تھے۔

ماخذات

مغلیہ دورِ حکومت، خافی نظام الملک، منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی،
طبقات ناصری (اردو) قاضی منہاج، تاریخ ہندوستان، ذکا اللہ

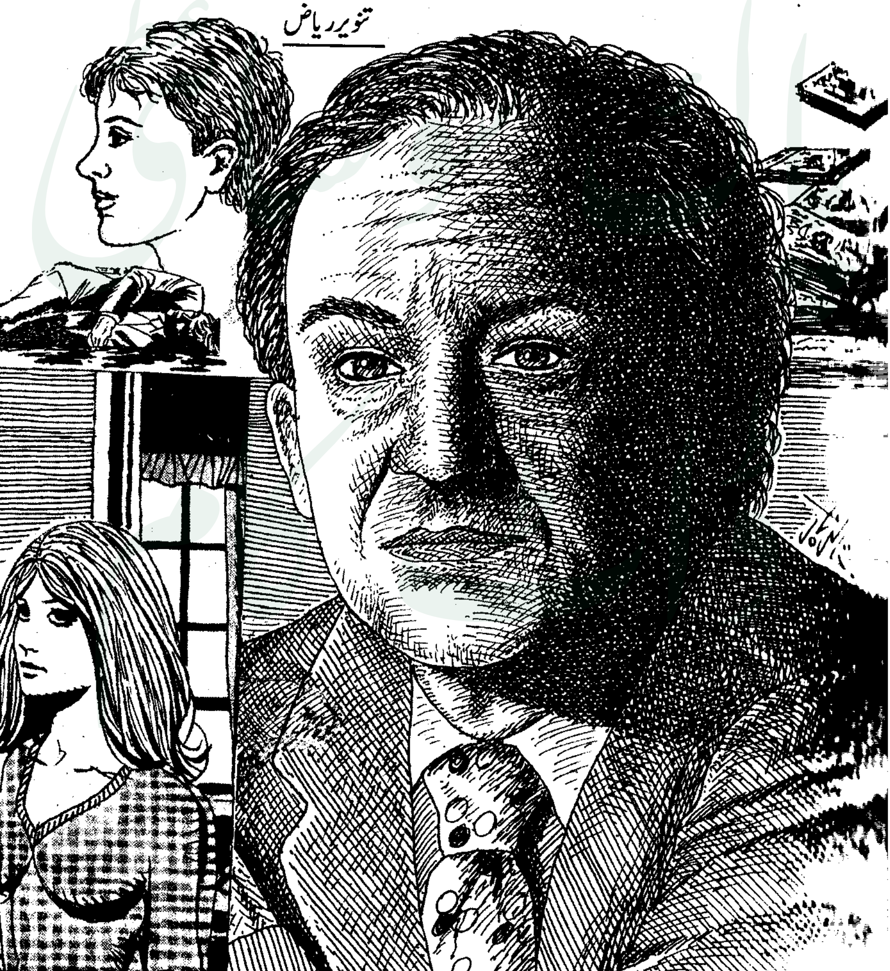
استقبالیہ کا میج میں بیٹھے ہوئے شخص سے اس نے
... ں چابیاں لیں اور باقی راستہ گاڑی چلاتے ہوئے طے
... اس وقت وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس نے بیرونی
... کا تالا کھولا اور لکڑی کی بنی ہوئی چھوٹی سی عمارت
میں داخل ہوگئی۔ دروازہ بند کر کے جب اس نے گہرا سانس
لیا تو ایک ناگوار بو اس کے نتھنوں میں اتر گئی جو یقیناً چوہوں
اور خشک پتوں کی تھی۔ ٹکٹ گھر کے دروازے کے ساتھ ہی
بجلی کا سوئچ تھا۔ اس نے نیم تاریکی میں ٹٹول کر اسے تلاش کیا

ایک ماں کی ممتا کا کڑا امتحان اور کڑوے حقائق کا سامنا

یوں تو انسان تمام عمر سفر میں ہی رہتا ہے لیکن زندگی کے سفر اور زمین کے سفر میں تھوڑا فرق ہوتا ہے۔ زندگی کے گزرتے لمحات کا نہ تو شمار ممکن ہے اور نہ ہی تعین لیکن کبھی کبھی زندگی کی حفاظت کی خاطر انسان ہجرت ضرور کرتا ہے۔ اس کے لیے بھی یہ بہت مشکل تھا لیکن اپنے لختِ جگر کے لیے اسے اس مشکل سے گزرنا ضروری تھا۔

مشکل فیصلہ

تنویر ریاض



اور لائٹ جلادی۔ اب وہ تنگ لابی اور دیواروں پر لگے ہوئے پرانے پوسٹرز دیکھ سکتی تھی۔

وہ بائیں ہاتھ کے دروازے سے آڈیٹوریم میں داخل ہوئی۔ اس میں تین سو بیس نشستیں تھیں جنہیں تین حصوں میں تقسیم کردیا گیا تھا اور ان کے درمیان دو راستے بنادیے گئے تھے۔ پہلی قطار کا ٹکٹ پچاس اور بقیہ نشستوں کا پچیس ڈالر تھا۔ آج اور کل میں ہونے والے دونوں شوز کے ٹکٹ پہلے ہی فروخت ہوچکے تھے۔ اسے حساب کتاب کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ یہ کام اس کے منیجر اگارڈ کا تھا جو ہر شو کے موقع پر کیا کرتا تھا۔

وہ پہلی بار ہوائی آئی تھی۔ ہیلو ائرپورٹ سے باہر آتے ہی اسے اور سام کو بارش کا سامنا کرنا پڑا۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور موسلادھار بارش ہورہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف جنگلات تھے۔ درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں کے درمیان وہ سڑک ایک سرنگ کے مانند معلوم ہورہی تھی۔ وہ بہت قدیم جگہ لگ رہی تھی جو اسے بالکل نامانوس لگی۔ اس سے پہلے اس نے صرف صحرا دیکھے تھے۔

وہ سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی اسٹیج پر چڑھ گئی اور وسط میں پہنچ کر پنجوں کے بل گھومی پھر اس نے خالی نشستوں پر نظر دوڑائی۔ آخری قطار کے اوپر پروجیکشن روم تھا۔ اسے وہاں جاکر یقین کرنا تھا کہ اسپاٹ لائٹ صحیح کام کرتی ہے لیکن فی الوقت وہ عقبی پردہ ہٹا کر اسٹیج کے پیچھے چلی گئی۔ یہ بہت اہم تھا کہ وہ اندھیرے میں وہاں کا راستہ جان لے۔

جب وہ ڈریسنگ روم میں پہنچی تو دروازے پر ایک خیر مقدمی کارڈ لگا ہوا تھا۔ اس نے وہ اتارا اور کھول کر پڑھنے لگی۔

”مس میڈیلین۔ کلاویا ملٹری کیمپ میں خوش آمدید، یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔“

اس کے سامان میں دو بڑے سوٹ کیس اور ایک لکڑی کا صندوق شامل تھا جس میں اس کے ملبوسات اور دیگر ضروری اشیا محفوظ تھیں۔ وہ جس شعبے سے وابستہ تھی، اس میں ظاہری نمود و نمائش اور اچھا نظر آنے کی بڑی اہمیت تھی۔ وہ کوئی الہڑ دوشیزہ نہیں بلکہ آٹھ سالہ بیٹے کی ماں تھی اور اس کے پیشے کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنی ڈھلتی ہوئی جوانی کو پُرکشش بنانے کے لیے ہر ممکن طریقہ استعمال کرے۔ جب اس کا سامان ڈریسنگ روم میں پہنچایا جارہا تھا تو وہ رات کے شو کے بارے میں تمام تفصیلات پر غور کررہی تھی۔ یہ شو اس کا تھا اور اسے کامیاب بنانے کی ذمے داری بھی اسی پر تھی گو کہ دوسرے لوگ بھی اپنا کام کررہے تھے لیکن وہ کسی پر بھروسا نہیں کرسکتی تھی۔ اسی لیے شو شروع ہونے سے پہلے انتظامات کا جائزہ لینے خود ہی چلی آئی۔

”سب کچھ ٹھیک ہے؟“ استقبالیہ پر بیٹھے ہوئے شخص نے پوچھا۔

”ہاں، ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا۔ ”بہترین...... میں سات بجے پہنچ جاؤں گی۔“

اس نے استقبالیہ پر بیٹھے ہوئے شخص کو تھیٹر کی چابیاں دیں اور وہاں سے روانہ ہوگئی۔ شو شروع ہونے میں اب بھی چار گھنٹے باقی تھے اور اس کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ اپنی عارضی رہائش گاہ پر سام کے ساتھ وقت سے پہلے کھانا کھالیتی۔

”میڈم!“

یہ آواز سن کر وہ دروازے پر ہی رک گئی اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دروازے کے کنارے پر جھکا ہوا شخص اب شرما رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید وہ اس سے کسی پوسٹر پر دستخط کرنے کے لیے کہے گا۔ اگارڈ نے پہلے ہی کافی تعداد میں پوسٹرز بھیج دیے تھے جو چھ مختلف ڈیزائنوں میں تھے لیکن اس کا پسندیدہ پوسٹر وہ تھا جس میں وہ ملکہ تھی سینٹ میڈیلین ایک پشتے پر کھڑی ہوئی تھی اور اس کے عقب میں جہازوں کا قافلہ اپنی منزل کی جانب روانہ ہورہا تھا۔ یہ پوسٹر اس نے تین سال پہلے شنگھائی میں بنوائے تھے اور اس کے بعد ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

”آخری دو ٹکٹ باقی بچے تھے۔“ اس آدمی نے کہا۔ ”وہ میں نے خرید لیے لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اپنی بیوی کو یہاں آنے پر آمادہ کرسکوں گا یا نہیں۔“

اس نے اس کے علاوہ بھی کچھ کہا تھا جس پر میڈیلن نے دھیان نہیں دیا۔ اس کے شو کی نوعیت ہی ایسی تھی جسے زیادہ تر عورتیں دیکھنا پسند نہ کرتیں لیکن وہ اس معاملے میں کچھ نہیں کرسکتی تھی۔

اب وہ شخص اس کی طرف دیکھنے کے بجائے اپنے فون پر بوکھلاہٹ میں کچھ بول رہا تھا لیکن وہ اندازہ کرسکتی تھی کہ وہ کیا جاننا چاہ رہا ہے۔

”تم نہیں جانتے کہ وہ اسے پسند بھی کرسکتی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اگر وہ اسے مناسب لگے۔“

اس شخص نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین نہیں ہے۔“

”بہت سے مرد اپنی بیویوں یا دوست لڑکیوں کو

ا ہاں۔''

''ہاں، یہ تو ہے لیکن وہ بہت زیادہ قدامت پرست ہے۔''

''کچھ عورتیں خود بھی آجاتی ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''اور وہ یہ شو کو مردوں سے زیادہ پسند کرتی ہیں۔''

اس شخص کے کان لوؤں تک سرخ ہوگئے۔ وہ اس کی حالت پر مسکراتی ہوئی کاٹیج سے باہر آگئی اور وہاں اتر کر کار کی طرف چل دی۔ ملٹری کیمپ سے نکل کر وہ آتش فشاں کے ساتھ والی سڑک پر چل دی اس کے دونوں طرف سرخ پھولوں سے لدے ہوئے درخت تھے جو دیکھنے میں ہی بہت کمزور اور نازک لگ رہے تھے کیونکہ آتش فشاں کے قریب ہونے کی وجہ سے وہاں کی مٹی بھربھری تھی۔ وہ جنگل کے درمیانی خلا سے آتش فشاں کا نظارہ کرسکتی تھی۔ اسے سیال چٹان کی سیاہ پرت صاف نظر آرہی تھی۔ اس کے سوراخوں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ جب میڈیلین نے کھڑکی کا شیشہ نیچے گرایا تو کہر آلود بارش میں گندھک کی بُو رچی ہوئی محسوس ہوئی۔

گاؤں پہنچ کر اس نے ایک جنرل اسٹور کے پاس گاڑی روکی تاکہ ڈنر کے لیے کچھ چیزیں خرید سکے پھر وہ اپنی عارضی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوئی اور تمام راستے مسٹر اگارڈ کی بتائی ہوئی ہدایات کے بارے میں سوچتی رہی۔ وہ اس شو کو ہر صورت میں کامیاب دیکھنا چاہتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ میڈیلین اس بارے میں بھرپور تعاون کرے۔

وہ گھر پہنچی تو سام آتش دان کے سامنے کرسی پر سو رہا تھا لیکن آتش دان میں آگ روشن نہیں تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا لیکن وہ پھر بھی نہیں اٹھا۔ میڈیلین نے مناسب نہ سمجھا کہ اس کی نیند خراب کرے اور اس کے لیے کھانا بنانے میں مصروف ہوگئی۔ جیسے ہی وہ فارغ ہوئی، سام بھی نیند سے بیدار ہوگیا۔ میڈیلین نے اسے آواز دے کر کھانے کے لیے بلایا۔ وہ چاہتی تھی کہ تھیٹر جانے سے پہلے اسے کھانا کھلادے ورنہ وہ ایسے ہی سوجائے گا۔

جب سام کھانے کی میز پر بیٹھا تو وہ سوچنے لگی کہ اس کا بیٹا کتنا لمبا ہوگیا ہے۔ اب اسے پہلے کی طرح کرسی پر چڑھنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ وہ اس پر آرام سے بیٹھ سکتا تھا۔

''کیا تمہیں بھوک لگ رہی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''تھوڑی سی۔''

''تمہیں یہ گھر پسند آیا؟''

''ہاں۔ میں نے کھڑکی سے باہر پرندے دیکھے تھے۔ ان میں ایک سبز رنگ کا پرندہ بہت خوب صورت تھا۔ اس کی چمکیلی سفید آنکھیں تھیں۔''

''تمہیں رات کو ڈر تو نہیں لگا؟'' اس نے پوچھا۔

''مسٹر اگارڈ نے مجھے ایک عورت کا نمبر دیا ہے۔ وہ بہت اچھی ہے اور وہ تمہارے ساتھ یہاں ٹھہر سکتی ہے۔''

''مجھے اب ڈر نہیں لگتا۔''

''بہتر ہوگا کہ تم اسے آنے دو۔'' وہ اس کے لیے پلیٹ لے کر آئی اور اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''کبھی کبھی سب کو ڈر لگتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات میں بھی ڈر جاتی ہوں۔''

سام اسے یوں دیکھنے لگا جیسے وہ مذاق کررہی ہو۔

''بالکل...... میں بھی ڈر جاتی ہوں۔''

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ گزشتہ شب ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ ہونولولو چائنا ٹاؤن میں واقع ہوائی تھیٹر میں شو کررہی تھی۔ جب وہ اسٹیج پر آئی تو اسپاٹ لائٹ کی روشنی اس پر پڑی۔ اس کی نظر حاضرین پر گئی۔ ہزاروں مردوں اور عورتوں کی نگاہیں اس پر مرکوز تھیں لیکن ایک شخص کے بغیر اسے تھیٹر خالی خالی لگتا۔ وہ دس قطاریں چھوڑ کر ہال کے وسط میں بیٹھا ہوا تھا۔ آخری بار اس نے اسے آٹھ برس قبل دیکھا تھا۔ اس وقت وہ تھوڑا دبلا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اسپاٹ لائٹ کی روشنی ایک بار پھر اس پر پڑی اور وہ اس میں پوری طرح نہا گئی۔ اس کے گرد روشنی کا ہالا تھا اور تماشائی دم بخود یہ منظر دیکھ رہے تھے لیکن وہ اس شخص کو دیکھ کر خوفزدہ ہوگئی تھی۔

اس کے بعد اس نے دو مرتبہ اس آدمی کی نشست پر نظر دوڑائی لیکن اب وہاں ایک دوسرا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ وہاں پورے وقت رہا ہو، ممکن ہے کہ اس نے کسی مختلف چہرے کا تصور کیا ہو۔

وہ شو ختم ہونے کے فوراً بعد سیدھی ہوٹل آئی۔ اس نے سام کو سوتے میں بستر سے اٹھایا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگئی۔ دوسری صبح آنکھ کھلنے پر اس نے دیکھا کہ یہ وہ جگہ نہیں ہے جہاں وہ گزشتہ شب سویا تھا لیکن اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ وہ ان باتوں کا عادی ہوچکا تھا۔

کھانا ختم کرنے کے بعد اس نے برتن دھوئے۔ سام

کو بستر میں لٹایا اور اس کے کمرے کا نائٹ بلب جلا دیا۔ اب وہ ایک بار پھر گاڑی چلا رہی تھی۔ ایک بار پھر وہی مناظر اس کی نظروں کے سامنے تھے۔ بارش، آتش فشاں سے اٹھتی ہوئی بھاپ اور سڑک کے دونوں اطراف درختوں کا جنگل۔ اس کی منزل تھیٹر تھی جہاں اسے آج رات اور اگلے روز شو کر کے پیسے بنانے تھے۔ اس کا دماغ چار جگہوں پر تھا لیکن دل صرف ایک ہی میں پڑا ہوا تھا جو یہاں کرائے کی گاڑی میں موجود نہیں تھا۔ وہ اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کیا وہ یہاں بھی آسکتا ہے؟ اس خیال کے آتے ہی اس کے دل میں خدشات سر اٹھانے لگے۔

اس مرتبہ تھیٹر کا عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اسی راستے سے کسی کو ملے بغیر اندر داخل ہوئی۔ وہاں پہلے ہی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ان میں افسران، نچلے درجے کے افسر اور دوسرے لوگ شامل تھے جو اس جزیرے اور کیمپ میں آرام و تفریح کی غرض سے آئے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کیا دیکھنا چاہتے ہیں اور وہ کیسے انہیں کچھ دے سکتی ہے۔ اسی لیے وہ عقبی دروازے سے آئی تا کہ کوئی اسے پردہ اٹھنے سے پہلے نہ دیکھ سکے۔

وہ مخملیں پردے کے پیچھے تاریکی میں کھڑی ہوئی لباس تبدیل کر رہی تھی۔ اس نے پورے جسم پر پرفیوم چھڑکا اور مخصوص انداز میں بال بنائے جن میں نو انچ لمبی جواہرات سے مرصع پنیں لگی ہوئی تھیں۔ روشنیوں کا رخ دوسری جانب ہوا تو حاضرین کی بے چینی بڑھ گئی اور وہ دھیمے لہجے میں بڑبڑانے لگے۔ جب روشنیاں وہاں اسٹیج اور پردے کے درمیانی خلا پر پڑیں تو لوگوں کی بڑبڑاہٹ بھی ختم ہو گئی اور وہ پردہ اٹھنے کا انتظار کرنے لگے پھر سیکسو فون پر ایک دھن سنائی دی اور پروجیکشن روم میں بیٹھے ہوئے شخص نے مائیکرو فون پر اس کا نام پکارا جو یقیناً فرضی تھا۔

اس نے اپنے لباس پر سامنے کی جانب ہاتھ پھیر کر چولی کے نیچے بندھی ہوئی سنہری جھالر کو دیکھا پھر اس نے زپ چیک کی۔

جب تماشائیوں نے تالیاں بجانا شروع کیں تو وہ پردہ ہٹا کر اسٹیج پر آ گئی۔ اسی وقت سیکسو فون پر ڈرم کی آواز گونجی اور اس نے مسکرا کر اپنے دونوں بازو پھیلا دیے۔ وہ چلتی ہوئی اسٹیج کے ایک سرے تک گئی اور دو مرتبہ گھومی تا کہ لوگ اسے ہر زاویے سے دیکھ سکیں۔

وہ ان کے جذبات محسوس کر سکتی تھی۔ مردوں کی آنکھیں پتھرا کر رہ گئی تھیں۔ اسے ان مردوں کی بے چینی کا بھی اندازہ تھا جو اپنی بیویوں اور دوست لڑکیوں کے ساتھ آئے تھے اور جنہیں بالکل بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ اس حد تک بھی جا سکتی ہے۔

وہ چلتی ہوئی اسٹیج کے کنارے پر آئی اور اچانک ہی اس کی نگاہ دائیں کونے میں کھڑے ایک شخص پر گئی۔ جب ان کی نگاہیں ملیں تو اس نے تعظیماً سر ہلایا، جواب میں اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ یہ ایک عام سی بات تھی لیکن اچانک ہی اس کے گھٹنے تقریباً مڑ گئے اور اسے اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے ایک افسر کے کندھوں کا سہارا لینا پڑا۔ لوگوں نے تالیاں بجائیں اور اس افسر کی بیوی نے اسے گھورا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ للی سینٹ میڈیلین کبھی نہیں پھسلتی اور نہ ہی وہ بے ارادہ کوئی ایسی حرکت کرتی پھر ایسا کیوں ہوا؟ اس نے اپنا ہاتھ اس افسر کے بالوں پر پھیرا، انگلیوں سے اس کے گال چھوئے، واپس مڑی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اسٹیج پر آ گئی۔

وہاں موجود ہر آنکھ اس پر جمی ہوئی تھی لیکن وہ صرف ان دو آنکھوں کی تپش اپنے چہرے پر محسوس کر سکتی تھی۔ اس بار اس نے اپنے آپ کو بہلانے کی کوشش نہیں کی کہ یہ اس کا تصور تھا بلکہ یہ ایک حقیقت تھی کہ وہ وہاں موجود تھا۔

وہ سیڑھیاں چڑھ کر اسٹیج پر پہنچی۔ موسیقی کی آواز آہستہ ہو گئی تھی اور اس کے ہر قدم کے ساتھ اسپاٹ لائٹ کی روشنی کم ہوتی جا رہی تھی۔ اب شو ختم ہونے کا وقت قریب آ رہا تھا اور اسے آخری جھلک دکھانا تھی۔ وہ اسٹیج کے وسط میں کھڑے ہو کر اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے سامنے جھک کر دعوت نظارہ دے رہی تھی۔ وہ سانس روکے یہ منظر دیکھ رہے تھے پھر وہ ایک جھٹکے کے ساتھ سیدھی ہوئی۔ دونوں بازو سینے پر باندھ کر پیچھے ہٹی اور آہستہ آہستہ تاریکی میں گم ہو گئی۔

اسپاٹ لائٹ بجھ چکی تھی اور اس سے پھوٹنے والی سفیدی کی جگہ زردی نے لے لی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر ایک بار پھر اس کونے پر نظر ڈالی۔ وہاں کوئی نہیں تھا اور صرف لکڑی کی دیوار نظر آ رہی تھی۔ لابی کا دروازہ جھول رہا تھا جیسے وہ چند سیکنڈ پہلے ہی باہر نکلا ہو۔ ہال میں تاریکی چھا گئی تھی اور اسے صرف تالیوں کی آواز آ رہی تھی۔ وہ تیزی سے پردے کے پیچھے چلی گئی۔

ڈریسنگ روم کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور سامنے آنے کے بجائے دیوار سے پشت لگا

ا ل ہو گئی۔

'' کیا بات ہے؟''

'' مس للی؟'' ایک نوجوان شخص کی آواز آئی۔ ''سب جا چکے ہیں۔ اب ہم صفائی کر رہے ہیں۔''

'' ٹھیک ہے۔''

'' تم کل کے لیے اپنا سامان یہیں چھوڑے جا رہی ہو؟''

'' ہاں۔''

'' ٹھیک ہے۔ میں اس کا خیال رکھوں گا۔''

'' شکریہ۔''

وہ یونہی کھڑی اس کے جانے کا انتظار کرتی رہی پھر اس نے سلک کا لباس اور ایک لمبا کشمیری کوٹ اور چھوٹی ایڑی کے جوتے پہنے۔ اس کے بال ابھی تک اسی انداز میں بنے ہوئے تھے اور اس نے جیولری بھی نہیں اتاری تھی۔ وہ اپنی کار تھیٹر کے عقبی دروازے پر چھوڑ کر آئی تھی اور اس کا ارادہ تھا کہ وہ مزید دیر کے بغیر سام کے پاس چلی جائے گی۔ اس نے کسی سے ملنے کا پروگرام نہیں بنایا تھا لیکن اتفاق سے پیش آنے والے واقعات کے بارے میں وہ کوئی منصوبہ بندی نہیں کر سکتی تھی۔ جب تک وہ اپنے گھر میں داخل ہو کر دونوں دروازے اندر سے مقفل نہ کر لیتی، اسے للی سینٹ میڈیلین کے روپ میں ہی رہنا تھا۔

تھیٹر کے باہر موسم سرد اور مطلع صاف تھا۔ بادل چھٹ چکے تھے اور آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اس کا استقبال کیا تو اس نے کوٹ کے بٹن بند کر کے کالر کھڑے کر لیے۔ چاندنی کی روشنی میں وہ پہاڑ کی چوٹی پر برف کی ہلکی تہ دیکھ سکتی تھی۔ ایسے موسم میں اسے زکام ہو جاتا تھا اور فی الوقت وہ اس سے بچنا چاہ رہی تھی ورنہ اس کے لیے اگلے دن شو کرنا مشکل ہو جاتا۔ اسی لیے اسے جلد از جلد گھر جانے کی جلدی تھی تاکہ بیماری سے محفوظ رہ سکے۔

'' تم آج بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔''

اسے چیخنے کی بھی مہلت نہ مل سکی۔ اس سے پہلے ہی وہ گھوما اور اس نے للی کے پیٹ پر ریوالور رکھ دیا۔ اس نے پلٹ کر عقبی دروازے کی طرف دیکھا تو اس شخص نے للی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

'' محافظ تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے اور اگر انہوں نے ایسا کرنے کی کوشش کی تو یہ ان کے حق میں بھی برا ہوگا۔ گاڑی کی چابی مجھے دو۔''

للی نے خاموشی سے چابی اس کے حوالے کر دی۔ اس شخص نے ہاتھوں پر دستانے چڑھائے ہوئے تھے۔ اس نے

کونسا بھائی

کلاس میں ٹیچر نے بچے سے پوچھا۔ ''اگر تمہارے پاس کیک کے دو پیس بچے ہوں، ایک بڑا اور ایک چھوٹا پیس تو تم اپنے بھائی کو کون سا پیس دو گے؟''

بچہ بولا۔ ''پہلے آپ یہ بتائیے کہ آپ کون سے بھائی کی بات کر رہے ہیں۔ بڑے بھائی کی ...... یا چھوٹے بھائی کی......؟''

☆☆

خراب حالات

ایک صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بہت اچھا خط لکھ دیتے ہیں۔ ایک ان پڑھ بوڑھا شخص ان کے پاس جا کر کہنے لگا۔ ''صدر صاحب کے نام میری طرف سے خط لکھو اور انہیں میری بری حالت سے آگاہ کرو۔''

وہ شخص خط لکھ چکا تو بوڑھے شخص نے کہا۔ ''ذرا پڑھ کر سناؤ۔'' اس نے پڑھ کر سنایا تو بوڑھا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس شخص نے پوچھا۔

'' کیا بات ہے تم رو کیوں رہے ہو؟''

تو بوڑھا شخص بولا۔ ''مجھے خود معلوم نہ تھا کہ میرے حالات اتنے خراب ہیں۔''

☆☆

دولت

آج کل لوگ کہتے ہیں کہ دولت سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے...... لیکن کبھی کبھی دولت بھی بے کار ہوتی ہے۔ پڑھ کر اندازہ لگائیے۔ یہ انتخاب شیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کی حکایات سے ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک فقیر ایک وسیع و عریض صحرا میں راستہ بھٹک گیا۔ اس دوران اس کے پاس کھانے پینے کا سامان نہ رہا۔ آخر سفر کی تکلیف اور بھوک پیاس سے وہ ہلاک ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد وہاں سے فقیروں کے ایک ٹولے کا گزر ہوا۔ انہوں نے اس کی لاش کو وہاں پڑے دیکھا۔ اس کے پاس چند درہم پڑے ہوئے تھے اور انگلی سے یہ لکھا ہوا تھا۔

'' اگر کسی کے پاس بہت سا خالص سونا بھی ہو تو بھی وہ بغیر توشہ کے ایک قدم بھی سفر نہیں کر سکتا۔ جنگل میں ایک خستہ حال فقیر کے لیے ابلے ہوئے شلجم بھی خالص سونے چاندی سے بہتر و مفید ہیں۔''

(مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال)

ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھول کر سر ہلایا اور وہ سمجھ گئی کہ آج رات کیا ہونے والا ہے۔ یہ مسئلہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہا، وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اور اپنی طرف کا دروازہ بند کرلیا۔ اب وہ اس کے بیٹھنے کا انتظار کررہی تھی۔ وہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتی تھی کیونکہ چابیاں اس شخص کے پاس تھیں۔

"تم نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ دوبارہ مجھے دیکھ سکوگی۔"

"نہیں۔"

"گاڑی اسٹارٹ کرو۔ ہمیں اس کیمپ سے نکلنا ہے۔"

وہ تنگ و تاریک سڑکوں پر گاڑی چلاتی رہی۔ وہ تفریحی مرکز سے گزر کر کاٹیجز کی قطار کے ساتھ چلتے رہے۔ جو وارنٹ آفیسر سے کم درجے کے لوگ کرائے پر لے سکتے تھے۔ جب وہ ہاف مون ڈرائیو وے پر آئے اور نیشنل پارک پہنچے تو اس نے کار روک دی۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے اور سڑک پر کوئی دوسری کار نہیں تھی۔

"دائیں جانب موڑلو۔"

اس نے گاڑی موڑی اور ہیڈ لائٹس کی روشنی میں آگے بڑھتی رہی۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ سڑک کہاں تک جاتی ہے اور کتنے فاصلے تک سیاہ چٹانوں کے ساتھ ساتھ چلتی رہے گی، جب تک کہ وہ اگلی آبادی تک نہیں پہنچ گئے۔

"تم سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ میں تمہیں تلاش کرلوں گا بلکہ تمہارا اندازہ تھا کہ کبھی دیکھ بھی نہیں پاؤں گا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری بلکہ کبھی سوچا بھی نہیں کہ تم مجھ سے جدا ہوگئی ہو۔"

اس نے تائید میں سر ہلا دیا۔ اس سے اختلاف کرنا خطرناک ہوتا۔ بالخصوص اس صورت میں جبکہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اگر اس تک پہنچنے میں اسے آٹھ برس لگے تو اسے یہ جاننے میں بھی بہت وقت لگا ہوگا کہ وہ کس دولت سے محروم ہوگیا ہے۔

"بہت سی دوسری لڑکیاں تھیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "تم سے پہلے اور تمہارے بعد اور یہ تم بھی جانتی ہو۔ ممکن ہے کہ میں کسی کو بھی موردِ الزام ٹھہراتا۔"

"تھوڑی دیر کے لیے یہ بات میرے دماغ میں آئی تھی۔"

"لیکن میں تمہارے بارے میں ہمیشہ سوچتا رہا۔"

"میں نہیں جانتی۔"

"اور تم ہی میرے ساتھ والٹ تک گئیں۔ میں تمہارے علاوہ کبھی کسی کو ساتھ لے کر نہیں گیا۔"

"ہم کہاں جارہے ہیں؟" للی نے بات بدلنے کے لیے کہا۔

"یہاں سے بائیں جانب موڑلو۔"

وہ ایک پتھریلے راستے پر مڑ گئی جو ایک خالی پارکنگ لاٹ کی طرف جاتا تھا۔ اس نے آخری سرے کی جانب اشارہ کیا تو اس نے وہاں جاکر کار روک لی۔ اس شخص نے اگنیشن سے چابیاں نکالیں اور انہیں اپنی جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ "باہر آجاؤ۔"

وہ گاڑی سے باہر نکلی اور دروازے سے لگ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ اس شخص نے للی کا بازو اوپر اٹھایا اور کوٹ کے اندر بائیں جانب ریوالور کی نال پوری قوت سے پیوست کردی۔ نال کے اوپر ابھرے ہوئے دھاتی ٹکڑے نے گردے کے اوپر اس کا لباس پھاڑ دیا اور وہاں سے خون رسنے لگا لیکن وہ کچھ نہیں بولی۔

"آؤ اوپر چلتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "وہاں سے اس جگہ کا نظارہ کریں گے۔"

وہ پتھریلی سڑک پر چلتے رہے۔ اس کا بازو للی کی کمر کے گرد تھا اور ریوالور بدستور اس کے پہلو سے لگا ہوا تھا۔ اس جگہ درخت چھوٹے اور اونچائی میں کم تھے۔ ہوا تیز چل رہی تھی۔ جب وہ اونچائی پر پہنچے تو اس نے ایک میل کے فاصلے پر سوراخ سے نارنجی رنگ کا لاوا نکلتے دیکھا۔ اس سے نکلنے والا دھواں تیز ہوا کی وجہ سے آسمان کی جانب پانچ سوفٹ کی بلندی تک جارہا تھا۔

"تم نے مجھے کیسے تلاش کرلیا؟" للی نے پوچھا۔

"اس لیے کہ تم مجھ سے نہیں چھپ سکیں۔" اس نے کہا۔ "تم نے اپنا نام اور بالوں کا رنگ تبدیل کرلیا پھر ایک نئے چہرے اور شناخت کے ساتھ منظرِ عام پر آئیں لیکن اس کے باوجود بھی بہت کچھ ظاہر ہورہا تھا اور جب میں نے تمہیں دیکھنا شروع کیا تو مجھے یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ للی سینٹ میڈیلین کے نقاب کے پیچھے کون ہے۔"

اس نے گھوم کر پستول کی نال اس کے چہرے کے سامنے کردی اور گولی چلانے کے لیے تیار ہوگیا۔ اسے یہ اطمینان تھا کہ اس ویرانے میں فائر کی آواز سننے والا دور دور تک کوئی نہیں۔ اس کے باوجود اس نے گولی چلانے میں توقف کیا کیونکہ اس نے ابھی تک للی سے گمشدہ رقم کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔

"تمہیں یاد ہے کہ تم پہلی بار مجھے کب ملے تھے؟" للی نے اس سے پوچھا۔

"وینٹین میں۔ تم ان دنوں رقص و موسیقی کے



جگمگاتی جھلملاتی تحریریں لیے ستمبر 2017ء کا دلہن نمبر

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

شیریں حیدر اور **رفعت سراج** کے خوب صورت سلسلے وار ناول......نئی اقساط لیے

سیما رضا ردا نے اپنے منی ناول **ہم کو عبث بدنام کیا** میں دکھائے کرداروں کے نت نئے رنگ

سحرش فاطمہ کے سحر انگیز بیان کا ترجمان مکمل ناول...... **میری دھوپ کی تم ہی چھاؤں**

عالیہ حرا کی نفسیاتی تحقیق کا نچوڑ ایک جاندار ناول...... **اشک، جگنو اور ستارے**

نگہت اعظمی، سعدیہ رئیس اور **فرح طاہر** کی خصوصی کہانیاں

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی قرآنی تحقیق اور حج کی باسعادت مناسبت سے **اختر شجاعت** کا پُرشکوہ مضمون

وہ آئے بزم میں......

ہماری سینئر رائٹر **صبیحہ شاہ**

کی صباحت بھری آمد

شائستہ زریں کا سنہرا روپہلا روپ لیے ایک جامع **سروے**

اس کے علاوہ

دلہن نمبر کے لیے شوخ وشنگ اور کہیں سنجیدہ رنگ لیے **فوزیہ احسان رانا، المیس جبار، ہالہ احمد، اُمِ ثمامہ، حنادیہ احمد، دانیہ آفرین، نگہت غفار** و دیگر ہنر مند لکھاریوں کی حسین تحریریں

اس کے ساتھ، ساتھ دلچسپ اور پُر تحقیق کارنرز، سحر انگیز شاعری، خوش ذائقہ پکوان، قابلِ عمل نسخے اور بہت بہت پُرلطف احوال...... صرف آپ کی اعلیٰ ذوقی کی نذر

پروگراموں میں حصہ لیتی تھیں۔ میں نے تمہاری مدد کی تھی۔''

وہ شوگرل نہیں بلکہ ملبوسات کی ڈیزائنر تھی لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ دونوں صورتوں میں اسے اپنے آپ کو نمایاں کرنا ہوتا تھا۔

''تم مجھے اپنے گھر لے گئے تھے جو شہر سے باہر پہاڑیوں پر واقع تھا۔ رات کا وقت تھا۔ یاد ہے تم نے مجھ سے کیا کہا تھا؟''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں نے کیا کہا تھا۔''

''تم نے جو وعدہ کیا، وہ پورا نہیں ہوا۔ میں ایک آوارہ عورت ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتی تھی۔''

''اسی لیے تم نے یہ حرکت کی؟''

''وہ پوری رقم میرے حصے میں نہیں آئی۔ میرے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔''

للی نے دیکھا کہ اس نے اپنی انگلی ٹریگر پر رکھ لی ہے اور وہ کسی بھی لمحے گولی چلاسکتا ہے۔ اس نے قدم آگے بڑھایا اور اس کے قریب ہوتے ہوئے اس طرح دھکا دیا کہ اگر وہ فائر کرے تو گولی اس کے سر پر سے گزر جائے۔ وہ پہلے ہی اپنے بالوں میں سے ایک ہیئر پن نکال چکی تھی جو ایک نو انچ لمبی سوئی کے مانند تھی۔ وہ اس سوئی سمیت اس سے ٹکرائی اور پن اس کے جسم میں اتار دی۔ اس نے اسے رقص کے انداز میں پیچھے سے پکڑ رکھا تھا پھر اس نے اس کے جسم میں اکڑاہٹ محسوس کی اور وہ بے جان ہوگیا۔ ریوالور زمین پر گرگیا۔ اس نے اسے نیچے کیا اور اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ ہیئر پن اس کے نتھنے میں اتر گئی تھی۔ اس نے وہ نکالی اور اس کی قمیص سے اس پر لگا ہوا خون صاف کرنے لگی۔

اس نے اپنے مکان کے باہر گاڑی کھڑی کی اور کافی دیر تک اسی میں بیٹھی رہی۔ بارش دوبارہ شروع ہوچکی تھی اور وہ گیراج کی نالی دار ٹین کی چھت پر بارش کے قطرے گرنے کی آواز سن سکتی تھی۔ وہ کار سے باہر آئی اور کوٹ کے کالر مضبوطی سے پکڑ لیے۔ باہر کی بھیگی اور معطر فضا میں سانس لینے سے اس کے حواس بحال ہوئے۔ اس جنگل میں اور بھی مکان تھے لیکن بارش اور تاریکی کی وجہ سے نظر نہیں آرہے تھے لیکن وہ ان کی چمنیوں سے نکلنے والے دھوئیں کو محسوس کرسکتی تھی۔ اس کے علاوہ تاریکی میں اسے مینڈکوں کے ٹرانے اور پرندوں کے پر پھڑپھڑانے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔

سام گیسٹ روم میں سو رہا تھا۔ وہ اس کے بستر کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر کچھ دیر کے لیے بیٹھ گئی۔ کھلی کھڑکی سے بارش کے قطرے گرنے کی آواز اس کے کانوں میں آرہی تھی لیکن اس کی نظریں سام کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ پھر وہ کچن میں گئی اور اس نے صابن سے اچھی طرح اپنے ہاتھ دھوئے پھر اس نے اپنے کوٹ سے ہیئر پن نکال کر اسے بھی واشنگ پاؤڈر اور پانی سے صاف کیا۔ اس کے بعد ایک بار پھر اپنے ہاتھ رگڑ رگڑ کر دھوئے۔ یہاں تک کہ ہتھیلیاں سرخ ہوگئیں۔

اب اسے صرف ایک ہی کام کرنا تھا کہ مسٹر اگارڈ کے پروگرام پر سختی سے عمل کرے۔ اسے کل رات کا شو کرنے کے بعد آئندہ تین روز یہیں گزارنا تھے۔ چوتھی صبح انہیں بذریعہ کار ہبلو جانا تھا جہاں سے وہ پہلی پرواز کے ذریعے آکلینڈ روانہ ہوجاتی وہاں انہیں چند چھوٹے تھیٹرز اور کلبوں میں شوز کرنا تھے۔ سام اب بڑا ہو رہا تھا اور اس کی ہر رات ایک مختلف کمرے میں گزرتی تھی۔ اس لیے اسے تنہا چھوڑنا ٹھیک نہیں تھا اس طرح وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن سکتا تھا یا اگر اسے کسی طرح یہ پتا چل جاتا کہ اس کی ماں اسٹیج پر کیا تماشا دکھاتی ہے تو وہ اس سے نظریں ملانے کے قابل نہ رہتی۔ اسی لیے وہ سوچ رہی تھی کہ اس ''محفوظ'' رقم کو کسی ایسی جگہ لگادے جہاں سے اسے ہر ماہ ایک معقول معاوضہ ملتا رہے اور خود یہ بے ہودہ کام چھوڑ کر دوبارہ ملبوسات کی ڈیزائنر بن جائے۔

''یہ کیا ہے؟'' سام نے پوچھا۔ ''کیا ہو رہا ہے؟''

''تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہوگا۔'' اس نے کہا۔ ''کچھ نہیں ہوا۔ میں تمہارے پاس موجود ہوں۔''

وہ دوبارہ لیٹ گیا۔ وہ بھی اس کے برابر میں لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے نائٹ گاؤن پہن رکھا تھا۔ کمرے میں ٹھنڈ ہونے کے باوجود کمبل لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور بارش کی آواز سننے لگی۔ اس نے سوچا کہ شاید یہ بارش رات بھر ہوتی رہے گی اور ایسا ہی ہوا۔ وہ بستر پر کروٹیں لیتی پوری رات بارش کی آواز سنتی رہی۔

اگلی رات جب اسٹیج پر اسپاٹ لائٹ نے روشنی کا ہالا بنایا اور ہال میں موسیقی کی آواز گونجنے لگی تو اس نے پہلے کی طرح اپنے لباس پر ہاتھ پھیرا اور اپنے جسم کے گرد لپٹا ہوا اثاثہ چیک کرنے لگی جو وہ ہمیشہ کیا کرتی تھی۔ اس کے بائیں پہلو میں ہلکی سی چبھن ہو رہی تھی لیکن اس کے علاوہ سب ٹھیک تھا۔

وہ پردہ ہٹا کر اسٹیج پر آئی تو اس کا زبردست تالیوں سے استقبال کیا گیا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح اسٹیج پر.... ماڈرن لباس میں...... چکر لگایا تاکہ سب حاضرین اسے دیکھ سکیں۔ اس نے گزشتہ روز کی طرح اپنے فن کا مظاہرہ کیا

اور لما شائقین کی سانسیں رک گئیں۔ وہ آگے کی طرف جھکے اس پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ پھر روشنیاں بجھ گئیں اور اس نے تاریکی میں شو کا آخری حصہ پیش کیا۔ بے اختیار اس کی نظر اسی کونے پر گئی۔ وہاں دیوار کے ساتھ ایک آدمی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے سفید قمیص کے ساتھ سیاہ رنگ کا جیکٹ سوٹ پہن رکھا تھا اور دونوں بازو سینے پر باندھے ہوئے تھے۔

روشنیاں بجھ گئیں اور وہ پردے سے گزر کر واپس اسٹیج کے عقب میں چلی گئی۔ وہ اس شخص کو نہیں جانتی تھی لیکن اسے معلوم تھا کہ وہ وہاں کیوں آیا ہے۔ وہ لباس تبدیل کررہی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو اس کے سامنے وہی سوٹ والا کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ بھی کندھوں کی طرح چوڑا تھا اور صرف سفید بالوں سے ہی اس کی عمر کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کارڈ نکال کر اسے دکھایا۔ اس پر لکھا ہوا تھا۔

''تھامس کوٹلی۔ اسپیشل ایجنٹ۔''

''مس میڈیلین۔'' وہ بولا۔ ''تم جانتی ہو کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟''

''یقیناً میں نہیں جانتی۔'' اس نے کہا۔ ''کیا تم اندر آنا پسند کروگے؟''

اس نے دروازہ کھولا اور اسے اندر آنے کے لیے راستہ دیا پھر دروازہ بند کر کے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اس کے سامنے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی۔

''میں نے تمہارا شو دیکھا۔ امید ہے کہ تم کچھ خیال نہیں کروگی؟''

''شکریہ۔''

''میں نے ٹکٹ نہیں خریدا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن میں تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ کیا تم کارلوس ڈالٹز نام کے کسی شخص کو جانتی ہو؟''

''نہیں۔''

اس نے جیکٹ کی جیب سے ایک تصویر نکالی اور ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی۔ وہ کم از کم دس سال یا اس سے بھی زیادہ پرانی تھی۔ اس وقت کارلوس کے چہرے پر ڈاڑھی نہیں تھی اور اس کا چہرہ بھی کافی دبلا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ گزشتہ شب شو دیکھنے آیا تھا۔'' للی نے تصویر دیکھ کر کہا۔

''تم نے اسے دیکھا تھا؟''

''اگر وہ کسی نشست پر بیٹھا ہوتا تو شاید میری نظر اس پر نہ جاتی۔ وہ پیچھے کونے میں دیوار کے ساتھ کھڑا ہوا تھا جہاں آج تم تھے۔''

''کیا تم نے اس پر توجہ دی؟''

''ہاں جیسے میں نے آج تمہیں دیکھا اور اس کی وجہ ایک ہی ہے جو میں بتا چکی ہوں...... اگر کوئی شخص میرے شو میں نشست پر بیٹھنے کے بجائے کھڑا ہوا ہو تو وہ میری توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔''

''اوہ، میں سمجھا۔'' ایجنٹ کوٹلی بولا۔ اس نے للی کے ہاتھوں کی طرف دیکھا جو اس نے اپنی رانوں پر رکھے ہوئے تھے۔ ''وہ دو دن پہلے ہونولولو میں بھی تمہارا شو دیکھنے آیا تھا؟''

''میں نے اسے وہاں نہیں دیکھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن شاید تم نے اسے دیکھ لیا؟''

''میں وہاں موجود نہیں تھا لیکن ہم نے ایسا سنا ہے۔'' وہ بولا۔ ''کیا اس نے تم سے بات کرنے کی کوشش کی...... گزشتہ شب یا دو دن قبل؟''

''نہیں۔''

وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح اس سے نظر بچا کر اپنا ہاتھ سر تک لے جائے اور پنوں کو بالوں کے اندر گہرائی تک گھسیڑ دے تاکہ وہ نظر نہ آئیں۔ وہ اپنے چہرے کی تپش کو چھپانے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ گالوں پر رکھنا چاہ رہی تھی لیکن اس کے بجائے اس نے ڈریسنگ ٹیبل سے کارلوس کی تصویر اٹھائی۔ پہلے اس کا چہرہ دیکھا پھر اسے پلٹ کر دیکھنے لگی۔ وہاں کچھ نہیں لکھا ہوا تھا۔

''یہ کون ہے؟''

''ایک خطرناک شخص۔'' ایجنٹ کوٹلی نے کہا۔ ''ایک ایسا شخص جس سے تم کبھی ملنا نہیں چاہوگی۔ ہم کافی دنوں سے اسے تلاش کررہے ہیں۔''

''کیا وہ تمہیں مل گیا؟''

''ہاں۔ ہم نے اسے تلاش کرلیا۔'' وہ بولا۔

یہ کہہ کر اس نے ڈریسنگ روم کا جائزہ لیا۔ وہاں وہ سب چیزیں موجود تھیں جو اس نے گزشتہ شب پہن رکھی تھیں۔ لباس، کشمیری کوٹ جس کے کف پر خون کا ایک بہت ہی چھوٹا سا دھبا لگا ہوا تھا۔ ہیئر پنیں وغیرہ وغیرہ۔

''تمہیں یقین ہے کہ تم نے ہونولولو میں اسے نہیں دیکھا؟''

''ہاں۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں۔''

''گزشتہ شب وہ کسی کے ساتھ آیا تھا۔ کیا اس کے برابر میں کوئی اور موجود تھا؟''

''وہ اکیلا ہی تھا۔'' اس نے کہا۔ ''وہ پروگرام ختم ہونے سے پہلے ہی چلا گیا تھا۔ جب روشنیاں گل ہوئیں تو وہ

بغلی دروازے سے باہر نکل چکا تھا۔ اس کے بعد میں نے اسے دوبارہ نہیں دیکھا۔''

''ٹھیک ہے۔'' ایجنٹ کوٹلی نے کہا۔

للی چاہ رہی تھی کہ وہ اٹھ جائے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اب بھی کمرے کا جائزہ لے رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ گزشتہ شب اس سے کہیں کوئی غلطی تو نہیں ہوئی، وہ خوفزدہ تھی۔ اس کے ہاتھ سردی کی وجہ سے سُن ہو گئے تھے۔ کارلوس کو وہاں سے ہٹانا ناممکن تھا۔ اس نے اسے وہیں چھوڑ دیا جہاں وہ گرا تھا لیکن کیا ہوگا اگر اس نے اس کی قمیص کے بٹن کو چھو لیا ہو یا قمیص سے ہیئر پن پر سے خون صاف کرتے ہوئے اس پر انگلیوں کے نشانات آ گئے ہوں۔

''صرف ایک بات اور۔'' کوٹلی اس کے بائیں کولہے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے شو میں تمہیں ماڈرن لباس میں دیکھا۔ تمہارے بائیں جانب ایک خراش ہے جسے تم نے میک اپ سے چھپایا ہے۔''

اس نے بے خیالی میں اس جگہ کو چھوا۔ ابھی تک اسے چبھن محسوس ہو رہی تھی۔ اگر انہیں کارلوس کا ریوالور چیک کرنے کا خیال آ گیا تو وہ جائے وقوعہ پر اس کی موجودگی ثابت کر سکیں گے۔ اس کے بعد سب کچھ واضح ہو جائے گا۔ وہ اس کی ہیئر پنیں تلاش کرلیں گے اور انہیں ان میں سے وہ پن بھی مل جائے گی جس سے کارلوس کو قتل کیا گیا۔ انہیں وہ چھوٹی سی پیتل کی چابی بھی مل جائے گی جس سے سیف ڈپازٹ بکس کھولا جا سکتا تھا اور جو اس نے اپنی کمر کے ساتھ باندھ رکھی تھی اور جب وہ کارسن سٹی جا کر بینک کے والٹ میں اس کا سیف ڈپازٹ بکس کھولتے تو انہیں پوری بات سمجھ میں آ جاتی۔ اس قتل کا ایک محرک تھا۔ وہ سمجھ جائیں گے کہ کارلوس اس کا پیچھا کیوں کر رہا تھا اور اس نے ناک میں نو انچ لمبی پن کیوں گھسیڑی جو اس کے دماغ تک چلی گئی۔

''مس میڈیلین! تم اس خراش کے بارے میں کچھ بتاؤ گی؟''

''میرا بیٹا...... اسے سوتے میں ڈراؤنے خواب آتے ہیں۔ اسی لیے میں گزشتہ شب اس کے ساتھ سوئی تھی تاکہ اسے پُرسکون رکھنے کی کوشش کر سکوں۔''

''کیا تم یہ کہہ رہی ہو کہ یہ خراش اس کی وجہ سے آئی ہے؟''

''ہاں۔''

''اس کی کیا عمر ہے؟''

''آٹھ سال۔''

''اس وقت وہ کہاں ہے؟''

''میں نے ایک مکان کرائے پر لیا ہے۔ وہ وہیں ہے۔ اس کے پاس ایک آیا بھی ہے اگر تم چاہو تو میرے ساتھ چل کر اس سے بات کر سکتے ہو۔''

کوٹلی نے کچھ دیر کے لیے سوچا پھر اس نے تصویر اٹھا کر جیکٹ میں رکھی اور کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''مس میڈیلین! تمہارے وقت کا شکریہ۔''

اس کے جانے کے بعد للی نے دروازہ بند کیا، چند لمحے اس کی ناب پکڑے کھڑی رہی پھر چلتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل تک آ گئی۔ اس نے اپنا سامان اٹھایا اور گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہاں کوئی آیا نہیں تھی۔ اس نے شرمندگی سے بچنے کے لیے ایجنٹ سے جھوٹ بولا تھا ورنہ وہ یہی سمجھتا کہ وہ بچے کو گھر پر اکیلا چھوڑ کر آئی ہے۔ اس نے... بلاسوچے سمجھے ایف بی آئی ایجنٹ کو گھر چلنے کی پیشکش کر دی تھی، اگر وہ مطمئن نہ ہوتا اور انٹرویو ختم کر کے نہ چلا جاتا تو ظاہر ہے کہ کیا ہونا تھا۔ سام کو دیکھتے ہی وہ جیکٹ کی جیب سے کارلوس کی تصویر نکال لیتا۔ دونوں چہروں کی مماثلت اسے بہت کچھ بتا دیتی۔ اس کے بعد وہ جو کچھ بھی کہتی، اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی کیونکہ وہ جان جاتا کہ آج رات اس نے جو کچھ کہا، وہ سب کچھ جھوٹ ہے۔ درحقیقت للی سینٹ میڈیلین نہیں بلکہ کارلوس کی سابق محبوبہ تھی اور یہ حماقت اسے جیل پہنچا سکتی تھی۔

اس نے ایک نظر سوئے ہوئے سام پر ڈالی۔ اس کا باپ دنیا میں نہیں رہا تھا لیکن اس کا ترکہ محفوظ تھا۔ اس نے سام کے محفوظ .... مستقبل کی خاطر یہ جوا کھیلا تھا۔ کارلوس کے ساتھ مل کر بینک میں ڈاکا ڈالا اور اسے چکما دے کر ساری رقم لے کر فرار ہو گئی۔ اس نے اپنا نام، شخصیت، پیشہ سب کچھ بدل ڈالا اور ایک نئی شکل لے کر شہر شہر خانہ بدوشوں کی طرح پھرتی رہی، کارلوس بھی پیچھا کرتا ہوا اس تک پہنچ گیا اور پھر وہ ہو گیا جس کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس بار تو وہ ایجنٹ کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گئی لیکن اب اسے کوئی مستقل حل تلاش کرنا ہوگا تاکہ کوئی سام کو دیکھ کر کارلوس کے ساتھ اس کے تعلق کو نہ جان سکے۔ بہت سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اسے بیٹے سے جدائی کا کڑوا گھونٹ پینا ہوگا۔ وہ سام کو بورڈنگ اسکول میں داخل کرا دے گی اور خود میڈیلین کے بھیس میں شہر شہر گھومتی رہے گی۔ یہ ایک مستقل فیصلہ تھا لیکن اسی میں اس کی بہتری تھی۔

❋ ❋

فنکار

اسما قادری

یہ کیسی عجیب بات ہے جب یہ کہا جائے کہ ہنرمند کو اس کی ہنرمندی کھاگئی... تو ایک لمحے کے لیے انسان سٹپٹا کر رہ جائے۔ کچھ ایسا ہی منظر یہاں بھی منتظر تھا... وہ جو اپنے فن میں یکتا تھے... ایک دوسرے کے دوست اور غم گسار تھے کہ اچانک ہیرے کے مانند محبت سے چمکتی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں پھوٹنے لگیں کیونکہ... ایک کا فن دوسرے کی فنکاری پر کاری ضرب لگا رہا تھا مگر... قسمت کی بساط پر اچانک بازی پلٹی اور دونوں نے اپنا فن ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ دفن بھی کر دیا کیونکہ ہنرمندوں کو ان کی ہرمندی کھاگئی تھی۔

ہاتھوں کی فنکاری اور ذہانت کی تلوار کے مابین

معرکہ آرائی

میں ایک فنکار ہوں..... میری اپنے بارے میں یہی [illegible] ئے ہے اور میں اس رائے سے دوسروں کا متفق ہونا [illegible] وری نہیں سمجھتا۔ میں ایک حقیقت پسند انسان ہوں اور اظہار رائے کی آزادی سے کسی فرد کو محروم نہیں دیکھنا چاہتا۔ مسئلہ صرف دوسروں کے اتفاق کرنے کا ہے ورنہ سچ بتایئے کہ آج کے دور میں دوسروں کی جیب سے پیسا نکلوانا اور اس فنکاری کے باوجود پولیس کی نظر میں آنے سے محفوظ رہنا کوئی آسان بات تو نہیں ہے۔ میں ان اونچے درجے کے فنکاروں



کی بات نہیں کر رہا جنہیں بڑے بڑے وزیروں، سفیروں اور مشیروں کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے یا وہ خود کسی اونچی کرسی پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے مجھ جیسے معمولی فنکار کا ان اعلیٰ فنکاروں سے کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ وہ تو دھڑلے سے لوگوں کا مال تو کیا، بال اور بال کی کھال بھی نکال کر معصوم ہی رہتے ہیں اور پولیس سمیت کسی بھی قانون لاگو کرنے والے یا احتسابی ادارے کی یہ ہمت نہیں ہو پاتی کہ ذرا گرم نظر سے ہی ان کی طرف دیکھ لیں۔

میں نے بتایا نا کہ میں ایک حقیقت پسند آدمی ہوں اور میری اپنے بارے میں یہ حقیقت پسندانہ رائے ہے کہ میں ایک چھوٹا فنکار ہوں جنہیں ہمیشہ معاشرے میں بڑی ناقدری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی ناقدری کے سبب لوگ مجھ جیسے فنکاروں کو چور اچکا کہہ کر پکارتے ہیں۔ ان ناشائستہ القابات کے باوجود میں اپنے فنکار ہونے کے دعوے سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہوں کیونکہ میں وہ عام سا چور اچکا نہیں ہوں جو کچھ چرانے کے چکر میں بھی پکڑا جاتا ہے اور پبلک کے ہاتھوں ''چندے کی مار'' کھانے کے بعد پولیس کے ریکارڈ میں ہمیشہ کے لیے مشکوک افراد کی فہرست میں شامل ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ مجھے بڑے قابلِ رحم محسوس ہوتے ہیں کیونکہ ان بے چاروں کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ جیسے ہی علاقے میں کوئی واردات ہوتی ہے اور پولیس پر مجرم کی گرفتاری کے لیے کہیں سے دباؤ پڑتا ہے تو وہ سب سے پہلے ان افراد پر ہی ہاتھ ڈالتی ہے اور انہیں پولیس کے ہاتھوں اچھی طرح ''لٹنے'' اور ''پٹنے'' کے بعد ہی تھانے سے باہر آنا نصیب ہوتا ہے۔ میں ان بیوقوفوں اور مظلوموں میں شامل نہیں ہوں اس لیے خود کو فنکار کہنے میں حق بجانب محسوس کرتا ہوں۔

میں کوئی بھی شے حاصل کرنے کے لیے پوری منصوبہ بندی اور احتیاط سے کام کرتا ہوں اور اس بات کا خیال رکھتا ہوں کہ جس مال پر میں ہاتھ ڈال رہا ہوں وہ اتنا بھی زیادہ قیمتی نہ ہو کہ مالک اس کی واپسی کے لیے ''غل'' مچا کر رکھ دے اور بے چارے پولیس والوں کو اپنا آرام ختم کر کے خواہ مخواہ حرکت میں آنا پڑے۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی خیال رکھتا ہوں کہ کسی بہت پہنچ والے آدمی کے مال پر ہاتھ نہ ڈالوں۔ اس طرح کے لوگ معمولی نقصان کو بھی انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں اور خود کو لوٹنے والے پر اپنی حیثیت اور اختیارات ثابت کرنے کے لیے ہاتھ دھو کر پولیس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ وہ مجرم کو تلاش کر کے حاضر کریں چنانچہ بے چارے پولیس والوں کا جینا دوبھر ہو جاتا ہے چنانچہ جب پولیس کی دم پر پیر پڑتا ہے اور مجبوراً وہ ذمے دار تک پہنچ جاتی ہے تو اسے اس جرم میں بڑی بُری طرح رگڑا لگایا جاتا ہے۔ میں کیونکہ ایسی کوئی حماقت نہیں کرتا اس لیے پولیس والوں کو مجھ سے اور مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں تھی اور ہم اپنی اپنی دنیا میں بڑے سکون سے جی رہے تھے لیکن اپنی تازہ ترین فنکاری کے بعد میں بڑے عذاب میں ہوں اور میری حالت اس بے چارے چھوٹے اور گمنام فنکار کی سی ہے جس سے اتفاق سے کوئی بہت بڑا شاہکار تیار ہو گیا ہو اور وہ انگشت بدنداں ہے کہ کوئی اس شاہکار کو اس کی کاریگری تسلیم بھی کرے گا یا نہیں۔

میرے خیال میں مجھے اپنے بارے میں کچھ اور تفصیل سے بتانا چاہیے۔ میرا نام صادق احمد ہے اور میں مناسب حد تک تعلیم یافتہ بھی ہوں اسی لیے میرے پاس ایک چھوٹی سی فیکٹری میں اسٹور کیپر کی ملازمت بھی موجود ہے جس میں تنخواہ نہایت نامعقول ملتی ہے اور اس تنخواہ میں دل کے ارمان پورے کرنا تو دور کی بات، ضروریاتِ زندگی پوری کرنا بھی سخت دشوار ہے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ میں ایک چھڑا چھانٹ آدمی ہوں اور ایک دو کمرے کے ڈربے نما کرائے کے فلیٹ میں تنہا رہتا ہوں۔ اس ڈربے کے کرائے، بجلی، گیس و پانی کے بلوں کی ادائیگی، ملازمت پر جانے کے لیے استعمال ہونے والی اپنی کھٹارا سی بائیک کے پیٹرول اور اعلیٰ درجے کے گھٹیا ہوٹلوں سے کھائے جانے والے کھانے کے بلوں کی ادائیگی میں اٹھنے والے اخراجات پورے کرنا بھی میری تنخواہ میں ممکن نہیں ہے اسی لیے میرے اندر سویا ہوا فنکار جاگا اور میں نے پارٹ ٹائم کے طور پر اپنے اس فن کا استعمال شروع کر دیا۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ دوست، احباب اور آس پاس والوں کو اپنی تنخواہ میں ہی بہ مشکل گزارہ کرنے والا آدمی نظر آؤں لیکن موقع محل دیکھ کر اپنے دل کے ارمان اپنی فنکارانہ کمائی سے پورے کرتا رہتا ہوں۔ دن میں ایک آدھ ٹائم اچھا کھانا، کسی چھٹی والے دن اچھے لباس میں معیاری تفریح گاہ کی سیر، گھر میں بہت چھپا کر رکھے گئے قیمتی اسمارٹ فون سے فرضی آئی ڈی پر سوشل میڈیا پر ماہ جبینوں سے دوستیاں، میرے وہ مشاغل ہیں جو میری کلاس کے ناآسودہ فرد کو بڑی آسودگی بخشتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں بہت سمجھداری سے کچھ رقم بھی پس انداز کرتا رہتا ہوں جس کے بارے میں میری پلاننگ ہے کہ مناسب وقت آنے پر اس سے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دوں گا اور اپنی بلیک منی کو وہائٹ بنانے کا انتظام کرنے کے بعد فیکٹری کی نوکری چھوڑ کر بیوی کی چاکری اختیار کر لوں گا۔ ہر نوجوان کی طرح میرے دل میں بھی شادی

لے ارمان مچلتے رہتے ہیں لیکن میں نے تہیہ کررکھا ہے کہ اپنے ساتھ کسی اور کو غربت کی چکی میں پیسنے کے لیے اس تنگ و تاریک فلیٹ میں نہیں لاؤں گا اور اسی وقت شادی کروں گا جب میرے شانے ایک فیملی کا بوجھ اٹھانے کے لائق ہوسکیں گے۔

میں آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا کہ مجھ سے وہ فنکاری سرزد ہوگئی۔ اس روز میں نے اچھا بھلا تفریح کے موڈ میں ایک تفریح گاہ کا رخ کیا تھا اور وہیں قائم ریسٹورنٹس میں سے کسی میں اچھا ڈنر کرنے کا بھی ارادہ رکھتا تھا کہ پارکنگ میں چھوٹی سی مہران سے اترتی اس خوبصورت عورت کو دیکھ کر میری نیت بدل گئی۔ اوہ! شاید میں کچھ غلط کہہ گیا ہوں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ اس خوبصورت عورت کے ہاتھ میں موجود خوبصورت سے کلچ کو دیکھ کر میری نیت بدل گئی۔ عورت اکیلی تھی اور خاصی معقولیت سے تیار نظر آرہی تھی۔ اس کی گاڑی اور شخصیت بہرحال ایسی نہیں تھی کہ میں اسے کسی بہت ہائی کلاس خاندان کی فرد سمجھتا اس لیے میں نے اسے اپنا شکار سمجھنے میں زیادہ پس وپیش سے کام نہیں لیا اور اپنی کسی حس کے تحت اس کے کلچ میں سے معقول رقم برآمد ہونے کی امید پر اچانک ہی اس پر حملہ آور ہوگیا۔

وہ بہت وسیع وعریض پارکنگ تھی جہاں روشنی کا زیادہ اچھا انتظام نہیں تھا۔ میں نے اپنے رومال سے اپنے آدھے چہرے کو ڈھانپا اور عورت کی پشت پر پہنچ کر اچانک ہی اس کا منہ دبوچ لیا، یوں اسے چیخنے کا ذرا بھی موقع نہ ملا اور میں نے پھرتی سے اس کا چھوٹا سا کلچ چھیننے کے بعد اپنی بڑی سی جیب میں منتقل کرلیا۔ میرے اس عمل کے دوران وہ بری طرح پھڑکی اور تڑپی تھی لیکن میری آہنی گرفت سے چھٹکارا پانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں نے اس کی مزاحمت پر سرگوشی میں اسے یہ بات بھی سمجھادی تھی کہ میرے ہاتھوں اس کی جان بھی جاسکتی ہے اور ظاہر ہے جان جانے کے بعد اسے نہ تو میری گرفتاری سے کوئی فائدہ حاصل ہوسکتا تھا اور نہ ہی اپنے کلچ کی واپسی سے۔ عورت سمجھدار تھی۔ اس نے میرا یہ نکتہ سمجھ لیا اور میں نہایت اطمینان سے اس کے منہ میں اس کا دوپٹا ٹھونس کر اور اسے اس کی ہی گاڑی میں مقفل کرکے وہاں سے نکل گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر وہاں پارکنگ میں کیمرے ہوئے اور ... خوش قسمتی سے ورکنگ کنڈیشن میں ہوئے تب بھی اتنی کم روشنی میں میری شکل واضح نہیں ہوسکے گی، چنانچہ میں اطمینان سے وہاں سے رخصت ہوگیا اور راستے میں ایک معمولی ہوٹل سے کھانا لے

کر واپس اپنے ڈربے میں جاپہنچا۔

گھر پہنچ کر میں نے کلچ کھول کر دیکھنے میں کسی بے تابی سے کام نہیں لیا اور اطمینان سے کھانا کھا کر اور ایک پیالی چائے بنا کر یوں کلچ کو کھولنے بیٹھا جیسے کوئی شخص آفس میں ادھوری رہ جانے والی فائل کا مطالعہ کرنے بیٹھا ہو۔ کلچ کھولنے پر اس میں سے دو ڈھائی ہزار کی رقم برآمد ہوئی جو میں نے ایک طرف رکھ دی اور رقم ہی کے ساتھ برآمد ہونے والی اس چھوٹی سی مخملیں تھیلی کو کھول کر دیکھنے لگا جس میں میرے اندازے کے مطابق کوئی چھوٹا موٹا طلائی زیور موجود ہوسکتا تھا لیکن تھیلی کو الٹتے ہی میری آنکھیں خیرہ ہوگئیں اور اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے ہی رہ گئی۔ وہ جگر جگر کرتے سات عدد ہیرے تھے جو میری توقع کے بالکل برخلاف اس تھیلی سے برآمد ہوئے تھے۔ میں نے خود کو غلط فہمی کا شکار محسوس کرتے ہوئے انہیں ہاتھ میں لے کر قریب سے دیکھا اور مجھے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے۔ وہ بالکل اصلی ہیرے تھے اور میں اس لیے اتنے وثوق سے یہ بات کہہ سکتا تھا کہ اوائل جوانی میں، میں نے ایک جیولر کے ہاں بھی کام کیا تھا اور اچھا خاصا کام سیکھ چکا تھا۔ بعد میں وہ جیولر کسی معمولی بات پر مجھ سے ناراض ہوگیا اور نوکری سے نکال دیا تو میں نے بھی دوبارہ کسی اور جیولر کی دکان کا رخ نہیں کیا اور کسی اور کام دھندے میں لگ گیا۔ اصل میں اوائل جوانی میں، میں نے جو اتنے بہت سے متفرق کام کیے تھے انہوں نے ہی مجھ جیسے آدمی کو فنکار بنایا تھا لیکن اس وقت یہ فنکار اس طرح حیران پریشان بیٹھا تھا کہ جیسے اس نے مائیکل اینجلو یا پکاسو کے درجے کا کوئی شاہکار تخلیق کر ڈالا ہو اور اب اس الجھن میں ہو کہ اس کی اس تخلیق کو تسلیم کون کرے گا۔

میرے جیسی حیثیت کا آدمی بھلا کیسے کسی کو یقین دلاسکتا تھا کہ یہ سات عدد بیش قیمت ہیرے میری ذاتی ملکیت ہیں۔ میں تو ایسا کوئی دعویٰ کرنے کی کوشش بھی کرتا تو دھرلیا جاتا۔ میرے ہاتھ بالکل اچانک لکشمی آگئی تھی لیکن میری یہ اوقات نہیں تھی کہ لکشمی کا مالک ہونے کا دعویٰ کرپاتا اور یہی میری سب سے بڑی پریشانی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اگر یہ ہیرے اپنی صحیح قیمت پر بک گئے تو میرے سارے دلدر دور ہوجائیں گے اور میں جو قطرہ قطرہ کرکے دریا بنانے کی جدوجہد میں لگا ہوا ہوں، بڑی آسانی سے میری کلاس بدل جائے گی لیکن بات وہی تھی کہ میں ان ہیروں کو کس کے ہاتھ فروخت کرنے جاتا۔ میں چوری شدہ مال فروخت

کرنے کے چکروں میں نہیں پڑتا تھا کیونکہ اس میں پکڑے جانے کا بہت زیادہ امکان ہوتا ہے۔ کسی بھی شکار پر ہاتھ ڈالتے ہوئے میری پہلی ترجیح کیش ہوتا تھا۔ موبائل فون چھیننے یا خواتین کے زیورات اتارنے کے تردد میں، میں کبھی نہیں پڑا تھا۔ البتہ بعض اوقات خواتین کے پرس سے یہ چیزیں بھی نکل آتی تھیں جن میں سے موبائل فون سے تو میں فوراً ہی جان چھڑا لیتا تھا۔ البتہ چھوٹی موٹی جیولری کا میرے پاس اچھا خاصا ذخیرہ ہو چکا تھا جن میں سے ایک آدھ چیز میں وقتاً فوقتاً، نہایت مہذبانہ حلیے میں مختلف جیولرز کے ہاتھوں فروخت بھی کرتا رہتا تھا۔ معزز حلیے میں چھوٹی موٹی چیزیں فروخت کرنے والوں سے نہ تو کوئی جیولر رسید کی فرمائش کرتا ہے اور نہ ہی شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس لیے میرا کام آرام سے چل رہا تھا اور میں کبھی شک وشبے کی زد پر نہیں آیا تھا لیکن ان ہیروں کا معاملہ مختلف تھا۔ کوئی چھوٹا موٹا جیولر تو ان کی خرید میں دلچسپی ہی نہیں رکھ سکتا تھا اور بڑے جیولر کے پاس جانے کی میری اپنی ہمت نہیں تھی کیونکہ مجھے اس صورت میں اپنے دھر لیے جانے کے پورے پورے امکانات نظر آرہے تھے۔ یوں میں اتنی بڑی دولت کا مالک بن کر بھی پریشان تھا اور میرے دن رات عجیب سی پریشانی میں گزر رہے تھے۔ دولت واقعی اپنے ساتھ بے سکونی لاتی ہے۔

☆☆☆

میں ایک سپر اسٹور کے پرفیومز والے سیکشن میں کھڑا غور وفکر کر رہا تھا۔ اصولاً اس جگہ کھڑے ہو کر مجھے پرفیوم کے انتخاب کے سلسلے میں غور وفکر کرنا چاہیے تھا لیکن ان خوبصورت چمکتی دمکتی اور شفاف ورنگین شیشیوں کو دیکھتے ہوئے نہ جانے کیسے میرا دھیان خود بخود ان خوبصورت چمکتے دمکتے اور تراشیدہ ہیروں کی طرف چلا گیا جو میں نے اپنے گھٹیا سے فلیٹ کی ایک بوسیدہ سی الماری میں بڑی حفاظت سے رکھے ہوئے تھے اور جن کے بارے میں، میں ابھی تک فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ مجھے ان ہیروں کا کیا کرنا چاہیے لیکن وہ ایسی چیز بھی نہیں تھے کہ میں انہیں فراموش کر دیتا۔ وہ ہیرے ہر وقت میرے ذہن پر سوار رہتے تھے اور کسی بھی چیز میں مجھے ان کا عکس دکھائی دے جاتا تھا جیسے کہ کسی سچے عاشق کے ساتھ، جس طرف آنکھ اٹھاؤں تیری تصویراں ہیں والا معاملہ ہوتا ہے تو میں بھی اس وقت پرفیومز کی نازک اور خوبصورت بوتلوں کو دیکھتے ہوئے اپنی ملکیت میں آنے والے ان ہیروں کو یاد کرتے ہوئے دل ہی دل میں ٹھنڈی آہیں بھر رہا تھا کہ اچانک ہی میری نظر اس

خوبصورت عورت پر پڑ گئی۔ عورت کی شکل اور عقل دونوں ہی نے لمحے بھر کے لیے مجھے مبہوت کر دیا۔ شکل نے اس لیے کہ یہ وہی عورت تھی جس سے چھینے گئے کلچ میں سے وہ سات بیش قیمت ہیرے برآمد ہوئے تھے اور عقل نے اس لیے کہ میں نے اس بھرے پُرے اسٹور میں، جہاں ہر طرف کیمروں کی موجودگی بھی یقینی تھی، اسے نہایت صفائی سے ایک قیمتی امپورٹڈ پرفیوم کی بوتل کو اپنے شولڈر بیگ میں منتقل کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے یہ کام اتنی صفائی سے کیا تھا کہ مجھے یقین تھا انسان تو کیا کیمرے کی آنکھیں بھی دھوکا کھا گئی ہوں گی اور کہیں اس کی یہ حرکت گرفت میں نہیں آئی ہوگی۔ میں خود اگر ایک فنکار نہ ہوتا تو اس کی فنکاری کو نہیں پکڑ سکتا تھا۔ بہرحال میں نے اس کی اس حرکت کو کسی پر عیاں نہیں ہونے دیا اور خود اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ جس حلیے میں تھی، اس پر کسی بہت امیر کبیر خوشحال عورت کا گمان ہو رہا تھا حالانکہ اس سے قبل میں نے اسے جس حلیے میں دیکھا تھا، وہ مجھے قدرے خوشحال تو محسوس ہوئی تھی لیکن اتنی امیر نہیں جتنی آج محسوس ہو رہی تھی۔

میں عجیب مخمصے میں پھنس گیا تھا کہ اس کی کلاس کے بارے میں کیا تعین کروں۔ اس سے چھینے گئے کلچ میں سے جو ہیرے برآمد ہوئے تھے، وہ بھی ایک طرح سے اس کی امارت کے گواہ تھے لیکن جو حرکت کرتے ہوئے میں نے اسے دیکھا تھا، اس کی کسی امیر عورت کو ضرورت نہیں تھی۔ دنیا کی ہر شے جن کی رسائی میں ہو، انہیں اس طرح چھوٹی موٹی چوریاں کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہوتی ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ اپنی کسی نفسیاتی گرہ کی وجہ سے ایسی حرکتیں کرتے پھریں۔ اس عورت کی حقیقت جاننے کے لیے میں نے اس کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا اور خود کو خریداری میں مصروف ظاہر کرتے ہوئے تھوڑے فاصلے سے اس کی نگرانی کرتا رہا۔

میں سپر اسٹورز میں خریداری سے زیادہ شغل کے لیے جانے والا بندہ تھا اور دو ڈھائی گھنٹے کی مٹرگشت کے بعد وہاں سے مشکل سے دو چار چیزیں ہی خریدتا تھا لیکن اس روز مجبوراً مجھے اپنی ٹرالی میں چند چیزوں کا اضافہ کرنا پڑا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرا نوٹس لے اور میری خالی ٹرالی دیکھ کر اسے یہ شک گزرے کہ میں اس کے پیچھے ہوں۔ بظاہر تو وہ بڑی بے نیازی دکھا رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں عجیب سی چوکسی اور مستعدی تھی اور یوں لگ رہا تھا کہ وہ وہاں موجود ہر شخص کو اندر تک ٹٹول رہی ہے۔ میری طرف بھی اس نے نگاہ ڈالی تھی لیکن میرے عام سے کپڑوں اور شخصیت کی وجہ سے

... میں اسے کچھ ایسا قابلِ توجہ محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ جسے ... کے لائق سمجھ رہی تھی اسے بھی میں نے تاڑلیا تھا۔ وہ ... لمبا چوڑا اور سرخ وسفید آدمی تھا جس کی خوشحالی اس کے ... ے اور لباس سے ٹپکی پڑ رہی تھی۔ وہاں ایسے کئی لوگ ... تھے لیکن وہ شخص اس کے لیے یقیناً اس لیے قابلِ توجہ ٹھہرا تھا کہ اس کا بٹوا نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ کارڈ سے ادائیگی کرنے والوں کی بھیڑ میں ایسے دولت مند بھی بہرحال موجود ہوتے تھے جو اپنے ساتھ خاصا کیش رکھ کر لاتے تھے۔ اس موٹے کے پاس رقم کی جھلک میں نے اس وقت دیکھی تھی جب وہ بیکری والے پورشن میں نقد ادائیگی کررہا تھا۔ اس سپر اسٹور کا اصول تھا کہ ساری خریداری کا بل تو آخر میں مین کاؤنٹر پر ہی بنتا تھا لیکن بیکری کے آئٹمز کی ادائیگی وہیں قائم کیے گئے کاؤنٹر پر کرنی پڑتی تھی۔ اس خوبصورت عورت نے بھی یقیناً میری طرح وہیں پر مرد کے پاس رقم کی جھلک دیکھی تھی اور کسی لومڑی کی طرح اس کے پیچھے لگ گئی تھی۔ فروزن آئٹمز والے پورشن میں، مرد کے بہت قریب رہتے ہوئے وہ ڈیپ فریزر میں سے نگٹس کا پیکٹ نکالتے ہوئے کچھ اس طرح سے لڑکھڑائی جیسے اس کا توازن بگڑ گیا ہو اور یہ حرکت کرتے ہوئے گویا اس نے غیرارادی طور پر سہارا لینے کے لیے مرد کو تھامنے کی کوشش کی۔ اس کوشش کے شاندار نتیجے کے طور پر مرد کا بٹوا اس کی پتلون کی پچھلی جیب سے نکل کر عورت کے شولڈر بیگ میں منتقل ہو چکا تھا لیکن مرد کو ہرگز بھی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آچکا ہے۔ عورت اپنی بے ساختہ حرکت کے لیے اس سے معذرت کررہی تھی اور وہ نہایت خوش خلقی سے اس کی معذرت کے جواب میں ”کوئی بات نہیں“ کہہ کر اسے تسلی دے رہا تھا۔ اتنی خوبصورت اور حلیے سے معزز نظر آنے والی جوان عورت کا بے ساختگی میں ہی سہی، سہارا لینا اس کے لیے یقیناً ایک خوشگوار تجربہ رہا ہوگا اور وہ دل ہی دل میں اس اتفاق پر مسرور ہو رہا ہوگا۔ یہ اور بات کہ اپنے بٹوے کی غیرموجودگی کا علم ہونے پر اس کی ساری خوشی کافور ہو جاتی اور رقم سے زیادہ اپنے بے وقوف بنائے جانے کا احساس اسے شاید کئی دنوں تک اہانت کے احساس میں مبتلا رکھتا۔

مجھے اس موٹے سے کوئی خاص ہمدردی نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسے دولت مندوں کی جیب سے بھرا ہوا پرس نکل جانے کی صورت میں ان کا کچھ نہیں بگڑتا۔ ایسی رقوم تو شاید ان کے لیے دریا میں ایک قطرہ پانی کے برابر ہوتی ہوں۔ میں صرف عورت کی فنکاری کی طرف متوجہ تھا اور اس کے لیے میرے دل میں تجسس پل پل اور بڑھ گیا تھا ... میں اس کے لیے عورت کا لفظ بھی کچھ غلط ہی استعمال کر رہا تھا ... بڑی عمر کی لڑکی تھی جس کی عمر تیس کے ہندسے سے تھوڑی ادھر یا اُدھر معلوم ہوتی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ موٹے کی جیب ہلکی کرنے کے بعد زیادہ دیر وہاں نہیں رکی اور ادائیگی والے کاؤنٹر کا رخ کیا۔ بہرحال اس کے انداز میں کسی قسم کی عجلت یا گھبراہٹ نہیں تھی اور وہ بڑی تمکنت سے کاؤنٹر کے سامنے لگی قطار میں اپنی ٹرالی کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ میں اس سے پہلے ہی ایک دوسرے کاؤنٹر کی قطار میں لگ چکا تھا اور اس سے پہلے ہی فارغ بھی ہوگیا تھا۔ میری کل خریداری ایک بڑے سے شاپنگ بیگ میں سما گئی تھی اور میں آرام سے اسے جھلاتا ہوا باہر نکل کر پارکنگ میں کھڑی اپنی کھٹارا موٹرسائیکل پر جا بیٹھا تھا۔ شاپنگ بیگ میں نے ہینڈل پر لٹکا لیا تھا اور اطمینان سے اس کا انتظار کررہا تھا۔

اس سپر اسٹور سے باہر نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا اس لیے مجھے اس بات کا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ میں اسے کھو بیٹھوں گا۔ تقریباً پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد میں نے اسے ٹرالی سمیت باہر نکلتے دیکھا۔ اس نے میرے مقابلے میں کافی خریداری کی تھی اور اب اس کی ساری خریداری تین چار بڑے بڑے تھیلوں کی شکل میں ٹرالی میں رکھی ہوئی تھی۔ وہ ٹرالی گھسیٹتی ہوئی پارکنگ میں موجود مہران تک گئی اور ٹرالی میں رکھے تھیلوں کو عقبی سیٹ پر رکھنے کے بعد خود ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھی۔ اس کی پارکنگ میں چھوڑی گئی ٹرالی کو شاپنگ سینٹر کا ایک باوردی ملازم کھینچ کر لے گیا تھا۔ وہاں یہی سلسلہ چلتا تھا۔ خریدار اپنا خریدا ہوا سامان گاڑیوں میں منتقل کر کے ٹرالی پارکنگ میں ہی چھوڑ دیتے تھے جنہیں مستعد ملازم فوراً اندر پہنچا دیتے تھے۔

گہرے سرمئی رنگ کی مہران پارکنگ سے نکل کر ٹریفک کے بہاؤ میں شامل ہوئی تو میں بھی اس کے پیچھے تھا۔ کئی مصروف سڑکوں سے گزر کر مہران ایک رہائشی علاقے میں داخل ہوئی تو میں نے اس سے اپنا فاصلہ کچھ بڑھا لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے اپنے تعاقب میں آتا محسوس کرے۔ رہائشی علاقے کا رخ کرتے دیکھ کر مجھے یقین سا ہو گیا تھا کہ وہ اپنے گھر جارہی ہے۔ وہ متوسط طبقے کی آبادی والا علاقہ تھا اور اس علاقے میں کسی امیر کبیر عورت کی رہائش کے امکانات نہیں تھے۔ اس کے پاس سے برآمد ہونے والے ہیروں اور اس کے آج کے حلیے کی وجہ سے اس پر امیر ہونے کا گمان کیا جاسکتا تھا لیکن اس سے سابقہ ٹکراؤ والا حلیہ، اس کی عام سی

گاڑی اور آج کی حرکتوں نے مجھے یقین سا دلا دیا تھا کہ وہ تھوڑی سی خوشحال ضرور ہے لیکن اسے امیر کبیر تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی رہائش گاہ دیکھ کر اور اس کے بارے میں ادھر ادھر سے معلومات جمع کر کے میں اپنے اندازے کی مزید تصدیق کر سکتا تھا لیکن میری یہ خواہش اس وقت ادھوری رہ گئی جب میں نے مہران کو کسی گلی وغیرہ میں مڑنے کے بجائے ایک پبلک پارک کے سامنے رکتے ہوئے دیکھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ گاڑی سے اتری اور اس کا دروازہ مقفل کر کے ادھر اُدھر دیکھے بغیر بڑے اطمینان سے پارک کے گیٹ میں داخل ہوگئی۔

وہ تقریباً دو ڈھائی بجے کا وقت تھا۔ اس بھری دوپہر میں اس کا پارک میں جانا میرے لیے حیرت کا باعث تھا اور تجسس میں مزید اضافہ ہوگیا تھا کہ وہ نہ جانے کس مقصد کے لیے پارک میں گئی تھی۔ ابھی تک میں نے اسے جتنی عجیب و غریب عورت پایا تھا، اس سے یہی گمان کر سکتا تھا کہ وہ کسی خاص مقصد کے تحت ہی پارک میں گئی ہوگی۔ اس مقصد کو جاننے کے تجسس میں، میں نے اپنی موٹر سائیکل اس کی مہران سے کافی فاصلے پر پارک کی باؤنڈری کے ساتھ کھڑی کی اور محتاط قدموں سے پارک میں داخل ہوگیا۔ وہاں ایک بینچ پر بیٹھ کر سگریٹ کے کش لگاتے دو لڑکوں کے سوا مجھے کوئی دکھائی نہیں دیا۔ وہ لڑکے بھی جس محویت سے اور فلسفیانہ انداز میں سگریٹ کے کش لگا رہے تھے اس سے مجھے یقین ہوگیا کہ ان کے سگریٹ بھرے ہوئے تھے اور اس وقت وہ بظاہر بینچ پر بیٹھے ہونے کے باوجود کہیں فضاؤں میں اڑ رہے تھے اس لیے ان سے یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی کہ انہوں نے وہاں کسی لڑکی وغیرہ کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہو۔ انہوں نے شاید مجھے بھی نہیں دیکھا۔ مجھے ان کے دیکھنے کی پروا بھی نہیں تھی۔ میں تو اس کی تلاش میں نظریں دوڑا رہا تھا جس کے پیچھے یہاں تک آیا تھا۔

آخر کار میں نے شمالی سمت لگے درختوں کی اوٹ میں اس کے فیروزی دوپٹے کی جھلک پالی۔ وہ جھلک بھی بس چند سیکنڈ کی تھی۔ البتہ اس نے میرا تجسس سوا نیزے پر پہنچا دیا تھا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ مجھ پر کوئی بہت بڑا انکشاف ہونے والا ہے۔ میں کسی ماہر جاسوس کی طرح ان درختوں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ کس درخت کے پیچھے ہوسکتی ہے، اس لیے اسی کو دھیان میں رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں اتنی ہوشیاری سے یہ کام کر رہا ہوں کہ کسی کی مجھ پر نظر نہیں پڑی ہوگی۔ درختوں کے اس سلسلے میں آگے بڑھتے ہوئے یکدم ہی میری یہ خوش فہمی دھری کی دھری رہ گئی اور دو دوسری چیزوں نے مجھ پر انکشاف کیا کہ ہوشیار میں نہیں، ہوشیار وہ تھی۔ ان دو دوسری چیزوں میں سے ایک میری گردن سے لگنے والی ریوالور کی نال اور دوسری اس کی آواز تھی۔ وہ اپنی سرد آواز میں مجھ سے کہہ رہی تھی۔

”شاپنگ بیگ نیچے رکھ دو اور اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھالو۔“ میں جو اپنی شاپنگ کو کسی چور اچکے کی بھینٹ چڑھنے سے بچانے کے لیے ہاتھ میں اٹھائے پارک میں چلا آیا تھا، اس نادر شاہی حکم کو سن کر ایک سرد آہ بھر کر اس کے حکم کی تعمیل کرنے لگا۔ اس کے سوا کوئی چارہ جو نہیں تھا۔

☆☆☆

”تم میرا پیچھا کیوں کر رہے تھے؟“ ہم دونوں سنگی بینچوں پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے حکم پر میں اسے اپنی ساری جیبیں الٹ کر اور پتلون کے پائنچے اٹھا کر دکھا چکا تھا کہ میں نے اپنے پاس کوئی ضرر رساں شے چھپا کر نہیں رکھی ہوئی ہے۔ اس اطمینان کے بعد اس نے مجھے اپنے سامنے ایک بینچ پر بیٹھنے کی اجازت دے دی تھی اور خود بھی میرے مقابل دوسری بینچ پر اس طرح بیٹھ گئی تھی کہ اس کا ریوالور والا ہاتھ اس کی گود میں دھرا تھا اور اس ہاتھ پر دوپٹے کا پلو ڈال کر اس نے ریوالور کو چھپانے کا اہتمام کر لیا تھا۔ اب دور سے کوئی ہمیں دیکھ کر یہی گمان کر سکتا تھا کہ ہم کوئی الو کی دم اور خبطی قسم کے عاشق تھے جنہیں ملاقات کے لیے بھری دوپہر کا یہی ”سہانا“ وقت ملا تھا۔ یہ تو بس میں ہی جانتا تھا کہ وہ طرح دار حسینہ کتنے خطرناک موڈ میں مجھ سے ہم کلام تھی۔

”میں نے تم سے پوچھا ہے کہ تم میرا تعاقب کیوں کر رہے تھے؟“ میری طرف سے پہلی بار میں اپنے سوال کا جواب نہ پاکر اسے کچھ اور غصہ آگیا تھا۔

”وہ...... میں بس ایسے ہی آپ کے پیچھے آگیا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اتنی خوبصورت خاتون اس سناٹے کے وقت پارک میں کیوں جارہی ہے۔ آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ہم فرزندانِ ملت کو خوبصورت خواتین کی فکر ذرا زیادہ ہی دامن گیر رہتی ہے۔“ میں نے معصومیت کا مظاہرہ کر کے اس خطرناک حسینہ سے اپنی جان چھڑانے کی کوشش کی لیکن میری یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی اور اپنے خوبصورت ہونٹوں سے خوفناک غراہٹ سی برآمد کرتے ہوئے وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

”پارک میں تو میں اب داخل ہوئی ہوں لیکن آپ

جناب تو سپر اسٹور سے ہی میرے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔ وہاں میرے علاوہ اور بھی کئی خوبصورت خواتین موجود تھیں۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کی نظرِ کرم مجھ حقیر پر ہی کیوں پڑی اور آپ نے تعاقب کے لیے میرا ہی انتخاب کیوں کیا؟'' اصولاً تو اس کے گلابی ہونٹوں سے پھول جھڑنے چاہیے تھے لیکن وہ مسلسل مجھ پر طنز کے تیر برسائے جا رہی تھی۔ آخرکار مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں نے اسے اسی کے انداز میں جواب دینے کا ارادہ کرتے ہوئے پہلے تو اسے ایک گہری معنی خیز مسکراہٹ سے نوازا پھر نہایت شیریں لہجے میں بولا۔

''اس بات سے تو انکار کی آپ نے گنجائش ہی نہیں چھوڑی ہے کہ میں سپر اسٹور سے آپ کے پیچھے ہوں۔ یقیناً آپ کافی ہوشیار خاتون ہیں اور اپنے اردگرد پر گہری نظر بھی رکھتی ہیں لیکن معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ اس ناچیز کے معاملے میں آپ سے تھوڑی سی چوک ہو گئی اور آپ اندازہ نہیں لگا پائیں کہ میری عقابی نظروں نے آپ کی فنکاری کو تاڑ لیا ہے۔ ذرا سوچیے کہ اگر میں اس وقت جبکہ آپ وہ امپورٹڈ پرفیوم اپنے شولڈر بیگ میں منتقل کر رہی تھیں یا اس موٹے کی جیب سے اس کا بٹوا نکال رہی تھیں، ذرا سا بھی شور مچا دیتا تو کیا ہوتا۔ میرے خیال میں تو آپ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہتیں۔ آج کے دور میں تو ویسے ہی ہر چھوٹے سے چھوٹا واقعہ ٹیلی ویژن یا سوشل میڈیا کے ذریعے منٹوں میں ہر ایک کے علم میں آ جاتا ہے۔ ذرا سوچیے کہ اگر ایسا ہو جاتا تو کیا ہوتا۔'' میرے الفاظ سے اس کے چہرے کا رنگ تیزی سے بدل رہا تھا اور میں اس کی کیفیت سے حظ اٹھا رہا تھا لیکن اس نے بہت تیزی سے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے، تم نے میری چوری پکڑ لی اور خاموش رہ کر مجھ پر ایک احسان کیا لیکن یوں تعاقب کی تمہیں کیا ضرورت تھی؟ کیا تم مجھ سے اپنے اس احسان کا کوئی بدلہ چاہتے ہو؟'' اس کی نظروں میں شک تھا۔ میں اس کے انداز پر آہستہ سے ہنسا پھر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔

''اپنی فنکاری کے لیے چوری کا لفظ استعمال کر کے آپ نے اپنے فن کی توہین کی ہے۔ اتنی ہنرمندی سے لوگوں کے ہجوم میں اپنا کام کر جانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ میں تو آپ سے بے حد متاثر ہوا ہوں اور آپ کو آپ کی ہنرمندی کی داد دینے آپ کے پیچھے کھنچا چلا آ رہا تھا۔''

''کیا تم مجھ سے اپنا تعارف کرواؤ گے؟'' اس نے الجھن زدہ سوچتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ میری طرف سے الجھن کا شکار ضرور ہے لیکن اس کا تناؤ کم ہو چکا ہے اور وہ پہلے کی سی چوکنی کیفیت میں اپنا ریوالور تھام کر نہیں بیٹھی ہوئی ہے۔

''میرا نام افتخار ہے۔ ماضی میں قریبی لوگ افی کہہ کر بھی پکارا کرتے تھے لیکن حال میں کوئی مجھ سے اتنا قریب نہیں ہے کہ مجھے اس نک نیم سے پکارے اس لیے اب میں صرف افتخار ہی کہلاتا ہوں۔'' میں نے اس سے اپنا تعارف کروایا۔

''کام کیا کرتے ہو؟'' اس نے مزید تفتیش جاری رکھی۔

''ایک فیکٹری میں اسٹور کیپر ہوں۔'' میں نے اختصار سے جواب دیا جس پر اس کی تسلی نہیں ہوئی اور وہ گہری نظروں سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

''بس......؟''

''کیا مطلب؟'' میں اس کے انداز پر ذرا سا گڑبڑا گیا۔

''مطلب یہ کہ کسی فیکٹری کا اسٹور کیپر تو اتنی گہری نظروں کا مالک نہیں ہو سکتا کہ مجھ جیسی بقول تمہارے ''فنکار'' کی فنکاری نوٹ کر پاتا اس لیے میرا اندازہ ہے کہ تم اس کے سوا بھی کچھ اور ہو۔ شاید میری ہی طرح کے کوئی فنکار...... کیوں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟'' اس نے تائید طلب نظروں سے میری طرف دیکھا اور میرا سر خودبخود ہی اثبات میں ہل گیا۔ اپنے اندازے کی درستگی پر وہ مسکرائی اور بولی۔

''اتفاق سے ہم، ہم پیشہ نکل آئے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ہمارے درمیان دوستی ہو سکتی ہے۔'' میں اس بار بھی احمقوں کی طرح سر ہلا کر رہ گیا اور وہ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے بولی۔

''اب جبکہ ہمارے درمیان دوستی ہو چکی ہے تو میں تم سے اپنا تفصیلی تعارف کروا دیتی ہوں۔ میرا نام شائلہ عرف شمی ہے۔ میں اندرونِ سندھ کے ایک چھوٹے سے شہر کی رہنے والی ہوں اور یہاں ملازمت کی غرض سے ایک ویمن ہاسٹل میں رہتی ہوں۔ میں نے بی اے تک تعلیم حاصل کی ہوئی ہے اور اس تعلیم کے بل بوتے پر صرف ٹیلی فون آپریٹر کی ملازمت حاصل کر سکی ہوں۔ اس ملازمت سے ملنے والی تنخواہ سے میں کراچی جیسے بڑے شہر میں اپنی اکیلی ذات کا خرچہ ہی اٹھا لوں تو بہت بڑی بات ہے لیکن میں یہاں اس لیے ملازمت کر رہی ہوں کہ مجھے اپنی فیملی کو سپورٹ کرنا ہے۔ مجھ

سے چھوٹی تین بہنیں اور ہیں۔ بھائی کوئی نہیں ہے اس لیے میں ہی اپنے ماں باپ کا بیٹا بن گئی ہوں۔ ویسے بھی میں بچپن سے ذرا مختلف مزاج کی اور جرأت مند لڑکی تھی۔ وسائل کی کمی کو میں نے کبھی اپنے لیے مسئلہ نہیں بننے دیا۔ ضرورت کی کوئی بھی چیز جو میرے پاس نہیں ہوتی تھی، میں بڑے آرام سے اپنی ہم جماعتوں اور آس پاس رہنے والی سہیلیوں سے حاصل کر لیتی تھی اور وہ بھی اتنی مہارت سے کہ کبھی کسی کو مجھ پر چوری کا الزام لگانے کی جرأت نہیں ہو سکی۔ بچپن کی یہ ہنرمندی میرے بہت کام آئی اور یہاں آ کر میں نے اپنی صلاحیت کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ شروع میں، میں ذرا کچی تھی اور تمہاری ہی طرح کے ایک نظر شناس نے مجھے عین موقع پر تاڑ لیا تھا۔ اس نے بھی تمہاری طرح شور نہیں مچایا اور مجھ سے مل کر میری غلطی کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ میری تربیت کی ذمے داری بھی سنبھال لی۔ اس کی تربیت نے مجھے اتنا ماہر کر دیا تھا کہ میں کبھی پکڑی نہیں گئی لیکن آج تم نے احساس دلایا کہ ابھی مجھ میں ایک آنچ کی کسر باقی ہے اور مجھے مزید تربیت حاصل کرنی چاہیے۔''

وہ یوں بول رہی تھی جیسے واقعی کسی اہم پیشے سے وابستہ ہو اور اپنے پیشے کے حساب سے مزید اعلیٰ تربیتی کورس کرنے کے بارے میں غور کر رہی ہو۔ میں اس کے انداز پر ہنسا اور دلچسپی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تو اب تم کیا کرو گی؟ کیا دوبارہ اپنے استادِ محترم سے رجوع کرو گی اور اسے بتاؤ گی کہ جناب ابھی مجھے مزید اعلیٰ تربیتی کورسز کی ضرورت ہے۔''

''میں چاہوں بھی تو ایسا نہیں کر سکتی۔'' میری بات پر وہ افسردہ سے انداز میں مسکرائی اور وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھے اتنا ہنرمند بنانے والا شخص اپنی ذرا سی غلطی سے اپنی جان کھو چکا ہے۔ جلد از جلد زیادہ دولت کے حصول کے چکر میں اس نے ہتھیار کا استعمال شروع کر دیا تھا اور ہتھیار کے زور پر لوگوں سے ان کی قیمتی چیزیں چھیننے لگا تھا۔ ایک رات وہ ایک گاڑی والے کو روک کر اس سے اس کا موبائل اور نقدی وغیرہ چھین رہا تھا تو اسی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لیٹے ہوئے شخص کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ اس شخص کے لیٹا ہوا ہونے کی وجہ سے اندھیرے میں اسے آخر تک اس کی موجودگی کا اندازہ ہی نہیں ہو سکا تھا۔''

''اوہ......'' اس کی افسردگی پر میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

وہ سر جھٹکتے ہوئے بولی۔

''اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ اس طرح کے لوگوں کے مرنے پر عموماً لوگوں کو افسوس بھی نہیں ہوتا لیکن مجھے اس کے مرنے کا دکھ ہوا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے علاج کے لیے جس کے دل میں سوراخ تھا، یہ سب کر رہا تھا۔ اس کے مجھ پر بہت سے احسانات تھے اور میں اس کے بعد اس کے بیٹے کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھی لیکن حالات نے مجھے اجازت نہیں دی۔ اس کی موت سے مہینا بھر پہلے ہی میں نے ایک ساتھ اپنی دو بہنوں کی شادی نمٹائی تھی اور میں تقریباً خالی ہو چکی تھی۔ میرے والدین اور جاننے والوں کی نظر میں، میں ایک اچھی فرم میں اچھی ملازمت کرتی ہوں۔ دوست کی فیملی کی مدد کے لیے میں کوئی اندھا قدم اٹھا کر خود مشکل میں پڑنا یا بدنامی مول لینا افورڈ نہیں کر سکتی تھی اس لیے مجھے اپنے دل پر جبر کرنا پڑا۔ میں اس کی تربیت اور بتائے ہوئے رابطوں کے ذریعے اب بھی اپنا کام کر رہی ہوں لیکن اس کے بیٹے کے علاج کے لیے ابھی کچھ کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ میرے والدین میری سب سے چھوٹی بہن کا رشتہ بھی طے کر چکے ہیں اور ایک سال کے اندر مجھے اس کی شادی کے اخراجات کے لیے بھی رقم جمع کرنی ہے۔ کہنے کو میں نے اپنے والدین سے یہی کہا ہے کہ میں بہن کی شادی کے لیے اپنی فرم سے لون لے لوں گی لیکن تم ہی بتاؤ کہ کسی پرائیویٹ کمپنی میں ایک ٹیلی فون آپریٹر کو کون لون دیتا ہے۔ دے بھی تو چند ہزار سے زیادہ کی رقم ملنا مشکل ہے اور شادی پر لاکھوں کا خرچ آتا ہے۔ یوں میں بس اپنی ہی فکروں میں لگی ہوئی ہوں۔ کسی کے احسان کا بدلہ اتارنے کی میرے پاس گنجائش ہی نہیں ہے۔'' اس کے چہرے پر گہری سوگواری تھی اور وہ یوں مجھے سب کچھ بتاتی جا رہی تھی جیسے میں اس کا کوئی بہت ہی قریبی اور رازدار دوست ہوں۔ شاید عرصے سے اسے کسی کو اپنے دل کی باتیں بتانے اور سنانے کا موقع نہیں ملا تھا جو وہ یوں اچانک ایک اجنبی کے سامنے دل کھول کر بیٹھ گئی تھی۔

''پچھلے دنوں اتفاق سے میرے ہاتھ ایک ایسی چیز لگ گئی تھی کہ مجھے لگا کہ میں سارے مسائل سے نمٹنے کی اہل ہو جاؤں گی لیکن جیسے وہ چیز اچانک میرے ہاتھ آ گئی تھی ویسے ہی اچانک ہاتھ سے نکل بھی گئی اور یوں جو ایک امکان پیدا ہوا تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔'' خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد وہ دھیمی سی آواز میں بولی تو میرا دل دھڑک اٹھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ ان ہیروں کے بارے میں بات کر رہی ہے جو اتفاقاً میرے ہاتھ لگ چکے ہیں لیکن اس نے کھل کر کچھ نہیں بتایا اور میں بھی چپ ہی رہا۔

"تو پھر اب کیا کرنا ہے؟ تم مجھ سے مل لیے، میرے بارے میں بہت کچھ جان بھی گئے پھر اب...... اب کیا ارادہ ہے تمہارا؟" اس نے اچانک ہی موضوع بدل لیا اور کھوجنے والی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"میرا خیال ہے کہ ہم اچھے دوست اور پارٹنر بن سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کا ساتھ یقیناً ہمیں فائدہ دے گا۔ تم اسے میری خوش فہمی یا تکبر نہ سمجھو تو میں دعویٰ کرسکتا ہوں کہ میں تم سے بڑا فنکار ہوں لیکن میرے پاس ایسے رابطے نہیں ہیں کہ میں حاصل کی گئی ہر شے کی قیمت حاصل کرسکوں اس لیے مجھے کافی محتاط رہ کر اور محدود دائرے میں کام کرنا پڑتا ہے۔ تم نے بتایا کہ تمہارے پاس رابطے ہیں تو ہم کچھ دو اور کچھ لو کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ پارٹنر شپ کرسکتے ہیں۔ تم بتاؤ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟" میں ایک دم ہی آپ جناب کا تکلف چھوڑ کر اسے تم کہہ کر مخاطب کرنے لگا جس پر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور ایک لمحے کے لیے مجھے جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے کے بعد بولی۔

"میں اس بارے میں غور کرنا چاہتی ہوں۔ دو دن بعد شام ساڑھے چھ بجے تم اسی جگہ آجانا۔ میں نے تمہارے حق میں فیصلہ کیا تو میں بھی آجاؤں گی ورنہ تم سمجھ لینا کہ میری طرف سے انکار ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ دو دن بعد میں تمہارے اقرار کے یقین کے ساتھ یہاں ضرور آؤں گا۔" میں نے اسے جواب دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ دوپٹے کے نیچے چھپا اس کا ریوالور کب کا بے مصرف ہوگیا تھا اور وہ بس بے خیالی میں اسے تھامے بیٹھی ہوئی تھی۔

☆☆☆

میری توقع کے مطابق شائلہ نے میری پیشکش قبول کرلی تھی اور اب ہم پارٹنرز کی طرح کام کررہے تھے۔ شائلہ میرے ساتھ رہ کر بہت سے گُر سیکھ رہی تھی اور میں اس کے تعلقات کا فائدہ اٹھا کر اب ایسی چیزوں پر بھی ہاتھ ڈالنے لگا تھا جن کی طرف پہلے صرف اس لیے نظرِ کرم نہیں کرپاتا تھا کہ انہیں ٹھکانے کیسے لگاؤں گا۔ اب قیمتی موبائل فون بھی بک جاتے تھے اور سونے کے زیورات کا بھی کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ آمدنی بڑھ جانے سے ہم دونوں اپنی اپنی جگہ خوش تھے۔ اس کے مشورے پر میں نے بھی اپنا لائف اسٹائل تبدیل کرنے کے لیے دھیرے دھیرے منصوبہ بندی شروع کردی تھی۔ یوں تو میرا کوئی بہت قریبی دوست نہیں تھا لیکن ملازمت کے حوالے سے جن چند گنے چنے لوگوں سے تعلقات

تھے انہیں میں نے پہلے اپنا پرائز بونڈ نکلنے کی خوشخبری سنائی اور پھر یہ اطلاع دی کہ میں ملنے والی رقم شیئرز کے کاروبار میں لگا رہا ہوں۔

میں نے سچ مچ بھی تھوڑی بہت رقم اس کام میں لگائی لیکن اصل مقصد دکھاوا تھا اور اس دکھاوے کے ذریعے میں اپنا طرزِ زندگی دھیرے دھیرے تبدیل کررہا تھا۔ میں نے اپنی رہائش تبدیل کرلی تھی اور موٹر سائیکل بھی دوسری لے لی تھی۔ اس کے بعد میں کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کرنے پر غور کررہا تھا۔ شائلہ بھی مستقبل میں ایک بوتیک کھولنے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن فی الحال اسے اپنی بہن کی شادی کے لیے رقم جوڑنے کی فکر تھی۔ ہم دونوں ہی کے ذہن میں یہ بات تھی کہ ہم جو کام کررہے ہیں، اس میں ہماری تمام تر جسارت کے باوجود بہرحال پکڑے جانے کے امکان کو یکسر مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے ہمیں کسی اور طرح اپنے قدم جمانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

چند مہینوں کے ساتھ میں ہی ہم اچھے دوست بن گئے تھے لیکن ابھی تک میں ان ہیروں کے متعلق شائلہ سے بات نہیں کرسکا تھا جو مجھے اس سے چھینے گئے کلچ میں سے ملے تھے۔ حقیقتاً میں اس سے اس موضوع پر بات کرنا ہی نہیں چاہتا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا اس صورت میں وہ مجھ سے ہیروں کی واپسی کا مطالبہ کرے گی یا کم سے کم بھی مجھے اسے حصہ تو دینا ہی پڑے گا۔ اس نے بھی اپنے متعلق بہت کچھ بتانے کے باوجود بھی ان ہیروں کے سلسلے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ دوستی ہوجانے کے باوجود ہم دونوں اپنی اپنی جگہ تھوڑے سے محتاط بھی تھے۔ ہماری ملاقات ہمیشہ کسی پبلک پلیس پر ہوتی تھی۔ وہ تو خیر رہتی ہی ہاسٹل میں تھی لیکن میں نے بھی کبھی اسے اپنے فلیٹ پر آنے کی دعوت نہیں دی تھی۔ اس نے بھی مجھے اپنے ہاسٹل کا پتا نہیں بتایا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ ہیرے بھی اسی جیولر کے ہاں فروخت کرتی جہاں ہم دوسری چیزیں بیچتے تھے۔ وہ بڑا خبیث آدمی تھا۔ شہر کے بڑے جیولرز میں شمار ہونے کے باوجود چوری شدہ مال کئی گنا کم قیمت پر خرید کر بھاری منافع کمانے میں کوئی عار نہیں سمجھتا تھا اور چالاک اتنا تھا کہ کبھی خود براہ راست معاملہ نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے ایک ملازم کو اس کام کے لیے استعمال کرتا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اگر کبھی کوئی گڑبڑ ہوئی بھی تو وہ بے چارے ملازم کو قربانی کا بکرا بنا کر خود کو صاف بچالے گا۔ بہرحال یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔ میں صرف اس بات پر غور کررہا تھا کہ مجھے ہیرے اس شخص کو فروخت کردینے چاہئیں یا پھر

کوئی اور پارٹی تلاش کرنی چاہیے۔ میں عجلت میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک بہت بڑی رقم ہاتھ آجانے کا خیال اگرچہ مجھے اچھا لگتا تھا لیکن میں ٹھنڈا کر کے کھانے کا قائل تھا۔ شاید یہ میرے مزاج کا ٹھہراؤ ہی تھا کہ میں ابھی تک اپنے کام میں بہت کامیاب تھا اور کبھی کسی مصیبت میں نہیں پھنسا تھا لیکن پھر ایک روز مصیبت خود ہی میرے گھر چلی آئی۔ اس روز فیکٹری سے آکر ابھی میں منہ ہاتھ ہی دھو رہا تھا کہ کال بیل بجی۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا تو سامنے شمائلہ کو کھڑے دیکھ کر اچھل پڑا۔

''شمی...... تم یہاں؟''

''ہاں بھئی۔ اندر آنے کا راستہ تو دو۔ کیا دروازے پر ہی کھڑا رکھو گے؟'' اس نے مسکرا کر مجھے ٹوکا تو مجبوراً مجھے اسے اندر بلانا پڑا لیکن میں اپنی حیرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکا اور اس سے بولا۔

''تمہیں میرے فلیٹ کا پتا کیسے چلا؟''

''بس اتفاق سے راستے میں میری تم پر نظر پڑ گئی اور میں نے اپنی گاڑی تمہاری موٹر سائیکل کے پیچھے لگا دی۔ اصل میں آج میں بہت اداس تھی اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ کسی سے اپنا دکھ شیئر کروں بس اسی لیے میں تمہارے پیچھے چلی آئی۔'' اس نے بہت سادگی سے بتایا اور سچ مچ دکھی نظر آنے لگی۔

''ٹھہرو۔ میں تمہارے لیے کوئی کولڈ ڈرنک وغیرہ لاتا ہوں پھر ہم بات کرتے ہیں۔'' وہ میرے خوابوں کی شہزادی تو نہیں تھی لیکن بہرحال ایک خوبصورت لڑکی تھی جسے اداس دیکھنا مجھے اچھا نہ لگا اور اس کی اچانک آمد پر مجھے جو حیرت اور ناگواری محسوس ہوئی تھی، اسے بھول کر اس کی دل جوئی کے لیے کمربستہ ہو گیا۔ ہم دونوں نے ساتھ بیٹھ کر کولڈ ڈرنک پی پھر وہ میرے پوچھنے پر اپنی اداسی کی وجہ بتانے لگی اور بولی۔

''میں نے تمہیں اپنے محسن کے بیٹے کے بارے میں تو بتا رکھا ہے نا کہ وہ شدید بیمار ہے اور اس کی ہارٹ سرجری ہونی ہے لیکن رقم کا بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک کچھ نہیں ہو پا رہا ہے۔''

''ہاں، اس بارے میں تو تم نے ابھی ہماری آخری ملاقات میں بھی مجھے بتایا تھا۔ واقعی یہ افسوس ناک بات ہے لیکن ہم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں۔ ہم دونوں ہی فی الحال ایسی پوزیشن میں نہیں کہ اتنی بڑی رقم کا بندوبست کر سکیں گے۔'' میں نے اپنے چہرے پر مصنوعی افسردگی طاری کر لی۔ حقیقتاً مجھے اس موضوع سے کوئی خاص دلچسپی نہیں

تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس شہر میں ہزاروں افراد ایسے ہوں جو صرف رقم نہ ہونے کی وجہ سے بے بسی سے موت کے میں جانے والے ہوں گے اور وہ بچہ بھی ایسے ہی افراد سے ایک تھا تو جیسے میں دوسرے لوگوں کے لیے کچھ نہیں کر تھا، ویسے ہی اس بچے سے بھی مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

''تم ایسی بات مت کرو افتخار! تم یہ مت کہو کہ تم نہیں کر سکتے۔ تم بہت کچھ کر سکتے ہو اور میں اتنے عرصے اسی بات کا انتظار کر رہی تھی کہ شاید تمہارے اندر انسانیت کوئی رمق جاگ جائے اور تم کچھ کرو لیکن تم نے ثابت کر کہ میرا انتظار لاحاصل تھا اور اب مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ اس کا لہجہ اچانک ہی بدل گیا اور آنکھوں میں تپش سی محسو ہونے لگی۔

''کیا مطلب...... تم کیا کہنا چاہتی ہو؟'' میں اس اس انداز پر تھوڑا سا گڑبڑا گیا۔

''میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے تمہیں روز پارک میں ہی پہچان لیا تھا کہ تم ہی وہ شخص ہو جس نے سے میرا کلچ چھینا تھا اور مجھے ان ہیروں سے محروم کر دیا تھا کا سودا کرنے کے لیے اس روز میں نے اس تفریحی مقام کسی سے ملاقات طے کر رکھی تھی۔ تمہارے دائیں ہاتھ چھ انگلیاں ہیں اور یہ بات میں نے کلچ چھینے جانے کے دورا ہی نوٹ کر لی تھی۔ جس روز تم نے میرا تعاقب کیا اور پھر نے پارک میں تم سے ملاقات کی تو میں نے دیکھ لیا کہ تمہار دائیں ہاتھ میں چھ انگلیاں ہیں۔ ...''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ایسے تو میرے علاوہ اور افراد بھی ہوں گے۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

''بیچ میں مت بولو، ابھی میری بات ختم نہیں ہو ہے۔'' اس نے گویا میرے بات کاٹنے پر برا مان کر مجھے ٹوکا بولنے لگی۔

''تمہارے دائیں ہاتھ کی چھ انگلیاں دیکھ کر مجھے شک ہوا تھا وہ تمہاری آواز سن کر اور بھی پختہ ہو گیا۔ م ایک ٹیلی فون آپریٹر ہوں اور مجھ میں آوازوں کو پہچاننے غیر معمولی صلاحیت ہے اس لیے تمہاری آواز کے سلسلے میں میرے دھوکا کھانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پھر پر سے تمہارا اپنے بارے میں فنکار ہونے کا دعویٰ...... تم قبول کرنے کے لیے کن دلیلوں کو رد کرو گے ڈیئر فنکاروں پر اتنا جھوٹ نہیں جچتا میرے دوست۔ فنکار بڑے سچے لوگ ہوتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں طنز کا زہر اور اب میں اس ریوالور کو بھی دیکھ سکتا تھا جو اس نے جا

نکال کر مجھ پر تان لیا تھا۔ آج اس ریوالور پر سائیلنسر لگا ہوا تھا۔

''میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے میرے پاس کوئی ہیرے نہیں ہیں۔'' میں نے اپنا لہجہ نرم رکھ کر اسے قائل کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ ساتھ ہی میری نظریں اس کے ریوالور پر جمی ہوئی تھیں۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل جاتا تو وہ میرے لیے مسئلہ نہیں تھی۔ میں آرام سے اسے قابو میں کرلیتا۔

''تم بڑے ڈھیٹ آدمی ہو انی! ایسے لوگ اپنا اور دوسروں کا وقت ہی ضائع کرتے ہیں۔ میں پہلے ہی تمہارا اپنا کافی سا وقت ضائع کرچکی ہوں اس لیے تمہیں مزید مہلت نہیں دے سکتی۔ میں صرف دس تک گنتی گنوں گی اور تمہیں گولی ماردوں گی۔ تمہارے مرنے کے بعد میں آرام سے تمہارے اس فلیٹ کی تلاشی لے سکتی ہوں۔'' اس کے لہجے کی سفاکی نے مجھے دہلا دیا اور میں نے اس سے کچھ اور کہنے کے لیے اپنا منہ کھولا لیکن وہ گنتی شروع کرچکی تھی۔

ایک...... دو...... تین...... چار...... معمولی سے وقفے سے گنتی کا سلسلہ جاری تھا۔ اب میرے پاس حرکت میں آنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میرے ہاتھ میں کولڈ ڈرنک کا گلاس اب بھی موجود تھا۔ میں نے اپنے اور اس کے درمیان فاصلے کا تعین کیا اور اس کے پانچ کہنے سے پہلے ہی تاک کر گلاس اس کے ریوالور والے ہاتھ پر دے مارا۔ اگلے ہی لمحے میں اپنا پیٹ پکڑے ہوئے تھا اور خون کے اس دھبے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا جو بہت تیزی سے بڑا ہوتا جارہا تھا۔ اس کے ریوالور سے نکلی ہوئی گولی میرے پیٹ میں لگ چکی تھی۔

''تم اتنے بڑے احمق ہوکر فنکار ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، مجھے اندازہ نہیں تھا۔ میں تمہیں سچ مچ گولی مارنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی لیکن تمہاری حرکت کی وجہ سے اضطراری طور پر مجھ سے گولی چل گئی۔ بہرحال، اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ اب تم اپنے انجام کا انتظار کرو۔'' اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی لیکن اس نے حیرت انگیز طور پر عملیت پسندی کا مظاہرہ کیا اور میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کر میرے ہاتھ پیر بھی اسی کرسی سے باندھ دیے جس پر میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پورے انتظام کے ساتھ آئی تھی اور میں سمجھ سکتا تھا کہ وہ آج اتفاقاً میرے گھر نہیں آئی ہے بلکہ اس نے پہلے ہی سے شاید میرا پیچھا کرکے میرا گھر دیکھ لیا تھا۔ وہ اتنی محتاط تھی کہ جس گلاس میں اس نے کولڈ ڈرنک پی تھی، وہ اٹھا کر اپنے بڑے سے شولڈر بیگ میں ڈال لیا تھا اور باقی کی کارروائی اسی بیگ سے نکالے گئے ربر کے دستانے پہن کر کررہی تھی۔ میں بے بسی سے اپنے پیٹ سے ابلتا خون اور اس کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑی مہارت سے میرے فلیٹ کی تلاشی لے رہی تھی۔ آخرکار اس نے وہ ہیرے دریافت کرلیے جو حالات کو اس نہج تک لے آئے تھے۔ ہیرے حاصل کرنے کے بعد وہ میرے سامنے آکر کھڑی ہوئی اور ہونٹوں پر سفاک سی مسکراہٹ سجا کر بولی۔

''کسی مرتے ہوئے آدمی سے تھوڑا سا سچ بول دینے میں کوئی حرج نہیں ہے اس لیے میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ میں ٹیلی فون آپریٹر ضرور ہوں لیکن کسی پرائیویٹ فرم میں نہیں بلکہ پولیس کی اسپیشل کرائم برانچ میں اور میرا محسن بھی وہیں سے تعلق رکھتا تھا لیکن ہم دونوں ہی کی ضروریات محکمے کی دی ہوئی تنخواہ سے پوری نہیں ہوسکتی تھیں اس لیے، ہم تم جیسے فنکاروں میں شامل ہونے پر مجبور ہوگئے۔ تم بہت بڑے فنکار ہو لیکن آج مرتے مرتے تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ بلی بہرحال شیر کی خالہ ہوتی ہے۔'' اس نے کہنے کے بعد وہ نہایت اطمینان سے باہر کی طرف بڑھ گئی۔ میں بھی دھندلائی ہوئی نظروں سے لحہ بہ لحہ قریب آتی موت کا انتظار کرنے لگا لیکن کیا ایک فنکار ایسی ہی بے بسی کی موت مرسکتا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کا قاتل عیش کرتا پھرے؟ ہرگز نہیں...... شمائلہ عرف شمی کو فنکار سے فنکاری کی پوری قیمت ادا کرنی پڑتی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس فلیٹ میں ایک خفیہ کیمرا نصب تھا۔ یہ کیمرا میں نے حال ہی میں نصب کیا تھا اور باہر جاتے ہوئے اسے آن کردیتا تھا تاکہ میری غیر موجودگی میں اگر فلیٹ میں کوئی گڑبڑ ہو تو مجھے پتا چل جائے۔ شمائلہ میری واپسی کے بعد اتنی جلدی وہاں آگئی تھی کہ مجھے کیمرا آف کرنے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس بعد میں میرے فلیٹ کی تلاشی لیتی تو اسے سارے ثبوت مل جاتے اور شمائلہ اپنی تمام تر چالاکی کے باوجود پکڑی جاتی۔ میں نے آپ سے کہا نا کہ میں ایک فنکار ہوں اور کسی فنکار کا خون بھلا کیسے رائگاں جاسکتا ہے۔ کچھ نہیں تو یہ پولیس کی ایک کالی بھیڑ پکڑوانے میں ہی کام آجائے گا۔ پھر تو آپ مانیں گے نا کہ میں ایک فنکار ہوں۔ یہ بھی محض شاید حسین اتفاق تھا کہ میرا ایک دوست مجھ سے ملنے آپہنچا اور پھر وہ ہوا جس کا شاید اس کالی بھیڑ نے سوچا بھی نہ ہوگا اور آج میں...... آپ کو اپنی فنکاری کے بارے میں بتانے کے لیے زندہ ہوں۔



تیسرا اور آخری حصہ

باغی

محمد طاہر عمیر

ضد ہو یا بغاوت ... ہمیشہ غیر متوقع حالات اور نظریات کے خلاف جنم لیتی ہے۔ جہاں بے اصولی کا راج ہو وہاں بغاوت جنگ کرتی ہے اور جنگی صورت حال میں پھول نہیں بٹتے بلکہ زخم لگتے ہیں... کبھی اپنوں کو اپنوں کے ہاتھوں اور کبھی دشمن کو دشمن کے ہاتھوں مگر... مشترکہ مفاد دشمن کو بھی دوست بنا کر خونی رشتوں میں دراڑیں ڈال دیتا ہے... جس طرح وہ باپ اور بیٹے ایک دوسرے کے مقابل اپنے حصے کا کردار ادا کررہے تھے ... وہ جو معاشرتی ناسوروں کا علاج کرنے نکلا تھا جب جانے پہچانے رستوں پر چلتے چلتے اپنے ہی پیروں کے آبلوں کو دیکھا تو روح تک زخمی ہوگئی اور پھر اندر کی وحشتوں نے اسے باغی بناکر اپنوں کی نظروں میں ہی مجرم ٹھہرادیا جبکہ دوسری جانب اس کا دل اس نازک اندام حسینہ کی اداؤں پر اس طرح آیا کہ اس کے کردار کی کالک اس کی گھنی زلفوں میں مدغم ہوکر رہ گئی مگر... کب تک ... پھر وقت کا وار ایسا چلا کہ ہر رنگ اپنی الگ شناخت کرا گیا۔

عشق کی جنوں خیزیوں میں پیار بھرے رشتوں کو روندنے والے ایک باغی کی کتھا



میں جن کے خلاف اٹھنے والا تھا، ان کے خلاف تو کوئی آواز بھی اٹھتی تو دبا دی جاتی۔ وہ اس ملک کے طاقتور ترین لوگ تھے۔ حکومتیں ان جیسوں کی مدد سے نہیں بلکہ ان کی مرضی سے چلتی تھیں...... میں اکیلا ان کا مقابلہ کہاں تک کر پاؤں گا۔ پھر میرے خیال کی رو دوسری سمت بہہ نکلی اور اگر سب کچھ ویسا نہ ہوا جیسا میں نے چاہا تب...... تب کیا ہوگا؟ کیا ہوگا اگر میری رپورٹ پڑھ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دی گئی اور کسی نے کوئی ایکشن نہ لیا......؟ میں نے ایک طویل سانس بھرا اور دل ہی دل میں خود سے کہا۔

”اب تو جو ہوگا دیکھا جائے گا لیکن ایک بات طے ہے۔ میں اس سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹوں گا کیونکہ اب مجھے اس دنیا میں کسی کی پروا نہیں رہی تھی......“ اور یہ ایک ایسا احساس ثابت ہوا کہ اچانک ہی آشتی کا چہرہ میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ شدتِ کرب سے میں ہونٹ بھینچ کر رہ گیا اور اٹھ کر چھت کی منڈیر کے پاس آ گیا۔

”تمہارا خیال میرے لیے سوہانِ روح ہے لیکن اس کرب سے میں اذیت نہیں کشید کروں گا۔ میں تمہارے کردار کی کالک سے اب بھی نفرت نہیں کروں گا۔ لیکن میری محبت پر اب تمہارے نام کا سایہ بھی نہیں پڑے گا۔ میں تمہاری یاد سے جان نہیں چھڑا سکتا لیکن تمہاری یاد کو ایک غصہ بنا کر رکھوں گا جو کبھی میرے قدم بھٹکنے نہیں دے گا۔ کبھی میرا عزم ٹوٹنے نہیں دے گا۔“

☆☆☆

میری رپورٹ دو حصوں میں شائع ہوگئی۔ پہلا حصہ نوادرات کی اسمگلنگ سے متعلق تھا جس میں چودھری حشمت علی اور مراد آباد کے اس خفیہ راستے کا ذکر تھا جو پاکستان اور انڈیا کے بارڈر پر تھا۔ دوسرے حصے میں قومی میوزیم کے بیش قیمت نوادرات کی گمشدگی اور انہیں تحائف کے ذریعے استعمال کرنے کا ذکر تھا جس میں اہم سرکاری عہدیداران ملوث تھے۔ ان رپورٹ پر پہلے دن کچھ زیادہ ہلچل نہیں بپا ہوئی لیکن دوسرے دن ایک ٹی وی چینل نے اسے بریکنگ نیوز کے طور پر پیش کر دیا۔ رات ہونے تک یہ ”نوادرات اسکینڈل“ میڈیا پر ہاٹ کیک بن گیا۔

مجھے گیارہ بجے صبح پہلا فون آیا۔ یہ ایک اپوزیشن لیڈر کی طرف سے تھا جس نے مجھے اس ”کارنامے“ پر مبارک باد دی تھی۔ دوسرا فون دھمکی آمیز تھا، اس نے اپنا نام تو نہیں بتایا لیکن اس کے لہجے کی تپش بتا رہی تھی کہ اس کا نام میری رپورٹ میں ضرور ہوگا...... اور پھر کالز کا تانتا بندھتا چلا گیا۔

ٹی وی چینل میری رائے جاننا چاہتے تھے کیونکہ اس سے پہلے جب میں نے اسٹاک ایکس چینج کا منی اسکینڈل اور ایس پی جنید کے جعلی مقابلے کے بارے میں انویسٹی گیو رپورٹس پیش کی تھیں تو ان کا کافی چرچا ہوا تھا۔ ایس پی والا کیس تو سپریم کورٹ میں چلا گیا تھا جس میں میری رپورٹس نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ لہٰذا صحافت میں میری کریڈیبلٹی تو پہلے ہی بن چکی تھی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ میڈیا کو اس میں زیادہ دلچسپی اس لیے ہے کیونکہ یہ رپورٹس ایک بیٹے نے اپنے باپ کے خلاف لکھی تھیں۔ اپوزیشن کا دلچسپی لینا بھی سمجھ میں آتا تھا۔ حکومت کے خلاف وہ ایسی محاذ آرائیوں کو استعمال کرنے کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ میں نے برکت صدیقی صاحب کو کال کی۔ ان سے رابطہ کافی دیر بعد ہوا۔

”دفتر کے سبھی فون مصروف ہیں، ہر طرف سے کالیں آ رہی ہیں......“ وہ کہہ رہے تھے۔ ”ٹی وی دیکھ رہے ہو؟ ہر نیوز چینل پر تمہاری رپورٹ کے تذکرے ہیں...... یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم سے رابطہ نہ کیا گیا ہو لیکن تمہارا موقف کہیں نظر نہیں آ رہا۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میرا موقف یا میری رائے اتنی مختصر نہیں کہ فون پر لی جا سکے۔ مجھے ٹاک شو میں بلائیں گے تو جاؤں گا۔“

”تمہیں ضرور جانا چاہیے ورنہ تمہارے خلاف ایسی لابی بن جائے گی جو الٹا تمہیں اس معاملے میں پھنسا دے گی...... تم جانتے ہو میڈیا جتنا بھی آزاد ہے لیکن کئی چینل اور صحافی حکومت کے پیسوں سے چلتے ہیں۔ تمہیں اپنا موقف پہلے سے ہی واضح کر دینا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ وہ لوگ اسے اتنا بگاڑ دیں کہ بعد میں تم اسے سلجھا نہ سکو...... میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“ وہ کہہ رہے تھے۔

”آپ کی بات ٹھیک ہے...... میں سوچتا ہوں اس بارے میں...... او کے خدا حافظ!“ میں نے فون بند کر دیا اور ٹی وی آن کر دیا۔ ہر طرف اسی کے تذکرے تھے۔ کوئی اسے سچ مان رہا تھا اور کوئی مفروضہ قرار دے رہا تھا۔ ایک چینل تقسیم کے بعد دریافت ہونے والے ایسی کئی راستوں کا ذکر کر رہا تھا جنہیں بند کر دیا گیا تھا۔ جہاں ہر نیوز چینل پر میری رپورٹ کے تذکرے تھے وہیں میڈیا پر وہ لوگ بھی موجود تھے جو میری رپورٹ کی زد میں آ چکے تھے۔ ساری رپورٹس کو مسترد کرتے ہوئے میرے خلاف باتیں کی جا رہی تھیں کہ میں انہیں بلیک میل کر رہا ہوں اور وہ بہت جلد میرے خلاف ہتکِ عزت کا دعویٰ دائر کرنے والے ہیں۔ میں خاموشی سے ٹی وی

دیکھتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد ہی مجھے عمران بھائی کی کال موصول ہوئی۔ ''تم نے اچھا نہیں کیا چھوٹے...... پتا نہیں میں اسے تمہاری بے وقوفی سمجھوں یا کچھ اور......'' ان کا اشارہ میری رپورٹ کی طرف ہی تھا۔

''چودھری صاحب کا ری ایکشن کیا ہے؟'' میں نے ان کی بات پر دھیان نہ دیتے ہوئے پوچھا۔

''انہوں نے ہی فون کرنے کو کہا تھا۔ کہہ رہے تھے کہ کامی سے کہو کہ اپنی رپورٹ کو مجھ تک محدود رکھے۔ باقی لوگوں کو اس میں ملوث نہ کرے۔ اور یہ بھی کہہ رہے تھے کہ کامی نے اچھا نہیں کیا...... میں نے پہلی بار اباجی کو اتنا خاموش دیکھا ہے۔ بھائی شفیق تو بہت غصے میں تھے کہہ رہے تھے کہ ابھی شہر جاؤں گا اور کامی کو کان سے پکڑ کر واپس لاؤں گا...... اباجی کے سامنے پیش کروں گا اور جو اباجی فیصلہ کریں گے کامی سے زبردستی اس پر عمل کرواؤں گا لیکن اباجی نے انہیں روک دیا......'' وہ بولتے جا رہے تھے۔

''اچھا...... اور تم نے بھی کچھ کہنا ہو تو کہہ لو، میں سن رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں نے کیا کہنا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم سب جانتے ہیں کہ تم کرو گے وہی جو تمہارا دل چاہے گا۔ میں جانتا تھا کہ کبھی نہ کبھی تم ایسا بے وقوفانہ کام ضرور کرو گے جسے حماقت کی اعلیٰ مثال کہا جا سکے گا...... لیکن یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ تم اپنے باپ کی ہی مخالفت شروع کر دو گے۔'' وہ طنز کرتے ہوئے بولے۔

''میں ایک صحافی ہوں عمران بھائی...... حقائق کو عوام کے سامنے لانا میرا کام ہے۔ یہ میری ذاتی جنگ نہیں ہے...... یہ میرا کام بھی ہے اور میرا فرض بھی۔''

''فرض تو تمہارا بیٹے ہونے کا بھی ہے۔ بہرحال اباجی والا معاملہ تو ایک طرف رہا تم نے تو بھڑوں کے پورے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔ تم نے جن لوگوں سے پنگا لیا ہے وہ عام لوگ نہیں...... اگر تم اپنی کچی صحافت پولیس اور بزنس مینوں کی کرپشن تک محدود رکھتے تو تمہارے لیے اچھا تھا۔ اب کی بار جنہیں تم نے چھیڑا ہے، وہ تمہاری سوچ سے زیادہ طاقتور ہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ تم قانونی طور پر انہیں ان کی غلطیوں کی سزا دلوا دو گے تو یہ تمہاری بھول ہے چھوٹے...... میری مانو تو اب بھی وقت ہے اس معاملے کو سلجھا لو۔'' عمران بھائی کہے جا رہے تھے۔

''سزا دلوانا میرا کام نہیں اور اس معاملے کو اگر سلجھانا ہی تھا تو بگاڑتا کیوں؟''

''تم پاگل ہو...... بالکل پاگل۔'' وہ جھنجلا کر بولے۔

''شاید واقعی میں ہوں...... یا پھر ہو رہا ہوں۔''

''تم جیسے باغی اکیلے ہی انقلاب کے نعرے لگاتے ہیں اور پھر منظر سے ایسے غائب ہوتے ہیں کہ نشان تک نہیں ملتا۔ بہرحال اپنا خیال رکھنا چھوٹے......'' انہوں نے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

اگلے دن میں نے ایک نیوز چینل کے ٹاک شو میں صاف صاف بتا دیا کہ میری رپورٹ حقائق پر مشتمل ہے اور میرے پاس ان تمام لوگوں کی کرپشن کے مکمل ثبوت بھی موجود ہیں اور اس بات کی سچائی کے لیے میں نے کچھ تصاویر بھی شو کر دیں جس میں نسیم اطہر جیسا بڑا عہدیدار بھی نظر آ رہا تھا۔ اس شو کے بعد ''نوادرات اسکینڈل'' کی گونج سرکاری ایوانوں میں بھی سنائی دینے لگی۔

''کہاں ہو تم؟'' صدیقی صاحب فون پر پوچھ رہے تھے۔

''گھر میں ہوں اور ٹی وی دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا۔

''اکیلے......؟'' وہ چونکے۔

''نہیں...... میرے ساتھ ایک عدد طوطا اور ایک عدد بلی بھی ہے۔'' میں نے گود میں بیٹھی سیامی بلی کو سہلاتے ہوئے کہا۔

''اچھا تیار ہو جاؤ، میں گاڑی بھیج رہا ہوں۔'' انہوں نے فون بند کیا تو میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر بعد میں ان کے آفس میں ان کے سامنے بیٹھا کافی کی چسکیاں لے رہا تھا۔

''اپوزیشن لیڈر خالد شیخ نے مجھ سے ملاقات کی ہے۔ وہ تم سے ملنا چاہتے تھے تاکہ وہ یہ کنفرم کر سکیں کہ اگر تمہارے پاس اہم ثبوت ہیں تو وہ سپریم کورٹ میں یہ کیس دائر کرنے کو تیار ہیں۔''

''اور یقیناً آپ نے مجھے ان کے جانے کے بعد بلوایا ہے؟''

انہوں نے طویل سانس لیا اور کہا۔ ''صحافت حقائق کا پردہ اٹھاتی ہے۔ مجرموں کے ساتھ لڑتی نہیں ہے۔ تمہاری رپورٹ چونکہ حکومتی عہدیداران کے خلاف ہے لہٰذا اپوزیشن تو اسے استعمال کرے گی لیکن تم صحافی ہو۔ تمہاری عزت ایک نیوٹرل صحافی کے طور پر ہے۔ تم نہ تو سیاست دان ہو اور میں چاہتا ہوں کہ نہ ہی تم ان کے آلۂ کار بنو۔ تمہیں اقتدار کی جنگ کا حصہ نہیں بننا چاہیے۔''

میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''میرا بھی یہی خیال

ہے۔ لیکن دوسری طرف میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ اس معاملے میں ملوث افراد کو سزا بھی ملے۔"

"چاہنے کی بات مت کرو۔ چاہتے تو ہم بہت کچھ ہیں لیکن زمینی حقائق اور اپنی حدود کو بھی مدِنظر رکھنا پڑتا ہے۔"

"لیکن میرے پاس ایک اور طریقہ بھی ہے۔ آپ خالد صاحب سے کہیے کہ وہ اپنے طور پر سپریم کورٹ میں کیس دائر کردیں۔ میں اپنے تمام تر ثبوت اور شہادتیں کورٹ میں پیش کروں گا۔"

"لیکن وہ تمہاری اس بات پر یقین کیوں کرنے لگے؟"

"انہیں یقین دلانے کے لیے میں ان کے وکیل سے بات کرسکتا ہوں اور انہیں اپنے تمام تر ثبوت بھی دکھا سکتا ہوں اور اس اسکینڈل کے متعلق اور بھی بہت کچھ بتا سکتا ہوں...... لیکن یہ ملاقات آف دی ریکارڈ ہوگی۔" میں نے کہا تو وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے۔

"یعنی تم پس منظر میں رہ کر ان لوگوں کے خلاف کام کرنا چاہتے ہو لیکن یہ بہت خطرناک ہے کامران۔" لمحہ بھر کا توقف لیتے ہوئے وہ مزید بولے۔

"تم جانتے ہو بیوروکریسی اور حکومت کا آپس میں ایسا ہی رشتہ ہوتا ہے جیسے کہ ہمارے ہاں خاندانی نظام ہوتا ہے۔ فلاں کی خالہ فلاں کی بہو ہوتی ہے، اور فلاں کی ممانی بھی فلاں کی بھانجی بھی اور فلاں کی کزن بھی...... ایسے ہی کچھ بیوروکریسی اور حکومت کا نظام ہوتا ہے۔ ایک بیوروکریٹ کسی وزیر کا بیٹا بھی ہوتا ہے، کسی جنرل کا داماد بھی اور کسی دوسرے سول آفیسر کا سالا بھی......"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں......؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"تمہاری رپورٹ کی زد میں آنے والے افسران بھی تنہا نہیں ہیں۔ اپنے اپنے طاقتور رشتے داروں کو حرکت میں لارہے ہیں۔ نسیم اطہر کا سسر سینئر فارن آفیسر ہے۔ حکومت اور اپوزیشن ہی نہیں، ملک کے کئی طاقتور اداروں میں بڑی اپروچ ہے اس کی......"

"یہ بات میں پہلے سے جانتا ہوں...... اور اسی طرح اگر مزید جائزہ لیا جائے تو ان سب کے ان جیسے بے شمار طاقتور عہدوں والے رشتے دار نکل آئیں گے لیکن مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا...... اگر مجھے ان کے عہدوں سے ڈرنا ہی تھا تو یہ رپورٹ کیوں تیار کرتا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا تو جانے کیوں وہ چونک گئے۔ ان کی جہاندیدہ نگاہیں مجھے ٹٹول رہی تھیں۔

"تم سر پھرے تو تھے لیکن اتنے نہیں...... میں نہیں جانتا کہ تمہارے ساتھ پچھلے چند دنوں میں ایسا کیا ہوگیا ہے کہ تمہارے رویّے اور انداز میں ایک "بے پروائی" سی جھلکنے لگی ہے۔ تمہارا بزرگ ہونے کے ناتے یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ جلد بازی مت کرنا۔ مجھے خبر ملی ہے کہ تمہارے ساتھ وہ لوگ بات چیت کرنا چاہتے ہیں جن کے خلاف تم نے لکھا ہے۔ اسے میری درخواست سمجھو یا نصیحت...... ان کی بات سننا اور اپنی کہنا...... لیکن دونوں صورتوں میں جذباتیت سے گریز کرنا۔"

"ٹھیک ہے، میں ایسا ہی کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔ کافی اور باتیں ختم ہوچکی تھیں، میں گھر واپس آگیا۔

رات تقریباً دو بجے کا وقت تھا۔ میری آنکھیں آسٹریلین طوطے کے شور سے کھلیں جو چلا رہا تھا۔ لاؤنج میں رکھے فون کی بیل بھی بج رہی تھی۔

☆☆☆

"دیکھو بیٹا...... صحافت انتقامی حملوں یا جذباتی رپورٹنگ کا نام نہیں ہے۔ ایک صحافی حکومت اور سماج کی خوبیوں وخامیوں کی حقیقت آمیز تصویر دکھاتا ہے لیکن اس کے بعد وہ اس سے اپنا تعلق ختم کرلیتا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ تمہارے گھر میں تمہارے اور تمہارے باپ کے درمیان کیا چل رہا ہے لیکن اگر تم اس لڑائی کو گھر تک محدود رکھتے تو زیادہ بہتر تھا...... مگر اب تو جو ہونا تھا وہ ہوچکا۔ اب آگے اس معاملے کو مزید بگاڑنے کے بجائے مصالحت کی جانب چلنے کی کوشش کرو تو بہت اچھا ہوگا۔"

وہ باریش شخص جو مجھ سے یہ سب کہہ رہا تھا، میں صحافت کی دنیا میں برملا انہیں اپنا استاد کہا کرتا تھا۔ رات کے اس تیسرے پہر مجھے چک شہزاد کے اس فارم ہاؤس میں بلوایا گیا تھا جو رولنگ پارٹی کی ایک اہم شخصیت سے منسوب تھا۔ فون آنے کے بعد میں نے سب سے پہلے صدیقی صاحب سے رابطہ کیا اور پھر انہی کے مشورے سے یہاں پہنچا تھا۔ اس وقت یہاں ان سینئر صحافی قدیر انکل کے علاوہ چار آدمی اور بھی بیٹھے تھے۔ میرے بالکل سامنے گرے سفاری سوٹ میں بیٹھا وہ ڈیشنگ سا بندہ سکندر بخت تھا...... نسیم اطہر کا سسر۔ اس کے پرفیوم اور انگلیوں میں دبے کیوبن سگار کی مہک سارے کمرے میں پھیل رہی تھی اور وہ بڑی بے نیازی کے ساتھ اپنے موبائل فون پر مسلسل ٹائپنگ کررہا تھا۔ اس نے اب تک ایک بار بھی نظر اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ میرے دائیں جانب رکھے صوفوں میں سے ایک پر [illegible] مسکراہٹ سجائے سلیم قریشی بیٹھا تھا جس سے میری ایک

ملاقات فارم ہاؤس پر بھی ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ چیف منسٹر کے سیکریٹری خورشید انور اور ان سے ذرا سا ہٹ کر ایک صوفے پر نسیم اطہر بیٹھا مجھے گھور رہا تھا اور میرے بائیں جانب قدیر بابا براجمان تھے...... دونوں ہاتھوں کو اپنے عصا پر ٹکا کر وہ مجھ سے ہی مخاطب تھے۔

''بابا...... آپ کو یہ لگتا ہے کہ میں اتنا جذباتی ہوں کہ چودھری صاحب سے ذاتی اختلاف پر میں نے ایک ایسی رپورٹ لکھ دی ہے جس سے ان کی عزت کو نقصان پہنچ سکے......؟ اور کسی انتقامی کارروائی کے سلسلے میں کچھ بیوروکریٹس کے نام بھی اس میں شامل ہو گئے ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''آپ جانتے ہیں نا مجھے۔ میں ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ میں ایک انویسٹی گیٹر جرنلسٹ ہوں۔ میرے سامنے اس ملک کے طاقتور لوگوں کا ایک جرم آیا ہے اور وہ بھی اپنے پورے حقائق کے ساتھ...... تو یہ میری ڈیوٹی ہے کہ اسے عوام کے سامنے پیش کروں۔''

''میں جانتا ہوں بیٹا...... اچھی طرح جانتا ہوں۔'' وہ ہاتھ اٹھا کر بولے۔ ''لیکن تم نوجوان ہو...... خون گرم ہے تمہارا...... تمہاری صحافتی قابلیت میں مجھے کوئی شبہ نہیں لیکن ابھی تمہیں بہت کچھ سیکھنے اور بہت کچھ جاننے کی ضرورت ہے۔ صحافت کے اصول اپنی جگہ لیکن عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہر بات سامنے لانے والی نہیں ہوتی۔ بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔ پوزیشن، ٹائمنگ، حالات کا رخ دیکھنا پڑتا ہے۔ صحیح حالات میں ایک کڑوا سچ بعض اوقات امن برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''بات اگر یہی ہے تب بھی میرے خیال میں میری رپورٹ کی ٹائمنگ اور حالات بالکل مناسب ہیں۔''

''سنو......'' قدیر بابا نے مجھے ٹوکتے ہوئے کہا لیکن اسی لمحے نسیم اطہر بول پڑا۔

''قدیر صاحب! یہ لیکچر پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھیں۔ فی الحال اس سے وہ بات کریں جس کے لیے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ اس سے پوچھیے اس کی قیمت!''

''پوچھنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے نسیم اطہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں ویسے ہی بتا دیتا ہوں، میری قیمت ادا کرنے کی اوقات اس کمرے میں بیٹھے کسی بھی شخص کی نہیں ہے۔''

وہ بھڑک اٹھا۔ ''یو بلڈی نان سینس...... اوقات تو تمہیں ہم دو منٹ میں یاد کروا دیں گے۔''

''کوشش کر کے دیکھ لیں۔ ہو سکتا ہے میری اوقات کی یاد دہانی کرواتے ہوئے آپ کو اپنی حیثیت کا پتا چل جائے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''دیکھو...... تم اپنی حد سے آگے بڑھ رہے ہو۔'' خورشید انور بول پڑے۔

''نسیم...... کامران...... ہم یہاں مصالحت کے لیے بیٹھے ہیں......'' قدیر بابا نے میرے جواب دینے سے پہلے ہی ٹوک دیا پھر میری طرف مڑے۔

''یہ جو تم باتیں کر رہے ہو یا جو ہم تم سے کہنا چاہتے ہیں، تم اس سے اچھی طرح واقف ہو۔ یہ صحافتی سچائیاں، عوام کا درد، کرپشن کا دکھ، ضمیر کی آواز وغیرہ وغیرہ...... یہ سب ٹیکنیکل ٹرم تک محدود ہیں۔ انہیں بول کر یا لکھ کر استعمال کیا جائے تو خوبصورت لگتی ہیں لیکن حقیقت کی دنیا میں ان کا کوئی کام نہیں۔ ان سب بہانوں کو جانے دو۔ بہتر ہوتا کہ اس رپورٹ کو شائع کرنے سے پہلے تم یا تمہارے ایڈیٹر صدیقی صاحب چند لوگوں سے مشورہ کر لیتے تو صورتِ حال اتنی خراب نہ ہوتی۔ لیکن اب بھی کھیل تمہارے ہاتھ میں ہے۔ ابھی معاملہ اتنا آگے نہیں گیا۔ اصل چیز وہ شہادتیں ہیں جو تمہارے پاس ہیں۔ ہمیں ان پر بات کرنی ہوگی اور اس معاملے کا کوئی بہتر حل تلاش کرنا ہوگا کامران بیٹے۔''

''حل تلاش کیا کرنا ہے، وہ تو آپ کے نسیم صاحب بتا چکے ہیں۔ مجھے یہاں رات گئے اس لیے بلوایا ہے کہ میری قیمت طے کی جائے......!'' میں نے برہمی سے کہا۔ ''ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ میں چودھری حشمت علی کا بیٹا ہوں جس سے وہ لاکھ دشمنی کریں لیکن ان کی وراثت میں کروڑوں کا حصہ ہے میرا۔ میں کوئی ٹٹ پونجیا نہیں اور نہ ہی یہ رپورٹس میں نے ان لوگوں کو بلیک میل کرنے کے لیے لکھی ہیں۔''

''دیکھو کامران! نسیم نے غلط لفظ استعمال کیا۔ اس کے لیے میں معافی مانگتا ہوں۔'' خوش شکل سلیم قریشی نے گفتگو کی لگام خود تھام لی۔ ''تمہیں بابا قدیر کی باتوں کو ٹھنڈے دماغ سے سوچنا ہوگا۔ اپنی فینٹسی ورلڈ سے تھوڑی دیر کے لیے باہر نکلو پلیز...... حقیقت کی دنیا کا سامنا کرو۔ یہاں کے حقائق کچھ اور ہیں...... تمہارے لیے یہ محض ایک رپورٹ ہے...... لیکن تمہاری اس رپورٹ سے درجن بھر قابل آفیسر شدید متاثر ہوں گے...... اور چلو میں مان لیتا ہوں کہ یہ درجن بھر لوگ اس جرم میں ملوث ہیں لیکن اگر ان کے خلاف یہی ہونا ہے تو پھر پورے سسٹم کے خلاف یہی کچھ کرنا چاہیے کیونکہ یہاں تو سبھی یہی کچھ کر رہے ہیں اور جانتے ہو اگر

پورے سسٹم کے خلاف یہ سب کیا گیا تو کیا ہوگا؟ اس ملک کا چلتا ہوا پہیا رک جائے گا۔ تمہیں دفتروں میں سرکاری عمارتوں میں کوئی نظر نہیں آئے گا۔ ایک دن...... صرف ایک دن کے لیے مان لو کہ تم اس سسٹم کے ہر کرپٹ آفیسر کو اس کے کام سے روک دو گے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ کروڑوں ڈالرز کا نقصان ہوگا اس ملک کو......"

"شاید آپ کی اکنامکس کمزور ہے سر...... کروڑوں ڈالرز کا نقصان نہیں ہوگا بلکہ فائدہ ہوگا کیونکہ صرف ایک دن اس ملک میں اگر ہر سرکاری افسر "کرپشن" نہ کر سکے تو کروڑوں ڈالرز کا فائدہ ہوگا...... نہیں یقین تو آزما کر دیکھ لیں۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا تو وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گئے۔

"تم چاہتے کیا ہو؟" قدیر بابا زچ ہو کر بولے۔

"بابا! میں ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں۔ ایک غریب اپنے بھوکے بچے کے لیے روٹی چوری کرے تو قانون اسے سزا دیتا ہے لیکن جب یہ بھرے ہوئے معدے اور بھری ہوئی تجوریوں والے "چوری" کرتے ہیں تو قانون بے بس کیوں ہو جاتا ہے؟"

کمرے میں سکوت طاری ہو گیا۔ میرے سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ میں اب اٹھنا چاہتا تھا۔

لیکن تبھی کمرے میں ابھی تک خاموش بیٹھے سکندر بخت نے حرکت کی۔ انہوں نے موبائل ایک طرف رکھا اور نظر کا چشمہ اتار کر میری طرف سرد نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کامران! یہی نام ہے نا تمہارا......؟" ان کی آواز میں ایک گونج تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اس سے پہلے تم نے جو رپورٹس لکھیں، کافی مشہور ہوئی تھیں اور بہت زبردست رسپانس ملا تھا ان پر...... غالباً تمہیں کوئی جرنلزم کا ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔ اچھی بات ہے لیکن مسٹر کامران...... کیا تم جانتے ہو کہ تمہاری ان تہلکہ خیز رپورٹس کا موجودہ اسٹیٹس کیا ہے؟ جن اسٹاک مارکیٹ کے بروکرز کا منی اسکینڈل تم نے پکڑا تھا، جانتے ہو وہ کہاں ہیں اس وقت، وہ آج کل یورپ میں عیش کی زندگی گزار رہے ہیں اور تمہارا دوست ایس پی جنید...... جس پر جعلی پولیس مقابلہ ثابت بھی ہو گیا تھا اسے معطل کر کے پولیس کورس کے بہانے ملک سے باہر بھیج دیا گیا ہے۔ وہ کچھ عرصے بعد واپس آئے گا تو ترقی کر کے پہلے سے بڑا افسر بن چکا ہوگا۔ دیکھو کامران! میں گھما پھرا کر گفتگو کرنے کا قائل نہیں۔ لہٰذا پوائنٹ پر آتا ہوں۔ تم نے سچ کہا کہ تمہاری قیمت کوئی نہیں لگا سکتا لیکن یہ رپورٹس تمہاری محنت ہیں اور ہر محنت کا معاوضہ ہوتا ہے۔ اب یہ تم پر ہے کہ تم اسے کس شکل میں لیتے ہو۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

وہ خاموش ہوا تو جیسے سب میری طرف فیصلہ کن انداز میں دیکھ رہے تھے۔ میں نے چند لمحے کے لیے سوچا اور پھر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ کی باتیں سن کر میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں صحیح لوگوں کے خلاف صحیح جگہ پر ہوں۔"

"کامران......" سلیم قریشی نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ سکندر بخت اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اٹھتا دیکھ کر باقی سب بھی اپنی اپنی جگہوں سے اٹھ گئے۔ سکندر بخت نے اپنا موبائل اٹھایا، چشمے کو آنکھوں پر جمایا اور نسیم اطہر کی طرف دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔

"دنیا میں دو طرح کے انسانوں کو سمجھانا ناممکن ہے...... ایک وہ جنہیں زندگی سے بہت پیار ہوتا ہے، دوسرے وہ جنہیں زندگی سے بالکل بھی پیار نہیں ہوتا۔ اس بندے سے بات کرنا بے کار ہے۔" اور وہ یہ کہہ کر دروازے کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھ گئے۔

چند لمحے تک نسیم اطہر، خورشید انور اور سلیم قریشی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر وہ تینوں بھی ایک ساتھ ہی باہر نکل گئے۔

کمرے میں میرے ساتھ قدیر بابا اکیلے رہ گئے۔ وہ گہری سوچ میں گم تھے۔ میں نے عصا پر دھرے ان کے جھریوں زدہ ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھا تو وہ ایک لمبا سانس لے کر رہ گئے۔

"یہ تم نے ٹھیک نہیں کیا۔" انہوں نے کہا۔

میں نے فقط یہ شعر پڑھا۔ "ہم صبح پرستوں کی یہ ریت پرانی ہے...... ہاتھوں میں قلم رکھنا، یا ہاتھ قلم رکھنا۔"

وہ خاموش ہو گئے۔ میں وہاں سے اٹھ آیا۔

☆☆☆

رپورٹ کا ہنگامہ اگلے دن بھی جاری تھا۔ کورٹ نے ازخود نوٹس لیتے ہوئے اس معاملے کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ ملوث افسروں اور تفتیشی اداروں کو عدالت میں بلوا لیا گیا تھا۔ اخباری تبصروں، میڈیا کے پروگرامز اور میری رپورٹ کو اس مقدمے کا حصہ بناتے ہوئے سمن جاری کر دیے گئے تھے۔ البتہ ابھی تک چودھری حشمت علی سمیت چند بااثر افراد کے نام عدالت میں پکارے نہیں گئے تھے۔

☆☆☆

''تمہیں اپنی سیکیورٹی پر توجہ دینی ہوگی۔ معاملہ گمبھیر ہوتا جارہا ہے اور تم بائیک پر گھوم رہے ہو۔'' صدیقی صاحب ناراضی سے کہہ رہے تھے۔

''میں گاڑی میں ہی آنا چاہتا تھا لیکن عین موقع پر پتا چلا کہ اس کا ٹائر پنکچر ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ یہ دن ایسی بھاگ دوڑ میں گزر رہے ہیں کہ ان چیزوں کی طرف دھیان ہی نہیں دیا جاتا لہٰذا بائیک لے کر نکل آیا۔'' میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا...... کچھ دیر پہلے ہی میں ان کے دفتر میں پہنچا تھا۔

''پھر بھی احتیاط کیا کرو۔ فارم ہاؤس کی میٹنگ میں تو تمہیں صاف الفاظ میں دھمکیاں دی گئی ہیں۔ انہیں محض دھمکیاں مت سمجھنا...... وہ لوگ بہت آگے تک جاسکتے ہیں۔''

''میرا نہیں خیال کہ کوئی اتنا بے وقوف ہوگا۔ عدالت میں کیس چل رہا ہے۔ ساری دنیا کو معلوم ہو چکا ہے۔ ایسے میں اگر مجھے خراش بھی آئے گی تو ذمے دار کون ہوں گے؟'' میں نے بے پروائی سے کہا۔

''اس بات کو اتنا ہلکا بھی مت لو...... تمہارے پاس ایسے ثبوت ہیں جو ان لوگوں کو مجرم ثابت کرسکتے ہیں۔ وہ لوگ تمہیں ان ثبوتوں کو ہرگز ہرگز عدالت تک نہیں لے جانے دیں گے، چاہے اس کے لیے انہیں کچھ بھی کرنا پڑے......'' وہ واقعی میں فکرمند تھے۔

''میں سمجھتا ہوں اسی لیے تو میں آپ کے پاس ایک بہت ضروری کام کے سلسلے میں آیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر مجھے کچھ بھی ہوجاتا ہے تو کم از کم وہ ثبوت عدالت تک ضرور پہنچ جائیں۔''

''اس کا بہترین حل تو یہی ہے کہ تم وہ سارے ثبوت اپنے وکیل کے حوالے کردو...... یا پھر کسی اعتماد والے شخص کو اس جگہ کا علم ہونا چاہیے جہاں وہ ثبوت تم نے چھپا رکھے ہیں۔''

''میں نے بھی یہی سوچا تھا...... لیکن وکیل والی بات پر دل نہیں مانا۔ دوسری بات ٹھیک ہے اور اسی لیے میں یہاں آیا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے ایک بند لفافہ جیب سے نکال کر ان کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ ''موجودہ حالات میں، میں آپ سے زیادہ کس پر اعتماد کرسکتا ہوں۔ اس لفافے میں اس جگہ کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں میں نے ثبوتوں کی اصل فائلز رکھی ہیں۔ اگر مجھے کچھ ہوجاتا ہے تو ان ثبوتوں کو عدالت تک پہنچانے کی ذمے داری آپ پر عائد ہوگی۔''

''یہ تم مجھ بوڑھے پر اتنا بوجھ کیوں ڈال رہے ہو؟''

''آپ کے علاوہ میں کسی اور پر بھروسا نہیں کرسکتا۔''

''خدانہ کرے کہ تمہیں کچھ ہو لیکن دوسری صورت میں میں تمہاری اس امانت کو اس کی منزل پر پہنچانے کی پوری کوشش کروں گا لیکن اگر مجھ سے کسی قسم کی کوئی کوتاہی ہوئی تو......؟'' وہ تذبذب میں تھے اسی لیے انہوں نے ابھی تک اس لفافے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔

''آپ پر اعتماد کیا ہے تو اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ آپ کی طرف سے کسی بھی قسم کی کوتاہی پر میری طرف سے آپ بری الذمہ ہوں گے۔ آپ پر کوئی مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔'' میں نے انہیں یقین دلاتے ہوئے کہا تو انہوں نے لفافہ اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اسی لمحے مجھے اپنے گھر سے چوکیدار کی کال ریسیو ہوئی۔

''سر! ہمارے گھر پر فائرنگ ہو رہی ہے۔''

☆☆☆

''وہ چار لوگ تھے، دو موٹر سائیکلوں پر سوار۔ دونوں موٹر سائیکلیں بغیر نمبر پلیٹ کے تھیں۔ فائرنگ دو آدمیوں نے آٹومیٹک رائفل سے کی اور تقریباً دس راؤنڈز فائر ہوئے۔ تمہارے چوکیدار کی طرف سے جوابی فائرنگ پر وہ لوگ بھاگ نکلے لیکن اگر ہم ان کی فائرنگ کا ٹارگٹ دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ گولیاں مین گیٹ اور ساتھ والی دیوار پر ماری گئیں جن کا مقصد صرف اور صرف ڈرانا تھا۔ کسی کی جان لینا ان کے پلان میں شامل نہیں تھا۔'' نیلی وردی میں ملبوس بھوری آنکھوں والا انسپکٹر مجھے وہ تفصیل بتا رہا تھا جو میں خود بھی سوچ سکتا تھا۔

''آپ کو کسی پر شک ہے مسٹر کامران؟''

''میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں ایک صحافی ہوں اور صحافیوں کے کئی دشمن ہوسکتے ہیں...... نئے بھی اور پرانے بھی...... میں اندازے کی بنا پر کسی کو نامزد تو نہیں کرسکتا۔'' میں نے کہا۔

''ہوں! ویسے پرانے دشمن صرف ڈراتے نہیں ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے، یہ نئے بھی تو ہوسکتے ہیں۔''

''ہونے کو تو بہت کچھ ہوسکتا ہے...... یہ پتا چلانا آپ کا کام ہے۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ اس نے چائے کا آخری گھونٹ بھرنے کے بعد کپ نیچے رکھ دیا اور اٹھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے پھر جیسے آپ کی مرضی...... میں نامعلوم افراد کے خلاف ہی پرچہ کاٹ دوں گا لیکن آپ کو تھوڑی تکلیف کرتے ہوئے تھانے آنا پڑے گا۔'' میرے سر ہلانے پر وہ اپنے ساتھ آئے اے ایس آئی اور دونوں کانسٹیبلوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔ اس کا اتنا مؤدبانہ لہجہ اس لیے نہیں تھا کہ

میں صحافی تھا بلکہ اس لیے تھا کہ میں ایک جاگیردار کا بیٹا بھی تھا۔ میں نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ وہ اپنے ساتھ موجود دونوں کانسٹیبلوں کو گیٹ پر چھوڑ گیا تھا۔ اس کے بعد کافی دیر تک مجھے صحافی برادری کی طرف سے کالیں موصول ہوتی رہیں وہ میرا حوصلہ بڑھا رہے تھے اور مجھے یقین دلا رہے تھے کہ وہ سب میرے ساتھ ہیں۔

''ہم کل پریس کلب کے سامنے احتجاج کر رہے ہیں۔ تمہیں ایک پریس کانفرنس کرنی چاہیے...... تاکہ لوگوں کو پتا چلے کہ تمہاری جان کو کن لوگوں سے خطرہ ہے۔ اس طرح تمہارا کیس بھی مضبوط ہوگا۔'' صدیقی صاحب نے مجھے مشورہ دیا جو کچھ دیر بحث کے بعد میں نے مان لیا لیکن دوسرے دن صبح ہی صبح مجھے میرے ایک صحافی دوست کا فون آیا جو مجھے ٹی وی دیکھنے کا کہہ رہا تھا۔ جب میں نے ٹی وی آن کیا تو وہاں وہی انسپکٹر پریس کانفرنس کر رہا تھا جس سے کل میری ملاقات ہوئی تھی۔

''گزشتہ رات ہم نے معروف صحافی کے گھر فائرنگ کرنے والے چاروں مجرم گرفتار کر لیے ہیں۔ مجرموں کا کہنا ہے کہ وہ چوری کی غرض سے گھر میں گھسنا چاہتے تھے لیکن گارڈ کی فائرنگ سے انہیں ناکامی ہوئی اور وہ جواباً فائر کرتے ہوئے فرار ہو گئے لیکن آج صبح کراچی کمپنی کے بس اسٹینڈ سے یہ لوگ گرفتار ہو گئے اور انہوں نے اپنا جرم بھی تسلیم کر لیا ہے۔''

صدیقی صاحب کا فون آیا۔ وہ بھی اسی رپورٹ کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ میں نے ہنس کر کہا۔

''اب احتجاج کا تو کوئی جواز نہیں بنتا کیونکہ پولیس نے شاندار کارکردگی دکھاتے ہوئے نہ صرف مجرموں کو گرفتار کر لیا ہے بلکہ ساری واردات کو چوری کا رنگ بھی دے دیا۔''

''خیر احتجاج تو ضرور ہوگا کیونکہ ایک صحافی پر حملہ ہوا ہے لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ کیا ان لوگوں کا خیال تھا کہ تم ایسی دھمکی سے ڈر جاؤ گے؟''

''شروعات تو ایسے ہی ہوتی ہیں صدیقی صاحب...... یہ تو فقط ایک ٹریلر تھا۔ اصل فلم تو ابھی انہوں نے ریلیز بھی نہیں کی۔''

''مجھے تمہاری سیکیورٹی کی فکر ہے۔'' وہ پریشانی سے کہہ رہے تھے۔ ''تم اپنے بھائیوں سے کیوں نہیں کہتے۔ وہ کچھ لوگ بھیج دیں تمہاری سیکیورٹی کے لیے......''

اب میں انہیں کیا بتاتا کہ بھائیوں نے تو بہت پہلے سے کہہ رکھا تھا لیکن میں انکار کرتا رہا تھا۔

''وہ ہیں نا پورے دو عدد کانسٹیبل میرے گھر کا پہرا دینے کے لیے۔''

''ان مجرموں کی گرفتاری کے بعد انہیں ہٹا لیا جائے گا۔ میں اعلیٰ افسران سے بات کرتا ہوں کہ انہیں کچھ دن کے لیے ہٹایا نہ جائے۔'' انہوں نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

اسی شام وہ خبر بھی آ گئی جس کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔ سیکیورٹی ایجنسیاں مراد آباد کے جنگل میں موجود خفیہ راستے تک پہنچ گئی تھیں۔ یہ میری ایک کامیابی تھی کیونکہ خفیہ راستے کے ہونے کا مطلب تھا کہ یہاں سے اسمگلنگ بھی ہوتی رہی ہوگی مگر اس کے برعکس جو خبریں آ رہی تھیں، ان کے مطابق یہ ریسٹ ہاؤس اور خفیہ راستہ طویل عرصے سے بند تھے اور انہیں ایسی کوئی شے نہیں ملی جس سے اندازہ ہو کہ یہ جگہ کافی عرصے سے استعمال ہوتی رہی ہے اور یوں حکومتی قبضے کے بعد وہاں سے اسمگلنگ کا باب ختم ہو گیا۔

ٹیلیفون کی بیل بج رہی تھی۔ دوسری جانب میرا دوست فیصل بٹ تھا۔

''اوئے تو کیا کرتا پھر رہا ہے...... کوئی رابطہ نہیں کوئی اطلاع نہیں۔ ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ...... کل شام تیرے اسلام آباد والے گھر پر فائرنگ ہوئی تھی۔ لگتا ہے تو گھر میں نہیں تھا ورنہ مجھے پورا یقین ہے کہ ان میں سے کوئی بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔''

''کھوتے کے سینگ...... میں نے سنا تھا کہ تو اپنے منسٹر کے ساتھ امریکا گیا تھا۔ انہیں واپس آئے مہینا ہو گیا تو کہاں رہ گیا تھا......؟'' میں نے پوچھا۔

''میں امریکا سے نہیں سعودیہ سے واپس آ رہا ہوں۔ منسٹر کے کچھ یار بیلی عمرے پر جا رہے تھے۔ ساتھ میں رپورٹنگ کے لیے مجھے بھی لے گئے۔''

''سرکاری پیسوں پر عمرہ کر کے آ رہا ہے تو...... مطلب اب تو سرکار کی نمک حلالی کرنی پڑے گی تجھے...... پھر تو اپنی چلنے والی نہیں۔''

''کیا مطلب......؟''

''مطلب یہ کہ آج کل تیری سرکار سے اپنی بن نہیں رہی۔''

''اوئے ان کی ایسی کی تیسی...... کاہے کی نمک حلالی...... دوست یار سے بڑھ کر اور کون ہوتا ہے۔''

میں ہنس پڑا۔ ''احسان فراموش...... جن کے پلے سے عمرہ کر کے آ رہا ہے انہی کے خلاف بولے گا؟''

''یار بولنا تو نہیں چاہیے...... پر تیرے جیسے سجن کے لیے یہ بھی کر سکتا ہوں۔'' وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ''میں نے ٹی وی

رپورٹ دیکھنے کے بعد پرانے اخبار دیکھے ہیں۔ تیری رپورٹ پڑھی تو سمجھ گیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ بس مجھے ایک بات بتا دے یار تو نے چاچاجی (چودھری حشمت) کو بیچ میں کیوں ڈال لیا؟''

''وہ بیچ میں نہیں آئے..... باقی لوگ راستے میں آ گئے تھے۔ میں نے یہ رپورٹ چودھری حشمت علی کے بارے میں ہی لکھی تھی لیکن تو جانتا ہے کہ ایسے تمام غیر قانونی کام..... ملی بھگت کے بغیر ممکن نہیں..... سو وہ افسر بھی بیچ میں آ گئے۔'' میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''تجھے ساری دنیا میں اپنے باپ کے علاوہ اور کوئی ٹارگٹ نہیں ملا تھا..... ویسے چاچاجی کا کیا ردعمل ہے؟''

''تبدیلی کا آغاز اپنے گھر سے ہی ہوتا ہے۔ ویسے چودھری صاحب اس معاملے میں بالکل خاموش ہیں۔''

''تبدیلی کی ایسی کی تیسی..... کس چیز کی تبدیلی کرنے جا رہا ہے تو..... یہ معاشرہ ٹھیک ہونے والا نہیں۔'' وہ جھنجلا کر بولا۔

''نہیں..... اس معاشرے کو ٹھیک کرنے والا کوئی نہیں لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ٹھیک کرنے والا ہم میں سے ہی ایک ہو۔ تم بھی ہو سکتے ہو لیکن تمہیں اس بات کا ادراک نہیں ہے۔''

میری بات سن کر وہ بولا۔ ''پھر تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھے ادراک نہیں ہے اسی لیے تو ہنس کھیڈ رہا ہوں۔ خیر اب تو نے ہمت کر ہی لی ہے تو تجھے تو اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔ اب تو ہر قدم پر ساتھ نبھانا ہوگا۔''

''کب مل رہا ہے..... گھر آ جا.....'' میں نے کہا۔

''میں تو ادھر لاہور میں ہوں۔ پرسوں اسلام آباد آؤں گا سیدھا تیرے پاس..... اپنا خیال رکھنا۔'' فون بند ہو گیا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی اور گھر میں میرے طوطے اور بلی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ کیونکہ ہاسٹل اور پھر فلیٹ میں رہنے کی عادت نے مجھے اکیلا رہنے کا عادی بنا دیا تھا۔ کھانا بنانے میں وقت لگ سکتا تھا۔ میں نے سوچا باہر نکلا جائے۔ ہوا خوری کے ساتھ کچھ پیٹ پوجا بھی ہو جائے گی۔ باہر چوکیدار اکیلا تھا۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ کانسٹیبل صبح ہی واپس چلے گئے تھے۔ گاڑی ابھی تک ورکشاپ سے واپس نہیں آئی تھی۔ میں ایک بار پھر اپنی ون ٹو فائیو لے کر باہر نکل آیا۔ ابھی میں اپنی گلی سے نکلا ہی تھا کہ کچھ ہی دور روڈ پر کھڑے ایک نوجوان لڑکے نے لفٹ کے لیے اشارہ کیا تو میں نے اسے ساتھ بٹھا لیا۔ اسے تھرڈ بلاک میں جانا تھا لیکن ایسا ہوا نہیں۔

☆☆☆

''بھائی..... یہ کیا ہے؟'' میں نے کمر میں چبھن محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

''اسے پستول کہتے ہیں۔ چپ چاپ چلتے رہو..... بریک مارنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ غرایا۔

''ہائے اللہ..... پپ..... پستول..... وہ جس سے گگ..... گولی نکلتی ہے؟'' میں نے خوفزدہ انداز میں کہا۔

''نہیں تو کیا موٹر سائیکل نکلتا ہے.....؟ چپ چاپ چلاتا رہ۔'' وہ میرا خوف دیکھ کر مطمئن سا ہو گیا۔

''مم..... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اگر مم..... مجھے راستے میں ہارٹ اٹیک ہو گیا تو ہم دونوں بائیک سے گر جائیں گے۔'' میں نے موٹر سائیکل کو لہراتے ہوئے کہا۔

''نہیں ہوتا تمہیں اٹیک..... اتنے نازک نہیں ہو تم..... اور یہ ہینڈل کو دائیں بائیں کیوں گھما رہے ہو..... بائیک سیدھی رکھو۔'' اس نے پسٹل کو مزید چبھویا۔

''نن..... نہیں وہ..... ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ آپ کو مجھ سے کیا چاہیے؟ موبائل میں گھر بھول آیا ہوں..... بائیک رینٹ کی ہے اور جیب میں ڈیڑھ سو روپے سے زیادہ نہیں ہیں۔''

''مجھے یہ سب نہیں چاہیے..... مجھے تو صرف تمہیں لے کر جانا ہے۔''

''اغ..... اغوا بالجبر..... یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میرے چھوٹے چھوٹے ماں باپ ہیں۔ بوڑھے بوڑھے بچے ہیں، ان سب کا کیا ہوگا؟'' میں نے روتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی بائیک کی رفتار بھی کم کر دی۔

''ابے رونا بند کر اور اسپیڈ بڑھا..... ورنہ ابھی تکبیر پڑھ دوں گا تیری۔'' وہ جھنجلا کر بولا۔ میں نے پہلے گیئر میں رکھتے ہوئے ریس کو پوری طرح گھما دیا اور بائیں ہاتھ میں دبا کلچ ایک دم چھوڑ دیا۔ ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ بائیک بالکل الف ہوتے ہوئے گولی کی طرح ون ویلنگ کرتی ہوئی آگے نکلی۔ میں نے ہینڈل کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا اور ذہنی طور پر تیار تھا اس لیے میں بائیک کے ساتھ ہی چپکا رہا لیکن پیچھے والا بندہ میری توقع کے عین مطابق پشت کے بل زمین پر جا گرا۔ جیسے ہی مجھے اس کے گرنے کا احساس ہوا، میں نے بائیک پر گرفت چھوڑتے ہوئے سڑک پر چھلانگ لگائی اور اس آدمی کی طرف بھاگا۔ وہ ایک ہاتھ میں اپنا بایاں ٹخنہ لیے اونچی آواز میں چلا رہا تھا۔ پسٹل اس کے ہاتھوں سے نکل کر

کس سائڈ پر گم ہوگیا تھا۔ میں نے جاتے ہی اس کے زخمی ٹخنے پر ٹھوکر لگائی۔ وہ ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح ڈکرایا۔ میں اسے زخمی ٹانگ سے گھسیٹ کر سڑک کے داہنی طرف موجود درختوں کے کنج میں کھینچ لایا۔ ''نام کیا ہے تیرا.....؟'' میں نے اس کے زخمی ٹخنے کو ہاتھ سے دباتے ہوئے پوچھا۔

''شش.....شاہد.....'' وہ کراہتے ہوئے بولا۔

''شاہد صاحب یہ بتانے کی تکلیف گوارا کریں گے کہ آپ کو میرے لیے کس نے بھیجا ہے؟''

''تیرے باپ نے.....؟'' وہ چلایا۔ میں نے اس کا ٹوٹا ہوا ٹخنہ ہاتھ سے دبا دیا تھا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ گالیاں بکنے لگا۔

''دیکھ میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے.....اور نہ ہی تیرے پاس..... بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ میرے سوالوں کا جواب دیتا رہ.....ورنہ دیکھ لے کہ سڑک ساری خالی ہے۔ میں تیرے پاؤں سے رسی باندھ کر موٹر سائیکل کے ساتھ اس سڑک پر دو تین کلومیٹر بھی گھسیٹوں تو تیرے جسم کی ساری کھال اتر جائے گی اور کوئی دیکھنے والا بھی نہیں ہوگا.....میں جانتا ہوں تو صرف ایک مہرہ ہے۔ مجھے بس اپنے باس کا نام بتا۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''اسحاق ساقا.....نام ہے اس کا۔''

''لہجے سے تو مجھے تو لاہوریا لگتا ہے۔ وہ ساقا بھی لاہوریا ہی ہے؟''

''وہ گوجر خان کا سب سے بڑا بدمعاش ہے۔ میں لاہور سے اس کے پاس ایک اور کام سے گیا تھا لیکن اس نے مجھے تیرے پیچھے اسلام آباد بھیج دیا۔'' وہ کراہتے ہوئے بولا۔

''تو کیا کہا گیا تھا تجھ سے میرے بارے میں؟'' میں نے پوچھا۔

''تیری فوٹو دکھائی تھی اور گھر کا پتا بتایا تھا۔ کہا تھا کہ تجھے تھوڑا سا ڈراوا دینا ہے.....اور بس۔'' اس کی بات سن کر میں حیران رہ گیا۔

''کیا مطلب.....تم مجھے اغوا کرنے کی کوشش نہیں کر رہے تھے؟''

''اگر اغوا کرنا ہوتا تو کیا میں اکیلا آتا اور وہ بھی پیدل؟ میں نے تو تھوڑی دور تک تجھے پستول سے خوفزدہ کرنا تھا، تقریباً ایک گھنٹے کے لیے گھر سے باہر رکھنا تھا۔'' وہ کراہتے ہوئے بول رہا تھا اور مارے حیرت کے میں کتنی ہی دیر کچھ بول بھی نہ سکا۔

''مم..... مجھے بہت درد ہو رہا ہے..... مجھے اسپتال لے جاؤ.....'' وہ کراہا۔

''میرا اصول ہے کہ میں ایک بندے کو ایک بار ہی لفٹ دیتا ہوں اور ویسے بھی تیرے کرموں کی کچھ تو سزا تجھے ملنی چاہیے۔'' میں اسے وہیں چھوڑ کر اپنی بائیک ڈھونڈتا ہوا آگے چلا آیا۔ کافی آگے سڑک سے نیچے جھاڑیوں میں وہ مجھے مل گئی۔ اس کی ٹینکی پچک گئی تھی اور کلچ کی تار بھی ٹوٹ گئی تھی لیکن جب میں نے اسے اسٹارٹ کیا تو باقی سب کچھ ٹھیک تھا۔ میں وہیں سے واپس گھر ہولیا۔ میرا دماغ سوچوں کے پندار میں گھرا ہوا تھا۔ کل گھر پر فائرنگ اور آج یہ واقعہ.....کیا وہ لوگ احمق تھے جو یہ سب کچھ کر رہے تھے؟ کیا انہیں لگ رہا تھا کہ میں دو ٹکے کے بدمعاشوں اور پستولوں سے ڈر جاؤں گا.....یا پھر یہ کوئی چال تھی؟ کوئی ایسی چال جسے میں سمجھ نہیں پا رہا تھا.....لیکن جیسے ہی میں گھر پہنچا تو میرے ہوش ٹھکانے آگئے۔ گیٹ بظاہر بند تھا لیکن دھکیلنے پر کھلتا چلا گیا۔

چوکیدار اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا۔ اسے کلوروفارم سے بے ہوش کرنے کے بعد اس کی مشکیں کس کر لان کی ایک کیاری میں پھینک دیا گیا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پاؤں کھولے اور وہیں گھاس پر لٹا کر برآمدے کی طرف بڑھا تو چونک گیا۔

برآمدے کی سیڑھیوں پر میں نے خون کے قطروں کی ایک قطار دیکھی۔ سفید پتھروں سے بنے فرش پر خون کے سرخ قطرے ایک قطار کی صورت میں لاؤنج کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں کسی روبوٹ کی طرح ان قطروں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ لاؤنج کا ادھ کھلا دروازہ میں نے ہاتھ بڑھا کر پورا کھول دیا..... تیز میوزک کی لہر میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میری نظریں خون کے قطروں پر ہی جمی تھیں جو کریم کلر کے قالین پر آگے بڑھتے ہوئے صوفوں اور گلاس ٹیبل پر سے ہوتے ہوئے سامنے کی دیوار کی طرف جا رہے تھے۔ سفید دیوار پر میرے ہفت رنگ آسٹریلین طوطے کی لاش چپکی تھی۔ اس کے دونوں پروں کو پھیلا کر چاقوؤں کی مدد سے دیوار پر اس طرح گاڑا گیا تھا جیسے اسے صلیب چڑھایا گیا ہو۔ اس کے جسم سے بہنے والا خون لکیروں کی صورت میں دیوار پر سے نیچے اترتا ہوا اب جم کر سیاہ ہو چکا تھا۔

میوزک کی آواز کانوں کے رستے میرے رگ و پے میں سما رہی تھی۔ جن خون کے قطروں کا میں پیچھا کرتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا وہ اس دیوار سے اور آگے بڑھ رہے تھے۔ اب کی بار ان کا رخ سیڑھیوں کی طرف تھا۔ میرے دل کی دھڑکن خوف سے تیز ہوتی جا رہی تھی اور میں ان قطروں کا پیچھا کرتے

ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگا تھا۔ اوپر پہنچ کر یہ خون کے قطرے ایک بند دروازے کے نیچے سے اندر جا رہے تھے۔ میں نے دروازہ دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اندر تاریکی تھی۔ میں نے بائیں جانب دیوار پر لگے پینل پر سے تمام بتیاں روشن کردیں اور اس کے ساتھ ہی ایک اور خوفناک منظر میرے سامنے تھا۔ میری سیامی بلی کو باقاعدہ پھانسی دی گئی تھی۔ اس کا بے جان جسم پنکھے کے ساتھ ایک رسّی کے ذریعے جھول رہا تھا۔ چند لمحے میں گم صم سا اسے دیکھتا رہا پھر اچانک مجھے جیسے ہوش ...... آ گیا۔ میں بھاگتا ہوا سامنے کی الماری کی طرف آیا۔ جیسے ہی میں نے اس کے پٹ کھولے، ایک گیلا سا رومال میری ناک سے ٹکرایا۔ ایک ناگوار سی مہک میرے احساسات کو اندھیرے میں دفن کرتی چلی گئی۔ بے ہوشی کے بے بس کر دینے والے احساسات کے پردے پر کچھ تصویریں تھیں۔ ایک چہرہ جس کے ہونٹوں سے قطرہ قطرہ خون ٹپک رہا تھا۔ نیم تاریکی میں ڈوبا ایک ہال نما کمرا...... ہانپتا ہوا ایک گھوڑا جس کا بدن پسینے سے بھیگا ہوا تھا...... آگ کے شعلوں میں گھرا ایک گھر...... سفید دیوار پر مصلوب کیے گئے آسٹریلین طوطے کی لاش......!

☆☆☆

میری آنکھیں ایک نیم تاریک کمرے میں کھلیں اور بہت دیر تک میرے احساسات سوئے ہی رہے۔ سر درد اور متلی کی سی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے چکراتے سر کو تھامتے ہوئے خود کو سنبھالا۔ میں اس وقت ایک بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ جب میں اٹھ کر بیٹھا تو مجھے شدید نقاہت کا احساس ہوا۔ میرے دونوں ہاتھوں کی پشت پر برنولے لگے تھے جن میں ڈرپ کی سوئی اتاری جاتی ہے۔ بیڈ کے سرہانے پڑی ایک چھوٹی سی ٹیبل پر پانی کی بوتل پڑی تھی۔ میں نے بوتل کو منہ سے لگایا اور غٹاغٹ اسے پیتا چلا گیا حتیٰ کہ بوتل خالی ہو گئی۔ بازوؤں میں چبھن سی ہو رہی تھی۔ قمیص کی آستین اوپر چڑھاتے ہوئے مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ میرے جسم پر کپڑے بھی تبدیل کیے جا چکے تھے۔ اس وقت میں نے ہلکے براؤن رنگ کی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ بازوؤں کے مسلز پر مجھے ایسے نشانات نظر آئے جیسے وہاں کئی انجکشن لگائے گئے ہوں۔ میں حیران ہوا کہ میں تو کلوروفارم سے ہی بے ہوش ہو گیا تھا پھر انجکشنز کی نوبت کیوں آئی؟ میں بیڈ سے نیچے اتر کر کھڑا ہوا تو نقاہت بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پہلا قدم تو میں نے یوں اٹھایا جیسا کوئی بچہ نیا نیا چلنا سیکھ رہا ہو۔ جسم میں توانائی کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کمرے پر طائرانہ نظر دوڑائی، دیواریں سپاٹ تھیں لیکن میرے بیڈ کے عین سامنے دیوار کے ساتھ ایک ٹی وی ٹرالی اور اس پر بڑا سا ٹی وی پڑا تھا جس کے نچلے ریک میں ایک سی ڈی پلیئر بھی نظر آ رہا تھا۔ کمرے کے کونے میں دس سے بارہ سیڑھیاں اوپر کو جاتی ہوئی ایک بند دروازے تک ختم ہو رہی تھیں جن سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ کمرا دراصل ایک تہ خانہ ہے۔ کمرے کے ایک کونے میں بنا دروازہ یقیناً باتھ روم کا تھا، میں اسی طرف آیا۔ واش بیسن کی ٹونٹی گھما کر میں نے پانی کھولا لیکن سامنے لگے شیشے میں خود کو دیکھ کر مجھے ایسا جھٹکا لگا کہ میں کتنی ہی دیر ساکت کھڑا رہ گیا۔ میں روزانہ شیو کرنے کا عادی تھا اور جب مجھے بے ہوش کیا گیا اس دن بھی صبح صبح میں نے خود اپنی شیو بنائی تھی مگر اس وقت میرے چہرے پر ڈاڑھی تھی۔ اتنی گھنی ڈاڑھی جیسے میں نے کئی ہفتوں سے شیو نہ بنائی ہو۔ چہرہ بھی کمزور سا لگ رہا تھا اور سر کے بال بھی بڑھ چکے تھے۔ مجھے اپنی نقاہت کا احساس ہوا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں چند گھنٹے نہیں بلکہ کئی دن تک بے ہوش رہا تھا یا پھر بے ہوش رکھا گیا تھا۔ میں واپس آ کر بیڈ پر گر سا گیا۔ دل کی دھڑکن کنپٹیوں میں گونج رہی تھی۔ مجھے انجکشنوں کی مدد سے بے ہوش رکھا گیا تھا اور انہی کے ذریعے مجھے اتنی خوراک دی جا رہی ہو گی کہ میں زندہ بھی رہوں...... لیکن ایسا کیوں کیا گیا اور میں کب تک بے ہوش رہا تھا؟ میری گھڑی، موبائل وغیرہ سب کچھ غائب تھا۔ جانے کتنے دنوں سے میں یہاں بے ہوش پڑا رہا اور پھر سب سے خطرناک سوال میرے ذہن میں گونجا۔

اس سب کا کیا ہوا ہو گا جس کے لیے میں اتنی محنت کر رہا تھا؟ اف خدایا! یہ سب کیا ہو رہا ہے...... میں سمجھتا رہا کہ میرے دشمن مجھے جان سے مارنے کی کوشش کریں گے لیکن انہوں نے تو کوئی اور ہی چکر چلا دیا۔ ان خیالات نے میرا دماغ ہلا کر رکھ دیا تھا۔ تہ خانے کا دروازہ کھل رہا تھا۔ ایک آدمی ٹرے لیے نیچے اترا اور ٹرے کو میرے قریب بیڈ پر رکھ دیا۔ اس میں بھاپ اڑاتے سوپ کا باؤل تھا۔

''کون ہو تم لوگ اور میں کہاں ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بنا کچھ کہے واپسی کے لیے مڑ گیا۔ میں اٹھ کر اسے دبوچنا چاہتا تھا لیکن کھڑے ہوتے ہی میرا سر اس بری طرح چکرایا کہ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا اور میں واپس بیڈ پر گرتا چلا گیا۔ میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ سوپ کی مہک میری اشتہا کو بڑھاوا دیے جا رہی تھی۔ لہٰذا میں نے باقی تمام معاملات پر لعنت بھیجتے ہوئے سوپ کا پیالہ اٹھا لیا۔ تب میری نظر ٹرے میں رکھی ایک اور چیز پر پڑی۔

کاغذ سے بنی پیکنگ کے اوپر لکھا تھا...... ''واچ دس'' اور اندر ایک سی ڈی تھی جس پر کوئی نشان نہیں تھا۔ میں نے پہلے سوپ پیا۔ اس سے میری بھوک تو نہیں مٹی البتہ حلق و معدہ ضرور تر ہو گئے۔ مجھے بے ہوش رکھنے والے جانتے تھے کہ مجھے ایک دم سے بہت سا کھانا نہیں کھلایا جا سکتا اس لیے انہوں نے پہلے پانی اور اب سوپ کا بندوبست کیا تھا۔ ذہن میں بہت سے سوالات مچل رہے تھے مگر ان کا جواب دینے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے ٹرے میں بھجوائی گئی سی ڈی اٹھائی اور آہستہ سے چلتا ہوا ٹی وی ٹرالی کی طرف آ گیا۔ پلے کیا تو ریکارڈ کی گئی ویڈیوز چل پڑیں اور اسکرین پر جو مناظر مجھے نظر آئے، وہ اتنے حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین تھے کہ میں ساکت بیٹھا انہیں دیکھتا رہ گیا۔ اسکرین چار حصوں میں تقسیم ہو کر چار مختلف نیوز چینلز کو ایک ساتھ دکھا رہی تھی۔ چاروں چینلز پر ایک ہی بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔

''معروف صحافی اور نوادرات کیس کے مرکزی کردار کامران چودھری ملک سے فرار ہو گئے۔'' اسکرین پر لاہور ائر پورٹ کی سی سی ٹی وی فوٹیج میں' میں ڈیپارچر لاؤنج اور پھر مختلف جگہوں پر جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے بعد میرا پاسپورٹ اور ٹکٹ نمبر دکھایا گیا جو میرے نام سے ہی تھا اور ساتھ ہی بتایا جا رہا تھا کہ کامران چودھری کسی کو بتائے بغیر کل صبح انگلینڈ روانہ ہو گئے۔ اسکرین پر ایک جھماکا ہوا اور پھر منظر بدل گیا۔

وہی چاروں نیوز چینل تھے جو باری باری پلے ہو رہے تھے اور اس بار بھی بریکنگ نیوز میری ہی ذات پر تھی۔

''کامران چودھری کے لندن میں ہونے کی تصدیق ہو گئی۔ سیاسی پناہ کی درخواست دینے کے بعد مقامی میڈیا کو بتایا گیا کہ وہ بہت جلد کچھ انکشافات کرنے والے ہیں۔''

ایک جھماکے کے بعد نیا منظر...... ''نوادرات اسمگلنگ کیس کے سلسلے میں ایف آئی اے کی تفتیش مکمل...... رپورٹ سپریم کورٹ میں پیش کر دی گئی۔ الزامات بے بنیاد ہیں، چودھری حشمت علی سمیت تمام ملزمان کا بیان...... سپریم کورٹ نے کامران چودھری کو طلب کر لیا۔ اگلی پیشی پر ثبوتوں کے ساتھ حاضر ہونے کا حکم......''

اگلا منظر...... ''ڈائریکٹر جنرل نسیم اطہر نے نیشنل میوزیم سے غائب اصلی نوادرات عدالت میں پیش کر دیے۔ سیکیورٹی رسک کی وجہ سے اصلی کی جگہ نقلی نوادر کلچر منسٹری کے حکم پر رکھے جاتے ہیں اور ایسا کرنے کے لیے بین الاقوامی طور پر حفاظت کا قانون موجود ہے۔ عدالت نے بنا ثبوت کے کامران چودھری کی رپورٹ مسترد کر دینے کا عندیہ سنا دیا۔''

پھر ایک نیا حیران کن منظر...... میں ٹی وی پر نظر آ رہا تھا۔ لندن سے براہِ راست...... ہاں وہ میں ہی تھا...... شاید...... اور وہ جو میں تھا، وہ کہہ رہا تھا۔

''میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے وہ رپورٹ کچھ لوگوں کو بلیک میل کرنے کے لیے تیار کی تھی۔ اس خود ساختہ رپورٹ کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے نہ ہی میرے پاس ان قیمتی نوادرات کی اسمگلنگ کے ٹھوس ثبوت ہیں اور نہ ہی خفیہ راستے کے ذریعے اسمگلنگ کی حقیقت ہے۔ اس خفیہ راستے کے بارے میں' میں بچپن سے جانتا ہوں۔ وہاں کبھی کوئی غیر قانونی کام نہیں ہوا۔ میں ان تمام لوگوں سے اور عوام سے معافی مانگتا ہوں کہ میں نے اپنے ذاتی غصے کا اظہار کسی اور پر بے بنیاد الزامات لگا کر کیا۔ چونکہ پاکستان میں میری جان کو

خطرہ تھا لہٰذا میں نے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ہے۔"

میں بُت بنا یہ ساری کارروائی دیکھتا رہا اور پھر ایک اور منظر...... "ملک بھر میں صحافی برادری کا کامران چودھری کے خلاف احتجاج...... صحافت کے غلط استعمال پر شدید غصہ...... کئی جگہ پر عوام نے بھی اس احتجاج میں بھرپور شرکت کی۔ مقامی روزنامے کے چیف ایڈیٹر صدیقی صاحب دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے انتقال کر گئے۔ یاد رہے کہ وہ کامران چودھری کے اچھے دوستوں میں شمار ہوتے تھے اور انہوں نے چند دن قبل قوم سے معافی مانگتے ہوئے انکشاف کیا تھا کہ کامران چودھری کی رپورٹ حقائق پر مبنی نہیں تھی اور اسے جانچے بغیر شائع کیا گیا۔"

میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو چکے تھے لیکن اس وقت مجھے اس کا ادراک نہیں تھا...... اور ابھی اس منحوس ٹی وی کی اسکرین روشن ہی تھی۔

"آخر کار بڑا فیصلہ آ گیا...... سپریم کورٹ نے نوادرات اسمگلنگ کیس میں ملوث تمام ملزمان کو باعزت بری کر دیا...... کامران چودھری کے خلاف کارروائی کا حکم...... صحافی برادری کا کامران چودھری کے خلاف احتجاج جاری۔"

...... اور پھر آخری منظر......

"نوادرات اسمگلنگ کیس کے اہم کردار اور متنازعہ صحافی کامران چودھری نے کل رات خودکشی کر لی۔ ڈاکٹروں کے مطابق کامران نے نیند کی کئی گولیاں ایک ساتھ کھا لی تھیں۔ کامران چودھری کے والد چودھری حشمت علی اپنے بیٹے کی لاش لینے آج شام لندن روانہ ہوں گے۔" اور ساتھ میں میری لاش کی کئی انداز سے کھینچی گئی تصاویر بھی تھیں۔ یہ تمام ویڈیوز پچھلے کچھ اس عرصے کی ریکارڈنگ تھیں جس عرصے میں میں شاید بے ہوش رکھا گیا تھا۔

اسکرین تاریک ہو گئی تھی۔ مجھے لگا جیسے میری تقدیر بھی ایسے ہی تاریک ہو گئی ہے۔ ایس پی جنید کہیں بیٹھا قہقہے لگا رہا ہوگا اور چلا چلا کر کہہ رہا ہوگا......

"میں نے کہا تھا نا کامی...... میں نے کہا تھا کہ اس نظام کو بدلنے نکلو گے تو پاش پاش ہو جاؤ گے۔ تمہاری یہ جنگ تمہیں زمین پر نہیں بلکہ نظروں سے ہی گرا دے گی۔ تم مجھے موردِ الزام ٹھہراتے تھے آج خود کو دیکھو، دیکھو تمہارا پہاڑ جیسا حوصلہ ہوا میں بکھر گیا ہے۔ یہ ہے تم جیسے باغیوں کا انجام کہ تم مرنے سے پہلے ہی مار دیے جاتے ہو۔"

یہ سب اس وقت ہوا جب کامیابی مجھ سے چند قدم دور تھی۔ سب کچھ میرے حق میں جا رہا تھا، سب کچھ وہی ہو رہا تھا جیسا میں چاہتا تھا اور مجھے لگ رہا تھا واقعی اگر ہمت ہو تو اس نظام سے ٹکرایا جا سکتا ہے، اس سے لڑا جا سکتا ہے لیکن...... لیکن میں غلطی پر تھا۔ میں نے اس نظام کو سمجھنے میں بہت بڑی غلطی کر دی تھی۔ یہ میری توقعات سے بھی بڑھ کر چالاک اور ناقابلِ شکست تھا۔ سب کچھ واضح ہو چکا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرے دشمن مجھے دھمکیوں سے ڈرائیں گے...... جان سے مارنے کی کوشش کریں گے اور اس طرح کی کسی بھی حرکت سے وہ خود پھنس جائیں گے لیکن وہ مجھ سے زیادہ ذہین نکلے۔ کیا کمال کی پلاننگ تھی کہ مجھے میرے گھر سے اغوا کیا گیا۔ انہوں نے وہیں سے میرے بینک لاکر کی چابی حاصل کی ہوگی یا پھر صدیقی صاحب سے...... اور پھر تمام ثبوت حاصل کر کے ختم کر دیے ہوں گے۔ مجھے یہاں طویل بے ہوشی میں ڈال کر انہوں نے میرا ڈپلیکیٹ تیار کیا اور اس کے ذریعے ایسا ڈراما رچایا کہ کوئی کچھ بھی نہ کر سکا۔ میرے صحافی دوست مجھ سے متنفر کر دیے گئے۔ میں بزدلوں کی طرح جان بچانے کے لیے بھاگتا دکھائی دیا اور پھر اپنی غلطی کا اعتراف بھی کر لیا۔ ان لوگوں کو کتنی تکلیف پہنچی ہوگی جن کو مجھ سے امیدیں وابستہ تھیں۔ صدیقی صاحب کے ہارٹ اٹیک کی خبر سے اندازہ ہو رہا تھا۔ پتا نہیں ان پر کیا بیتی ہوگی۔ ہو سکتا ہے وہ بھی مجھ سے متنفر ہو گئے ہوں...... جہاں ایک طرف مجھ کو میرے ہی ڈپلیکیٹ سے برباد کیا گیا، وہیں دوسری طرف صحافی برادری اور میڈیا کا سر بھی جھک گیا...... میری ساری محنت، ساری کارکردگی، سارا عزم ریت کی دیوار کی طرح ڈھے گیا اور اسے اب دوبارہ کھڑا کرنا ناممکن تھا۔ سوچنے کی بات صرف ایک ہی رہ گئی تھی کہ اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود...... مجھے زندہ کیوں رکھا گیا؟ عین اسی لمحے تہ خانے کا دروازہ کھلا اور اندر آنے والی شخصیت کو دیکھ کر ہی مجھے اس آخری سوال کا جواب بھی مل گیا۔

وہ چودھری حشمت علی تھے...... میرے ابا جی۔

☆☆☆

"وہ کیا کہا ہے کسی بھلے شاعر نے...... سارے شہر نے پہن رکھے ہیں دستانے...... کیوں چودھری کامران! اب بتا...... تو کس کس کے ہاتھ پر اپنا لہو تلاش کرے گا؟ دیکھا تُو نے...... جن لوگوں کے چاروں طرف تو نے ایسے ایسے پھندے نصب کیے تھے کہ جن سے بچنا ناممکن تھا، وہ لوگ اس میں سے یوں نکلے جیسے مکھن میں سے بال نکلتا ہے۔ وہ تو نکل گئے اب تو ان پھندوں سے کیسے نکلے گا؟ تُو تو ایک چٹان کے مانند کھڑا تھا، صرف ایک ہی وار سے ریزہ ریزہ ہو کر کیسا

محسوس کر رہا ہے؟ مان لے کہ تو ہار چکا ہے...... مان لے کہ اس نظام نے تجھے بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا ہے۔'' وہ پھنکار رہے تھے۔

''نہیں...... میں ناکام ضرور ہوا ہوں...... مگر ہار نہیں مانوں گا۔'' میں نے کہا تو ان کا قہقہہ تہ خانے میں گونجتا چلا گیا۔

''یہ تو نہیں بول رہا...... تیرے اندر چودھریوں کی اکڑ بول رہی ہے۔ تیری جگہ میں بھی ہوتا تو یہی کہتا کہ ہار نہیں مانوں گا...... لیکن حقیقت سے جتنی مرضی نظریں چرا لے تو ہار چکا ہے۔ تیری اپنی صحافی برادری تیرے خلاف جلوس نکال رہی ہے۔ تیری وہ سوئی ہوئی قوم جسے تو جگانے کے لیے نکلا تھا وہ بھی تیرے خلاف آوازیں بلند کر رہی ہے۔ رہی بات ان لوگوں کی جنہیں تو نے اس معاملے میں گھسیٹا تو وہ آج بھی تیری جان کے دشمن ہیں۔ اگر میں تجھے یوں اغوا کر کے یہاں نہ رکھتا تو اب تک تیری قبر کا بھی کوئی اتا پتا نہ ہوتا۔''

''لکھا تو میں نے آپ کے خلاف بھی تھا...... پھر اتنی رحم دلی کیوں؟'' میں نے تنک کر کہا۔

''کیونکہ مقدر نے مجھے تیرا باپ بنا رکھا ہے۔ تو مجھ سے جتنی چاہے نفرت کر...... میں چاہ کر بھی تیرے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔'' ان کی آواز میں بے بسی نمایاں تھی۔

''میں نے کبھی آپ سے نفرت نہیں کی......''

''پھر تو مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ تیری محبت کا اسٹائل ساری دنیا سے وکھرا ہے۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولے۔

''ایک بیٹا اپنے باپ سے کیوں نفرت کرے گا...... مجھے تو صرف آپ کے غیر قانونی کاموں سے اختلاف تھا اور یہ اختلاف تو اب بھی ہے۔''

''تیری اس ایک رپورٹ کی وجہ سے کیا کچھ بگڑ گیا تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ میرے وہ سارے دوست ایک دم ہی میرے دشمن بن گئے۔'' وہ افسوس بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ ''تجھے کیا پتا کہ ان سرکاری ملازموں سے تعلقات بنانا تاش کے پتوں سے محل کھڑا کرنے سے بھی مشکل ہے...... اور پھر ان تعلقات کا ٹوٹ جانا اسی محل کو گرانے سے زیادہ آسان ہے۔ میں تو اسلام آباد میں منہ دکھانے جوگا نہیں رہا۔''

''اس سے زیادہ آپ کے لیے یہ آسان تھا کہ آپ کھل کر میری مخالفت کرتے اور ان لوگوں کے ساتھ مل کر مجھے مروا دیتے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''تو کیا سمجھتا ہے تجھے مروانا بہت مشکل تھا؟ تو نے جو چال چلی تھی اس میں ہر چیز ممکن تھی لیکن اگر تجھے خراش بھی

ہنسیے

ایک بچہ کلاس میں فیل ہو گیا۔ گھر گیا تو اپنے فیل ہونے کا اعلان کرنے کے بجائے اس نے اپنے والد سے سوال کیا۔ ''ابو! جب آپ امتحان میں فیل ہوتے تھے تو دادا جان نے آپ کو کچھ کہا تھا کیا؟''

والد۔ ''ہاں مارا تھا۔''

''اور جب دادا جان فیل ہوئے تھے تو؟''

والد۔ ''نہیں ان کے والد نے مارا تھا۔''

بچے نے کہا۔ ''ابو جان! آپ مجھ سے تعاون کریں تو ہم دونوں مل کر اس خاندانی غنڈا گردی کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔''

(مرسلہ: عبدالجبار روی انصاری۔ لاہور)

آ جاتی تو تیرا کیس اور بھی مضبوط ہو جانا تھا۔ اگر تجھے کچھ ہو جاتا تو ان صحافیوں کی تحریک شروع ہو جاتی اور عوام تو پہلے ہی کسی انقلاب کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ معاملہ تیری سوچ سے بڑھ کر بگڑ جاتا اور اس میں ہم چند لوگ ہی نہیں پوری کی پوری گورنمنٹ کو وقت پڑ جانا تھا۔ اسی لیے تو خوب سوچ بچار کے بعد ایسی پلاننگ کی گئی کہ پہلے تجھے ہیرو سے زیرو بنایا جائے اور پھر چاہے تجھے سرعام گولیاں ماردی جاتیں، کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔ وہ تو میں تھا جس نے تجھے اغوا کر کے بھی زندہ رکھا ورنہ طے تو یہ تھا کہ تجھے اغوا کرنے کے بعد جان سے مار دیا جائے گا پھر تیرا ڈپلیکیٹ اپنا کام کرے گا۔ تیرے زندہ رہنے کی خبر ابھی تک کسی کو معلوم نہیں ہے اور یہ خبر اگر کسی کو معلوم ہو گئی تو تیرے ساتھ ساتھ میری زندگی بھی داؤ پر لگ جائے گی۔''

''یہ خبر کب تک چھپی رہے گی...... آپ مجھے کب تک قید رکھیں گے؟ کبھی نہ کبھی تو مجھے یہاں سے باہر نکلنا ہی ہے۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''تو یہاں سے نکل سکتا ہے اور نکلے گا بھی لیکن کامران چودھری سچ مچ مر چکا ہے۔ وہ اب اپنی قبر سے کبھی نہیں نکلے گا۔ اب تو ایک نئے نام اور نئے چہرے کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرے گا۔ میں نے سب بندوبست کر لیا ہے۔'' ان کی بات سن کر میں چونکا۔

''کیا مطلب...... میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''تیری پلاسٹک سرجری کی جائے گی جس میں تیرے چہرے کو بدل دیا جائے گا۔ تیرے بال، آنکھوں کا رنگ اور انگلیوں کے نشانات بھی بدل دیے جائیں گے۔ اس کے

بعد تو ایک نئے پاسپورٹ اور نئے نام کے ساتھ امریکا روانہ ہو جائے گا اور باقی کی زندگی وہیں بسر کرے گا۔ یہ سب تجھے ہوش میں لائے بغیر بھی کیا جا سکتا تھا لیکن ڈاکٹروں نے بتایا کہ تجھے اب ہوش میں لے آنا چاہیے کیونکہ تیری جسمانی کمزوری بڑھ رہی تھی۔'' وہ کہہ رہے تھے اور میں حیرت سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

''سب کچھ بدل دینے سے کیا ہوگا...... ڈی این اے نہیں بدلا جا سکتا چودھری صاحب! آپ کی سپریم پلاننگ کرنے والوں نے یہ نہیں بتایا آپ کو؟''

''تیرے پاگل پن کا سرٹیفکیٹ تیار ہوا پڑا ہے۔ تیرے دماغی علاج کے لیے تجھے حویلی میں بھی قید رکھا جا سکتا ہے اور امریکا بھی بھیجا جا سکتا ہے۔'' انہوں نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

میں یک لخت ہذیانی کیفیت میں چلّا اٹھا۔

''یہ...... یہ ممکن نہیں ہے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں نے کہہ دیا نا کہ میں ہار نہیں مانوں گا...... میں پھر لڑوں گا۔'' میرا سر پھر سے چکرانے لگا اور نقاہت ذہن پر غلبہ جمانے لگی۔

''تُو نے اپنی زندگی گزار لی ہے چودھری کامران...... تو یقین کرلے کہ تو مر گیا ہے۔ اب تیری یہ زندگی میری امانت ہے۔ اب تو وہی کرے گا جو میں چاہوں گا۔''

''میں ہار نہیں مانوں گا...... آپ مجھے جان سے مار سکتے ہیں لیکن میرا حوصلہ نہیں توڑ سکتے۔ میں بزدلوں کی طرح نہیں بھاگوں گا، میں لڑتا رہوں گا۔'' میں ہانپتی ہوئی آواز میں چلایا۔ ''اگر آپ اپنی انا کے غلام ہیں تو میں بھی ضد کا پکا ہوں...... آخری سانس تک لڑوں گا آپ سے۔''

وہ جو میرے سامنے کرسی پر بیٹھے تھے، ایک دم جیسے دم بخود رہ گئے اور پھر چودھری حشمت علی نے اپنے بیٹے کی طرف اس طرح دیکھا کہ اس طرح زندگی میں کبھی نہ دیکھا ہوگا۔

''میں یہ تو جانتا تھا کہ تیری لڑائی مجھ سے ہے لیکن کامران! میں یہ نہیں جانتا تھا کہ تو میرے ساتھ اس لڑائی کو آخری سانس تک لے جانا چاہتا ہے۔''

انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا تو ان کے لہجے میں غصہ نہیں حیرت تھی۔ وہ پُرسوچ انداز میں بڑی آہستگی کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف جا رہے تھے اور میں خاموش بیٹھا انہیں دیکھ رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں دل چاہا کہ انہیں پکاروں اور اپنی بات سمجھانے کی کوشش کروں لیکن میں خاموش رہا۔ وہ دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے۔

☆☆☆

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ میری ذہنی کیفیت بدتری کا شکار تھی۔ سوچ کی ساری لہریں جیسے تھم گئی تھیں۔ میں زمانے سے لڑنے نکلا تھا تو میرا حوصلہ پہاڑ جیسا تھا لیکن اب خود سے لڑنے نکلا تو میری ہمت جواب دے چکی تھی۔ تین بار ملازم کھانے سے بھری ٹرے چھوڑ کر گیا اور پھر اسے ویسے ہی واپس لے گیا۔ باوجود اس کے کہ میں بھوک سے نڈھال ہو رہا تھا۔ نقاہت میرے روم روم میں بس رہی تھی لیکن میں کھانے کا ایک لقمہ تک حلق سے نہ اتار سکا پھر کریہہ صورت ماکھا اندر آیا اور مجھے کھانے کی تلقین کرنے لگا۔

''ابا جی کہاں ہیں۔ مجھے ان سے بات کرنی ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''وہ تو جی اسلام آباد چلے گئے ہیں۔''

''ماکھے! میں اس وقت کہاں ہوں؟''

''چھوٹے چودھری جی آپ کھانا کھالیں۔ آپ کی صحت بگڑتی جا رہی ہے۔''

''دفع ہو جاؤ یہاں سے......'' میں نے شیشے کا گلاس اس پر دے مارا۔ وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر ٹوٹے ہوئے گلاس کی کرچیاں اٹھا کر باہر چلا گیا۔ اگلے دن بھائی شفیق آ گئے۔

''کیوں کر رہا ہے تُو ایسا کامران...... پچھلے کئی دنوں سے تُو نے ہمیں سولی پر چڑھا رکھا ہے۔ اب تو سب کچھ ٹھیک بھی ہو گیا ہے۔ اب ہمیں کس بات کی سزا دے رہا ہے؟'' وہ خفگی سے بولے۔ ''اپنی حالت پر رحم کھا۔ آئینے میں دیکھ خود کو...... کیا ہو گیا ہے تیرے ساتھ...... تو کیا سمجھتا ہے تجھے اس حالت میں دیکھ کر ہمیں خوشی ہو رہی ہوگی...... درد ہوتا ہے ادھر دل میں...... ہمارے لیے نہیں تو خود کے لیے ہی کچھ کھالے۔''

''بھائی میں کوئی بھوک ہڑتال پر نہیں بیٹھا اور نہ ہی اتنی ہمت ہار بیٹھا ہوں کہ خود کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ مجھے بھوک نہیں لگی، جب لگے گی تو کھالوں گا۔'' میں نے بے رخی سے کہا۔ وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتے رہے پھر کہنے لگے۔

''ابا جی نے سب کو سختی سے تجھ سے ملنے سے روک رکھا ہے۔ کوئی نہیں جانتا تمہارے بارے میں...... لیکن میں پھر بھی تیری صورت دیکھنے کے لیے چلا آیا اور میں اکیلا نہیں کوئی اور بھی ہے میرے ساتھ...... جسے تیری ہم سب سے زیادہ فکر رہتی ہے۔ تجھے بھوک لگی ہے یا نہیں میں نہیں جانتا۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ تُو وہی کرتا ہے جو تو کرنا چاہتا ہے۔ کبھی بھی ان

کی فکر بھی کر لینی چاہیے جو تمہیں چاہتے ہیں۔'' وہ اٹھنے لگے۔ ''ضروری یہ نہیں کہ جو ہم چاہیں ویسا ہی ہمارے ساتھ ہو۔ ضروری یہ ہے کہ جو ہمارے ساتھ ہو رہا ہے ہم اسے برداشت بھی کر سکتے ہیں یا نہیں۔'' وہ باہر نکل گئے اور ان کے باہر نکلتے ہی ماہی اندر داخل ہوگئی اس کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے تھی۔

''ماہی تم یہاں......؟ میرا مطلب ہے تم یہاں کیوں چلی آئیں؟'' وہ یک ٹک میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں پانی سا بھرتا جا رہا تھا۔

''پلیز ماہی......میں تمہارے آنسو پونچھنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔'' اس نے جلدی سے اپنی آنکھیں ہاتھوں کی پشت سے صاف کیں اور میرے قریب بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''یہ آپ نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ ایک لمحے کے لیے تو ہم آپ کو پہچان ہی نہ سکے۔''

''ہاں......کچھ لوگوں نے میرا چہرہ ہی بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔'' میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم سناؤ مجھے تو تم بھی کمزور سی لگ رہی ہو۔ کہیں تم بھی شہری لڑکیوں کی طرح ڈائٹنگ تو نہیں کرنے لگیں؟''

''میں آپ کی ہر بات کا جواب دوں گی لیکن پہلے کھانا کھالیں۔ آپ نے بڑی دیر سے کچھ نہیں کھایا۔ بیمار ہو جائیں گے۔'' وہ بار بار اپنی بھر جانے والی آنکھیں صاف کر رہی تھی۔

''خدایا میں تیرے بندوں کو کیسے سمجھاؤں۔'' میں نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔

''خدا کے بندے اچھی طرح جانتے بھی ہیں اور سمجھتے بھی ہیں۔'' وہ ہلکے سے مسکرائی اور میں سب کچھ بھول کر اس کی مسکان دیکھنے لگا۔

''اوہ ماہی......تم اتنی دیر بعد مسکرائی ہو یا میں تمہاری مسکراہٹ ہی بھول گیا تھا۔ بتاؤ......آخری مرتبہ کب میرے سامنے مسکرائی تھیں؟'' ایک لمحے کو اس کا چہرہ متغیر ہوا پھر اس نے اپنا چہرہ جھکا لیا۔ کچھ دیر اس کے ہونٹ تھرتھراتے رہے پھر وہ آہستہ سے بولی۔

''شاید اس دن......جس دن ہم نے غلطی سے ہیئر کلپ پہن لیا تھا۔'' اس فقرے میں ایسی کاٹ تھی کہ میں کچھ دیر......کے لیے پتھر سا بن کر رہ گیا۔ وہ شام مجھے اچھی طرح یاد تھی جب نواب صاحب اور چودھری حشمت علی ہماری شادی کی تاریخ طے کر رہے تھے اور عین اس وقت باہر لان میں، میں نے اسے کہا تھا کہ میں اس سے محبت نہیں کر سکتا۔ تب ماہی نے ایک عجیب بات کہی تھی۔

''ایسا مت کہو کامی......مجھے درد ہوتا ہے۔'' اور یہ درد بعد میں، میں نے خود بھی محسوس کیا تھا جب مجھے آشتی نے کہا تھا کہ اس کی دسترس میں ایسا کوئی ایک لمحہ بھی نہیں ہے جس لمحے اس نے مجھ سے محبت کی ہو۔ وہ سارے مناظر میری آنکھوں کے سامنے سے ایک لمحے میں گزرتے چلے گئے۔ میں اس وقت چونکا جب ماہی نے کھانے کا ایک لقمہ میرے ہونٹوں سے ٹکرایا۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا دُھلا دُھلا سا چہرہ اپنی اندرونی روشنی سے ہی چمک رہا تھا۔ اس چہرے پر گزرے لمحات کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا جب حویلی میں، میں نے ایک شام اسے بری طرح ڈانٹا تھا۔ ان لمحات میں جب میں موت اور زندگی کی کشمکش میں تھا ایک وہی تو تھی جس نے دوبارہ مجھے پاؤں پر کھڑا کیا تھا لیکن میں نے اس کا صلہ یوں دیا تھا کہ ایک بار پھر اسے ڈانٹ کر بھگا دیا تھا مگر وہ بھی جانے کس مٹی کی بنی تھی۔ جب بھی میرے سامنے آتی، میرے دیے گئے زخموں کو یکسر بھول چکی ہوتی۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر نہیں تھا جس سے میں یہ اندازہ لگا سکتا کہ وہ مجھ سے ناراض ہے۔

''اچھے بچوں کی طرح اب منہ کھولیں۔'' میں نے لقمہ دانتوں سے پکڑ لیا۔ وہ پُرسکون انداز میں دوسرا لقمہ بنانے لگی۔

''ماہی! کیا تم نے مجھے معاف کر دیا؟'' میں نے بے اختیار پوچھا۔

''معافی دوسروں کو دی جاتی ہے، اپنوں سے تو ناراض ہوا ہی نہیں جاتا......منہ کھولیں۔'' وہ بے نیازی سے کہتے ہوئے مجھے کھانا کھلائے جا رہی تھی۔

''ویسے بھی پرانی باتوں میں اب کیا رکھا ہے۔ ہمیں افسوس تو اس بات کا ہے کہ آپ جس کام کے لیے نکلے تھے، وہ نہیں ہوا۔ میں نے خود بھی پڑھا اور عمران بھائی سے بھی پوچھا تھا لیکن آپ فکر مت کریں۔ رب ایک دروازہ بند کرتا ہے تو کوئی اور کھول دیتا ہے۔ ایک نہ ایک دن آپ کو اپنے مقصد میں کامیابی ضرور ملے گی۔'' وہ کہتی جا رہی تھی اور میں چپ چاپ کھانا کھائے جا رہا تھا۔

''میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ اباجی مجھے ایک نئے نام اور چہرے کے ساتھ زندگی میں جھونکنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ کامران چودھری کو مرا رہنے دیا جائے اور میں ایک نئی زندگی شروع کروں لیکن ماہی میں ہار نہیں ماننے والا۔ میں یہاں سے نکل کر اپنے نام اور چہرے کے ساتھ اس

"ماہا! دوبارہ مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔"
"یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس سے بڑھ کر بھی کچھ اور مل سکتا ہے۔"
"ہاں...... صرف ایک ناکامی مجھے شکست نہیں دے سکتی...... زندگی ابھی باقی ہے تو مطلب کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔" میں اس سے زیادہ شاید خود سے کہہ رہا تھا۔
سارے برتن خالی ہو گئے تو اس نے ٹرے ایک طرف رکھ دی...... ٹیبل پر رکھے تھرماس میں سے دو کپ چائے نکال کر لے آئی۔ اس سے پہلے اس نے مجھے میڈیسن بھی کھلائیں جن کے بارے میں شاید وہ باہر سے پوچھ کر آئی تھی یا اسے تلقین کی گئی تھی۔
"آپ صرف وہی کرتے ہیں نا جو آپ کا دل چاہتا ہے...... کیا کبھی ان لوگوں کے بارے میں سوچا ہے جو آپ سے توقعات لگائے بیٹھے ہیں...... جیسے کہ بھائی شفیق، بھائی عمران، بڑی بھابی اور نازو......"
"جیسے کہ تم......" میں نے لقمہ دیا تو وہ خاموش سی ہو گئی۔
"دیکھو ماہی! ہمیں سب سے زیادہ نقصان اسی وقت ہوتا ہے جب ہم کسی ایسے انسان سے بہت ساری امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں جو ہماری امیدوں پر چاہے بھی تو پورا نہیں اتر سکتا۔ یہی غلطی تم نے بھی کی اور میں نے بھی...... اس غلطی کا ازالہ کرنے کے لیے میں نے خود کو ایک مقصد کے لیے مختص کر لیا ہے لیکن تم...... تم پھر وہی غلطی کرنے جا رہی ہو۔"
"مجھے...... مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے۔" اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔
"تو پھر کیوں تم بار بار میرے پاس آ کر میرے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کرتی ہو؟" میرا سر بھاری سا ہو رہا تھا۔
"کیا مجھے اتنا حق بھی نہیں ہے؟"
"تمہیں حق ہے لیکن میں اس قابل نہیں ہوں......"
میری زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ نیند کا ریلا مجھے بہا لے جانا چاہتا تھا لیکن اس میں اتنی تیزی تھی کہ میں اس میں اترتے اترتے بھی چونک گیا۔ "ماہی!" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "...... تم نے...... چائے میں...... کچھ ملایا تھا؟" میرے منہ سے ٹوٹے پھوٹے سے الفاظ نکلے۔
"آپ سو جائیں کامی...... نیند آپ کے لیے بہتر ہے۔" اس نے میرے کانوں میں سرگوشی کی تو اس کا لہجہ بہت عجیب سا لگا اور پھر میں گھپ اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

میری آنکھیں کھلیں تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں بہت دیر تک سوتا رہا ہوں لیکن نیند کا خمار پن اور سستی نہیں تھی۔ کچھ دیر میں چھت کو گھورتا رہا پھر ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے دماغ میں آیا تو میں اٹھ بیٹھا۔ چھت کی طرح کمرے کی ہیئت بھی بدل چکی تھی۔ میں اس تہ خانے کے بجائے ایک اور چھوٹے سے کمرے میں تھا۔ اس کمرے میں فرش پر قالین بچھا تھا اور میں ایک ڈبل بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میرے کانوں میں ماہی کا وہ آخری فقرہ گونج رہا تھا جسے میں نے سونے سے پہلے سنا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ماہی مجھے وہاں سے نکال لائی ہے لیکن کیوں اور کیسے؟ چودھری حشمت علی نے مجھے نہایت خفیہ جگہ اور سخت پہرے میں رکھا ہوگا اور وہاں تو ماکھا اور بھائی شفیق بھی تھے اور پھر مجھے وہاں سے نکالا کیسے ہوگا؟ ماہی کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ اس قسم کے رسک لینے والی لڑکی تھی ہی نہیں پھر یہ سب اس نے کس طرح اور کس لیے کیا ہوگا؟ کیا ماہی یہ سمجھتی تھی کہ وہ جگہ میرے لیے غیر محفوظ ہے؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں اٹھا تو ایک اور بات محسوس کی کہ اب میری جسمانی کمزوری بھی اتنی شدید نہ تھی۔ یہ شاید پیٹ بھر کر کھانے اور دوا کا اثر ہوگا۔ میں نے کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر کوریڈور میں آ گیا۔ یہ ایک مکمل فرنشڈ اور آسائشوں سے بھرپور کوٹھی تھی لیکن یہاں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں کوریڈور سے سیڑھیوں تک پہنچا پھر نیچے لاؤنج میں سے ہوتا ہوا باہر نکل آیا۔ یہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ پہلے میں گیٹ کی طرف جانے لگا لیکن پھر اطراف میں پھیلے وسیع لان میں آ گیا۔ یہاں گھاس پر کرسیاں اور ایک میز رکھی گئی تھی۔ میز پر چائے کا سامان موجود تھا۔ میں نے دیکھا چائے بالکل تازہ اور گرم تھی۔ ایک اور چیز جس کا احساس مجھے ہو رہا تھا، وہ یہ کہ میں اسلام آباد میں نہیں تھا۔ شام کے اس وقت اسلام آباد میں ٹھنڈ ہوتی ہے جبکہ یہاں مجھے گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ اچانک ایک نسوانی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے گنگناتی ہوئی اس آواز کی سمت دیکھنے کے لیے اوپر دیکھا۔ میرے بالکل سامنے قدرے بلندی پر گولائی کی شکل میں ٹیرس بنا تھا، آواز وہیں سے آ رہی تھی۔
بالکل ایسے جیسے شیشہ ٹوٹتا ہے میرے اندر بھی ایک چھناکا سا ہوا۔ ٹیرس کے جنگلے پر آشتی کھڑی تھی۔ گنگناہٹ کی آواز اسی کی تھی۔
اس نے مجھے دیکھ کر یوں ہاتھ لہرایا جیسے ایک دوست دوسرے کو دیکھ کر ہائے کہہ رہا ہو۔ میں گم صم سا یک ٹک اسے

دیکھتا رہا پھر اس نے مجھے اشارہ کیا کہ وہ نیچے آ رہی ہے۔ ایک لمحے کے لیے وہ ٹیرس سے اوجھل ہوئی اور اگلے ہی پل وہ برآمدے سے نمودار ہوئی اور میرے قریب سے گزر کر لان میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ جس وقت میں پلٹا وہ کپ میں چائے انڈیل رہی تھی۔ اس نے پیازی رنگ کا سادہ سا سوٹ پہن رکھا تھا اور بالوں کو ایک پونی میں باندھ رکھا تھا۔ اس حلیے میں وہ ایک عام سی گھریلو لڑکی معلوم ہو رہی تھی۔

''لگتا ہے مجھ سے مل کر تمہیں زیادہ خوشی نہیں ہوئی کامران......!'' وہ کہہ رہی تھی۔ میں اسے گھورتا ہوا اس کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''جانتی ہو۔ میں تمہیں ایک پل کے لیے بھی بھول نہیں پایا۔ ہمیشہ یہی دعا کرتا رہا کہ تم میرے سامنے کبھی نہ آؤ لیکن لگتا ہے کہ میری یہ دعا قبول نہیں ہوئی۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''اتنی نفرت کرتے ہو مجھ سے۔'' وہ تھوڑا آگے جھک کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تو سنا تھا کہ انسان اپنی پہلی محبت...... کبھی نہیں بھولتا۔''

''تم سے یہ بحث اس لیے فضول ہے کہ تمہیں ان احساسات کا ادراک نہیں۔''

''ٹھیک کہا تم نے...... یہ سب فضول باتیں ہیں۔ وقت کا زیاں کرنے سے بہتر ہے کہ ہم کچھ کام کی باتیں کرلیں۔'' چائے کا سپ لیتے ہوئے وہ یوں کہہ رہی تھی جیسے دو دوست بے تکلف ماحول میں بیٹھے گفتگو کر رہے ہوں۔ مجھے اس کے انداز سے جھنجلاہٹ سی ہونے لگی۔

''مجھے یہاں کون لایا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی جسے تمہاری بہت پروا ہے۔ مجھے لگتا نہیں تھا کہ وہ ڈرپوک اتنی بہادر ہوسکتی ہے لیکن اس نے کر دکھایا۔''

''تم ماہی کی بات کر رہی ہو نا؟ کہاں ہے وہ؟'' میں نے سختی سے پوچھا۔

''وہ جہاں بھی ہے خیریت سے ہے اور تمہاری خیریت نیک مطلوب چاہتی ہے...... لیکن ابھی تم اس سے مل نہیں سکتے۔''

''آشتی! اگر اسے ایک خراش بھی آئی تو تم تصور بھی نہیں کرسکتیں کہ میں تمہارے ساتھ کیا کرسکتا ہوں۔'' میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''مجھے اچھی طرح علم ہے کہ وہ تمہارے لیے کتنی اہم ہے اسی لیے تو میں نے اسے بہت سنبھال کر رکھا ہے۔ بالکل ایسے جیسے پانی کے بلبلے کو کوئی ہتھیلی پر رکھتا ہے۔'' وہ اپنی چائے ختم کرتے ہوئے بولی۔ ''آہ...... اب ہم سکون سے باتیں کر سکتے ہیں۔ ارے تم نے چائے نہیں پی؟ تمہیں تو میرے ہاتھ کی بنی چائے بہت پسند تھی نا؟''

''کم ٹو دی پوائنٹ!'' میں چلایا۔

''ٹھیک ہے، اس میں چلانے کی کیا بات ہے۔ تو کہاں سے شروع کریں...... تم ہی بتاؤ۔''

''مجھے یہ بتاؤ کہ تم اپنا منحوس چہرہ لے کر میرے سامنے کیوں آگئی ہو اور تم ماہی سے کیسے جاملیں؟'' میں نے دانت پیستے ہوئے پوچھا۔

''مجھے بھی تمہاری محبت نہیں کھینچ لائی جانِ من! میں تو تمہاری زندگی سے دور جا رہی تھی لیکن تمہارے باپ نے مجھے ایک بار پھر تمہارے سامنے آنے پر مجبور کر دیا ہے۔'' میں چونکا لیکن خاموش رہا۔ ایک توقف کے بعد وہ کہنے لگی۔

''کہانی اسی موڑ سے شروع کرتے ہیں جہاں سے دو پیار کرنے والے بچھڑ گئے تھے۔'' وہ جان بوجھ کر مجھے چڑا رہی تھی لیکن میں سپاٹ تاثر لیے خاموش بیٹھا رہا۔

وہ بولی۔ ''اس دن جب تم ہماری قید میں تھے، وہاں ماکھے کے آدمیوں نے حملہ کر دیا تھا۔ میں اور جواد وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ بعد میں ہمیں پتا چلا کہ تمہیں گولی لگی ہے یقین کرو مجھے بہت دکھ ہوا اور میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ تمہیں مارنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں تھا اور وہ گولی بھی ہم میں سے کسی نے نہیں چلائی تھی۔ خیر ہمیں ہیرے مل چکے تھے اور تمہیں اسپتال لے جانے کی وجہ سے ماکھا اینڈ کمپنی بھی ڈھیلی پڑ گئی اور اس طرح ہمیں مراد آباد سے بہ آسانی نکل جانے کا موقع مل گیا...... لیکن ہم جانتے تھے کہ چودھری حشمت ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا اس لیے ہم نے طے کر لیا تھا کہ ہم اس ملک سے ہی باہر نکل جائیں گے۔ قانونی طور پر تو ہم کہیں نہیں جاسکتے تھے کہ ہمارے پاس غیر قانونی ہیرے تھے اور اتنا وقت نہیں تھا کہ ہم ان ہیروں کو کسی بلیک مارکیٹ میں فروخت کرسکتے...... لہٰذا ہم یہاں سے سندھ کی طرف نکل گئے۔ محراب پور میں جواد کا ایک وڈیرا دوست تھا جو کہ خود انسانی اسمگلنگ میں ملوث تھا۔ وہ ہمیں بذریعہ لانچ عمان بھیج سکتا تھا لیکن اسے ہمارے پاس موجود ہیروں کا پتا چل گیا جس کی وجہ سے اس کی نیت بدل گئی۔ اس نے ہیرے ہڑپ کرنے اور ہمیں مار ڈالنے کا منصوبہ بنایا۔ خوش قسمتی سے ہمیں اس منصوبے کا بروقت علم ہوگیا اور ہم وہاں سے نکل گئے لیکن ہم جہاں بھی گئے اس کے آدمی سائے کی طرح ہم تک پہنچتے رہے۔ ان کو چکما دیتے دیتے ہم کراچی پہنچ گئے جہاں ہماری ملاقات ایک شخص اکرم

لمان سے ہوئی۔اس نے بتایا کہ بھاری رقم کے عوض وہ ہمیں راستہ چمن افغانستان پہنچا سکتا ہے۔معاوضہ طے کرنے کے بعد ہم وہاں سے کوئٹہ کی جانب روانہ ہوئے لیکن جیکب آباد میں ہم پر سندھی وڈیرے کے آدمیوں کا ایک اور حملہ ہوا جس میں وہ شخص مارا گیا۔یہاں ہماری جان ایک ٹرک ڈرائیور سالار خان نے بچائی۔وہ لنڈی کوتل جارہا تھا۔وڈیرے کے ایک آدمی سے پتا چل گیا تھا کہ وڈیرے کو ہمارے پلان کی خبر ہوچکی ہے لہٰذا چمن کی طرف جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔جواد نے منصوبہ بنایا کہ ہمیں سالار خان کے ساتھ خیبر تک جانا چاہیے۔چنانچہ ایک بار پھر ہم نے اپنی منزل کا رخ بدلا لیکن شومئی قسمت ایسا بھی نہ ہوسکا۔ہمیں قطعاً علم نہ تھا کہ ٹرک میں رکھی چاولوں کی بوریوں کے درمیان اسلحہ بھی چھپایا گیا تھا اور اس ٹرک کی اطلاع پولیس کو پہلے ہی مل چکی تھی۔ڈیرہ غازی خان میں پولیس کا ناکا دیکھ کر ڈرائیور اور اس کا ساتھی فرار ہوئے تو ہم بھی بھاگ نکلے اور ملتان پہنچ گئے لیکن وہاں ہمیں پناہ نہیں مل سکی۔دو دن بعد وہاں سے ہم چیچہ وطنی کے پاس ''اوکاں والا'' نامی ایک گاؤں میں پناہ گزین ہوگئے۔وہیں پر ہمیں تمہاری تہلکہ انگیز رپورٹ کے بارے میں پتا چلا جس کی وجہ سے ہر طرف ایک بھونچال سا آیا ہوا تھا۔جواد نے غلطی کی جو تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوکر تمہارے بارے میں خبریں معلوم کرنے لگا۔اسی غلطی کی بنا پر وہ ایک ایسے آدمی کی نظروں میں آگیا جس کا تعلق ماکھے سے تھا۔جس وقت جواد کو پکڑا گیا وہ اس گھر سے باہر تھا جہاں ہم پناہ گزین تھے۔جواد نے میرے بارے میں ان کو نہیں بتایا اس لیے وہ صرف جواد کو لے کر واپس مراد آباد چلے گئے۔

میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا اس لیے میں جواد کو بچانے کے لیے ایک بار پھر سے مراد آباد آگئی لیکن اس بار میرے پاس افرادی قوت بے حد کم تھی۔میں چودھری حشمت علی کے آدمیوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی اس لیے میں نے لمبی پلاننگ کی اور ماہی کے ساتھ دوستی کی......''میں پھر سے چونکا لیکن اب کی بار بھی خاموش رہا۔وہ بولتی رہی۔چونکا دینے کی اس کی پرانی عادت تھی۔

''ماہی کے سامنے میں میک اپ میں آئی تھی لیکن وہ میرے اصل چہرے سے بھی واقف ہوگئی......لیکن ہائے رے میری وہی مظلوم کہانی......جس نے تم جیسے جغادری کو بھی میرا ہمدرد بنادیا تھا تو ماہی تو پھر معصوم تھی۔میں اس کی دوست بن کر نواب کی حویلی میں رہنے لگی اور ماہی کے ذریعے نہ صرف مجھے چودھری حشمت علی کی اندرونِ خانہ باتیں معلوم ہوتی رہیں بلکہ پہلی بار مجھے یہ بھی پتا چلا کہ ماہی کو کامران چودھری سے محبت بھی ہے......اور یہ محبت کامران چودھری کے انکار کے بعد بھی اتنی ہی شدید تھی جتنی کہ پہلے سے تھی۔باوجود تمام کوششوں کے مجھے اس بات کا علم نہ ہوسکا کہ جواد کو کہاں قید رکھا گیا ہے۔میں بلاوجہ کسی جگہ پر حملہ کرکے ماکھے اینڈ کمپنی کو یہ نہیں بتانا چاہتی تھی کہ میں واپس آگئی ہوں۔اسی دوران تمہاری کہانی کا دی اینڈ ہوگیا......پہلے تو میں سمجھی کہ تم واقعی ملک سے فرار ہوگئے ہو اور پھر تم نے دلبرداشتہ ہوکر خودکشی بھی کرلی ہے۔اس خبر کا ماہی پر اتنا اثر ہوا کہ وہ شدید بیمار ہوگئی حتیٰ کہ اس کی جان بچانے کے لیے چودھری حشمت نے اسے یہ دھماکا خیز خبر دی کہ مرنے والا کامی کا ڈپلیکیٹ تھا۔اصل کامی زندہ ہے اور اسے اسلام آباد سے نکال کر یہاں ساہیوال کی ایک کوٹھی کے تہ خانوں میں چھپا کر رکھا گیا ہے......اور پھر ماہی کی تسلی کے لیے اسے اس قید خانے کا بھی چکر لگوایا گیا جہاں تمہیں بے ہوشی کے عالم میں رکھا گیا تھا۔ماہی کے ذریعے مجھے ان سب باتوں کا علم ہوگیا اور میں نے اپنا پلان بدل لیا۔ماہی یہ بات بھی جانتی تھی کہ چودھری حشمت نے اب کامی کو ایک نئے چہرے اور نئے نام کے ساتھ ایک بالکل نئی زندگی دینے کا منصوبہ بنا رکھا ہے لیکن ماہی یہ بھی جانتی تھی کہ تم کبھی بھی اپنے باپ کی یہ بات نہیں مانو گے......اور ہوسکتا ہے کہ اس بار باپ بیٹے میں پہلے سے بھی بڑا ٹکراؤ ہوجائے۔

''ایک ہمدرد اور رازِ محبت سے واقف دوست ہونے کی حیثیت سے میں نے ماہی کو یہ یقین دلادیا کہ چودھری حشمت اگر اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہوکر اپنے بیٹے کی زندگی بچاسکتا ہے تو وہی باپ اپنی عزت بچانے کی خاطر اسی بیٹے کو جان سے مار بھی سکتا ہے۔اس بات کو لے کر میں نے ماہی کو مجبور کردیا کہ اسے ہر حال میں کامی کو بچانا چاہیے۔بس پھر کیا تھا معصوم اور بھولی لڑکی میری باتوں میں آگئی اور تمہیں بچانے کے لیے وہ ایسا سب کچھ کرنے کو تیار ہوگئی جس کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی......تم ہوش میں آچکے تھے، چودھری حشمت علی کو اسلام آباد جانا پڑا۔تم ہوش میں آنے کے بعد بھوک ہڑتال پر چلے گئے جس پر ماکھے نے بھائی شفیق کو بلوالیا۔مجھے ان ساری باتوں کی خبر تھی لہٰذا موقع غنیمت جانتے ہوئے میں نے ماہی کو بھائی شفیق کے ساتھ تمہارے پاس بھیج دیا۔شاید تمہیں معلوم نہ ہو کہ تمہیں تمہارے بھائی شفیق کی ساہیوال والی کوٹھی کے تہ خانوں میں رکھا گیا تھا۔''

اس نے ایک توقف کیا پھر کہنے لگی۔

''پھر جو ہوا اس میں ماہی کا کمال تھا۔ اس نے سب کے لیے اپنے ہاتھوں سے کھانا بنایا جس میں نیند کی گولیاں شامل کردی گئی تھیں۔ اس سے پہلے ماہی تمہیں بھی ٹرنکولائزر دے چکی تھی۔ جیسے ہی سب بے سدھ ہوئے، اس نے مجھے فون کیا اور مجھے وہیں بلوالیا۔ اس کے بعد ہم دونوں نے مل کر تمہیں تہ خانے سے باہر نکالا اور کار میں ڈال کر اس کوٹھی سے باہر لے آئے۔ ماہی کو میں نے ایک اور خفیہ جگہ رکھا ہے اور تمہیں یہاں لے آئی۔ اس بیچاری کو یہ علم نہیں کہ اس نے تمہیں دشمنوں کی قید سے نکال کر قاتلوں کی قید میں دے دیا۔ ہے نا دلچسپ بات......؟'' آخر میں اس نے شرارتی انداز میں قہقہہ لگایا۔

''اب ماہی کہاں ہے؟'' میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''سمجھ لو وہ میری قید میں ہے لیکن بالکل خیریت سے ہے......اور یقین کرو اگر تم میرے کہنے پر چلتے رہے تو وہ خیریت سے ہی رہے گی۔''

''تم نے ماہی سے دوستی کی...... یقیناً اس کے گھر بھی جاتی رہی ہوگی۔ نواب صاحب نے تمہیں پہچانا نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تم جانتے ہو کہ بہروپ بھرنا میرے لیے مشکل نہیں۔ نواب صاحب تو میرے سامنے آتے ہی نہیں تھے کافی شرمیلے انسان ہیں، البتہ ماہی کو میں نے اپنی اصلیت بتادی تھی لیکن فکر مت کرو۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ میں وہی ہوں جسے کامران چودھری نے کشتوں کے پشتے لگاتے ہوئے بچایا تھا۔''

''فضول باتوں کے بجائے بہتر ہے کہ تم اس مدعے پر آؤ جس کے لیے تم نے یہ سارا ڈراما رچا ہے۔''

''تم کم ذہین نہیں ہو...... بلاشبہ اس بات کی میں معترف ہوں، کچھ اندازہ لگاؤ۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''مجھے کچھ کچھ اندازہ ہے۔ تم چاہتی ہو کہ میں ماہی کی زندگی بچانے کے لیے جواد کو چودھری حشمت کی قید سے چھڑوا کر یہاں لے آؤں؟''

''ارے واہ...... تم تو بڑے سمجھ دار نکلے۔ آئی ایم ریئلی امپریس......'' اس نے ہلکے سے تالیاں بجاتے ہوئے کہا۔ وہ بار بار ایسی حرکتوں سے مجھے یوں چھیڑ رہی تھی جیسے مجھے بھڑکانا چاہتی ہو اور میں یقیناً اندر سے غصہ دبائے ضرور بیٹھا تھا لیکن میرا اضبط کامل تھا۔

''ویسے تو مجھے اس بات سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن ایک سوال کا جواب ضرور پوچھنا چاہوں گا......؟'' ایک خیال کے تحت میں نے پوچھا۔

''ہاں ہاں پوچھونا؟''

''میں واقعی جواد کو زندہ سلامت یہاں لے کر آؤں یا پھر صرف اس سے ان ہیروں کا پتا معلوم کرلوں جسے اس نے اس طرح کہیں چھپایا ہے کہ تم بھی اسے ڈھونڈ نہیں سکیں؟'' میں نے اچانک اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔ اس کی مسکراہٹ وہیں جم کر رہ گئی اور بڑی آہستگی سے معدوم ہوتی چلی گئی۔ کانچ جیسی آنکھیں مضطرب ہوگئیں۔

''مجھے جواد چاہیے۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں...... سمجھے تم؟'' وہ سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ غرائی۔

''لیکن جہاں تک میرا اندازہ ہے تمہارے فقرے کا دوسرا حصہ جھوٹ پر مبنی ہے۔'' میں نے مطمئن ہوکر کہا۔ وہ کچھ دیر ہونٹ کاٹتے ہوئے مجھے گھورتی رہی پھر بولی۔

''تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں جواد کے بجائے ہیروں میں دلچسپی رکھتی ہوں؟''

''کیونکہ میں نے تم سے محبت کرنے کی غلطی کی تھی اور جب مجھے اس غلطی کا احساس ہوا تو ساتھ ہی مجھے یہ ادراک بھی ہوگیا کہ تم تو محبت کیے جانے کے لائق بھی نہیں ہو۔ تمہارے سینے میں دل نہیں ہے، ایک ہیرے کا ایسا ٹکڑا ہے جو جتنا بھی خوبصورت ہو لیکن ہوگا بے جان......'' میں نے تلخی سے کہا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ ''تم جیسی عورتیں صرف مردوں کو استعمال کرتی ہیں۔ پیسے کے لیے یا عزت کے لیے......عزت تو تمہیں راس نہیں...... اس لیے مجھے یقین ہے کہ تمہیں پیسوں سے ہی دلچسپی ہوگی جو کہ جواد کے پاس ہیروں کی شکل میں ہے۔''

''اپنی بکواس بند کرو۔'' وہ چلائی۔

''اور مجھے اندازہ ہے کہ اس بات کا جواد کو بھی علم ہوگیا ہوگا اس لیے اس نے ان ہیروں کو پہلے ہی کہیں چھپا دیا تھا۔ شاید تم بھی وڈیرے کی طرح ان ہیروں کو حاصل کرکے جواد سے چھٹکارا چاہتی تھیں لیکن تمہیں صرف ایسے وقت کا انتظار تھا کہ جب تم کسی محفوظ مقام پر پہنچ چکی ہوتیں...... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟'' وہ غصیلی نظروں سے مجھے کچھ دیر گھورتی رہی پھر لہجے کو سپاٹ بناتے ہوئے بولی۔

''یہ سچ نہیں ہے۔'' لیکن اس کا اندرونی اضطراب بتا رہا تھا کہ میرے اندازے کا ہر تیر نشانے پر بیٹھ رہا ہے۔

''میں تو صرف حقائق کی بات کرتا ہوں۔ تم چاہے لاکھ نظریں چرالو جو سچ ہے، وہ بدل نہیں سکتا۔''

''جب میں تمہیں ٹرین میں ملی تھی تب ہیرے تو

میرے پاس ہی تھے۔ میں اس وقت فرار کیوں نہیں ہوگئی؟" اس نے دانت کچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"کیونکہ اس وقت تم اور تمہارے گھر والے جواد کے رحم وکرم پر تھے۔ اگر تم اسے بھی دھوکا دیتیں تو ماکھے کے ساتھ ساتھ جواد بھی تمہارا پیچھا دوزخ کے دروازے تک کرتا۔ تم نے اس وقت کا انتظار کیا جب تک تم اپنے گھر والوں کو محفوظ نہیں کر دیتیں۔ میں نے پتا چلایا تھا...... "موسی وال" کے اس گھر میں جہاں تمہارے گھر والوں کو جواد نے چھپا رکھا تھا اور جس دن مجھے گولی لگی تم دونوں نے وہیں پناہ لی تھی اور وہاں سے نکلنے سے پہلے تم نے اپنے گھر والوں کو ایسی جگہ بھیج دیا جس سے جواد بھی ناواقف تھا۔ ہیرے جواد کے پاس تھے لہٰذا تمہیں اس کے ساتھ جانا ہی تھا۔ دونوں کہیں دور نکل جاتے جہاں تمہارے ساتھ جواد کے علاوہ کوئی اور نہ ہوتا پھر ایک وقت آتا جب جواد ہیروں کو تمہارے سامنے لے آتا۔ تم وہ ہیرے حاصل کر کے جواد کو ختم بھی کر دیتیں تو کسی کو پتا نہ چلتا کہ تم میں اور جواد میں کیا کنکشن تھا...... کیونکہ روپ بدلنے کی تو تم ماہر ہو لیکن فرار کی تمہاری کہانی سن کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس افراتفری میں بھاگتے ہوئے تمہیں شاید جواد سے ہیرے حاصل کرنے کا موقع نہیں مل سکا ہوگا۔" میں نے مسکراتے ہوئے بات ختم کی تو وہ مجھے گھور رہی تھی۔

"تمہارے یہ اندازے غلط بھی تو ہو سکتے ہیں؟" اس کی آواز میں اب تن فن ختم ہو چکا تھا۔

"اندازے ہمیشہ سچ کی بنیادوں پر قائم ہوتے ہیں۔ تم شاید بھول گئی ہو کہ میں ایک صحافی بھی ہوں۔ جب تم اور جواد مجھے دھوکا دے کر بھاگ نکلے تھے تب میں نے تم لوگوں کی جان بخشتے ہوئے تمہارا پیچھا نہ کرنے کا فیصلہ ضرور کیا تھا لیکن میں نے تمہارے بارے میں تمہارے ماضی کی داستانیں ضرور کھدیڑ کر باہر نکال لی تھیں لیکن پھر میں تم لوگوں پر لعنت بھیج کر شہر چلا آیا کیونکہ میرے پاس تم جیسے فضول لوگوں سے زیادہ اہم کام تھا۔" اب کی بار چونکا دینے کی باری میری تھی۔ مجھے بہت سی باتیں ماکھے سے معلوم ہو چکی تھیں جب مجھے گولی لگنے کے بعد وہ جواد اور آشتی کے پیچھے لگ گیا تھا۔

"تم...... تم کہنا کیا چاہتے ہو......؟" وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔

"یہی کہ مجھے علم ہو چکا ہے کہ تمہاری رگوں میں اس بازار کے کسی گاہک کا خون دوڑ رہا ہے جہاں شریف زادے بھی نہیں جاتے۔ تمہاری ماں کا نام انیسہ بائی تھا۔ "بازاروں" کا دور ختم ہو جانے کے بعد جب بہت سی طوائفوں نے پنجابی تھیٹروں کا رخ کیا تو ان میں سے ایک تمہاری ماں بھی تھی...... اور تمہاری بہن ساہیوال کے تھیٹر کی ایک ابھرتی ہوئی اداکارہ تھی۔ جعفری نامی وہ غنڈا تمہاری بہن کے ڈانس پر فدا ہو کر اس کے پیچھے پڑا تھا۔ تمہاری ماں ایک چالاک عورت تھی، اسے تمام بازاری گُر اچھی طرح آتے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ اپنی گدڑی کے لعل کو ایک دم بیچا نہیں جاتا بلکہ اس کی نمائش لگا کر بڑی بڑی پارٹیوں سے اس کی قیمت لگوائی جاتی ہے۔ اس مقابلے میں حصہ لینے والے اپنی انا کی خاطر قیمتیں بڑھاتے رہتے ہیں پھر اس لعل کا حق دار وہ ہوتا ہے جس کی قیمت بھی سب سے بڑی ہوتی ہے اور طاقت بھی...... جعفری تھرڈ کلاس غنڈا تھا۔ وہ اس لعل کو چھیننے کا پروگرام بنا رہا تھا...... اسی لیے جب ایک رات وہ تمہارے گھر پر حملہ آور ہوا تو تمہارے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ جواد کے ذریعے تم رانا ایوب کی این جی او میں پہنچیں منشیات کے کام میں بہت پیسا ہوتا ہے اور پیسے کا نشہ سب سے بڑا نشہ ہوتا ہے۔ تم اس کام میں اپنی مرضی سے ملوث ہوئیں اور پھر جب تم جواد کو بگ باس کے روپ میں ملیں تو تمہیں پتا چلا کہ یہ نوجوان وڈیرا تمہاری زلف کا اسیر بن چکا ہے تو تمہارے اندر کی طوائف جاگ اٹھی...... لیکن پھر تمہیں پتا چل گیا کہ جواد تو کنگال ہے، اس کے پاس اپنا تو کچھ بھی نہیں، جو کچھ بھی ہے وہ چودھری حشمت علی کا ہے۔ ہاں البتہ منشیات کی اسمگلنگ میں وہ بگ باس بن کر بہت کچھ کر سکتا تھا...... مگر اسے اتنا موقع ہی نہیں ملا۔ جب معاملات خراب ہو گئے تو تم نے یہ کوششیں شروع کر دیں کہ کسی طرح وہ ہیرے ہاتھ لگ جائیں اور تم جواد کو چھوڑ دو۔ تمہیں قسمت نے جواد کی شکل میں سنبھلنے کا موقع دیا کہ جواد سب کچھ چھوڑ دینا چاہتا تھا لیکن خون اپنا اثر ضرور دکھاتا ہے۔ تمہارے لباس، چہرے، کردار اور الفاظ میں شاید شرافت ضرور آ گئی تھی لیکن نیت کا کیا کیا جائے۔ ایک طوائف زادی کے دل میں دنیا کی ہر شے سے محبت ہو سکتی ہے، سوائے ایک انسان کی محبت کے...... جواد نے تم سے محبت کی تھی لیکن تم نے صرف اس کے پیسوں سے اور صاف لگ رہا ہے اب بھی یہ تماشا جاری ہے۔" نیم تاریکی میں، میں اس کے چہرے کے تاثرات نہ دیکھ سکا۔ وہ بس خاموش تھی۔ اتنی خاموش جتنی خاموشی سے ہمارے گرد شام کے اندھیرے ابھر رہے تھے۔ میں نے چٹکی بجا کر اسے مخاطب کیا۔

"تم کیا سمجھتی ہو...... صرف تمہیں ہی چونکانا آتا ہے؟" اس کی آنکھوں میں پانی چمک رہا تھا۔

"اندر چل کر بات کرتے ہیں۔" وہ ایک دم اٹھی اور تیز

تیز قدموں سے اندر بڑھ گئی۔ اسے پتا تھا کہ ساری کوٹھی خالی ہے حتیٰ کہ مین گیٹ پر بھی سوائے ایک چوکیدار کے کوئی نہیں ہے۔ میں چاہوں تو یہاں سے نکل سکتا ہوں...... لیکن وہ جانتی تھی کہ میں اب کہیں نہیں جاسکتا۔ میرے پاؤں میں ماہی کے نام کی ان دیکھی زنجیریں بندھ گئی تھیں۔ میں کچھ دیر وہیں بیٹھا سوچتا رہا پھر میں بھی اندر چلا آیا۔

☆☆☆

''ماہی تم ٹھیک ہو؟'' میں نے ٹیلی فون ریسیور پر اس کی آواز پہچانتے ہوئے کہا۔

''کامی! آپ کہاں ہیں......؟ اور وہ آشتی کہاں ہے...... اسے کہیں کہ اس کا گارڈ مجھے باہر نہیں جانے دے رہا۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

''تم فکر مت کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ گارڈ تمہاری حفاظت کے لیے ہی ہے۔'' میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''ہمیں ڈر لگ رہا ہے۔ ہمیں گھر جانا ہے۔ ابا جی کتنے پریشان ہوں گے۔'' اس کی پریشانی کم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔

''ماہی! میری بات غور سے سنو۔ سب ٹھیک ہے، میں خود نواب صاحب سے بات کرلوں گا۔ تم بس پریشان مت ہو۔ میں بہت جلد تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں پھر ہم ایک ساتھ مراد آباد چلیں گے۔ تم سمجھ رہی ہو نا...... اپنا ڈر وغیرہ سب نکال دو۔''

''آپ ہیں کہاں؟ آپ میری دوست آشتی سے ملے؟ آپ اس کی بات ماننا وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔''

''میں جانتا ہوں، وہ واقعی بہت اچھی لڑکی ہے۔'' میں نے دائیں طرف بیٹھی آشتی کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا جسے ماہی سمجھ نہیں سکی۔ ''اور میں کوشش کروں گا کہ اس کی کچھ باتیں مان بھی جاؤں۔''

''آپ کب آئیں گے؟''

''بہت جلد...... گھبرانا مت اور اپنا خیال رکھنا۔'' میں نے اختتامی الفاظ کہتے ہوئے فون کا ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور آشتی کی طرف دیکھنے لگا جس کا چہرہ خلافِ توقع بے تاثر تھا۔ یہ ان انکشافات کا نتیجہ تھا جو میں نے اس کے بارے میں تھوڑی دیر پہلے کیے تھے، وہ بولی۔

''تم نے جو کچھ میرے بارے میں سنا اور کہا وہ سب سچ ہے۔ بس اس میں کچھ ترمیم کرنا چاہتی ہوں، یہ سچ ہے کہ میری ماں ایک طوائف تھی اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ مجھے ایک

شریفانہ زندگی دینے کی بھی خواہاں تھی اسی لیے اس نے مجھے پڑھانا لکھانا چاہا مگر شاید تم ٹھیک کہتے ہو کہ ایک طوائف سب کچھ حاصل کرسکتی ہے سوائے عزت کے...... لیکن یہ بات بھی حقیقت ہے کہ اگر جواد نے مجھ سے محبت کی تھی تو میں نے بھی اسے بے لوث چاہا تھا۔ ایسی بے لوث محبت جس میں روپے پیسے کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ ہم نے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اس کے بعد ایک نئی زندگی شروع کرنا چاہتے تھے اسی لیے ہم نے منشیات کے چنگل سے بھی خود کو نکالنے کا فیصلہ کرلیا تھا لیکن اس فیصلے پر عمل کرنا آسان نہیں تھا۔ آخری کھیپ کے ان ہیروں کی حفاظت اور ماکھے کا ہمارے پیچھے لگ جانا ہمارے لیے وبالِ جان بن چکے تھے۔ ایسے میں تم بیچ میں ٹپک پڑے تو ہمیں تمہارا استعمال کرنا پڑا۔

''میری اگلی کہانی بھی سچ پر مبنی ہے کہ ہم پہلے وڈیرے سے دھوکا کھاتے کھاتے بچے اور آخر کار ''اوکاں والا'' نامی گاؤں میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے لیکن یہاں پر میں نے تم سے کچھ چھپایا ہے۔ اسی گاؤں کے ایک کچے سے گھر کی ایک رات کا واقعہ ہے۔ جواد باہر سے شراب پی کر آیا تھا۔ اس رات وہ خود کے قابو میں نہ تھا۔ اس کی زبان پھسلتی جارہی تھی اور مجھ پر نت نئے انکشاف ہو رہے تھے۔ اس نے مدہوشی میں مجھے ذلیل طوائف کہہ کر پکارا تو میرا وجود ریزہ ریزہ ہوگیا۔ حالانکہ اسے میرے بارے میں سب کچھ تو پتا تھا لیکن اس نے مجھے کبھی اس طرح نہیں پکارا تھا شاید دشمنوں کے نرغے میں جان بچاتے بچاتے اس کی ذہنی حالت ابتر ہو چکی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میں نے اسے پیسوں کی خاطر غلط کاموں پر اکسایا اور میں ہی اس کے اب تک کے حالات کی ذمے دار ہوں۔ وہ اپنے آپے سے باہر ہوتا جارہا تھا۔ اس نے مجھے تھپڑ مارے میرے بال نوچے...... اور مجھے بتایا کہ وہ مجھے ہیروں کے پاس بھی پھٹکنے نہیں دے گا۔ وہ مجھے مارتا رہا اور میں اس کے اس روپ پر اتنی حیران تھی کہ اس کی مار کھاتی رہی۔ اگلے دن اسے کچھ یاد نہیں تھا اور نہ ہی میں نے اسے احساس دلایا۔ میں تو بس اس حیرانی میں تھی کہ یہ کیا ہوگیا ہے۔ ہم دونوں کئی سال سے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے ہر راز سے آشنا تھے۔ ہمارا تعلق کیسے اس طرح کمزور پڑ سکتا ہے...... اور جانتے ہو تب مجھے صرف ایک ہی وجہ سمجھ میں آئی اور وہ یہ کہ مجھے یہ سزا تمہیں دھوکا دینے کے صلے میں ملی ہے۔ میں بھول گئی تھی کہ میں کئی دن بے یار و مددگار تمہارے ساتھ ایک گھر میں رہی اور تم نے میرے لیے جو کیا وہ عام بات نہ تھی۔ تم نے میری خاطر ساری دنیا سے لڑائی مول لی

موت کے منہ سے کھینچ کر باہر نکالا اور بدلے میں، میں نے تمہیں صرف دھوکا ہی نہیں دیا بلکہ تمہاری محبت کا مذاق بھی اڑایا شاید مجھے اسی بات کی سزا ملی تھی۔"

وہ کہہ رہی تھی اور میں حیرانی کے سمندر میں غوطہ زن یہ سوچ رہا تھا۔ جب میں موت و زندگی کی کشمکش...... سے نکل کر دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ رہا تھا تب ماہی میری تیمارداری کر رہی تھی۔ انہی لمحات میں مجھے بھی یہی خیال آیا تھا کہ میں نے ماہی کا دل دکھایا ہے شاید اس لیے قسمت نے مجھے بھی میری محبت سے محروم کر دیا۔ یہ عمل ردِعمل کا دائرہ تھا، سزا و جزا کا معاملہ تھا یا پھر توہینِ محبت کا قانون تھا...... میں نہیں جانتا تھا لیکن ہاں...... کھیتی وہی اُگتی ہے جس کا بیج ڈالا جائے۔ ببول کے بیج سے گلاب نہیں اُگتے۔ کسی کا دل دکھا کر محبت کا بیج بویا جائے تو چاہے اس بیج کی آبیاری آنسوؤں سے کرلو یا اس کے سرہانے بیٹھ کر دن رات دعائیں کرتے رہو لیکن محبت کا پودا نہیں پھوٹتا۔ پھوٹتی ہیں تو صرف کانٹے دار جھاڑیاں۔

میں آشتی کی آواز سن کر سوچ کے صحرا سے واپس پلٹا وہ کہہ رہی تھی۔

"میں جانتی ہوں، تمہیں ان باتوں پر یقین کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی کوئی وجہ...... اور مجھے بھی تم سے کوئی کریکٹر سرٹیفکیٹ نہیں بنوانا۔" وہ یک لخت پھر اپنے پرانے موڈ میں آگئی۔ "ہم دونوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ ہم وہ کام کی بات کریں جس کے لیے ہم یہاں موجود ہیں۔ مجھے جواد چاہیے...... زندہ سلامت...... بدلے میں، میں تمہیں تمہاری ماہی دوں گی۔ بولو سودا منظور ہے؟"

"تم لوگوں کا قرض مجھ پہ بڑھتا جا رہا ہے۔ تمہیں اندازہ ہے کہ میں ماہی کو بچانے کے بعد تم لوگوں کے ساتھ کیا کرسکتا ہوں؟"

"مجھے اندازہ ہے...... اچھی طرح اندازہ ہے لیکن میں یہ رسک ضرور لوں گی۔ میں جواد کو لے کر یہاں سے بہت دور نکل جاؤں گی لیکن اگر تمہیں شوق ہوا تو تم ہمارے راستے روک کر بھی دیکھ لینا۔" وہ بے خوف انداز میں بولی، اس لمحے وہ مجھے وہی پہلے والی آشتی لگی۔ نڈر، بے باک، بے خوف، اور شاطر!

☆☆☆

تیز ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی میرے گرد چکرا رہی تھی ایک ایسی خاموشی پھیلی ہوئی تھی جیسے آواز ہونا جرم ہو۔ میرے سامنے موجود گیلی مٹی کے ڈھیر سے مٹی، گلاب اور اگربتیوں کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس گیلی مٹی کے ڈھیر کے سرہانے ایک کتبہ ابھی ابھی نصب کیا گیا تھا۔ "چودھری حشمت علی۔" نیچے تاریخ وفات دو دن قبل کی درج تھی۔ میری آنکھوں سے بہنے والے آنسو اس قبر پر تواتر سے گر رہے تھے پھر کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے اس ہوش ربا منظر سے باہر کھینچا۔ یہ بھائی شفیق تھے، ان کے ساتھ عمران ماکھا اور کئی دوسرے آدمی بھی تھے۔

"چلو واپس چلیں۔" عمران نے مجھے کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر گاڑی کی طرف لے آیا میں ان کے ساتھ یوں چل رہا تھا جیسے قدم اٹھانے میں نیت کو دخل نہ ہو۔ چند لمحوں بعد گاڑی حویلی کی طرف جا رہی تھی۔ میں آج دوپہر کو ہی مراد آباد پہنچا تھا اور جس وقت میں نے حویلی میں قدم رکھا، تب تک جنازہ قبرستان لے جایا جا چکا تھا۔ حویلی روتی ہوئی عورتوں سے بھری ہوئی تھی۔ بھرجائی اور نازو نے روتے ہوئے مجھے یہ اندوہناک خبر دی تو میرا دماغ ماؤف سا ہو گیا۔ میں قبرستان پہنچا تو تدفین کی تیاری ہو رہی تھی۔ میرے اندر اس قبرستان سے بھی زیادہ گہرا سناٹا اترتا جا رہا تھا۔ میں سفید کفن میں لپٹے اس انسان کو دیکھ رہا تھا جس سے میرے دو رشتے تھے یہ میرا باپ بھی تھا اور میرا دشمن بھی...... لیکن ایک بات طے تھی، مجھے اس سے یا اسے مجھ سے نفرت نہیں تھی۔

ہم حویلی واپس پہنچ گئے۔ بھائی شفیق کہہ رہے تھے۔

"آج صبح اباجی اسلام آباد سے واپس آ رہے تھے موٹر وے پر بھیرہ انٹرچینج کے قریب ایک ٹرک نے ان کی گاڑی کو ٹکر دے ماری۔ ڈرائیور، اباجی اور ایک گارڈ موقع پر ہی جان کی بازی ہار بیٹھے۔ دوسرا گارڈ شدید زخمی حالت میں اسپتال لایا گیا۔ اس سے پہلے عمران سے اباجی کی کل رات بات ہوئی تھی۔ وہ تمہاری (کامران)...... گمشدگی پر بہت پریشان تھے۔ بار بار کہہ رہے تھے کہ کامی کو ڈھونڈو اس کی جان خطرے میں ہے۔ ادھر ہم بھی کم پریشان نہیں تھے۔ ساہیوال کی کوٹھی میں جو ہوا اس کا راز بھی نہیں کھل رہا تھا۔ ہم سب کھانا کھا کر بے ہوش ہو گئے تھے۔ ہوش میں آئے تو تم اور ماہی غائب تھے۔ اباجی کے حادثے کی خبر سب سے پہلے عمران کو ملی تو یہ فوراً روانہ ہو گیا۔ بعد میں ماکھا اور میں وہاں پہنچے لیکن...... لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔"

"وہ ایکسیڈنٹ نہیں...... قتل تھا۔" عمران کی گمبھیر آواز گونجی۔ "زخمی گارڈ نے مجھے بتایا کہ ٹرک نے سائڈ سے گزر جانے کا اشارہ دیا تھا جیسے ہی ہم گزرنے لگے اس نے سائڈ ماردی۔ ان کی گاڑی سڑک کے داہنی طرف لگے پتھروں

سے ٹکرا کر گھوم گئی۔ اس کا بایاں حصہ بری طرح پچک چکا تھا۔ اباجی اور پیچھے بیٹھا گارڈ شدید زخمی ہوگئے لیکن اسی ٹرک نے بریک لگا کر ٹرک کو بیک کیا اور ایک بار پھر گاڑی کو بری طرح سے روندتا ہوا آگے گزر گیا...... جسے کچھ دور جا کر ہی موٹر وے پولیس نے روک لیا اور ڈرائیور کو گرفتار کرلیا تھا۔ بظاہر یہ ایکسیڈنٹ تھا لیکن یہ ایک قتل کی سوچی سمجھی سازش تھی۔'' پھر ایک توقف کے بعد وہ بولا۔

''اور اس بات کا خدشہ اباجی کو پہلے سے تھا۔ کچھ دنوں سے وہ بہت پریشان سے تھے۔ تمہیں ساہیوال کی جس کوٹھی میں رکھا تھا وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی لیکن پچھلے چند دنوں سے بار بار خود بھی وہاں جاتے اور ہم دونوں کو بھی بھیجتے۔ سیکیورٹی بھی سخت کردی گئی تھی...... اور یہی نہیں، ایک دن مجھے وڈے کمرے میں بلایا تو وہاں ان کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے مجھ سے ایک عجیب بات کہی...... بولے۔

''عمران پتر! جب کا کی آئے گا نا تو اسے یہ چابی دے دینا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے تہ خانے والی تجوری کی چابی مجھے دے دی۔

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''...... اباجی کا کی کب آئے گا؟''

بولے۔ ''بہت جلدی...... اسے اب آجانا چاہیے۔ بہت آرام کرلیا اس نے، اسے اب کام پر واپس آجانا چاہیے۔'' ان کے لہجے میں تھکاوٹ تھی کہہ رہے تھے۔ ''میں تھک گیا ہوں ان چیزوں کی حفاظت کرتے کرتے...... اب اسے کا کی کے حوالے کرنا ہی ہوگا۔''

مجھے ان کی باتیں سمجھ نہیں آرہی تھیں لیکن جو آخری بات انہوں نے کہی، اس نے مجھے پریشان کردیا۔ انہوں نے کہا۔ ''عمران پتر! کامران سے کہنا چودھری حشمت کی انا بیٹے کی ضد سے ہار گئی۔''

عمران بھائی ساری تفصیل سنانے کے بعد چپ ہوئے پھر انہوں نے ایک بڑی مضبوط سی پرانی وضع کی چابی میری ہتھیلی پر رکھ دی اور بولے۔

''اس تجوری میں تمہارے لیے کچھ ہے۔ ابھی دیکھ لو تو بہتر ہے۔ ہم ذرا مہمانوں کا انتظام دیکھ لیں۔'' اس نے کہا اور بھائی شفیق کو لے کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد تجوری میرے سامنے اپنے سارے راز کھولے بیٹھی تھی۔ اندر ایک بریف کیس تھا۔ جسے کھولا تو دیکھا اس میں وہ تمام ثبوت اپنی اصل حالت میں تھے جن کی مدد سے میں اباجی اور ان کے دوست سرکاری افسروں کو ان کے غیر قانونی کاموں کی وجہ سے عدالت تک کھینچ لایا تھا۔ البتہ اس میں کافی چیزوں کا اضافہ ہوچکا تھا۔ ایک خط بھی تھا۔ جو تاریخ کے اعتبار سے انہی تاریخو سے ایک میں لکھا گیا تھا جب میں ان کی تحویل میں طوی ہوشی کے عالم میں تھا۔ اس خط میں انکشاف انگیز باتیں تھ ان باتوں میں ایک ویڈیو کا ذکر بھی تھا جو اس سامان میں مو تھی۔ یہ ایک ویڈیو ڈسک تھی۔ میں نے ویڈیو پلیئر منگ اسے پلے کیا۔ یہ ویڈیو بہت ہی اہمیت کی حامل تھی۔ اس تین حصے تھے۔ پہلا حصہ کسی خفیہ کیمرے کی مدد سے بنا تھا۔ کیمرا کمرے کی ایک دیوار پر قدرے بلندی پر آرائشی پھولوں میں نصب تھا مگر اس کا رزلٹ بھی بہت اچھا اور آواز کی کوالٹی بھی...... منظر ویسا ہی تھا جیسا کہ اسلام آباد ایک فارم ہاؤس میں مجھے بلوا کر اعلیٰ حکومتی عہدیداروں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اس منظر میں نسیم اطہر، سلیم قریشی سکندر بخت کے علاوہ چودھری حشمت علی اور تین چار شخصیات بھی نظر آرہی تھیں...... ان کے درمیان ہونے وا بحث کا موضوع میری رپورٹس ہی تھیں۔ (ویڈیو کے کو میں تاریخ اور وقت بھی نظر آرہا تھا جس کے مطابق یہ وہ وقت تھا جب سپریم کورٹ میری رپورٹ پر از خود نوٹس لے چکی تھی)

''سچ بات تو یہ ہے چودھری صاحب کہ ہم اگر خاموش ہیں تو صرف آپ کی وجہ سے۔'' نسیم اطہر کہہ رہا تھا۔ ''اگر کامران چودھری آپ کا بیٹا نہ ہوتا تو اب تک شاید اس کے ساتھ نجانے کیا کچھ ہوچکا ہوتا۔''

''چودھری صاحب! نسیم کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم تو خاموش ہیں لیکن آپ کو تو بولنا چاہیے۔ کامران کو اگر آپ نہیں روکیں گے تو مجبوراً ہمیں ایکشن لینا ہوگا اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ ایکشن کیا ہوسکتا ہے۔'' سلیم قریشی کہہ رہا تھا۔

''آپ والد ہیں اس کے...... مگر اس وقت وہ صرف ہمارا ہی نہیں آپ کا بھی دشمن ہے۔ اگر آپ یونہی خاموش بیٹھے رہے تو اس کا صاف مطلب یہی نکلتا ہے کہ آپ خود پر لگائے گئے تمام الزامات کو قبول کررہے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہم سب بھی پھنس جائیں گے۔'' نسیم اطہر نے کہا۔

''وقت ریت کی طرح مٹھی سے نکل رہا ہے چودھری صاحب! کل کو کورٹ ہمیں طلب کرلے گی۔ ہم سب پر نوادرات کی اسمگلنگ اور بدعنوانیت کے الزامات ثابت ہو جائیں گے۔'' سفید کلف لگا سوٹ پہنے وہ شخص میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اس تمام گفتگو میں اباجی اور سکندر بخت بالکل خاموش بیٹھے تھے پھر ایک دم سکندر بخت نے اپنی خاموشی

ادا۔

''دیکھیں چودھری صاحب! جتنی آپ کو اپنے بیٹے کی جان سے زیادہ مجھے میری بیٹی کا گھر عزیز ہے۔ نہ تو مجھے اس میں کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی آپ کے اس خودسر بیٹے میں صرف نسیم کے کہنے پر ابھی تک آپ کے بیٹے کے خلاف حرکت میں نہیں آیا، ورنہ میرے ایک فون کرنے سے اس طرح غائب ہو چکا ہوتا کہ جیسے اس دنیا میں پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ آپ میری خاموشی کو میری کمزوری مت سمجھیے۔ ابھی اسی وقت مجھے اپنا فیصلہ سنائیے۔''

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد اباجی نے کہا۔

''میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہم سب اس معاملے سے بچ نکلیں اور کامران بھی بچ جائے۔''

''چودھری صاحب! آپ اتنی سی بات نہیں سمجھ رہے کہ جب تک کامران زندہ ہے اس وقت تک یہ معاملہ ختم ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ سمجھنے سمجھانے کے چکر سے نکل گیا ہے۔ ایسے ضدی بچے کو اب آپ بھی نہیں سمجھا سکتے۔'' سلیم قریشی نے کہا۔

''وہ میرا پتر ہے سلیم قریشی...... چوہدری حشمت علی کا پتر۔'' اباجی بلبلا کر بولے۔

''چودھری صاحب! مرنے کا مطلب جان سے مارنا نہیں ہوتا...... ایک موت وہ بھی ہوتی ہے جس میں بندہ کسی کی نظروں میں مرجاتا ہے۔'' سکندر بخت سگار کا گاڑھا دھواں اگلتے ہوئے بولا۔ ''میرے پاس ایک حل ہے جس میں سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔'' ایک توقف کے بعد وہ بولا۔ ''ہم کامران کے قدوقامت کا ایک بندہ تلاش کریں گے۔ پلاسٹک سرجری یا جدید میک اپ کے ذریعے اسے ہوبہو کامران بنایا جائے گا۔ پھر ہم اصل کامران کو اغوا کر کے طویل بے ہوشی میں رکھ دیں گے...... کامران کا ڈپلیکیٹ کامران بن کر وہی کرے گا جو ہم کہیں گے...... وہ سپریم کورٹ تک اپنے ثبوت پہنچنے نہیں دے گا...... میڈیا پر آ کر یہ اعلان کرے گا کہ اس کی رپورٹ غلط تھی۔ اس نے انتقامی طور پر بھی سرکاری افسروں کے خلاف لکھا۔ یہی میڈیا جو اس وقت اس کی پشت پر کھڑا ہے، اسے اس کے خلاف کر دینا آسان ہو جائے گا۔ ڈپلیکیٹ کامران اپنا کیس خود ہی خراب کرے گا۔ کیس کا فیصلہ ہمارے حق میں آنے کے بعد ہم نقلی کامران کو اس طرح قتل کریں گے کہ وہ خودکشی معلوم ہو۔'' سکندر بخت نے تفصیل بتائی۔

''بہت اچھی تجویز ہے لیکن اصل کامران کا کیا ہوگا؟ وہ بھی نہ کبھی تو ہوش میں آ ہی جائے گا۔'' سلیم قریشی بولا۔

کام بھی نہیں ہوا

شوہر اور بیوی میں زبردست لڑائی ہوئی۔ شوہر نے خودکشی کی ٹھان لی چنانچہ موصوف بازار گئے اور زہر کی گولیاں خرید لائے۔ بیوی کو دکھاتے ہوئے انہوں نے گولیاں کھالیں لیکن مرے نہیں، صرف بیمار ہو گئے۔ بیوی نے سر پیٹ کر کہا...... سو بار کہا ہے کہ چیزیں دیکھ بھال کر خریدا کرو...... اتنے پیسے بھی بیکار گئے اور کام بھی نہیں ہوا۔

☆☆

بلیک باکس

تباہ ہوجانے والے جہازوں کا بلیک باکس تلاش کیا جاتا ہے۔ جو آگ، دھماکے غرض کسی چیز سے تباہ نہیں ہوتا۔ آخر یہ سارا ہوائی جہاز اسی مواد کا کیوں نہیں بنایا جاتا؟

☆☆

زہرِ قاتل

ہمیں اپنے جسم سے ورم، پھوڑے اور رسولیاں دور کرنے کی نسبت اپنے ذہن سے غلط خیالات خارج کرنے کی زیادہ کوشش کرنی چاہیے کیونکہ یہ زیادہ زہریلے اور مہلک ہوتے ہیں۔

☆☆

عاجزی

ایک خستہ حال فقیر نے کسی دروازے کے سامنے صدا لگائی...... ''اے نیک بی بی! کچھ کھانے کو ملے گا۔ بابا بھوکا ہے۔'' گھر سے کوئی آواز نہ آئی تو فقیر دوبارہ عاجزی سے بولا۔ ''اے بی بی! بابا روٹی بھی کھالیتا ہے چاول اور برگر بھی نوش کر لیتا ہے۔'' ایک دم گھر سے ایک کڑک دار نسوانی آواز سنائی دی۔ ''کیا بابا جوتے بھی کھالیتا ہے؟''

''نہیں بی بی! بابا کو سخت غذا منع ہے۔'' بابا نے اطمینان سے جواب دیا۔

(مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ)

''بس اسی بات کی گارنٹی چودھری حشمت صاحب ہمیں دیں گے۔ ایک بار یہ سپریم کورٹ کا معاملہ ختم ہوجائے۔ کامران کو ہوش میں لا کر اسے اس سارے کھیل کے بارے میں بتا کر اس کی ہمت توڑی جاسکتی ہے۔ دوسری صورت میں اس کی بھی پلاسٹک سرجری کروا کر اسے ملک سے باہر رکھا جاسکتا ہے۔ پرندہ اور وقت ہاتھ سے نکل جائے تو واپس نہیں لائے جاسکتے۔ ویسے بھی اگلا سال الیکشن کا ہے۔ یہ معاملہ جلدی دوبارہ سر نہیں اٹھاسکے گا۔'' سکندر بخت اپنی گونج دار آواز میں کہہ رہا تھا۔

اس کی تجویز پر سبھی پرجوش نظر آرہے تھے جبکہ چودھری حشمت بھی اثبات میں سر ہلا رہے تھے۔ بات سن کر وہ بولے۔

''ٹھیک ہے، ان حالات میں یہی مناسب معلوم ہوتا ہے لیکن کامران کو میرے بندے اغوا کریں گے اور وہ میری ہی تحویل میں رہے گا اور اس بات کی میں گارنٹی دیتا ہوں کہ میرے ہوتے ہوئے کامران دوبارہ کوئی گڑبڑ نہیں کرے گا۔''

''ہمیں منظور ہے...... لیکن کامران کے اغواء کے بعد اس کے پاس جو ثبوت ہیں وہ آپ نے ہمیں دینے ہیں۔'' نسیم اطہر نے کہا تو اباجی نے سر ہلا دیا۔

''بس تو ٹھیک ہے، ہم آج سے کامران کا ڈپلیکیٹ بنانے کے لیے بندہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔'' سکندر بخت نے ایش ٹرے میں سگار بجھاتے ہوئے کہا تو ابا بولے۔

''اس کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ایک بندہ میرے پاس ہے جو کامران کی جگہ لے سکتا ہے۔'' اس کے بعد کچھ دیر وہاں اسی موضوع پر بحث ہوتی رہی پھر اباجی وہاں سے چلے گئے مگر ویڈیو چلتی رہی۔ کمرے میں نسیم اطہر، سلیم قریشی اور دو بندوں کے علاوہ سکندر بخت موجود تھے۔

''کامران کو زندہ رکھنا بہت بڑی بے وقوفی ہوگی۔ جیسے ہی...... کورٹ کا فیصلہ آجائے، کامران کو ختم کرنا تمہاری اولین ترجیح ہوگی، ورنہ اس کے خطرے کی تلوار تم پر لٹکتی رہے گی اور جہاں تک میں دیکھ رہا ہوں، اس کامران سے زیادہ ٹیڑھا اس کا باپ ہے۔ اس کا بھی کچھ کرنا ہوگا ورنہ یہ اس سے بھی زیادہ خطرناک بن سکتا ہے۔''

یہ فقرہ سکندر بخت نے کہا تھا جس پر ان سب نے اثبات میں سر ہلایا جو اباجی کے دوست اور شریکِ جرم تھے۔ یہاں پہنچ کر ویڈیو کا پہلا حصہ ختم ہوگیا۔

چودھری حشمت علی کتنے جہاندیدہ اور چالاک تھے، یہ بات اس ویڈیو سے ثابت ہوتی تھی کہ انہوں نے اس خفیہ میٹنگ کی ویڈیو ریکارڈنگ کا بندوبست پہلے سے ہی کر رکھا تھا۔ اس ہوش ربا ویڈیو کا دوسرا حصہ شروع ہوچکا تھا۔

یہ حصہ کسی اسٹوڈیو میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔ اس میں چودھری حشمت علی خان کا اعترافِ جرم تھا جس میں انہوں نے نہ صرف اپنے تمام غیر قانونی کاموں بشمول نوادرات کی اسمگلنگ کا ذکر کیا تھا بلکہ ان معاملوں میں شامل ان تمام سرکاری افسران کے نام بھی لیے تھے۔ سب سے اہم بات یہ کہ انہوں نے نوادرات اسکینڈل کے متعلق اس سارے پلان کا تفصیل سے ذکر کیا تھا جس کی وجہ سے نوادرات کیس کامران چودھری کی ناکامی اور سرکاری افسروں کی جیت پر ختم ہوا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے خود کو اور اپنے دوستوں کو بچانے کے لیے ایک ڈراما کھیلا جس میں انہوں نے کامران چودھری کو اغوا کر کے بے ہوشی میں رکھا اور اس کی جگہ ایک اور آدمی کو کامران چودھری کے میک اپ میں ملک سے باہر بھیج کر ایسی صورتِ حال پیدا کی کہ سچ کو جھوٹ میں بدل دیا گیا۔

اباجی نے مزید کہا کہ شاید بات یہاں تک ختم ہوجاتی لیکن سکندر بخت چاہتا تھا کہ کامران کو مار دیا جائے اسی لیے انہوں نے کامی کو ایسی جگہ پر رکھا جس کا علم صرف انہیں ہی تھا اور اب انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی اور کامران چودھری کی جان کو شدید خطرہ ہے۔ اسی لیے...... وہ اس معاملے کے متعلق تمام حقائق کی نہ صرف ویڈیو بنا کر انہیں ریکارڈ کر رہے ہیں بلکہ ان سے متعلق کئی دستاویزی ثبوت بھی ساتھ منسلک ہوں گے اور ان کا یہ بیان مجسٹریٹ اور چند گواہان کے روبرو بھی پیش کیا جائے گا۔

ویڈیو ختم ہوگئی...... لیکن اس کے ساتھ ہی میری مٹھی میں دبا شکست کا پروانہ جیت میں بدل گیا۔ چودھری حشمت علی جاتے جاتے میرا دامن بھر گئے تھے۔

اس ویڈیو کے تیسرے حصے میں پہلے اس آدمی کی پلاسٹک سرجری کرتے دکھایا گیا جسے میری شکل دی گئی اور وہ بندہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا...... اس کے بعد اس تہ خانے کا منظر بھی تھا جہاں میرا بے ہوش وجود مختلف مشینوں سے جڑی تاروں پر ساکت پڑا تھا۔ اس ڈسک کی مدد سے یہ ثابت ہو جاتا تھا کہ میں طویل بے ہوشی میں تھا اور لندن میں بیان دینے والا اور مر جانے والا بندہ میں نہیں کوئی اور تھا۔ بریف کیس میں جن چند کاغذوں اور فائلوں کا اضافہ تھا ان میں میری جگہ مرنے والے بندے کی ڈی این اے رپورٹس بھی

ہیں۔ اباجی کا اعترافی بیان بھی موجود تھا۔ نیشنل میوزیم سے اور تحائف حاصل کیے گئے نوادرات بھی موجود تھے۔ اباجی کو اس خطرے کا احساس ہو گیا تھا کہ یہ معاملہ سنگین صورت حال اختیار کر جائے گا۔ وہ چاہتے تو کھلم کھلا ان لوگوں سے دشمنی مول لے سکتے تھے لیکن وہ باوقار انسان تھے۔ جن لوگوں کو انہوں نے اپنا دوست کہا تھا' ان کے ساتھ اس وقت تک یہ دوستی نبھائی جب تک ان کی جان نہیں چلی گئی۔ میں محسوس کر سکتا تھا کہ وہ ایک جانب اپنے دوستوں اور دوسری جانب اپنے بیٹے کے درمیان جاری جنگ میں دونوں اطراف سے بندھے ہوئے تھے۔ دونوں فریقین انہیں اپنی اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ اس کا انجام یہی ہونا تھا جو ہو گیا۔

اور میں...... آنسوؤں سے تر چہرے پر ہاتھ رکھے ایک ہی منظر میں کھویا ہوا تھا۔ جب وہ آہستہ آہستہ تہ خانے سے باہر جا رہے تھے اور میں چاہ رہا تھا کہ انہیں روک لوں لیکن میں انہیں روک نہ سکا۔ کاش میں انہیں آواز دے لیتا۔ جس طرح دھیرے دھیرے وہ سیڑھیاں چڑھ رہے تھے' شاید وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ میں انہیں ایک بار پکار لوں لیکن وقت کے اس لمحے میں ہم دونوں ہار گئے۔ بطور چودھری حشمت علی یا کامران کے نہیں...... بلکہ اس دن ایک باپ اور بیٹا ایک دوسرے سے ہارے تھے۔

رات کو بھائی شفیق کہہ رہے تھے۔ ''اباجی کی وصیت بھی پڑھ لینا...... اور میں نے اور عمران نے فیصلہ کیا ہے کہ وڈے کمرے کی کرسی پر تجھے بٹھایا جائے۔ اباجی کی پگھ تیرے سر ہی بندھے گی۔'' میں دھندلائی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔ انہوں نے میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''تو جانتا ہے' ہم تو شروع سے ہی ان معاملات سے دور رہے ہیں۔ ہمیں جاگیر کی دیکھ بھال کا کام آتا ہے وہ ہم کیے جائیں گے۔ یہاں بیٹھ کر لوگوں کے مسئلے مسائل حل کرنے اور فیصلے کرنے کی ہمت ہم دونوں میں سے کسی میں بھی نہیں ہے۔ تو پڑھا لکھا ہے۔ اس پگھ کی لاج ہم سے بہتر رکھے گا۔'' وہ بولتے جا رہے تھے۔ ''کل قرآن خوانی کے بعد تیرے سر پر پگھ رکھنے کی رسم ہو گی۔ چالیسویں تک تجھے حویلی میں ہی رہنا ہے۔ تجھے جتنے بھی ضروری کام ہیں وہ بعد میں نمٹا لینا۔''

''نہیں، مجھے ابھی فوراً جانا ہے۔ اس کے بعد آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''تیرے کام اتنے ضروری نہیں کہ تو......'' میں نے ان کی بات کاٹ دی۔

''یہ ماہی کے متعلق ہے۔ اگر میں کل وہاں نہ پہنچا تو اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

''اوہ...... ماہتاب کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔ نواب صاحب بھی پریشان ہیں لیکن انہیں میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ اسلام آباد میں ہے لیکن وہ ہے کہاں؟ تم اور وہ ایک ساتھ ہی غائب ہو گئے تھے؟''

''ماہی اس وقت آشتی کی قید میں ہے اور میں یہاں اباجی کی قید سے جواد کو چھڑوانے آیا تھا تاکہ جواد کے بدلے ماہی کو آزاد کروا سکوں۔'' میں نے کہا تو دونوں بھائیوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

''مگر......'' عمران نے کہنا چاہا۔

''میں جانتا ہوں لیکن میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے۔'' میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اچھا لیکن ماکھے اور اس کے آدمیوں کو ساتھ لے جا...... بلکہ میں خود بھی چلتا ہوں تیرے ساتھ۔'' عمران نے کہا تو میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں عمران بھائی! مجھے اکیلے ہی جانا ہے اور ابھی جانا ہے لیکن اس سے پہلے مجھے ماکھے سے بھی ملنا ہے۔''

☆☆☆

میں فارم ہاؤس کے ایک کمرے میں تھا۔ میرے ساتھ ماکھا کھڑا تھا اور سامنے کرسی پر دلاور نامی آدمی بیٹھا تھا جس کی ابھی ابھی ماکھے نے اچھی خاصی درگت بنائی تھی۔ آشتی نے مجھے روانہ کرنے سے پہلے ایک اور کوٹھی کا ایڈریس دیا تھا جہاں جواد کو میں نے لے کر پہنچنا تھا۔ یقیناً اس کوٹھی میں اس کے اور ساتھی بھی ہوں گے اور روانہ ہونے کے بعد مجھے یقین تھا کہ میرے پیچھے وہ اپنا کوئی مخبر بھی بھیجے گی جو میرے بارے میں پل پل کی خبر اسے پہنچاتا رہے۔ واپسی کے سفر کے دوران تو مجھے اپنے تعاقب میں کوئی آتا محسوس نہیں ہوا، البتہ اباجی کی تدفین کے دوران چاہے میں دماغی طور پر کتنا بھی غیر حاضر تھا لیکن ایک آدمی کو اپنی طرف گھورتا اور مشکوک انداز میں اپنے گرد منڈلاتا محسوس کر لیا تھا اور یہ آدمی ماکھے کا آدمی ہی تھا۔ بھائی شفیق اور عمران سے مل کر میں ماکھے سے ملا اور اسے اس آدمی کے بارے میں بتایا۔ ماکھا اسے یہاں لے آیا اور اس نے بتایا کہ اس کا نام دلاور ہے اور اب اپنی درگت کے بعد اس نے تسلیم کر لیا کہ وہ جواد اور آشتی کے لیے بہت عرصے سے کام کر رہا ہے۔ البتہ اسے اب جواد کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ اس سے ایک ٹرانسمیٹر بھی برآمد ہو گیا جس کے ذریعے اس نے آشتی تک یہ اطلاع پہنچا دی تھی کہ چودھری

حشمت وفات پا گئے ہیں اور بقول دلاور...... آشتی کو یہ خبر ٹیلی ویژن سے پہلے ہی مل چکی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کوٹھی میں کیا صورتِ حال ہے جہاں مجھے جواد کو لے کر پہنچنا تھا تو اس نے مجھے ساری تفصیل بتا دی۔ میں نے اس کے بارے میں آخری فیصلہ ماکھے پر چھوڑ دیا اور باہر نکل کر ماکھے سے کہا کہ مجھے ایک آدمی کی ضرورت ہے لیکن اس کی وفاداری پر کوئی شک نہ ہو۔ ماکھے نے کہا کہ وہ خود میرے ساتھ چلے گا مگر میں نے اس سے کہا کہ اس کی ضرورت حویلی میں زیادہ ہے، مجھے بس ایک بندہ چاہیے۔

تھوڑی دیر بعد میں سلطان نامی اس آدمی کے ساتھ مراد آباد سے نکل رہا تھا۔ دورانِ سفر میں آگے کی پلاننگ سوچتا رہا۔ جس کوٹھی میں مجھے بلوایا گیا تھا، ماہی کو بھی وہیں ہونا چاہیے۔ بالفرض وہ وہاں نہ ہوئی تب یہ بہت ضروری تھا کہ مجھے آشتی پر اس طرح قابو پانا ہوگا کہ وہ بے بس ہو جائے۔

مطلوبہ گھر سے کافی دور ہی میں نے گاڑی روک دی۔ باقی کا سفر ہم نے پیدل طے کیا۔ خاکی لکڑی کے بڑے سے گیٹ کے باہر سڑک کے پار درختوں کے بیچ میں نے سلطان کو روک دیا۔

''تم نے اور کچھ بھی نہیں کرنا۔ میں تمہیں ٹرانسمیٹر پر کال کروں گا تب تم نے اندر آنا ہے۔ ورنہ یہیں رہنا ہے اور اگر تم دیکھو کہ اس کوٹھی سے میرے علاوہ کوئی فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہے تو تم اسے نشانہ بنا سکتے ہو...... سمجھے؟''

''آپ فکر نہ کریں چھوٹے چودھری جی...... میں سب سنبھال لوں گا۔'' اس نے اپنی رائفل سنبھالتے ہوئے کہا۔

میں خود اس کوٹھی کی طرف بڑھ گیا جس کی اندرونی و بیرونی لائٹس مدھم تھیں۔ اس کے باوجود میں بڑی احتیاط سے دس فٹ اونچی دیوار پھلانگ کر اندر لان میں کودا اور پھر ایک گوشے میں بیٹھ کر جائزہ لیتا رہا۔ میرے کودنے سے کسی قسم کی کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی تھی جس پر کوئی ردعمل ظاہر ہوتا پھر بھی میں نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر گھاس پر رینگتا ہوا سامنے کی کیاری تک پہنچ گیا۔ پھولوں سے بھرے کنج میں سے مجھے برآمدہ نظر آ رہا تھا۔ یہاں ہلکے پاور کے بلب کی روشنی میں ایک شخص کرسی پر بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنی گن کرسی کے ساتھ ٹکا رکھی تھی اور خود سگریٹ پیتے ہوئے کسی خیال میں گم تھا۔ میں نے کیاری میں سے ایک چھوٹا سا پتھر تلاش کیا اور بازو گھما کر اپنے دائیں طرف پھینک دیا۔ پتھر لان سے باہر پختہ زمین پر ٹنک کی آواز سے ٹکرایا۔ کرسی پر بیٹھا آدمی بجلی کی سی تیزی سے اپنی گن اٹھا کر کھڑا ہو گیا اور اس سمت دیکھنے لگا جدھر سے آواز آئی تھی۔ شاید وہ اندازہ لگا رہا تھا کہ آواز سچ مچ آئی تھی یا اس کا واہمہ تھا۔ میں نے ایک اور پتھر اسی سمت پھینکا۔ اب کی بار وہ بڑی احتیاط سے چلتا ہوا برآمدے سے باہر نکل آیا اور آواز کی سمت چلنے لگا۔ میں رینگتا ہوا کیاری کے بائیں طرف کھسکتا رہا...... حتیٰ کہ اس کی پشت پر پہنچ گیا۔ وہ اس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں پتھر گرائے گئے تھے لیکن ظاہر ہے ناکافی روشنی میں اسے بھلا کیا نظر آتا تھا۔ میں آہستگی سے کھڑا ہوا اور اس کے پیچھے پہنچ گیا۔ اس نے پیچھے مڑنا چاہا لیکن تب تک اس کی گردن میرے دائیں بازو کی گرفت میں آ چکی تھی۔ بائیں ہاتھ سے میں نے اس کی گن کی نال کو پکڑ کر خود سے دور رکھا تھا۔ اس نے خود کو چھڑانے کے لیے زور لگایا تو میں نے اسے کیاری کے اوپر سے لان کی گھاس پر پٹخ دیا۔ میں خود بھی اس کے ساتھ ہی تھا کیونکہ گردن چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ اس کی گن اس کے جسم کے نیچے ہی دب چکی تھی۔ میں نے اس کی گردن کا دباؤ اتنا رکھا نہ تو وہ ہل سکے اور نہ ہی چلا سکے۔

''اندر کتنے لوگ ہیں۔'' میں اس کے کان میں آہستہ سے غرایا۔

''کک...... کوئی نہیں۔'' وہ بھنچی سی آواز میں بولا تو میں نے دباؤ بڑھا دیا۔ اس نے ٹانگیں چلائیں لیکن میں محفوظ رہا۔

''ہلو گے تو تمہاری گردن ٹوٹ جائے گی۔'' وہ ساکت ہو گیا...... میں نے دباؤ کم کیا اور وہی سوال دہرایا۔

''تت...... تین......'' وہ اٹک اٹک کر بولا۔

''آشتی کہاں ہے؟''

''وہ...... وہ اوپر دوسری منزل پر پہلے کمرے میں...... مم...... مجھے چھوڑ دو...... میرا سانس......'' میں نے دباؤ پھر بڑھا دیا اور اس وقت کم کیا جب وہ بے ہوش ہو کر میرے بازو میں جھولنے لگا۔ میں نے اس کا مفلر اتار کر اس کے ہاتھوں اور پاؤں کو ایک ساتھ باندھ دیا اور پھر اس کے گٹھری بنے جسم کو اسی کیاری میں ڈال دیا جہاں اس کی گن پڑی تھی۔ گن کا میگزین نکال کر میں نے دور پھینک دیا۔ میں نے برآمدے میں موجود اندرونی عمارت میں داخل ہونے والا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ سامنے کوریڈور تھا جس کے دائیں بائیں کمروں کے دروازے تھے جبکہ سامنے ڈرائنگ روم نظر آ رہا تھا۔ میں آرائشی لڑیوں کو ہٹا کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو پہلی نظر صوفے پر سوئے ہوئے آدمی پر پڑی۔ یہ اکیلا ہی تھا۔ میں نے اس کی نیند خراب کیے بغیر گردن کی نس مسل کر اسے بے ہوش کر دیا اور اسے ایک چادر سے یوں ڈھانپ دیا

رہے وہ سو رہا ہو۔ اس کی رائفل بھی ساتھ پڑی تھی۔ میں نے اسے صوفے کے نیچے دور پھینک دیا۔ دو آدمی اور ہوں گے لیکن وہ یہاں نظر نہیں آرہے تھے۔ میں کوریڈور میں موجود کمروں کی طرف آگیا۔ پہلے دونوں کمرے خالی تھے تیسرے میں دونوں افراد موجود تھے لیکن ان کی حالت دیکھ کر میرے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ قالین پر ہی ٹیڑھے میڑھے انداز میں گرے اونگھ رہے تھے اور ان کے قریب شراب کی تین خالی بوتلیں اور ناؤ نوش کا باقی سامان بکھرا پڑا تھا۔ یہ دونوں بھی جلدی اٹھنے والے نہیں لگتے تھے۔ میں نے ان کی رائفلیں اٹھائیں اور کمرے کا دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔ رائفلیں میں نے ڈرائنگ روم میں صوفوں تلے پھینک دیں۔

کمرے کے بائیں جانب لکڑی کی سیڑھیاں اوپر جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں انہیں پھلانگتا ہوا اوپر پہلے کمرے کے سامنے پہنچا جس کے اندر آشتی کو ہونا چاہیے تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ میرے سامنے نیلی مدھم روشنی میں نہایا ایک شاندار بیڈ روم تھا۔ اے سی کی خنکی باہر کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ وسط میں رکھے ڈبل بیڈ پر کوئی کمبل لیے لیٹا تھا۔ یہ آشتی ہوگی یقیناً...... میں نے اپنا پسٹل تھاما اور اس کی طرف بڑھا۔

لیکن جیسے ہی میں نے کمبل کا کونا اٹھایا تو نیچے تکیے رکھے ہوئے تھے عین اسی لمحے لوہے کے سرد لمس نے میری گردن کو چھوا۔

''اپنے ہاتھ اوپر ہٹالو کامران اور کوئی ایسی حرکت مت کرنا جس کے بعد تمہیں پچھتانا پڑے۔'' آشتی کی غراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں نے ہاتھ اٹھا دیے اور ساکت کھڑا رہا۔ اس نے اپنے دوسرے ہاتھ سے میرا پسٹل چھین لیا۔ ''اسی رخ پر چار قدم دائیں طرف چلو اور صوفے پر بیٹھ جاؤ۔''

میں نے اس کی اس بات پر بھی عمل کیا۔ صوفے پر بیٹھنے سے اب وہ میرے سامنے آچکی تھی۔ سیاہ لباس پہنے...... اپنی پراسرار آنکھوں کے تمام تر سحر کے ساتھ...... اس کی پُرفسوں شخصیت میں ہاتھ میں پکڑا پستول واحد ایسی چیز تھی جسے نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ میرے سامنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''چودھری حشمت علی کے بارے میں سن کر مجھے اندازہ تو ہوگیا تھا کہ تم جلد واپس لوٹو گے لیکن یہ امید نہیں تھی کہ تم جواد کو لانے کے بجائے اس طرح کی حماقت پر اتر جاؤ گے جس کی وجہ سے تمہاری اور ماہی کی زندگی مشکل میں پڑ سکتی ہے۔ تم کیا سمجھے میں نے یہ گھٹیا باڈی گارڈ اپنی حفاظت کے لیے رکھے ہوئے ہیں؟ نہیں کامران چودھری نہیں...... مجھے اپنی حفاظت کرنا خود آتی ہے لیکن پتا نہیں تم کب اس بات کو سمجھو گے...... اور تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ وہ کیوں نہیں کرتے جس کام کے لیے بھیجا جائے۔ تمہارے جیسے باغی ذہن کے افراد اسی لیے نقصان اٹھاتے ہیں۔'' وہ تلخ لہجے میں بولتی رہی اور میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''اب بتاؤ، میں تمہارا کیا کروں؟ کیوں نہ تمہیں اس جگہ پر چوٹ لگاؤں جہاں تمہیں واقعی درد ہو؟ میرا مطلب ہے ماہی......!'' وہ سرد لہجے میں بولی۔

''نہیں تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔''

''کیوں نہ کروں؟ تمہیں جواد کو ساتھ لانے کا کہا تھا...... تم نہیں لائے...... اس کی سزا تو ملے گی۔''

''اس کی سزا نہ ماہی کو ملے گی نہ مجھے اس کی سزا تمہیں ملے گی آشتی!'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ حیرانی سے بولی۔

''جواد اب اس دنیا میں نہیں رہا...... وہ مر چکا ہے۔'' میں نے اسے سچ بتا دیا۔ وہ مجھے یوں دیکھنے لگی جیسے اسے میرے الفاظ کی سمجھ نہ آئی ہو۔ میں بتاتا رہا۔

''تمہارے پاس سے نکل کر میں مراد آباد گیا تھا۔ وہاں مجھے پتا چلا کہ وہ اب زندہ نہیں ہے اور وہ مجھے بچاتے ہوئے مرا ہے۔'' میں نے قدرے دکھ سے کہا۔

''پہیلیاں مت بجھواؤ کامران...... صاف صاف بات کرو۔'' اس کی آواز میں لرزش تھی۔ شاید اس نے میرے چہرے کی سنجیدگی سے اندازہ لگا لیا تھا۔

''جواد کو پکڑنے کے بعد چودھری حشمت علی نے اسے اپنی قید میں رکھا تھا۔ وہ ان دنوں میرے معاملے میں الجھے ہوئے تھے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ ملک کے طاقتور لوگ میری رپورٹ پر اتنے ناراض تھے کہ وہ میری جان لے لینا چاہتے تھے۔ اباجی نے پہلے کچھ دن نہ تو ان کی حمایت کی اور نہ ہی میری...... جس کے نتیجے کے طور پر وہ لوگ اباجی سے بھی متنفر ہونے لگے۔ دراصل اباجی ایک ایسا درمیانی راستہ ڈھونڈ رہے تھے جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ آخر کار ...انہیں ایک راستہ مل ہی گیا۔ یہ راستہ انہیں سکندر بخت نے بتایا تھا کہ میری جگہ میرے ڈپلیکیٹ کا استعمال کیا جائے۔ اس شاندار پلان کو سبھی نے قبول کر لیا لیکن دقت یہ تھی کہ میرے ڈپلیکیٹ کا کردار کون نبھائے گا۔ اس کے لیے اباجی نے جواد کو سب کے سامنے پیش کر دیا۔ جواد میرا کزن اور بچپن کا دوست

تھا۔اسے میری ہر عادت اور انداز کا پتا تھا۔اباجی نے اسے سزا دینے کے لیے قیدی بنا رکھا تھا لیکن اب اسے ایک پیش کش کی گئی کہ اسے رہائی مل سکتی ہے اگر وہ ان کے کہنے پر کامران کا کردار ادا کرے۔جواد کے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا۔وہ نہ صرف اباجی کے عتاب سے بچ سکتا تھا بلکہ اس ملک سے باہر بھی جاسکتا تھا۔اس کا خیال تھا کہ کامران کا معاملہ ختم کر کے وہ آزاد ہو جائے گا۔کہیں روپوش ہو کر دوبارہ جواد بن جائے گا اور کبھی پاکستان واپس نہیں آئے گا لیکن یہ اس کی بھول تھی۔اسے علم نہیں تھا کہ جو لوگ اس سے ایسا کام کروا سکتے ہیں، وہ کس حد تک جاسکتے ہیں۔لہٰذا اس نے کامران بن کر وہ سب کچھ کیا جو اس سے کہا گیا۔اس نے میرے سارے پلان کو تباہ و برباد کر دیا اور پھر وہی ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔اسے قتل کر کے خودکشی کا کامیاب ڈراما رچایا گیا تاکہ یہ راز راز ہی رہے۔کسی کو بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ کامران کی جگہ جواد مر گیا ہے۔اباجی خود لندن گئے اور اس کی لاش کو مراد آباد لا کر قبرستان میں دفن کیا۔اس کی قبر پر اب بھی کامران چودھری کے نام کا کتبہ ہے۔''

''تو تم نے ایک دن میں یہ کہانی تیار کی ہے؟'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی تو میں نے ایک ڈسک نکال کر اسے دی۔اس نے بڑی حیرانی سے اس ڈسک کی طرف دیکھا اور پہلی بار اس کا اطمینان اضطراب میں بدلنے لگا۔

''میرے دشمنوں کو اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ جب تک میں یعنی کامران زندہ ہے تب تک یہ معاملہ پوری طرح ختم نہیں ہو سکتا......لیکن میرے اصل وجود کو ختم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ چودھری حشمت علی تھے۔اس لیے اباجی کو جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ نہ صرف کامران بلکہ خود اباجی کی جان کو بھی شدید خطرہ ہے۔میرے دشمنوں خاص طور پر سکندر بخت نے بہت کوشش کی کہ میرا پتا چلایا جاسکے لیکن وہ ناکام رہے پھر انہوں نے اپنی آخری چال چلی کہ انہوں نے اباجی کو ایک حادثے میں قتل کروا دیا تاکہ میں منظر عام پر آسکوں اور وہ مجھے بھی مار سکیں لیکن مجھے اس سے پہلے ہی تم ماہی کے ذریعے وہاں سے نکلوا چکی تھیں۔اباجی کو کسی ایسی ہی صورتِ حال کا ڈر تھا لہٰذا انہوں نے تمام ثبوتوں کے ساتھ اپنا ایک ویڈیو پیغام بھی میرے لیے رکھ چھوڑا تھا جس میں انہوں نے جواد کو کامران بنانے کی پلاسٹک سرجری کے آپریشن کو بھی ریکارڈ کر رکھا تھا تاکہ وقت آنے پر یہ ثابت کیا جاسکے کہ اصل کامران زندہ ہے۔یہ ڈسک اسی ویڈیو کی ایک کاپی ہے۔'' میں نے اسے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

آشتی یک ٹک میری طرف دیکھتی رہی پھر جیسے سب کچھ بھول بھال کر سامنے پڑے ٹی وی ریک کی طرف بڑھ جس کے نچلے خانوں میں سی ڈی پلیئر بھی رکھا ہوا تھا......ا نے ڈسک آن کی اور وہ سب دیکھنے لگی جو میں اسے بتا تھا اور اس لمحے وہ سب کچھ بھول چکی تھی۔یہ بھی کہ کمر میں ''میں'' بھی ہوں۔یہ بھی کہ اس کا پسٹل اس کے ہاتھ سے نیچے قالین پر گر چکا ہے۔ڈسک ختم ہوئی تو وہ......خود فراموشی کی سی کیفیت میں بیٹھی تھی۔اس کی نظریں اب بھی تاریک اسکرین پر جمی ہوئی تھیں......میں اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا......جواد کے ایسے انجام کا مجھے بھی دکھ تھا......اس کی دہری شخصیت کا راز فاش ہونا اور مجھے مارنے کے لیے میری طرف پستول تاننا......یقیناً وہ مناظر مجھے کبھی نہیں بھول سکتے تھے......لیکن ان سب سے پہلے وہ میرا سب سے اچھا دوست بھی تھا۔ہمارا بچپن ایک ساتھ گزرا تھا۔ہم ایک ساتھ کھیتوں میں کھیلے تھے۔ایک ساتھ ٹیوب ویل پر نہاتے تھے ایک ساتھ اسکول جاتے تھے...اور ایک ساتھ ہی جوان ہوئے تھے اور کیسی عجیب بات تھی کہ ہمیں محبت بھی ایک ہی لڑکی سے ہوئی۔مجھے نئی زندگی اس کی وجہ سے ملی اور اسے موت میرے نام سے ملی۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں ان ہیروں کے بارے میں کچھ معلومات نہیں لا سکا۔'' میں نے خاموشی کو توڑتے ہوئے آہستگی سے کہا تو آشتی نے چونک کر میری طرف یوں دیکھا جیسے وہ یہ بھول ہی گئی تھی کہ اس کمرے میں، میں بھی موجود ہوں۔اس کی نم آنکھوں میں پہلے مجھے حیرانی ہی حیرانی نظر آئی پھر وہ حیرانی ایک ہیجان میں بدلتی چلی گئی۔

''تو پھر......تم یہاں کیا لینے آ گئے کامران چودھری......جب تمہیں ہیروں کا پتا ہی نہیں چلا تو تم یہاں کیوں آ گئے؟'' وہ بلند آواز میں بڑبڑائی اور پھر اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات پھیلتے چلے گئے۔''کیا سمجھتے ہو تم کہ ان ہیروں کے بغیر میں تمہیں تمہاری ماہی لوٹا دوں گی......ہرگز نہیں......اگر مجھے میرے ہیرے نہیں ملے تو میں......تو میں ماہی کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گی۔تم کیا سمجھتے ہو......میں......میں اسے واقعی مار دوں گی۔'' وہ اس زور سے چلائی کہ اس کے حلق میں خراشیں سی پڑ گئیں۔اس نے یک لخت جھک کر اپنا پسٹل اٹھایا، میں اس کی طرف لپکا ہی تھا کہ اس نے ذرا سا جھک کے مجھے لفٹ کیا اور بیڈ پر اچھال دیا......جب تک میں اٹھ کر کھڑا ہوا، وہ کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ماہی اگر

اس عمارت میں تھی تو اس کی جان کو شدید خطرہ تھا۔ میں آشتی کے پیچھے بھاگا۔ وہ کوریڈور کے آخری دروازے پر ایک لمحے کے لیے نظر آئی اور پھر..... اندر داخل ہوگئی۔ میں جب دروازے پر پہنچا تو میں نے ماہی کو بیڈ پر نیم دراز لیٹے دیکھا۔ آشتی نے اس کی پیشانی پر پسٹل رکھا ہوا تھا۔ ماہی کا چہرہ دھواں دھواں ہورہا تھا۔

''آشتی! یہ..... یہ تم کیا کررہی ہو؟'' وہ ہکلاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''آشتی! خدا کے لیے رک جاؤ..... میری بات سنو۔'' میں نے اسے پچکارا۔

''وہیں کھڑے رہو کامران..... ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو میں ٹریگر دبادوں گی۔'' وہ جنونی انداز میں چلائی۔ میں وہیں رک گیا۔ میرے اور اس کے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ میں صرف ایک جست میں اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ واقعی پاگل ہورہی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہوچکا تھا۔

''کیا کہہ رہے تھے تم... کہ تم میرے ہیرے نہیں لاسکے؟ تم مجھے بے وقوف نہیں بناسکتے کامران! میں جانتی ہوں کہ ہیرے تمہارے پاس ہیں۔ مجھے ہیرے دے دو ورنہ میں ماہی کو ختم کردوں گی۔'' وہ غرائی۔

''آشتی! تم ہم پر گولی چلاؤ گی؟'' ماہی نے جیسے صدمے کی سی کیفیت میں پوچھا۔

''ہاں..... میں تمہیں بھی مارسکتی ہوں اور کامران کو بھی۔ یہ صحافی ہے۔ لوگوں کے اندر تک کی خبر اسے رہتی ہے۔ یہ جانتا ہے کہ میں کون ہوں۔ یہ سب جانتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میں ایک طوائف کی بیٹی ہوں اور ساری دنیا نیست و نابود ہوسکتی ہے لیکن ایک طوائف کبھی محبت نہیں کرسکتی۔ اس کے دل میں صرف ہوس ہوتی ہے..... پیسے کی ہوس..... مجھ میں بھی وہی ہوس ہے۔ میں بھی ہیروں سے پیار کرتی ہوں۔ جواد مرگیا سو مرگیا بھاڑ میں جائے وہ۔ مجھے میرے ہیرے چاہئیں۔ بتاؤ کہاں ہیں میرے ہیرے..... بتاؤ۔'' وہ چلا رہی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرتی جارہی تھیں۔ اسے ادراک نہیں تھا کہ اس کی نگاہ دھندلا رہی تھی۔ وہ بس ایک جنونی..... سی کیفیت میں اناپ شناپ بکے جارہی تھی۔ میں اسے باتوں میں لگا کر نامحسوس انداز سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا پھر میں ایک جست لگا کر اس تک پہنچا لیکن وہ مجھ سے تیز نکلی۔ اس کی اسٹریٹ کک نے مجھے واپس وہیں دھکیل دیا جہاں سے میں نے چھلانگ لگائی تھی۔ وہ ماہی کو چھوڑ کر میری طرف لپکی۔ میں کھڑا

امیر ترین

دو بچے ایک دوسرے پر اپنے اپنے والد کے زیادہ امیر ہونے کا رعب ڈالنے کی کوشش کررہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر دلیلیں دے رہے تھے۔ آخر میں ایک بچہ بولا۔ ''میرے ابو اس لیے بھی تمہارے ابو سے زیادہ امیر ہیں کہ وہ ہر مہینے تمہارے ابو سے زیادہ چیزوں کی قسطیں دیتے ہیں۔''

(مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال)

شگوفے

بچپن میں ماں باپ ڈرتے تھے مینڈک کو پتھر مارا تو گونگی بیوی ملے گی۔ بہت ڈر لگتا تھا۔ اب سوچتے ہیں پتھر مار ہی دیا ہوتا.....!

☆☆☆

ایک صاحب حج کرکے آئے تو سیدھے اپنے محلے کی دکان پر گئے اور دکاندار کو کہا کہ میرا کھاتا نکالو۔ دکاندار خوش ہوگیا کہ شاید اس کے تین سال کا ادھار ملنے والا ہے۔ جونہی اس نے کھاتا کھولا تو ان صاحب نے کہا۔ ''میرے نام کے ساتھ حاجی لکھ دو۔''

(مرسلہ: راحیلہ شفیق۔ سندھی ہوٹل، نیو کراچی)

ہی ہوا تھا کہ اس کا پسٹل میرا نشانہ لے چکا تھا۔ ایک لمحے کو مجھے لگا کہ وہ مجھے شوٹ کردے گی لیکن تبھی اچانک وہ ہوا جس کے بارے میں، میں تو کیا آشتی بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ ماہی بجلی کی سی سرعت کے ساتھ میرے اور اس کے درمیان آکھڑی ہوئی۔

''تم مارو گی ہمیں..... اچھا تو چلو مارو..... چلاؤ گولی..... ہم بھی دیکھتے ہیں کہ تم یہ کیسے کرتی ہو..... چلاؤ گولی۔'' ماہی نے بلند آواز سے کہا۔ میں نے دیکھا آشتی کا پسٹل والا ہاتھ لرز رہا تھا۔ ماہی نے اس کا لرزتا ہاتھ تھاما اور پسٹل کی نال اپنی پیشانی سے لگا دی۔ ''لو اب چلاؤ۔ تمہارا نشانہ نہیں چوکے گا..... دباؤ ٹریگر۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تمہارے لیے کسی کی جان لینا اتنا آسان کیسے ہے۔ خاص کر ان کی جان لینا جو تم سے پیار کرتے ہیں۔'' ماہی کے اس فقرے نے مجھے بھی چونکا دیا۔ یہ فقرہ بتاتا تھا کہ وہ آشتی کی حقیقت سے آشنا تھی اور شاید یہ بھی جانتی تھی کہ آشتی ہی وہ لڑکی ہے جس سے میں نے محبت کی تھی۔

''اب کیوں پیچھے ہٹ رہی ہو۔ ہم تمہارا کام آسان کر دیتے ہیں۔'' اس کے بعد ماہی نے وہ کیا جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ٹریگر پر رکھی آشتی کی انگلی پر اپنی انگلی رکھ دی اور اسے دبانے لگی۔ آشتی نے بے اختیار اسے دھکا دے کر پسٹل چھڑایا اور پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر بیڈ پر گر گئی۔ اس کا ہچکولے کھاتا جسم اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ وہ رو رہی تھی۔ ماہی جو ابھی کسی مضبوط دیوار کی طرح میرے سامنے کھڑی تھی، اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھتی چلی گئی۔ اس نے آشتی کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''تم کیوں ایسی بن رہی ہو جو تم نہیں ہو...... کیوں تم نے اپنے چہرے پر اتنے چہرے لگا رکھے ہیں کہ تمہارا اصل چہرہ غائب ہی ہو کر رہ گیا ہے۔'' ماہی اس سے کہہ رہی تھی۔ ''انسان جیسا اندر سے ہوتا ہے اسے باہر سے بھی ویسا ہی ہونا چاہیے اور میں جانتی ہوں کہ تم اندر سے کتنی اچھی ہو...... کتنی خوبصورت اور کتنی معصوم ہو۔ لوگ تمہیں اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تم انہیں بتاتی ہو لیکن میں نے ہمیشہ تمہارے اندر جھانک کر تمہیں پہچانا ہے۔ تم وہ نہیں ہو جو بن گئی ہو۔ تم وہ بھی نہیں ہو جو بننے کی کوشش کرتی ہو۔ آشتی میں جانتی ہوں کہ تمہارا دل بھی چاہتا ہے کہ تمہارے ہاتھ میں پستول نہیں پھول ہوں...... تمہارے چہرے پر کسی اور کا چہرہ نہیں تمہارا اصل چہرہ ہو...... تم محبت کرتی ہو جواد سے...... محبت کرنے والے تو کسی کی جان نہیں لیتے۔''

''جواد مر گیا ماہی! میرا جواد...... نہیں رہا۔'' آشتی بلک اٹھی۔ ''میں بہت بُری ہوں۔ میں نے تم لوگوں کے ساتھ بہت برا کیا۔ میں نے کامی کا دل توڑا۔ بدلے میں خدا نے مجھ سے جواد کی محبت چھین لی۔ وہ نفرت کرنے لگا تھا مجھ سے...... شک کرنے لگا تھا کہ میں اس سے نہیں اس کے ہیروں سے پیار کرتی ہوں لیکن یہ سچ نہیں...... میں قسم کھا کر کہتی ہوں یہ سچ نہیں۔''

ماہی نے اسے گلے سے لگا لیا اور تبھی خود سے جدا کیا جب خوب رو چکنے کے بعد وہ پُرسکون ہونے لگی تھی۔

اس دوران میں، میں خاموشی سے ایک طرف کھڑا رہا، انہیں دیکھتا رہا پھر آشتی نے خود کو سنبھالا اور ماہی کو ہلکا سا دھکا دیتے ہوئے بولی۔

''جاؤ کامی! لے جاؤ اپنی ماہی کو......'' آشتی نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''صرف ہم نہیں، تم بھی ہمارے ساتھ چل رہی ہو۔ چلو اٹھو۔ بہت رو لیں تم......'' ماہی اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہنے لگی۔

''تم دونوں چلے جاؤ یہاں سے...... مجھے کہیں نہیں جانا۔'' وہ نڈھال سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''یہ پسٹل ہمیں دو۔'' ماہی نے اس کے ہاتھ سے پسٹل لیا اور پھر اس کا نشانہ لیتے ہوئے بولی۔ ''ہم تمہیں گن پوائنٹ پر بھی ساتھ لے جا سکتے ہیں...... چلو اٹھو۔''

''تم واقعی سب سے بڑی پاگل ہو۔'' آشتی اس کے انداز پر ہنس پڑی اور پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''تمہارے لیے واقعی ایسی ہی لڑکی ہونی چاہیے تھی...... مجھے یقین ہے یہ تمہارے سارے کس بل سیدھے کر دے گی۔'' اس بات پر ماہی کا چہرہ سرخ پڑ گیا لیکن وہ بضد رہی۔

''ہم تمہیں ساتھ لیے بغیر نہیں جائیں گے......''

''دیکھو ماہی...... ابھی تم کامران کے ساتھ جاؤ۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ ایک بار گاؤں آ کر تم سے ضرور ملوں گی لیکن فی الحال نہیں۔ مجھے کچھ دن اکیلا رہنا ہے۔ خود کو سنبھالنا ہے۔''

''تمہارا کوئی بہانہ میرے آگے چلنے والا نہیں۔'' ماہی نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ آشتی نے بیچارگی سے میری طرف دیکھا۔

''پلیز کامران! اسے لے جاؤ۔ میں ابھی بہت پریشان ہوں...... مجھے تنہائی چاہیے...... پلیز۔''

''لیکن اس طرح پریشانیاں کم تو نہیں ہوں گی۔'' میں نے کہا۔ ''دیکھو قدرت نے تمہیں ایک نئی زندگی دی ہے۔ جو لوگ تمہارے مجرمانہ پس منظر سے واقف تھے، ان میں سے کوئی بھی نہیں رہا۔ اپنے گھر والوں کے ساتھ تم ایک نئی زندگی شروع کر سکتی ہو۔ تم ایک مضبوط اور ہمت والی لڑکی ہو۔ تم اب اپنی بہنوں کو سنبھال سکتی ہو۔ یوں تنہائی میں بیٹھ کر سوچنے سے تمہیں سوائے پریشانی کے اور کچھ حاصل نہیں ہو گا۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو کامران! تم ہمیشہ سے ہی ٹھیک کہتے تھے...... میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ اب میں اپنی بہنوں کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کروں اور مجھے اسی بارے میں سوچنا ہے۔ مجھے سب سے دور تنہا ہو کر کچھ فیصلے کرنے ہیں...... پلیز۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں ماہی کی بات پر اس لیے اصرار کر رہا تھا کہ مجھے ڈر تھا کہیں یہ جذباتی لڑکی خود کو کوئی نقصان نہ پہنچا لے لیکن اب مجھے اس کے لہجے کی مضبوطی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ خود کو سنبھال چکی ہے۔ میں ماہی کو ساتھ لے کر کمرے سے نکل آیا۔ آشتی ہمیں گیٹ تک چھوڑنے کے لیے ساتھ آ رہی تھی۔ نیچے ڈرائنگ روم والا بندہ

ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔ ہم برآمدے سے باہر نکل آئے تو آشتی بولی۔

''گیراج میں ایک ہنڈا سوک کھڑی ہے۔ تم اسے اسٹارٹ کر کے باہر لے آؤ، میں گیٹ کھولتی ہوں۔'' میری گاڑی تو باہر کچھ دور کھڑی تھی لہٰذا میں گیراج کی طرف آ گیا۔ گاڑی میں چابی موجود تھی۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہیڈ لائٹس روشن کر دیں۔ تیز روشنی میں مجھے آشتی گیٹ دھکیلتی ہوئی نظر آئی۔ دونوں پٹ کھول دینے کے بعد اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا کہ میں گاڑی باہر لے آؤں۔ میں نے دو تین دفعہ ریس دے کر گیئر لگایا اور کلچ دباتے ہوئے ایکسلریٹر کو دبانے لگا لیکن ابھی گاڑی کے پہیے آہستہ سے حرکت میں آئے ہی تھے کہ وہ ہو گیا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ایک دھماکا ہوا۔ یہ پسٹل کے فائر کا دھماکا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں میں نے آشتی کو لہرا کر زمین پر گرتے دیکھا۔ میں یوں ساکت ہو گیا جیسے اس منظر کے ''ہونے'' کا یقین نہ ہو رہا ہو۔ تیز روشنی میں گیٹ کے باہر سے کوئی اچھل کر اندر داخل ہوا۔ وہ سلطان تھا جسے میں مراد آباد سے اپنے ساتھ لایا تھا اور اسے باہر بٹھا کر آیا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ میرے سامنے ابھی ابھی جو کچھ ہوا ہے وہ میرا وہم نہیں حقیقت ہے۔ پھر میرے کانوں میں ایک تیز چیخ گونجی۔ یہ ماہی کی چیخ تھی جو برآمدے سے نکل کر آشتی کی طرف بھاگتی جا رہی تھی۔ سلطان نے بے اختیار اس کی طرف بھی پسٹل اٹھا دیا۔ ایک لمحے کو میرا دل ڈوب سا گیا۔ میں گاڑی سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ چیخ کر سلطان کو روکنا چاہتا تھا لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ یہ منٹوں سیکنڈوں کا نہیں بلکہ ایک لمحے کا کھیل تھا اور وہ کوئی قسمت والا لمحہ ہی تھا جب اسٹیئرنگ پر رکھے ہاتھ میرے اعصابی دباؤ کی وجہ سے ہلے اور گاڑی کا تیز ہارن گونج اٹھا...... اور وہ لمحہ بے آواز گزر گیا جس میں فائر کی ایک اور آواز گونجی تھی۔ سلطان کے پستول کا رخ اب گاڑی کی طرف تھا۔ میں نے اپنی ساری طاقت یکجا کی اور گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ سلطان مجھے دیکھ کر چونک گیا اور پھر بھاگتا ہوا میری جانب آیا۔

''چھوٹے چودھری جی آپ ٹھیک تو ہیں۔'' وہ پوچھتا ہوا میرے قریب آ گیا۔ نفرت کی لہر میں، میں نے جو مکا اسے مارا اس میں جھنجلاہٹ اور بے بسی کے ساتھ غصہ بھی شامل تھا۔ وہ لڑکھڑا کر گاڑی سے ٹکرایا اور ناک آؤٹ ہو کر زمین پر گر گیا۔ گیٹ کے قریب ماہی آشتی کا سر گود میں رکھے اونچی آواز میں رو رہی تھی۔ میں نے قریب پہنچ کر آشتی کو دیکھا۔ پسٹل کی گولی اس کی پیشانی میں گھس کر سر کے عقبی حصے کو پھاڑتے ہوئے باہر نکل گئی تھی۔ اس کا چہرہ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ وہ مر چکی تھی۔ میری ایک چھوٹی سی بھول نے اسے نئی زندگی شروع ہونے سے پہلے ہی موت کی طرف دھکیل دیا۔ میں بت بنا اسے دیکھتا رہا جسے ایسا بے جان دیکھنے کا تصور بھی میں نے کبھی نہیں کیا تھا۔ محبت میں پہلا یا دوسرا نہیں ہوتا...... محبت یا تو ہوتی ہے یا پھر نہیں ہوتی۔ ہاں جس سے ایک بار ہو جائے پھر اس سے کبھی ختم نہیں ہوتی، چاہے اس کے دامن میں آپ کے لیے چاہت کا ایک لمحہ بھی نہ ہو...... اور میرے لیے دکھ اس لیے بھی شدید تھا کہ وہ اب سب کچھ چھوڑ کر ایک نئی زندگی بسر کرنے جا رہی تھی۔ انسان اچھا ہو یا برا، اس کے انجام کا فیصلہ وہ راستہ کرتا ہے جس پر وہ چل رہا ہو۔ آشتی نے کچھ دیر پہلے ہی اپنا راستہ بدلنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر اس فیصلے سے باہر گھات لگائے بیٹھا سلطان واقف نہیں تھا۔ اس نے آشتی کو دیکھ کر یہ سمجھا ہوگا کہ شاید میں اندر کسی مشکل میں پھنس گیا ہوں اور یہی وہ موقع تھا جس میں وہ اپنی وفاداری ثابت کر سکتا تھا۔ یہ میری غلطی تھی یا آشتی کی بدقسمتی...... حقیقت تو صرف یہی تھی کہ وہ اب نہیں رہی تھی۔

''تیرگی میں جل اٹھے...... روشنی میں بجھ گئے...... کیا عجیب لوگ تھے...... درد جھیلتے رہے...... اور...... خوشی میں مر گئے۔''

ماہی مسلسل روئے جا رہی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ ہمیں صبح ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے نکلنا ہوگا۔ آشتی کی لاش کو ایک چادر میں لپیٹ کر میں نے سوک کی پچھلی سیٹوں پر رکھ دیا۔

میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور ماہی میرے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھ گئی۔ شہر والا پل کراس کر کے ہم پاکپتن والے روڈ پر نکل آئے جہاں اس وقت ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔

گاڑی کی خاموشی میں ماہی کی ''سوں سوں'' گونج رہی تھی...... اور میرے اندر کے سناٹے میں بھی کوئی چیخنا چاہتا تھا...... چلانا چاہتا تھا...... اپنے آنسو بہا دینا چاہتا تھا...... لیکن میں ضبط کیے خاموش بیٹھا رہا۔

''تمہیں آشتی کی حقیقت پہلے سے معلوم تھی؟'' میں نے پوچھا تو وہ بھیگے ہوئے لہجے میں بولی۔

''پہلے پہل نہیں...... پھر ایک دن ہم نے اس کے پاس وہی ہیئر کلپ دیکھا جو آپ مجھ سے یہ کہہ کر واپس لے گئے تھے کہ یہ ہمارے لیے نہیں ہے، تب ہمیں اس کے بارے میں جاننا ہی پڑا۔'' وہ رکی اور ایک توقف کے بعد بولی۔

''آشتی باہر سے جتنی سخت تھی وہ اندر سے اتنی ہی نازک اور کمزور بھی جتنی کہ ایک لڑکی ہوسکتی ہے۔بس حالات نے اس پر ایک سخت خول چڑھا دیا تھا۔ہم نے اس کا یہ سخت خول توڑنے کی ٹھانی اور ہمیں یقین تھا کہ ہم کامیاب ہوجائیں گے۔وہ ایک نارمل زندگی گزارنا چاہتی تھی اور اب جبکہ وہ فیصلہ بھی کر چکی تھی تو......تو یہ سب......'' اس نے ڈیش بورڈ پر رکھے ٹشو پیپر کے ڈبے سے ایک سافٹ پیپر کھینچا اور آنکھوں پر رکھ لیا۔

میں نے ماہی کی طرف دیکھا اور اگلے ہی پل میں نے پوری قوت سے بریک لگا دیے۔تیز چرچراہٹ کی آواز نکالتے ہوئے گاڑی کے ٹائر جیسے سڑک سے چپک کر رہ گئے۔ماہی کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرا گیا۔ایک ہلکی سی چیخ مار کر وہ اپنا ماتھا رگڑتے ہوئے مجھے ناراضی سے دیکھنے لگی لیکن میری نظریں اس کے بالوں پر ٹکی تھیں جہاں سفید پھولوں والا ہیئر کلپ لگا ہوا تھا۔میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اتار لیا۔

''یہ تمہارے پاس کیسے آیا؟''

''کل رات آشتی نے دیا تھا۔اس نے کہا تھا کہ بہت جلد تمہیں کامران لینے آئے گا پھر تم اس کے ساتھ گاؤں چلی جاؤ گی۔ہوسکتا ہے پھر ہماری ملاقات ہونہ ہو۔اس لیے میری طرف سے یہ تمہارے لیے تحفہ ہے۔'' ماہی کہہ رہی تھی اور میں بے یقینی کے سے عالم میں اس ہیئر کلپ کو تک رہا تھا پھر میں نے اس کے میکنزم کے ذریعے اسے کھولا اور ہتھیلی پر انڈیلا۔جگمگ جگمگ کرتے ہیرے میری ہتھیلی پر آ گئے۔یہ اصلی ہیرے تھے۔

''یہ کیا ہے......یہ تو ہیرے ہیں......کامی!'' ماہی کی روئی روئی سی آنکھیں ایک دم پھیل گئیں اور میں سوچ رہا تھا کہ آشتی نے جان بوجھ کر یہ ہیرے ماہی کو دیے ہیں کہ غلطی سے......؟ پھر ذہن میں آشتی کی وہ جنونی کیفیت ابھری جب میں نے اسے بتایا تھا کہ جواد نہیں رہا تو وہ رونے لگی لیکن جب میں نے اسے یہ بتایا کہ مجھے ہیروں کا پتا نہیں تو وہ غصے میں آ گئی تھی۔اس نے مجھے ماہی کے بدلے جواد کو لانے کا کہا تھا۔اس کا مطلب تھا کہ ہیرے جواد کے پاس نہیں بلکہ آشتی کے ہی پاس تھے اور وہ واقعی جواد سے محبت کرتی تھی۔

اور ہوسکتا ہے یہ سچ ہو کہ جواد اب اس پر اعتبار نہیں کرتا تھا......لیکن آشتی پھر بھی جواد کے لیے یہاں آئی تھی۔

''یہ سب کیا ہے کامی؟'' ماہی نے میری محویت کو توڑا۔

''یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ آشتی نے جواد سے سچی محبت کی تھی۔'' میں نے خوابناک لہجے میں کہا۔''اور اس بات کا کہ وہ پہلے سے ہی فیصلہ کر چکی تھی کہ اپنا راستہ بدل لے گی۔''

میں نے ہیرے ماہی کے ہاتھ پر رکھ دیے اور گاڑی دوبارہ آگے بڑھا دی۔میں ماہی کو سپر ایکسپریس سے شروع ہونے والی ''ہیرو، ہیروئن اور ہیروں'' کی یہ کہانی سنانے لگا۔ماہی حیرانی اور تاسف سے سب کچھ سنتی رہی۔جب میں خاموش ہوا تب تک ہمارے سامنے افق پر سے صبح کا سویرا ہویدا ہونے لگا تھا۔

نہر کا پل کراس کرتے ہوئے ماہی نے اچانک مجھ سے پوچھا۔''ان ہیروں کا کیا کریں گے؟''

''ابھی سوچا نہیں......'' میں نے جواب دیا تو وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

''لیکن ہم نے سوچ لیا ہے......گاڑی روکیے۔'' میں نے بریک لگا دیے۔

''ان کے منہ کو انسانی خون لگ گیا ہے کامی!'' وہ اپنی ہتھیلی پر جگمگاتے ہیروں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔''یہ ہیرے کسی اور کی جان لیں اس سے پہلے انہیں ہی ختم کر دیتے ہیں۔''

اس نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا اور مٹھی میں دبے درجنوں ہیرے نہر کے بہتے ہوئے پانی میں اچھال دیے۔میں حیرانی سے اس کی اس حرکت کو دیکھتا رہا۔ہیرے پھینک کر اس نے پُرسکون انداز میں میری طرف دیکھا تو میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

آشتی کو ہم نے مراد آباد کے قبرستان میں جواد کی اس قبر کے ساتھ دفنایا تھا جس کے کتبے پر کامران چودھری لکھا تھا۔اباجی کے چالیسویں تک میں حویلی میں ہی مصروف رہا......لیکن میری موجودگی کو مراد آباد تک ہی محدود رکھا گیا۔

اور پھر میں حرکت میں آ گیا۔اپنے تمام تر ثبوتوں کو یکجا کر کے میں نے اس بار آخری وار کی حکمت عملی بنائی۔پرنٹ میڈیا سے زیادہ اس وقت الیکٹرونک میڈیا ترقی کر رہا تھا اور یہ میرے لیے بے حد مفید بات تھی۔ملک کے نامور چینلز کو مراد آباد میں دعوت دے کر میں نے ایک دھماکے دار پریس کانفرس کی۔میرا زندہ ہونا ہی ایک بریکنگ نیوز بن گئی تھی۔میں نے اس پریس کانفرنس میں ان سرکاری افسران کا کچا چٹھا کھول دیا جو اس ساری سازش میں ملوث تھے۔میں نے چودھری حشمت علی کی آخری ویڈیو ٹیپ کو بھی ٹی وی چینلز کے حوالے کر دیا۔ایک طرح سے میں نے اپنا معاملہ عوام کے سپرد کر دیا اور اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔میڈیا کی ہمدردیاں میرے ساتھ تھیں۔ان کی

فل کورٹ بیج کے بعد نہ صرف سپریم کورٹ نے میرا کیس ری اوپن کر دیا بلکہ حکومت کو بھی اپنے پسندیدہ افسروں کے خلاف کارروائی کرنی پڑی۔ نسیم اطہر سمیت کئی افسران کو معطل کر کے انکوائری شروع کر دی گئی۔ اگر حالات دوسرے ہوتے تو یہ انکوائری بھی سالوں جاری رہنے کے بعد دبا دی جاتی اور ان افسران کو صرف عہدے بدل کر نئی جگہوں پر تعینات کر دیا جاتا لیکن اس بار میڈیا کی وجہ سے اس معاملے کو اتنا اچھالا گیا کہ اس کیس کا فیصلہ چند ماہ میں ہی مکمل کر دیا گیا۔ سپریم کورٹ نے تمام ملزمان کو مجرم قرار دیتے ہوئے سزائیں سنا دیں۔ اس بار سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسا میں چاہتا تھا۔ صرف ایک آدمی باقی رہ گیا تھا...... سکندر بخت۔ میرے پاس اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔ نقلی کامران کا سارا پلان اسی ایک بندے کا تھا اور یہ پلان ایک ویڈیو میں محفوظ بھی تھا لیکن صرف اس ایک ثبوت کی بنا پر سکندر بخت جیسے بندے کا کچھ بگاڑا نہیں جا سکتا تھا۔

ماہی سے میری شادی ہو چکی تھی۔ حویلی کے دوسرے پورشن میں جہاں کبھی جواد رہتا تھا، اب وہاں آشتی کی بہنیں اور بوڑھی ماں تھی جنہیں ماہی خود لائی تھی۔ مراد آباد میں میری دستار بندی کی جا چکی تھی۔ وڈے کمرے کے تخت پر میں روز بیٹھا کرتا تھا۔ علاقے کے وہ سارے سرکاری افسر جو چودھری حشمت علی کے دستِ سایہ اپنے اپنے غیر قانونی کاموں میں ملوث تھے مجھ سے ملنے کے لیے آئے اور اپنی تمام تر وفاداریاں میرے سپرد کرنے کی کوششیں کیں لیکن انہیں اندازہ ہو گیا کہ میں ان کی توقعات پر کبھی بھی پورا نہیں اتر سکوں گا۔ نوادارت کی اسمگلنگ تو اسی وقت بند ہو گئی تھی۔ میں نے غیر قانونی طور پر قبضے میں رکھی گئی سیکڑوں ایکڑ زمین کو حکومت کے حوالے کر دیا۔ بعد میں میری ہی کوششوں کے نتیجے میں ان کے مالکانہ حقوق ان مزارعوں کے نام کر دیے گئے جو سالوں سے ان پر کاشتکاری کر رہے تھے۔

میں نے صرف اسی بات پر اکتفا نہیں کیا۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ اگر مجھے کرپٹ سسٹم اور اس کے کارندوں کے خلاف اپنی جنگ جاری رکھنی ہے تو اب میدان بدلنا ہوگا۔ اس سسٹم کو باہر سے جتنی ضربیں لگا سکتا تھا لگا چکا تھا۔ اب اسے اندر سے ضرب لگانے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میں نے باقاعدہ طور پر سیاست میں حصہ لیا۔ میں نوادرات اسکینڈل کا مشہور و معروف کردار ہی نہیں بلکہ چودھری حشمت علی کا بیٹا بھی تھا۔ ملک کی طاقتور پارٹیوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور میں نے اس پارٹی کو جوائن کر لیا جو اس بار کے الیکشن میں یقینی نظر آ رہی تھی۔ الیکشن سے پہلے ہی میں نے پارٹی میں اپنی جگہ اور ساکھ اس طرح بنا لی کہ جب ہماری پارٹی گورنمنٹ میں آئی تو مجھے بڑے آرام سے وزیر اعلیٰ کا منصب مل گیا جو کہ میں چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں اب بھی آزادانہ طور پر بہت سے کام نہیں کر سکتا لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا میں اتنا اونچا ضرور اڑتا ہوں جتنا میرے پنکھ مجھے اجازت دیتے ہیں۔ اس لیے جہاں تک ہو سکتا ہے میں اس فرسودہ نظام کو جکڑنے والے کرپٹ افسران کے خلاف کام کیے جا رہا ہوں...... اور آگے بھی مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔

ایک روز مجھے سکندر بخت سے ملاقات کا موقع مل گیا اور میں اس مخصوص بنگلے کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ جیسے ہی میں گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا، ایک نوجوان تیزی سے میری طرف آیا۔ اس نے خاموشی سے ایک سیاہ پستول میرے حوالے کر دیا اور خود گیٹ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں نے پستول جیب میں ڈالا اور سیدھی روش پر چلتا ہوا پورچ تک پہنچا اور وہاں سے برآمدے میں بنے بڑے سے دروازے کو کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ لاؤنج میں نیم تاریکی تھی اور اس تاریکی میں دھوئیں اور سگار کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ کریم کلر کے صوفے پر بیٹھا مجھے ہی گھور رہا تھا۔ ایک لمحے کو میں اسے پہچان نہ سکا۔ یہ وہ شخص تھا جس کے لباس، انداز، تاثرات اور گفتگو میں نفاست ہی نفاست جھلکتی تھی...... لیکن اس وقت اس کے بدن پر مسلا ہوا لباس شاید کئی دن پرانا تھا۔ شیو بڑھی ہوئی اور سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں یوں سرخ تھیں جیسے کبوتر کے خون سے تر کی گئی ہوں۔ پپوٹے یوں پھولے ہوئے تھے جیسے کئی راتوں سے سو نہیں سکا ہو۔ یہ سکندر بخت تھا...... ایکس فارن منسٹر۔ میں اس پر ایک نظر ڈالتا ہوا سامنے کے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ جما کر بیٹھ گیا۔

"کیا چاہتے ہو تم مجھ سے......؟" وہ لڑکھڑاتی آواز میں غرایا۔

"تمہارے پاس بچا ہی کیا ہے؟" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"سچ کہتے ہو تم...... میرے پاس اب کچھ بھی نہیں بچا۔ سب کچھ تم نے مجھ سے چھین لیا ہے۔"

"تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ موت دو طرح کی ہوتی ہے ایک وہ جس میں بندہ سچ مچ مرجائے اور دوسری وہ جس میں بندہ دوسروں کی نظروں میں مرجاتا ہے...... تم نے مجھے

دوسروں کی نظروں سے گرانا چاہا تھا اس لیے میں نے تمہیں تمہارا یہی تحفہ واپس کر کے حساب برابر کر دیا ہے۔''

''میری نوکری گئی...... عزت گئی...... بیوی بچے گئے...... مجرموں کی طرح سیکیورٹی اداروں سے چھپ رہا ہوں۔ دیکھو تم نے میرا کیا حال کر دیا ہے۔ یہ سزا میرے جرائم سے بہت بڑی ہے کامران...... لوگ کیا کچھ کرنے کے بعد بچ نکلتے ہیں۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا تھا۔'' وہ نڈھال سے لہجے میں بولا۔

''جو تمہارے لیے کچھ بھی نہیں تھا، وہ کسی اور کے لیے بہت کچھ تھا سکندر بخت۔'' میں نے غرا کر کہا۔ ''اگر میں قانون کے دائروں سے باہر نکل کر تمہارا مقابلہ کرتا تو تم سب کا ایسا حشر کرتا کہ دنیا یاد رکھتی لیکن میں تو صرف ایک بات باور کروانا چاہتا تھا کہ قوانین بُرے نہیں ہوتے...... وہ انسان غلط ہوتے ہیں جو ان قوانین کو استعمال کرتے ہیں۔ میں تو صرف دنیا کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ جس سسٹم کو ہم اور باقی دنیا کرپٹ سسٹم کہتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بے جان سسٹم کے تم جیسے جاندار آپریٹر کرپٹ ہیں۔ تم لوگوں نے میرے ساتھ جو کچھ بھی کیا، وہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مجھے اپنے ساتھ ہونے والے سلوک کا پہلے سے اندازہ تھا لیکن ایک یقین مجھے تم سب سے بڑھ کر یہ تھا کہ چاہے مجھے جتنا بھی گرایا جائے، چاہے مجھے جتنی بھی شکست ملے...... آخرکار فتح میری ہوگی۔ سنو سکندر بخت! میرے پاس ایسے کئی ثبوت ہیں جن کی بنا پر تم اس کی سزائیں بھگتتے بھگتتے مر جاؤ گے لیکن میں تمہارے منہ سے ایک ایسا جرم سننا چاہتا ہوں جسے تم جرم ہی نہیں سمجھتے...... اقرار کر لو کہ چودھری حشمت علی کا قتل تمہارے حکم سے ہوا تھا۔''

وہ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر اس نے جیسے شکست مان لی ہو۔ ''ہاں، حشمت علی کا قتل میرے ہی حکم سے ہوا تھا۔''

میری رگوں میں دوڑتا خون جیسے لاوا بن گیا۔ میں نے بے اختیار اٹھ کر اسے گریبان سے پکڑ لیا۔ اس کی آنکھوں میں خوف ابھر آیا لیکن میں نے خود کو سنبھالا اور اسے دوبارہ صوفے پر دھکیل دیا۔ میں نے اپنی آنکھوں کی نمی کو صاف کیا۔

''تم نہیں جانتے کہ تم نے کیا کیا...... لیکن تمہارے لیے میرے دل میں اب کوئی رحم نہیں ہے۔ البتہ میں صرف ایک رعایت تمہارے ساتھ کر سکتا ہوں اور وہ یہ کہ تمہارا آخری فیصلہ میں تم پر ہی چھوڑ دیتا ہوں۔''

یہ کہہ کر میں نے جیب سے پسٹل نکالا اور اس کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ جس وقت میں گیٹ کھول کر باہر نکل رہا تھا، اندر سے فائر کی آواز سنائی دی۔ میں نے ایک ثانیے کو مڑ کر اس کوٹھی کی طرف دیکھا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

ہماری سیاست کٹھ پتلیوں کا ایک تماشا ہے جس میں ہر پتلی اس ڈوری سے حرکت کرتی ہے جو کسی اور کے ہاتھ میں ہوتی ہے...... یہاں زندہ اور آزاد پتلیوں کا کوئی کام نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میرے پاس وقت کم ہے لیکن میری یہی کوشش ہے کہ اس کم وقت میں، میں اس نظام کو بہتر بنا سکوں۔ بات اچھے برے کام کی نہیں اچھی بری نیت کی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک شہر میں خوفناک آگ بھڑک اٹھی۔ ایک چھوٹی سی چڑیا اپنی چونچ میں پانی کے چند قطرے لے کر آئی اور اس آگ میں ڈالنے لگی۔ ایک اور پرندے نے یہ دیکھا تو کہنے لگا۔ ''تم یہ کیوں کر رہی ہو؟ کیا یہ چند قطرے اس آگ کو بجھا پائیں گے؟'' چڑیا بولی۔ ''میں جانتی ہوں کہ ان چند قطروں سے یہ آگ بجھنے کی نہیں۔ میں تو بس اتنا چاہتی ہوں کہ جب اس آگ کی تاریخ لکھی جائے تو میرا نام آگ بجھانے والوں میں سے ہو...... نہ کہ خاموش کھڑے تماشائیوں میں سے......''

سسٹم برے نہیں ہوتے انہیں آپریٹ کرنے والے برے ہوتے ہیں۔ نصف صدی سے مایوس بیٹھے لوگ اب کس کا انتظار کر رہے ہیں...... کیوں یہ لوگ اسی ایک بات پر یقین رکھتے ہیں کہ کوئی مسیحا آئے گا اور انہیں دکھوں سے آزاد کروائے گا؟ کوئی بھی مسیحا آسمان سے نہیں ٹپکتا، وہ میرے تمہارے جیسا ایک عام انسان ہی ہوتا ہے، صرف اس میں یہ ہمت ہوتی ہے کہ وہ غلط کو غلط کہتا ہے اور اپنے حصے کی ایمانداری...... ضرور برتتا ہے۔ ہر انسان کی ایک حدِ پرواز ہوتی ہے اور اسے اس حد تک ضرور اڑنا چاہیے۔ بھوک کا خوف موت کا خوف، عزت کا خوف کہہ کر اپنی جان چھڑانے والے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ جس آگ پر وہ خاموش ہیں، ایک دن وہ ان کا گھر بھی جلانے آئے گی۔

میں نے آنکھیں موند کر سیٹ سے پشت ٹکا...... دی اور آہستہ سے کہا۔ ''مجھے سدا اس کرسی پر بیٹھے نہیں رہنا...... مجھ سے پہلے کوئی اور تھا اور میرے بعد کوئی اور آئے گا...... جو بھی اس کرسی پر بیٹھتا ہے قدرت اسے وقت بھی دیتی ہے اور موقع بھی۔'' سیاہ مرسیڈیز کے ساؤنڈ سسٹم میں گونجنے والی نیرہ نور کی مدھم آواز زیادہ واضح ہو گئی۔

''اے جذبۂ دل گر میں چاہوں، ہر چیز مقابل آ جائے
منزل کے لیے دو گام چلوں اور سامنے منزل آ جائے''

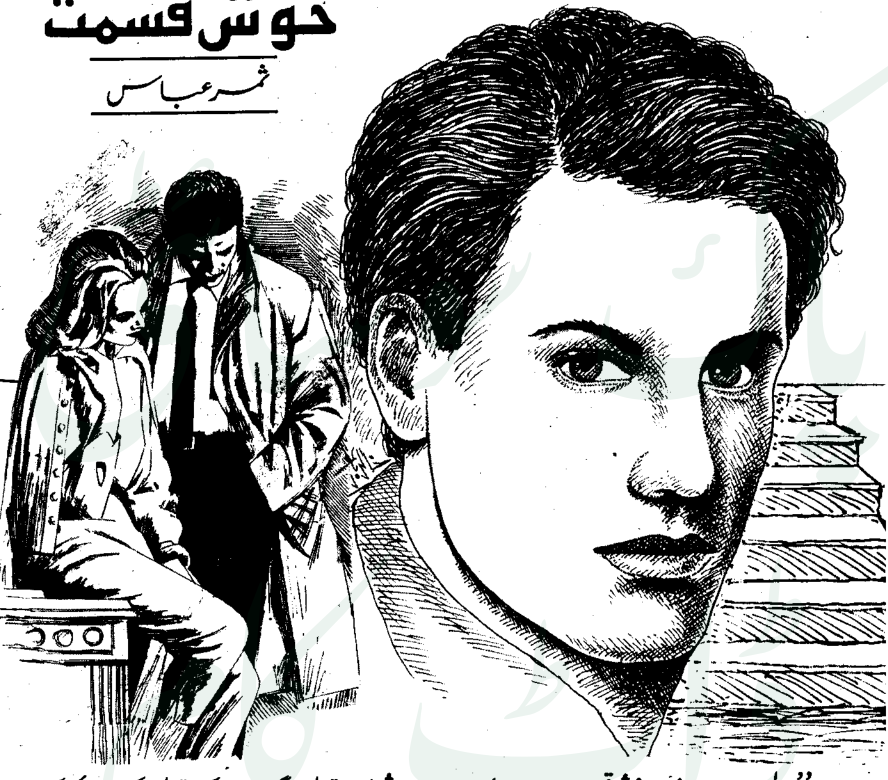
(ختم شد)

دل میں کسی کو پالینے کی تمنا لیے ایک زیرک محبوبہ کی بلیک میلنگ

بدقسمتی ہو یا خوش قسمتی عموماً دستک دیے بغیر ہی ہماری زندگی میں داخل ہوجاتی ہے لیکن... اس نے بڑی ہوشیاری سے اپنی بدنصیبی کو خوش قسمتی میں بدل ڈالا تھا کیونکہ جب سچائی کا دعویٰ کرنے والے فریب کی بے ساکھی سے چلتے ہے تو قدم لڑکھڑا ہی جاتے ہیں۔ وہ جو اس کا ہمسفر تھا کیسے اپنے ہم نفس کی لڑکھڑاہٹ کو محسوس نہ کرتا... اور پھر وہ ہوگیا جس کا ان دونوں نے سوچا تک نہ تھا۔

خوش قسمت

ثمر عباس



"دولت مند ہونے سے خوش قسمت ہونا زیادہ بہتر ہے۔" یہ جملہ بچپن میں لائم نارتھ نے سنا تھا اور تبھی سے اس کے دماغ میں چپک کر رہ گیا۔ اس وقت وہ ایک خاندانی تقریب میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ماموں اپنے ایک دور کے کزن سے باتیں کر رہے تھے جس نے بتایا کہ اس کی منگنی ایک بینکر سے ہوگئی ہے جس سے اس کی ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ انکل گریم کے پاس دولت نہیں تھی لیکن وہ خوش قسمت بھی نہیں تھے۔ اس کے چھ ماہ بعد ہی ان کا ایک حادثے میں انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کے بعد لائم کے دل میں یہ خیال پختہ ہوگیا کہ دولت تو آنی جانی شے ہے لیکن اگر آپ پیدائشی خوش قسمت ہیں تو زندگی کے کسی موڑ پر وہ سب کچھ مل جائے گا جو آپ چاہتے ہیں۔

لائم کا گھرانا بھی امیر نہیں تھا لیکن وہ اپنے آپ کو پیدائشی خوش قسمت سمجھتا تھا۔ گھر میں سب لوگ اس کے ساتھ شفقت سے پیش آتے اور صرف لفظوں کے ذریعے ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی اپنی محبت کا اظہار کرتے رہتے تھے

جس کی وجہ سے اس کی زندگی آرام سے گزر رہی تھی، اسی وجہ سے وہ سست اور نکما ہوگیا تھا اور یہ کاہلی وقت گزرنے کے ساتھ ناقابلِ علاج ہوتی جارہی تھی لیکن وہ ابھی تک اس کے مضمرات سے محفوظ تھا۔ وہ مطالعے کا شوقین تھا اور ہر وقت کتابوں میں گھرا رہتا جس کی وجہ سے ہر کوئی اسے پسندیدہ اور مطالعہ دوست شخصیت سمجھتا تھا اور جوان کے خیال میں بہت آگے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اسکول اور یونیورسٹی کے امتحانات میں اس کی چرب زبانی تو کام نہ آسکی کیونکہ وہ اپنی روایتی سستی کے سبب پوری تیاری نہیں کر پاتا تھا لیکن اس کے باوجود اپنی ذہانت کے طفیل اچھے نمبر حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہوجاتا۔ اس کا حافظہ بہت اچھا تھا اور کلاس میں جو کچھ پڑھایا جاتا، وہ اس کے ذہن میں محفوظ رہ جاتا لیکن وہ اپنی سستی اور کاہلی کی وجہ سے اسے دہرانے اور یاد رکھنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ لائم کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ ہر امتحان میں پاس ہو رہا تھا۔ اگر وہ اچھے نمبر حاصل نہیں کر پارہا تو اس کا الزام بار بار ہونے والے آدھے سر کے درد کو دیتا جس کی وجہ سے ہر کوئی اس سے ہمدردی کرنے لگتا۔ لوگ اسے پسند کرتے تھے اور اس کی کہی ہوئی بات پر آسانی سے یقین کرلیتے۔ اس طرح اسے شک کا فائدہ مل جاتا۔

اسکول کے زمانے میں اس نے چند چھوٹے موٹے اور غیر اہم معاشقے کیے لیکن کبھی کسی لڑکی کے ساتھ سنجیدہ نہیں ہوا۔ شاید اس وقت اسے سنجیدہ ہونے کا مطلب بھی معلوم نہیں تھا یا پھر وہ کسی ایسی لڑکی کی تلاش میں تھا جو اس کے لیے خوش قسمتی کا پیغام لے کر آئے۔ البتہ جب اس نے سنڈرلینڈ یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو پہلے ہی ہفتے میں اس کی ملاقات ایک ساتھی طالبہ سے ہوئی۔ وہ سنہرے بالوں والی انتہائی پُرکشش لڑکی تھی اور لائم کی طرح اسے بھی کتابوں سے لگاؤ تھا۔ اس نے پہلی ہی ملاقات میں لائم کو بتادیا کہ وہ ہمیشہ سے ہی مصنف بننے کا خواب دیکھتی آئی ہے۔ زمانہ طالب علمی کے دوران اس کا لیپ ٹاپ نظموں، ڈراموں، مختصر کہانیوں اور ناولوں کے اقتباسات سے بھر گیا تھا۔ ان میں سے کوئی چیز بھی شائع نہ ہوسکی لیکن لائم اس کی حوصلہ افزائی کرتا رہا گو کہ وہ کبھی قائل نہ ہوسکا کہ سیلی میں لکھنے کی صلاحیت ہے لیکن کوئی بات نہیں۔ کسی وقت بھی قسمت اس پر مہربان ہوسکتی تھی۔

فارغ التحصیل ہونے کے تین ماہ بعد انہوں نے شادی کرلی۔ سیلی کا ہائی سیکنڈ گریڈ آیا جبکہ لائم کو تھرڈ گریڈ پر ہی اکتفا کرنا پڑا حالانکہ پڑھائی کے دوران سیلی نے اس کی بہت مدد کی تھی۔ یہاں تک کہ لائم کے زیادہ تر نوٹس اسی نے لکھے۔ اس کے باوجود وہ اپنی کامیابی پر شرمندہ تھی کیونکہ لائم کو امتحانوں کے دوران ایک بار پھر آدھے سر کا درد ہوتا رہا۔ وہ اس لیے پریشان ہو رہا تھا کہ نارتھ ایسٹ میں ناقابلِ قبول قابلیت رکھنے والے انگلش گریجویٹ کے لیے ملازمت کے مواقع بہت کم تھے۔ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کہ ملازمت کے بغیر ضروریاتِ زندگی کس طرح پوری ہوں گی۔ سیلی تیز، مستعد اور خود کو کچھ سمجھنے والی شخصیت تھی۔ اس نے جلد ہی ترقی کی سیڑھیاں چڑھنی شروع کردیں لیکن لائم ایک کے بعد دوسری ملازمت کے پیچھے بھاگتا رہا۔ اس نے مختلف بارز اور ریستوران میں نوکری کی۔ اس کے علاوہ ایک ناول لکھنے کی بھی کوشش کی لیکن پہلے باب سے آگے نہ بڑھ سکا۔

دوسرے لوگوں کی کتابیں پڑھنا اپنی کتاب لکھنے کے مقابلے میں آسان تھا۔ اس کے اسی شوق کو دیکھتے ہوئے ایک عمر رسیدہ دوست گڈمین اسے اپنے ساتھ لے گیا جس کی ہارٹل پول کے علاقے ہیڈلینڈ میں پرانی کتابوں کی دکان تھی۔ اس عمارت میں بوسیدہ پرانی کتابوں کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی اور یہ ایک الگ تھلگ جگہ اس سڑک پر واقع تھی جو قبرستان اور لائٹ ہاؤس سے گزرتی تھی۔ اس سڑک پر لوگوں کی آمدورفت برائے نام تھی اور اسی وجہ سے اس دکان پر بہت کم گاہک آتے تھے۔ وہاں کا سکون اور خاموشی لائم کے لیے بہت مناسب تھی۔ وہاں مطالعہ کرنے کے زیادہ مواقع تھے اور اس کا امکان بہت کم تھا کہ کوئی اس کا راستہ روک کر یہ پوچھے کہ وہ اپنا وقت کیسے گزارتا ہے۔

گڈمین اپنی بیماری کی وجہ سے دکان کو زیادہ وقت نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے اس نے لائم کی خدمات حاصل کرلیں تاکہ دکان چلتی رہے گو کہ تنخواہ بہت کم تھی لیکن لائم کو اس بارے میں کوئی پریشانی نہیں تھی کیونکہ سیلی اچھا خاصا کمارہی تھی اور کم از کم انہیں یہ فکر نہیں تھی کہ اپنے علاوہ کسی اور کو بھی کھلانا ہے۔

سیلی جسمانی نظام میں ہونے والی کسی خرابی کے سبب اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم تھی۔ جب ڈاکٹری رپورٹ سے اس کی تصدیق ہوگئی تو وہ رات بھر روتی رہی اور لائم کے علاوہ اسے دلاسا دینے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ بار بار یہی کہتا رہا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سیلی کو خوف تھا کہ وہ محض زبانی ہمدردی جتا رہا ہے لیکن وہ خلوصِ دل سے

اسے سمجھا رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بچوں کو بہت زیادہ توجہ کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اس بات کو ترجیح دے گا کہ ہمیشہ سیلی کی نگاہوں کا مرکز بنا رہے۔ سیلی کی آمدنی معقول تھی اور روزمرہ اخراجات کے باوجود اتنی بچت ہو جاتی تھی کہ وہ اسٹین کیریو میں ایک چھوٹا سا مکان خریدنے کے قابل ہو گئے۔ یہ اس گھر سے بے حد نزدیک تھا جہاں لائم پلا بڑھا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ بالائی منزل کے بیڈروم سے سمندر کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ زندگی اچھی بھلی گزر رہی تھی، اس سے زیادہ اور کیا چاہیے تھا۔

وہ اسے خوش رکھنے کی ہرممکن کوشش کرتا۔ سیلی کو بھی کتابوں سے لگاؤ تھا لہٰذا وہ ویک اینڈ پر دکان آجاتی اور کتابوں کی فہرست بنانے میں اس کی مدد کرتی اور جب ان کے پاس کرنے کے لیے کچھ نہ ہوتا تو وہ شام کو مل کر کھانا بناتے اور گھر کے دیگر ضروری کام نمٹاتے۔ سیلی نے کبھی یہ توقع نہیں کی کہ گڈمین اس خدمت کے عوض اسے معاوضہ ادا کرے بلکہ وہ اپنے ذہن کو مصروف رکھنے کے لیے یہ سب کچھ کرتی تھی تاکہ اس کا دھیان بٹا رہے اور اسے بچوں کا خیال نہ آئے۔

سیلی کے موافق رویّے کی وجہ سے معاملات کچھ عرصہ ٹھیک چلتے رہے۔ وہ مہم جو طبیعت کی مالک تھی اس لیے اس نے دکان کی بہتری کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ دکان کی آمدنی بڑھنے سے لائم کو بھی فائدہ ہوگا اور اس کی تنخواہ بڑھ جائے گی۔ اس مقصد کے لیے اس نے کئی آئیڈیاز پر کام شروع کر دیا جن میں مصنفین کے کبھی کبھار دورے بھی شامل تھے۔ اس نے انہیں دکان پر مدعو کرنا شروع کر دیا تاکہ ان کی دستخط شدہ کتابیں قارئین کو فروخت کی جائیں۔ لائم کو توقع نہیں تھی کہ وہ اس کے لیے تیار ہو جائیں گے جہاں ان کی پرانی کتابیں انتہائی کم قیمت پر بیچی جاتی تھیں لیکن سیلی انتہائی متحرک تھی اور بہت کم عرصے میں اس نے ایسی تقریبات کا انعقاد کیا جن میں نارتھ ایسٹ کی نمایاں ادبی شخصیات موجود تھیں۔

لائم بہت خوش تھا کہ سیلی مکمل طور پر مصروف ہو گئی ہے اور اسے کام کے دوران کتابیں پڑھنے یا دن میں خواب دیکھنے کے لیے زیادہ وقت مل رہا ہے۔ سیلی نے اسے اپنی ایک دوست کے بارے میں بتایا جو باتونی اور انتہائی موٹی تھی۔ اس کا شوہر اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا اور اسے شادی کے بارہ ماہ بعد معلوم ہوا کہ وہ ہم جنس پرست تھا۔ میری کشادہ دل اور اچھی فطرت کی مالک تھی اور ہمیشہ دوسروں کے کام آتی تھی لیکن اس کی قسمت اچھی نہیں تھی۔ اس کا جسم بے ڈول تھا اور اسے کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنے فرضی معاشقوں کے قصے سناتی۔ سیلی کے مطابق اس کا قول تھا کہ کسی بھی کام کے لیے ایک کوشش ضرور کرو۔ لائم کی خواہش تھی کہ سیلی بھی اس کی ہم خیال بن جائے۔ وہ اس سے انکار نہیں کرسکتا تھا کہ اس کی محبت میں پہلے جیسی شدت نہیں رہی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی تمام خواہشات دم توڑ چکی ہیں۔ بالخصوص لائم کے لیے اس کے دل میں کوئی خواہش باقی نہیں رہی تھی۔ وہ صرف یہ چاہتی تھی کہ بوڑھے گڈمین کے مرنے کے بعد وہ دکان پر قبضہ کرے اور اسے مناسب انداز میں چلایا جائے۔ ایک دو مرتبہ لائم نے غور کیا کہ میری اسے ارمان بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے لیکن اس نے یوں ظاہر کیا جیسے اس پر کوئی توجہ نہ دی ہو۔ وہ صرف اپنی بیوی کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ممکن ہے کہ سیلی کے ساتھ اس کی زندگی مکمل نہ ہو لیکن وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا تھا کہ سیلی اس کے لیے خوش قسمت ثابت ہوئی ہے۔ میری کے ساتھ وقت گزارنے کے تصور سے ہی اس کے پسینے چھوٹ گئے۔

اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی ازدواجی زندگی خطرے میں پڑسکتی ہے جب تک سیلی نے جان موریسن کو چھ ماہ میں دوسری مرتبہ دکان پر نہیں بلایا۔ اس کا مقصد بظاہر نئے مصنفین کے لیے ایک ورکشاپ کا انعقاد تھا۔ موریسن کا تعلق ساؤتھ شیلڈز سے تھا اور اٹھارہ ماہ قبل اس کا تیسرا ناول منظرِ عام پر آیا تھا۔ لائم کو اس کے نظریات سے اختلاف تھا۔ اس سے ملنے کے بعد لائم نے محسوس کیا کہ وہ خود پسند، شیخی خورہ اور لوگوں سے بے زار رہنے والا شخص ہے لیکن سیلی اس کے کام کی گرویدہ تھی اور بالآخر لائم کو یوں لگا کہ شاید وہ اس کی شخصیت سے بھی متاثر ہو گئی ہے۔ موریسن کی شہرت ایک رنگین مزاج کی تھی اور وہ اپنی محبوبہ کے بوائے فرینڈ کو زدوکوب کرنے کے جرم میں چھ ماہ کی جیل بھی کاٹ چکا تھا۔

پہلے پہل تو لائم نے اپنے اندر پیدا ہونے والے حسد کے جذبے کو جھٹکنے کی کوشش کی جو سیلی اس کی نثر کی تعریفیں کرکے ابھار رہی تھی لیکن سیلی نے یہ طرزِ عمل جاری رکھا اور جب اس نے یہ بتایا کہ موریسن نے اسے کچھ مشورے دیے ہیں کہ کس طرح وہ اپنی تحریر کو بہتر بنا سکتی ہے، تو وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور اس نے بلاسوچے سمجھے کہہ دیا کہ موریسن ایک گھمنڈی شخص ہے اور اسے اپنے کام سے غرض

رکھنی چاہیے۔

”لائم!“ اس کے گال غصے سے سرخ ہو گئے۔ ”یہ کہنا [illegible] نہیں سمجھتی کہ لائم اسے پسند کرتے ہو۔“

وہ اپنے چہرے سے نقاب نہیں اتارنا چاہ رہا تھا اس لیے نرمی سے بولا۔ ”میرا مطلب یہ تھا کہ تم میں بھی اتنی صلاحیت ہے جتنی کہ اس میں۔ تم اس سے انکار نہیں کرسکتیں کہ اس کے کام میں فحاشی نظر آتی ہے۔“

”بکواس۔“ یہ سنتے ہی وہ ایک قدم پیچھے ہٹا جیسے وہ اس کے گال پر طمانچہ ماردے گی۔ ”وہ ایک سچا فنکار ہے۔ جو لوگ اسے گھمنڈی اور شدت پسند کہتے ہیں، انہیں معلوم ہی نہیں کہ وہ حقیقت میں کیسا ہے۔“

وہ اتنی تیزی سے غصے میں پیر پٹختی ہوئی چلی گئی کہ اسے شک ہونے لگا کہ وہ شام کا کھانا بنائے گی یا نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے فون کر کے پیزا منگوانا پڑ جائے۔

لائم کے لیے ایک نئی پریشانی شروع ہوگئی۔ اسے موریسن پر شبہ ہونے لگا کہ کیا وہ اپنی محبوباؤں کی فہرست میں سیلی کے نام کا اضافہ کرسکتا ہے؟ کیا وہ خود اتنا خوش قسمت ہے کہ اپنی بیوی کی وفاداری پر بھروسا کر سکے؟ اس طرح مطمئن ہو کر بیٹھنا ایک غلطی ہوگی۔ بہتر ہے کہ معاملات پر نظر رکھی جائے۔ سیلی کے موبائل اکاؤنٹ اور دوسری سرگرمیوں کو دیکھنا بہت ضروری تھا۔

اسے یہ جان کر بہت صدمہ ہوا کہ قسمت اس سے روٹھنے والی ہے۔ سیلی اور موریسن کے درمیان باقاعدگی سے ٹیلی فون کالز اور پیغامات کا تبادلہ ہو رہا تھا اور یہ سلسلہ عرصے سے جاری تھا۔ ایک ہفتے کی صبح اس نے رازداری سے ان دونوں کی گفتگو سن لی اور اس کے بدترین خدشات کی تصدیق ہوگئی۔

”سوموار کو بینک ہالی ڈے ہے۔ اس روز میں دکان میں ہی رہوں گی۔“ سیلی نے مدھم آواز میں کہا۔ ”لائم نے مجھ سے مدد کرنے کے لیے کہا ہے کیونکہ وہ اس بوڑھے شخص سے ملنے جائے گا جو اپنی کتابیں فروخت کرنا چاہ رہا ہے۔ ہاں، تمہارے آنے کے بعد ہم دروازہ اندر سے بند کرسکتے ہیں۔ ہم دکان اس لیے کھول رہے ہیں کہ کچھ لوگوں کو گن بیٹری کے معائنے کے لیے آنا تھا لیکن بارش کی پیش گوئی ہے۔ اس لیے شاید وہ نہ آسکیں۔ میں نے لائم سے کہہ دیا ہے کہ مجھے دکان کی صفائی کرنی ہے۔ وہ انتہائی احمق شخص ہے، میری باتوں میں آگیا۔ موسم چاہے کیسا بھی ہو، میں نہیں چاہتی کہ دکان پر کوئی گاہک آئے اور کوئی مجھے دیکھے۔

تمہارا بہت بہت شکریہ۔ میں ایک باعزت عورت ہوں اور تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تم سے ملنے کے بعد مجھے کوئی اچھا نہیں لگتا۔ تم ہی میرے لیے سب کچھ ہو۔“

گفتگو کا اختتام کھنکتی ہوئی ہنسی پر ہوا۔ کتابوں کی الماری کے پیچھے چھپے ہوئے لائم کی کمر مسلسل جھکے رہنے کی وجہ سے اکڑ گئی تھی۔ اس کے سینے میں درد کی لہر اٹھی جس پر اس نے بڑی مشکل سے قابو پایا۔ کھانے کے وقفے میں جب وہ رات کے کھانے کا سامان لینے گئی تو اس نے عمارت کی چھت پر جا کر وہاں کا جائزہ لیا۔ اس نے اس جگہ کو اسٹور کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا لیکن وہ نصف درجن کے قریب ویلوٹ کے آرام دہ کشن کیوں وہاں رکھنا چاہ رہی تھی۔ اسے اس کی نیت کا اندازہ لگانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

رات کو جب وہ کھانے پر اکٹھے ہوئے تو اس نے محسوس کیا کہ سیلی کچھ پریشان ہے اور کافی دیر سے اس نے کوئی بات بھی نہیں کی تھی۔ وہ اس کے تبصروں کا بے توجہی سے جواب دے رہی تھی جس کا اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ ان دنوں اکثر ایسا ہو رہا تھا۔ دکان، کچن یہاں تک کہ بستر میں بھی اس کا دماغ کہیں اور ہوتا۔ اب وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کا ذہن کس محور کے گرد گھوم رہا ہے۔ اس کے دماغ میں غصے کی لہر دوڑ گئی۔

کیا سیلی اپنا سامان باندھ کر اسے روتا دھوتا چھوڑ کر چلی جائے گی؟ اس کے جو معاشی اور عملی نتائج ہوں گے، وہ ان کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر موریسن نے بھی اسے چھوڑ دیا تو کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ وہ اپنی ازدواجی زندگی سے دور ہو جائے گی اور کوئی دوسرا ہرجائی اسے ورغلائے گا۔ وہ کوئی معصوم لڑکی نہیں جس سے وہ شادی کرلے گا۔ حالات دوبارہ اس جیسے نہیں ہوسکتے۔

دانت صاف کرتے ہوئے اسے یاد آیا کہ حال ہی میں سیلی کی فرم نے اسے کچھ مزید سہولتیں دی ہیں جس میں تنخواہ میں اضافے کے علاوہ زندگی کا بیمہ بھی شامل ہے۔ کیا سیلی کو کوئی حادثہ پیش نہیں آسکتا؟ ایسی صورت میں اسے اس کا حق مل جائے گا۔

دوسرے روز شیو کرتے وقت یہ بات اس کے ذہن میں آئی۔ حادثات تو ہوتے رہتے ہیں پھر سیلی کے ساتھ ایسا کوئی حادثہ کیوں نہیں ہوسکتا جس میں موریسن بھی اس کی لپیٹ میں آجائے۔ ایک پتھر سے دو پرندوں کو مارنا ہمیشہ

اس کا پُرکشش مشغلہ رہا ہے جس میں تھوڑی سی کوشش سے بڑی کامیابی ملتی ہے۔

غصے کے عالم میں سوچتے ہوئے اس نے دکان سے باہر جانے کا پروگرام بنایا۔ ویسے بھی وہ بند ہوچکی تھی اور وہ سکون سے بیٹھ کر اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ اس بارے میں بہت محتاط تھا کہ منصوبے میں کوئی خامی نہ رہے۔ بعض اوقات سوچی سمجھی اسکیم بھی غلط ہوسکتی ہے۔ اس نے کئی ایسے جرائم کے بارے میں پڑھ رکھا تھا جن کی منصوبہ بندی بڑی ہوشیاری سے کی گئی تھی لیکن وہ بدقسمتی سے ناکام ہوگئے۔ اسی لیے اس نے منصوبے کے ہر پہلو پر اچھی طرح غور کیا۔ اسے یقین تھا کہ ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی خوش قسمتی اس کا ساتھ دے گی۔

''تم کب تک واپس آؤ گے؟'' اگلی صبح سیلی نے دکان پر اترتے وقت اس سے پوچھا۔

''کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ تم جانتی ہو کہ ایرنی کس طرح کا شخص ہے۔''

وہ گڈمین کے پرانے گاہک سے ملنے جارہا تھا جس کے پاس کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا اور وہ اسے فروخت کرنا چاہ رہا تھا۔ ''وہ فضول باتیں کرے گا اور مجھے ہر کتاب کی قیمت کا تعین کرنے میں کافی وقت لگ سکتا ہے۔ میں لنچ کے لیے مچھلی اور چپس لے لوں گا۔ شاید میری واپسی سہ پہر کے بعد ہی ہوسکے۔''

''واقعی۔'' سیلی کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور لائم کا یقین مزید پختہ ہوگیا کہ وہ جو کچھ کرنے والا ہے، وہ درست ہے۔ سیلی نے کہا۔ ''تمہیں جلدی کرنے کی ضرورت نہیں۔ موسم بہت اچھا ہے اور میں نہیں سمجھتی کہ دکان میں زیادہ لوگ آئیں گے۔ وہ اپنا وقت کتابیں تلاش کرنے کے بجائے کسی بہتر کام میں لگائیں گے۔''

'ان لوگوں میں تم اور موریسن بھی شامل ہو۔' لائم نے تلخی سے سوچا۔ ''ہاں۔ میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں بھی شاید کام سے فارغ ہونے کے بعد سیدھا گھر چلا جاؤں گا۔''

وہ مسکرائی۔ اس کے چہرے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ ''اچھا خیال ہے۔ کیا تم واپسی میں مچھلی لیتے آؤ گے؟ آج میں تمہارے لیے ایک خاص ڈش بناؤں گی۔''

وہ مچھلی بڑے شوق سے کھاتا تھا۔ اس لیے وہ اسے دھوکا دینے کے لیے اس ڈش کی بات کررہی تھی۔ لائم نے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''زبردست...... تم سے شام

حیات کی تباہی

زمین کی یا زمین پر موجود حیات کی تباہی کے اسباب جو بتدریج وقوع پذیر ہوسکتے ہیں ان میں سے چند خاص کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت سمجھا جاسکتا ہے۔

(1) یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ہمارا سورج توانائی کی بہت بڑی مقدار مسلسل خارج کررہا ہے۔ اس کے اپنے اندر بھی اچھی خاصی توانائی پیدا ہورہی ہے، لیکن اس کی مقدار خارج ہونے والی توانائی کی مقدار سے کم ہے۔ نتیجہ میں سورج آہستہ آہستہ ٹھنڈے ہونے کے عمل سے گزر رہا ہے۔ ایک زمانے کے بعد جو کہ کروڑوں سالوں پر محیط ہوسکتا ہے سورج کی حرارت میں اتنی کمی واقع ہوجائے گی کہ اس کی وجہ سے زمین پر حیات ممکن نہیں رہے گی۔

(2) ہم سب جانتے ہیں کہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے سائنس دانوں کے خیال میں ایک دن کائنات کے پھیلنے کا عمل رک جائے گا اور پھر تمام ستارے سیارے ایک دوسرے کی جانب کھنچے چلے آئیں گے اور آخر کار ٹکرا کر تباہ ہوجائیں گے۔ یوں زمین کی تباہی بھی ان کے ساتھ ناگزیر ہے۔ ایک دوسرے سائنسی نظریہ کے مطابق اگر یہ پھیلنے کا عمل جاری رہا تو ایک دن تمام کہکشائیں جل بجھیں گی اور ان کے ساتھ یہ زمین کو محفوظ نہیں رکھ سکیں گی اور زمین پر زندگی ممکن نہ ہوگی۔

(3) زمین کا مقناطیسی ہالا رفتہ رفتہ کمزور ہوتا جارہا ہے جو کہ زمین کو کہکشاں شعاعوں کی تباہی سے محفوظ رکھتا ہے۔ مقناطیسی ہالے میں واقع ہونے والی کمی بھی اس حد تک رفتہ رفتہ کم ہوجائے گی کہ کہکشاں شعاعوں کی تابکاری کی یلغار سے زمین کو محفوظ نہیں رکھ سکے گی اور زمین پر زندگی ممکن نہ ہوگی۔

سعید الظفر صدیقی کی کتاب
''ماورائے گل'' سے اقتباس

میں ملاقات ہوگی۔‘‘

اس نے لائم کو رخصت کرتے ہوئے گرم جوشی سے ہاتھ ہلایا۔ ایرنی کوب ہرٹ کے مضافات میں ایک پُرسکون کاٹیج میں رہتا تھا جس سے متصل ایک وسیع ویران باغ بھی تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح تنہا زندگی بسر کررہا تھا۔ اس کی عمر اسّی برس سے تجاوز کرچکی تھی اور یادداشت بھی خاصی کمزور ہوچکی تھی۔ لائم کو یقین تھا کہ اسے بھولنے کا مرض لاحق ہوچکا ہے۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے ہفتے میں دوبار کوئی تیمار دار آیا کرتا۔

لائم کو کاٹیج تک پہنچنے میں پانچ منٹ لگے اور اگلے پانچ منٹ میں وہ اس کا حال پوچھتا رہا۔ اس کے بعد وہ بہانہ کرکے مکان سے باہر آگیا۔ سیلی کو دکان پر چھوڑنے کے بیس منٹ بعد اس نے اپنی گاڑی ایک آٹوسنز کے باہر کھڑی کی جو گزشتہ موسم سرما میں دوالیا ہوگیا تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ یہاں اس کی گاڑی کو دیکھنے والا کوئی نہیں۔ وہ دکان کی عقبی گلی میں داخل ہوا اور صحن کے گیٹ پر لگا ہوا تالا کھول کر ان سیڑھیوں کے ذریعے چھت پر پہنچ گیا جو آگ لگنے کی صورت میں نکلنے کے لیے لگائی گئی تھیں۔ اسے وہاں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر وہ ڈھکنا ہٹادیا جس سے سورج کی روشنی آسکتی تھی۔ وہ جگہ تنگ اور گرد آلود تھی اور وہاں سے نکلنے کا واحد رستہ ایک چور دروازہ تھا۔ اس نے وہ دروازہ کھولا اور اس طویل تنگ لکڑی کی سیڑھی کے ذریعے اترنے کا ارادہ کیا جو نچلی منزل تک جاتی تھی۔ اب وہ ڈھلواں چھت پر دہرا ہوکر بیٹھا ہوا خاموشی سے اس وقت کا انتظار کررہا تھا جب وہ ضروری کارروائی کرسکے۔

اس کے خیال میں ایسا کرنا ضروری ہوگیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ ایک بڑا خطرہ مول لے رہا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ اس بار بھی قسمت اس کا ساتھ دے گی۔

نیچے کی منزل سے سیلی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ شاید وہ بیرونی دروازے کی طرف جارہی تھی۔ گراؤنڈ، پہلی اور دوسری منزل پر واقع کمرے کتابوں سے بھرے ہوئے تھے۔ دوسری منزل پر ایک چھوٹا سا دفتر تھا اور چھت کے بالکل نیچے ایک کھلی جگہ میں کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ سیلی نے اس جگہ کو تقریبات کے لیے مخصوص کررکھا تھا۔ لائم کو اس کے کہے ہوئے الفاظ یاد آگئے کہ یہ جگہ کسی بے تکلف موقع کے لیے انتہائی موزوں ہے۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس کے ذہن میں کس قسم کا بے تکلف موقع ہے۔

دس منٹ بعد اس نے سیلی کے قدموں کی آواز سنی۔ وہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اس نے اوپر آکر کشن درست کیے۔ وہ حیران تھا کہ سیلی نے دکان پر آتے ہی پہلے یہ انتظام کیا۔ اس کی پہلی ترجیح یہ تھی کہ وہ اپنے محبوب کے ساتھ وقت گزار سکے۔ لائم نے چور دروازے کا ڈھکنا بند کیا اور انتظار کرنے لگا۔

اس نے لکڑی کی سیڑھی کو تین جگہ سے کاٹ کر واپس اسی طرح رکھ دیا۔ پہلی نظر میں دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس میں گڑبڑ کی گئی ہے۔ یقیناً سیلی کو بھی اس کا اندازہ نہیں ہوگا۔ اس کے گرنے اور چلّانے کی آواز ایک ساتھ آئی۔ جب لائم نے چور دروازے سے جھانک کر دیکھا تو یوں لگا جیسے وہ بے ہوش ہوگئی ہے لیکن اس کی سانس ابھی چل رہی تھی۔ فرش پر قالین نہیں تھا اس لیے اسے بہت زیادہ چوٹ آئی تھی۔

اس نے چھت کے زنگ آلود ہک میں ایک لمبی رسی مضبوطی سے باندھ کر لٹکادی تھی۔ اگر ہک ٹوٹ جاتا تو اس کی اپنی گردن بھی ٹوٹ سکتی تھی لیکن وہ بحفاظت نیچے اتر گیا۔ جب وہ سیلی پر جھکا تو اس نے تصور میں اسے آنکھیں کھولتے دیکھا۔ اس نے احتیاط کے طور پر ایک لکڑی کا ٹکڑا بھی رکھ لیا تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر سیلی کو دوبارہ خاموش کیا جاسکے لیکن شکر ہے کہ سیلی نے کوئی حرکت نہیں کی۔ اس کی کھوپڑی سے خون بہہ رہا تھا جس کی وجہ سے اس کا سارا میک اپ برباد ہوگیا تھا۔

گھنٹی بجنے کی آواز آئی اور کوئی دکان کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس کے آواز دینے سے پہلے ہی لائم کو یقین ہوگیا کہ آنے والا جان موریسن ہی ہے۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو وہ حیرانی کے عالم میں پہلی منزل کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

’’سیلی! تم کہاں ہو؟‘‘ وہ زور سے ہنستے ہوئے بولا۔ ’’مجھے آنے میں کچھ دیر ہوگئی۔‘‘

اس لمحے لائم نے سیلی کی نقل اتارتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اس کی مشق وہ کافی دنوں سے کررہا تھا اور اس وقت جوش میں آکر اس نے کچھ زیادہ ہی اچھی نقل اتارلی۔

’’سیلی۔‘‘ موریسن اچانک ہی محتاط ہوگیا۔ ’’کیا یہ تم ہو؟‘‘

دوسری منزل پر جانے والی سیڑھیاں چھت کے نزدیک نوّے درجے کے زاویے پر مڑجاتی تھیں۔ لائم کتابوں کی الماری کے پیچھے چھپ گیا۔ اب وہ کسی کو نظر نہیں

آسکتا تھا۔ ویسے بھی اسے یقین تھا کہ موریسن کی نظریں صرف سیلی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔

''سیلی! کیا تم مجھ سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہو؟'' اس کی خوشامدانہ آواز میں جھنجلاہٹ نمایاں تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بھی سزا کا مستحق تھا۔ ''ٹھیک ہے، میں آرہا ہوں۔ تم تیار ہو یا نہیں۔''

ایک بار پھر اس نے سیڑھیاں چڑھنا شروع کیں لیکن سیلی کو فرش پر لیٹا دیکھ کر اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی اور لائم کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا۔ اس نے وحشیانہ انداز میں اسے گھمایا اور اندازے کی غلطی کی وجہ سے وہ موریسن کے ماتھے کو چھو کر گزر گیا۔ اس کے اطمینان کے لیے یہ بھی کافی تھا۔ سیلی کی لاش کو دیکھ کر وہ سیڑھیوں پر پیچھے کی جانب لڑکھڑایا۔ درد اور دہشت سے اس کی گھٹی گھٹی چیخیں نکل رہی تھیں۔ لائم اس کے پیچھے لپکا اور جیسے ہی وہ گرا، اس نے اسے ٹھوکریں مارنا شروع کردیں۔ موریسن غرایا لیکن اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ وہ بھی سیلی کی طرح مرا نہیں تھا لیکن اتنی جلدی ہوش میں بھی نہیں آسکتا تھا۔

لائم نے موریسن کے ہاتھ سے گرنے والی کتاب اٹھالی اور اس کی جینز کی جیبوں کی تلاشی لینے لگا جن میں سے ایک سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس کی ڈبیا برآمد ہوئی۔ وہ دن میں کافی سگریٹ پیتا تھا۔ اسے تو جوانی میں ہی مرجانا چاہیے تھا۔ لائم نے رومال سے پکڑ کر وہ دونوں ڈبیاں فرش پر رکھیں تاکہ ان پر اس کی انگلیوں کے نشانات نہ آنے پائیں۔ وہ خود سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن اس نے ایرنی کی نظر بچا کر اس کے سائڈ بورڈ سے ایک ماچس کی ڈبیا اٹھا کر جیب میں رکھ لی تھی۔ اس نے بیک وقت دو تیلیاں جلائیں اور فرش پر رکھے ہوئے رسالوں کے ڈھیر کو آگ لگادی۔ اوپر واپس جاتے ہوئے اس نے ایک اور تیلی جلا کر پرانے اخباروں کے ڈھیر کو دکھادی۔ نتیجہ اس کی توقع سے بڑھ کر تیز اور مؤثر نکلا۔ آگ تیزی سے پھیلنا شروع ہوگئی اور چند ہی سیکنڈ بعد دھوئیں کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ گو کہ وہ فوراً ہی چھت پر پہنچ گیا اور اس نے ہک میں سے رسی نکال دی۔ اس نے سیلی پر آخری نظر ڈالنے کی ہمت نہیں کی کیونکہ اس کے گرد شعلے بھڑک رہے تھے گو کہ یہ بڑے شرم کی بات تھی لیکن اس نے اپنے جذبات کو تھپک کر سلادیا تھا۔ کتابوں کی تباہی بھی ایک تکلیف دہ نقصان تھا لیکن اس کی تلافی ہوسکتی تھی۔ اس دوران وہ چھت میں بنے ہوئے روشن دان سے باہر آچکا تھا اور موریسن کی کتاب اس کے ہاتھ میں تھی۔ پوری عمارت آگ کی لپیٹ میں آچکی تھی۔ وہ آگ سے بچنے کے لیے تھوڑا سا لڑکھڑایا۔ اس کی کوشش تھی کہ کسی کی نظر پڑنے سے پہلے ہی وہ وہاں سے نکل جائے۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر وہ تقریباً گرنے والا تھا۔ یہ مناسب نہیں تھا کہ قتل کرنے اور گڈمین کی دکان تباہ کرنے کے بعد وہ خود بھی اپنی گردن تڑوالیتا۔ لائم کو ایک منٹ کے لیے یقین نہیں آیا پھر اس کے کانوں میں انکل گریم کے الفاظ گونجنے لگے کہ تم چند انڈے توڑے بغیر آملیٹ نہیں بنا سکتے۔

کسی نے اسے گلی میں بھاگتے یا کار میں سوار ہوتے نہیں دیکھا۔ دکان سے ایک میل دور آنے کے بعد اس نے آگ بجھانے والی گاڑی کا سائرن سنا اور وہ سوچنے لگا کہ ان تمام رکاوٹوں کے باوجود شاید سیلی اور موریسن کی جان بچالی جائے لیکن نہیں، یہ بعید از قیاس تھا۔ لہٰذا اس نے اس امکان پر مزید غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

☆☆☆

''کیا میں باہر جا کر اپنے اور تمہارے کھانے کے لیے کچھ لے آؤں؟'' اس نے چند منٹ بعد ایرنی سے پوچھا۔ اس بوڑھے شخص نے بے دھیانی سے سر ہلادیا۔ لائم کو یقین نہیں تھا کہ وہ اس کی بات سمجھا یا نہیں۔ اسے اس سے غرض نہیں تھی۔ اس کا مقصد صرف جائے وقوعہ سے اپنی غیر موجودگی کو ظاہر کرنا تھا۔ واپس آنے کے بعد وہ خریدی ہوئی کتابوں کی قیمت کا چیک وہاں چھوڑ دیتا اور وہ کتابیں اپنی کار میں رکھ لیتا۔ ایرنی آنکھ بند کر کے گواہی دیتا کہ لائم پورے وقت وہاں موجود تھا۔ ویسے بھی لائم اپنی کہانی پر مضبوطی سے قائم رہتا۔

پولیس کا فون اس وقت آیا جب وہ ایرنی کے یہاں سے واپس جارہا تھا۔ اسے یہ امید نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی اس کا نمبر معلوم کرلیں گے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ نمبر انہیں گڈمین سے ملا تھا جو آگ لگنے کے چند منٹ بعد ہی دکان پر پہنچ گیا تھا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس نے فوراً ہی دہشت زدہ انداز میں کہا۔

''لیکن میری بیوی......''

''کیا مطلب؟'' ایک نوجوان خاتون آفیسر نے کہا۔ ''تم یہ نہیں کہہ رہے تھے کہ بینک ہالی ڈے کی وجہ سے دکان میں کوئی نہیں تھا؟''

''ہاں لیکن وہ کسی کام سے وہاں گئی تھی۔ شاید وہ صفائی اور کتابوں کو ترتیب سے رکھنا چاہ رہی تھی اور ہمارے

ایک دوست کو بھی اس کی مدد کے لیے وہاں آنا تھا۔''
''کس دوست کی بات کررہے ہو؟''
''جان موریسن۔ وہ بھی ایک مصنف ہے۔ اچھا آدمی ہے اور ہر وقت لوگوں کی مدد کے لیے تیار رہتا ہے لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ وہ دونوں تمہیں وہاں ملے یا نہیں؟''
جب وہ دکان پہنچا تو اس وقت بھی ہلکی ہلکی آگ سلگ رہی تھی لیکن اب بھی کسی کو بچانے کی کوشش خطرناک ہوسکتی تھی۔ لائم نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن اس کی چیخیں نکل گئیں۔ اسے کتابوں کے جلنے کا بہت صدمہ تھا۔
دکان کے مالک گڈمین کو دل کا شدید دورہ پڑا اور بڑی مشکل سے اس کی جان بچائی جاسکی۔ لائم کو پورا یقین تھا کہ ایک دو ہمدرد پولیس افسروں کو آگ لگنے کی وجہ کے بارے میں شبہات ہوسکتے تھے لیکن سیڑھی اور رسّی کے جل جانے کے بعد وہاں کوئی ثبوت باقی نہیں رہا تھا جس سے پتا چلتا کہ سیلی اور موریسن کو جلایا گیا ہے یا جس وقت آگ لگی تو ان کے علاوہ بھی دکان میں کوئی موجود تھا۔ موریسن کثرتِ سگریٹ نوشی کی وجہ سے بدنام تھا۔ اس لیے سارا الزام اس کے سر آگیا کہ اس نے بے پروائی سے جلتی ہوئی ماچس کی تیلی یا سگریٹ کا ادھ بجھا ٹکڑا کاغذوں کے ڈھیر پر پھینک دیا جس کی وجہ سے آگ بھڑک اٹھی۔ ایک افواہ یہ بھی تھی کہ سیلی نے اس کی پیش قدمی روکنے کی کوشش کی تو اس نے غصے میں آکر دکان کو آگ لگادی۔
پولیس نے اس سے موریسن کے بارے میں کئی چبھتے ہوئے سوالات کیے لیکن وہ اپنی بات پر قائم رہا کہ مصنف بہت ہی اچھا انسان تھا اور صرف سیلی ہی نہیں بلکہ لائم کے ساتھ بھی اس کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ایک مشہور مصنف ہونے کے باوجود اس میں اکڑ یا غرور نام کو نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ موریسن اس روز دکان پر آئے گا اور اس کی بھی کوشش تھی کہ ایرنی سے نمٹنے کے بعد وہ جلد از جلد دکان پر پہنچ جائے۔ اس تمام صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد سراغ رساں اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر لائم ایک بے وفا بیوی کا شوہر تھا تو اس پر شبہ کرنے کے بجائے ترس کھانا چاہیے۔
اس تحقیقات کی سربراہی ایک ایسا شخص کررہا تھا جو خود بھی ریٹائرمنٹ کے قریب تھا اور اسے ایک پُرسکون زندگی عزیز تھی۔ لائم نے ایک ایسے شخص کا کردار بڑی خوبی سے نبھایا جس کا سب کچھ کھو گیا ہو۔ اس نے دورانِ تفتیش سیلی کے بیمہ کی رقم کا کلیم داخل کرنے کی بھی کوشش نہیں کی بلکہ انتظار کرتا رہا کہ سیلی کی فرم اس سلسلے میں اس سے رجوع کرے۔ اس نے پولیس کے سامنے بھی وضاحت کی کہ سیلی نے کبھی اسے ان سہولتوں کے بارے میں نہیں بتایا۔
سیلی کی تجہیز و تکفین کے موقع پر میری نے لائم کے لیے غیر معمولی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ وہ ہمیشہ سے ہی پُرجوش واقع ہوئی تھی۔ وہ آگ لگنے کے بعد روزانہ اس کی خیریت معلوم کرنے آتی گو کہ لائم اپنی کتابوں کے ساتھ وقت گزارنے کو ترجیح دیتا تھا لیکن وہ کبھی اس کی آمد پر اعتراض نہ کرسکا اور ایک دن جب وہ سیلی کی یاد میں کھویا ہوا تھا، اس نے ایک انکشاف کرکے اسے حیران کردیا۔
''ہاں۔ وہ بہت پیاری تھی لیکن کبھی کسی ایک کی ہوکر نہیں رہی۔''
''کیا؟'' لائم کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔
''میرا مطلب ہے کہ جس طرح وہ اس گھٹیا شخص موریسن سے پینگیں بڑھا رہی تھی لیکن وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد نہیں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ تم بھی اس بارے میں جانتے ہوگے۔ وہ مجھے اپنے معاشقوں کے بارے میں بتاتی رہتی تھی۔ گو کہ میں نے کبھی اس کی طرح ہینڈسم مردوں کا انتخاب نہیں کیا اور اس سے اس بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کی لیکن مجھے ان باتوں سے نفرت تھی۔ وہ ہمیشہ خوش قسمت رہی اور میں اس کے مقابلے میں غریب اور بوڑھی تھی۔ اس نے تمہارے ساتھ جو سلوک کیا، اس سے مجھے بہت تکلیف پہنچی۔'' اس نے اپنا ہاتھ لائم کے بالوں پر پھیرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تم نے یہ کام کردیا۔''
''میں نے کیا کیا؟''
''وہ قتل تم نے ہی کیے ہیں۔'' وہ اس کا بازو پکڑتے ہوئے بولی تو اسے جھرجھری آگئی۔
''جھوٹ بولنے کی کوشش مت کرنا۔ میں سچائی سے متاثر ہوئی ہوں۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تم اس طرح معاملہ حل کروگے۔''
وہ تلخ گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ ''میری سمجھ میں بالکل نہیں آرہا کہ تم کس بارے میں بات کررہی ہو۔''
میری ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''لائم! اس روز میں ایرنی کے عقبی باغ میں موجود تھی۔ وہ میرا گاڈ فادر تھا اور میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ قصوروار سمجھا کہ اس کی صحیح طرح خدمت نہ کرسکی۔ میں اس روز باغ کی صفائی کرنے گئی تھی کیونکہ وہ بالکل جنگل لگ رہا تھا۔ صرف یہی نہیں کہ مجھے باغبانی کا شوق ہے بلکہ اس نے مجھے بتادیا تھا کہ تم بھی آنے والے ہو اور میں نے سوچا کہ ہم دونوں کے لیے تنہائی

میں باتیں کرنے کا یہ اچھا موقع ہوگا کیونکہ ایرنی تو دوپہر کے کھانے کے بعد سوجاتا ہے اس طرح ہم ایک دوسرے کو بہتر طور پر جان سکیں گے۔''

اس نے لائم کو معنی خیز انداز میں آنکھ سے اشارہ کیا لیکن لائم کی زبان سے ایک لفظ ادا نہیں ہوا۔

''بہرحال، تم میری حیرت کا تصور کرسکتے ہو جب اپنے آنے کے صرف پانچ منٹ بعد ہی تم کوئی کتاب خریدے بغیر اپنی کار میں بیٹھ کر دوبارہ کہیں چلے گئے۔ یہ دیکھ کر میں پریشان اور افسردہ ہوگئی۔ میں نے اپنا کام بیچ میں چھوڑ دیا لیکن یہ بات مجھے بہت بعد میں سمجھ میں آئی جب میں نے تمہیں یہ کہتے ہوئے سنا کہ تم تمام وقت ایرنی کے پاس تھے اور درمیان میں صرف کھانا لینے گئے تھے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تم نے اس کے بعد ہی اپنا کام شروع کیا تھا۔''

''تم ایک بہت بھیانک غلطی کررہی ہو۔'' لائم نے کہا۔

''یقین کرو۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ کیا کررہی ہوں۔'' میری جھجکتے ہوئے بولی۔

''مجھے آگ لگنے پر حیرانی تھی پھر یاد آیا کہ سیلی نے مجھے اپنی زندگی کے بیمے کے بارے میں بتایا تھا۔ تمہیں میرا شکرگزار ہونا چاہیے کہ میں نے پولیس کو یہ بات نہیں بتائی بلکہ یہی کہا کہ تم دونوں ایک مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تم نے جو کچھ کیا، اس کے لیے تمہیں کوئی الزام نہیں دے سکتی۔ میں جانتی ہوں کہ سیلی اور موریسن نے تمہیں اس کے لیے مجبور کیا۔ تمہارے اندر ایک پاکیزہ روح ہے اور تمہیں محض ایک ایسے ساتھی کی ضرورت ہے جو تمہارا خیال رکھ سکے۔ جو کچھ ہوا اس کے بارے میں، میں گزشتہ روز تک یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی لیکن جب میں نے تمہارا مطالعے کا کمرا دیکھا تو مجھے وہ چیز نظر آ گئی۔''

اس نے لائم کی آنکھوں کے سامنے کاغذ میں لپٹی ہوئی ایک کتاب لہرائی۔ وہ موریسن کا نیا ناول تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سرورق پلٹتی، لائم سمجھ گیا کہ وہ کیا دکھانا چاہ رہی تھی۔ اس پر سیلی کے لیے موریسن کے دستخط کے ساتھ ایک جملہ لکھا ہوا تھا اور اس پر سوموار یعنی بینک ہالی ڈے کی تاریخ پڑی ہوئی تھی۔

''میں نے اس کی فوٹو کاپی بنوالی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''یہ بھی ایک طرح کی بیمہ پالیسی ہے۔ اگر مجھے بھی سیلی کی طرح کوئی حادثہ پیش آجائے تو یہ میرے وکیل کے پاس محفوظ رہے گی۔''

لائم نے اسے گھورا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میری جھوٹ بول رہی ہے۔ ''تمہارا کوئی وکیل نہیں ہے۔'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔

''ٹیلر نے طلاق کے سلسلے میں میرے لیے کام کیا تھا۔'' وہ دل کی بات پڑھتے ہوئے بولی۔

''ہمارا تعلق چند ہفتے قائم رہا لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ساتھ دینے سے قاصر رہا۔ میں اس سے انکار نہیں کرسکتی کہ مجھے بہت زیادہ توجہ چاہیے۔''

لائم کا گلا خشک ہونے لگا۔ ''کیا......؟'' اس نے کہنا شروع کیا۔

''پریشان مت ہو۔'' وہ بولی۔ ''تم میری طلب پوری کرسکتے ہو۔ میرا ذہن بالکل صاف ہے۔ میں بتاتی ہوں کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ ہم خاموشی سے شادی کرلیں گے۔ فی الحال اسے ظاہر کرنا مناسب نہ ہوگا کیونکہ ہم ابھی تک سیلی کی موت کا سوگ منا رہے ہیں۔ یہ ہمارا مشترکہ غم ہے۔ جب تم دوسری ملازمت تلاش کررہے ہوگے تو بیمہ سے ملنے والی رقم کافی مفید ثابت ہوگی۔ شاید تمہیں کسی لائبریری میں ملازمت مل جائے۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں کتابوں سے محبت ہے گو کہ ذاتی طور پر میں فکشن کو پسند نہیں کرتی۔ میرے نزدیک حقیقی زندگی اہمیت رکھتی ہے۔ بہرحال میں یہ توقع نہیں کرتی کہ تم مجھے یا اپنے آپ کو مار ڈالو گے۔ ہم ہفتے میں دو دن ایک جوڑے کے طور پر رہیں گے اور باقی وقت اکٹھے گزاریں گے۔''

یہ کہتے ہوئے میری کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا، جب اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا تو لائم نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ وہ اس نفرت کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا جو اس کے قریب آنے کی صورت میں اس کے چہرے سے عیاں ہوتی۔ میری کو خوش فہمی تھی کہ وہ اس کی باتوں سے پگھل گیا ہے۔ اس نے اپنا چہرہ لائم کے چہرے پر جھکا دیا۔

''وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں بہت پیار دوں گی۔'' اس نے دو منٹ بعد کہا۔ جب لائم نے سانس لینے کے لیے اپنے آپ کو الگ کرنے کی کوشش کی۔

''سیلی تمہارے لیے ٹھیک نہیں تھی۔ وہ تمہاری خواہشات پوری کرنے کے قابل نہیں تھی۔ وہ تمہیں اولاد کی خوشی نہ دے سکی اور تم سے بے وفائی کرتی رہی۔ وہ ہر لحاظ سے مجھ سے مختلف تھی۔ آخر کار اتنے برسوں بعد میں جان گئی کہ قسمت کی دیوی مجھ پر مہربان ہوگئی ہے اور میں بھی تمہاری طرح خوش قسمت ہوں۔''

دوستانہ

ملک صفدر حیات

دنیا میں ہر وہ چیز جو بے جوڑ ہے وہ تنقید کا نشانہ بنتی رہی ہے اور اگر... تعلقات میں غلط جوڑ توڑ کرلیا جائے تو زندگی کی تباہی یقینی ہوجاتی ہے۔ عورت کے قدموں کی لرزش مضبوط گھروں کی بنیادیں تک ہلادیتی ہے... وہ جو من موہنی صورت والی تھی من کی اتنی کالی نکلے گی اس کے شریکِ سفر کو احساس تک نہ ہوسکا۔ اس نے کب یہ سوچا تھا کہ اجلی رنگت میں اتنا میل چھپا ہے کہ اس کے اپنے کردار کی شناخت تک اس میں ڈوب جائے گی... لیکن ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل جائے تو ہر ناممکن منزل خود چل کر قدموں میں آجاتی ہے۔ یہی انجام اس عبرت ناک داستان کا ہوا جس کا ایک سرا جب اس مسیحا کے ہاتھ لگا تو ساری گتھی خود بہ خود سلجھتی چلی گئی۔

ملک صاحب کی ڈائری سے ایک سفاکانہ

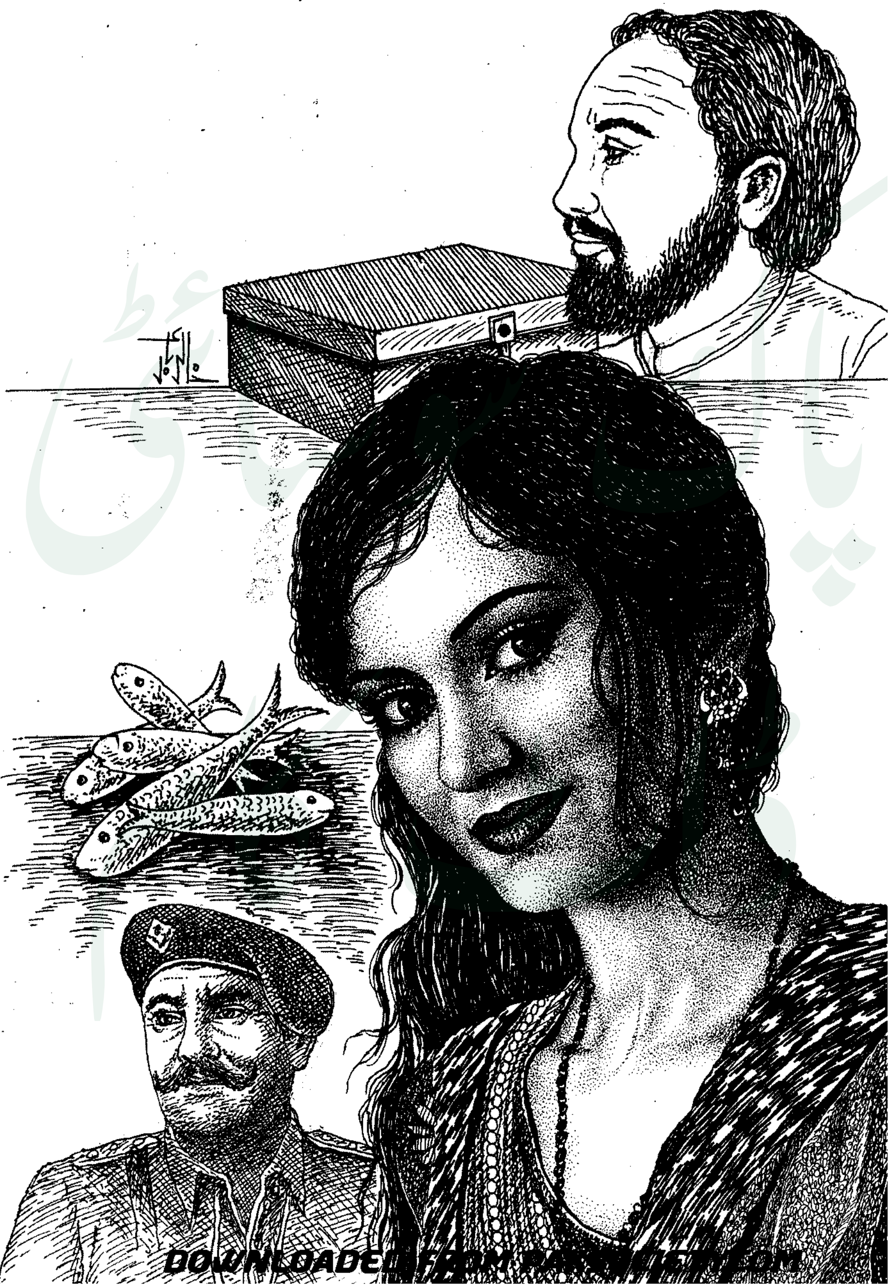
قتل کی واردات کا احوال

کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ ہمارے زمانے میں مجرموں کو پکڑنے کا ماہانہ ایک کوٹا ہوا کرتا تھا اور یہ کوٹا ہر تھانے کی حدود میں پائے جانے والے گاؤں دیہات کی وسعت، تعداد اور وہاں بسنے والے افراد کی کمی و زیادتی پر منحصر ہوتا تھا چنانچہ بعض تھانوں کے لیے یہ کوٹا مختصر اور بعض کے لیے خاصا صحت مند ہوا کرتا تھا۔ ہر تھانہ انچارج کی یہ ڈیوٹی ہوتی تھی کہ وہ مہینے کے اختتام پر اپنے تھانے کے کوٹے کو پورا کرے لہٰذا مہینے کی آخری تاریخوں میں پکڑ دھکڑ کا سلسلہ عروج پر ہوتا تھا۔ میں دوسرے تھانہ انچارجز کے بارے میں کوئی تبصرہ کرنا مناسب نہیں سمجھتا، البتہ اپنے حوالے سے میں پوری دیانت داری کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ بعض اوقات مجھے اس ''کوٹا سسٹم'' کی باریکیوں سے گزرنا پڑتا تھا لیکن میں نے کبھی کسی بے گناہ کے ساتھ زیادتی نہیں کی تھی۔ ہر تھانے میں اردگرد کے علاقوں میں پائے جانے والے عادی مجرموں کی فہرست موجود ہوتی ہے، میں کسی پیشہ ور چور اچکے کو پکڑ کر ایک رات کے لیے اپنے تھانے کی حوالات میں بند کردیا کرتا تھا اور اگلی صبح یا دوپہر میں اسے جانے کی اجازت دے دیتا تھا۔ اس طرح قانونی فائلوں کا پیٹ بھرنے کے لیے خانہ پُری بھی ہوجاتی تھی اور کسی کے ساتھ ظلم بھی نہیں ہوتا تھا۔

اس طویل تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔ ان دنوں میری تعیناتی ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے ایک دور دراز تھانے میں تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ ماہِ مارچ کی آخری تاریخ تھی یعنی اکتیس مارچ۔ موسم بہار کا آغاز ہوچکا تھا۔ مذکورہ تھانے میں چارج سنبھالے ابھی مجھے چند روز ہی ہوئے تھے۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ میں تھانے میں بیٹھا روزمرہ کے معمولات نمٹا رہا تھا کہ اے ایس آئی جہاں زیب نے میرے پاس آکر کہا۔

''ملک صاحب! آج مہینے کی آخری تاریخ ہے اور ہمیں اس ماہ کا کوٹا پورا کرنا ہے......''

میں فوراً جہاں زیب کی بات کی تہ میں اتر گیا اور چونکے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھا۔ ''کتنی کمی ہے؟''



"صرف ایک بندے کی ضرورت ہے جناب۔" اس

"جہاں زیب! مجھے تو اس تھانے میں آئے جمعہ ... دن ہوئے ہیں۔ تم کافی عرصے سے یہاں کام ... ہو۔ ذرا تھانے سے باہر نکلو اور ہاتھ پاؤں کو حرکت ... تم یہاں کے ایک ایک جرائم پیشہ بندے کو اچھی ... جانتے ہو۔ ایک آدھ بندہ گھیر کر تھانے لانا تمہارے ... سا مشکل کام ہے۔"

"یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے ملک صاحب!" ... بائیں ہاتھ کو مخصوص انداز میں حرکت دیتے ہوئے ... "بس، آپ کی طرف سے اجازت کا انتظار تھا۔ میں ... جاتا ہوں اور انشاء اللہ کامیاب لوٹوں گا۔"

"اجازت تو میں تمہیں دے رہا ہوں۔" میں نے ... انداز میں کہا۔ "لیکن میری ایک بات کو ذہن میں رکھنا ... زیب ...... کسی معصوم اور بے گناہ انسان کے ساتھ کوئی ... نہیں ہونی چاہیے۔"

"آپ بے فکر ہو جائیں ملک صاحب! میں آپ کو ... کی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔" وہ اپنے سینے پر ... رکھ کر گہری سنجیدگی سے بولا۔ "میں نے چند روز آپ ... کام کر کے بڑی اچھی طرح یہ بات سمجھ لی ہے کہ ... ٹائپ کے تھانے دار ہیں۔"

"ویری گڈ!" میں نے ستائشی انداز میں اس کی ... دیکھا اور کہا۔ "اگر تم میرے مزاج اور فطرت کو سمجھنے ... تو پھر ہماری خوب نبھے گی۔"

"ان شاء اللہ!" وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے فخریہ ... بولا۔

جہاں زیب کے جانے کے بعد میں اسی کے بارے ... سوچنے لگا۔

مغرب سے پہلے اے ایس آئی لوٹ آیا۔ اپنے ... کے مطابق وہ خالی ہاتھ واپس نہیں آیا تھا۔ اس کے ... لگ بھگ چالیس سال کی عمر کا ایک غریب صورت شخص ... تھا۔ اس بندے کو دیکھ کر میرے ذہن میں پہلا خیال ... کہ کہیں جہاں زیب نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی تو ... کر دی......!

جہاں زیب بڑے فخر سے اس بندے کو میرے سامنے ... کرتے ہوئے بولا۔ "ملک صاحب! بندہ حاضر ہے۔"

"یہ کون ہے؟" میں نے اے ایس آئی سے پوچھا۔ "اور اس نے کیا جرم کیا ہے؟"

"میرا نام منظور ہے تھانے دار صاحب۔" وہ عاجزی سے بولا۔ "اور میں نے کوئی جرم نہیں کیا سرکار۔"

میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میرا بندہ تمہیں خوامخواہ ہی پکڑ لایا ہے؟"

بات کے اختتام پر میں نے سوالیہ نظر سے جہاں زیب کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔ "ملک صاحب! میں بتاتا ہوں۔"

میں جہاں زیب کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ان لمحات میں میرے ذہن میں یہی خیال تھا کہ شاید جہاں زیب گنتی پوری کرنے کے چکر میں منظور نامی اس بندے کو اٹھا لایا تھا۔ بہر حال، حقائق تک رسائی حاصل کرنے کے لیے دونوں کا موقف سننا ضروری تھا۔

"ملک صاحب! جھورا بہت بدتمیز آدمی ہے......" اے ایس آئی نے بولنا شروع کیا ہی تھا کہ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور پوچھا۔

"یہ جھورا کون ہے؟"

"یہی ہے جناب...... منظور احمد عرف جھورا مچھلی فروش۔" وہ منظور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "اس نے آج ماسٹر عنایت جیسے بھلے مانس کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ کسی شریف آدمی کا گریبان پکڑ کر اسے گالیاں دینا اور پھر دھکے دے کر اپنے ٹھیلے سے بھاگ جانے کو کہنا تو کھلی بدمعاشی ہے ملک صاحب۔ یہ ایک رات حوالات میں گزارے گا تو اس کے دماغ کی ساری گرمی نکل جائے گی پھر یہ کسی کے ساتھ بدتمیزی کرنے سے پہلے سو بار سوچے گا۔"

اے ایس آئی کی بات مکمل ہو گئی تو میں جھورا مچھلی فروش کی جانب متوجہ ہو گیا اور رعب دار آواز میں پوچھا۔

"ہاں بھئی جھورا...... کیا تم نے انسانوں کو بھی مچھلیاں سمجھ رکھا ہے کہ جس کے ساتھ تمہارا جو جی چاہے وہ سلوک کرو؟"

"تھانے دار صاحب! میری کوئی غلطی نہیں ہے۔" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر منت ریز لہجے میں بولا۔ "میں تو ایک سیدھا سادہ امن پسند انسان ہوں۔ نہر کے کنارے بنے ہوئے تالاب میں سے مچھلیاں پکڑتا ہوں اور پھر قصبے کے مین بازار میں اپنے ٹھیلے پر رکھ کر انہیں بیچتا ہوں۔ میرا کسی سے کیا لینا دینا۔"

"جب تمہارا کسی سے کوئی لینا دینا نہیں تو پھر تم نے ماسٹر عنایت کے ساتھ بدتمیزی کیوں کی؟" میں نے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

میں اگر چاہتا تو ایک بھی سوال کیے بغیر جھورا کو

حوالات میں ڈال دیتا۔ ہمارا مارچ کا کوٹا پورا ہو جاتا۔ اللہ اللہ، خیر سلا...... لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میرا یہ عمل انصاف کے اصولوں کے منافی ہوتا لہٰذا میں اپنی تسلی اور ضمیر کے اطمینان کے لیے اس سے پوچھ تاچھ کر رہا تھا۔

''تھانے دار صاحب! برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔'' وہ برہمی سے بولا۔ ''اس ماسٹر عنایت نے کافی دنوں سے میرا دماغ خراب کر رکھا تھا۔ میں نہ صرف اس کی روز سن لیتا بلکہ اس کے کہے پر عمل بھی کرتا جا رہا تھا لیکن آج تو میری کھوپڑی ہی گھوم گئی۔ میں اس کی عمر کا احساس کرتے ہوئے برداشت کرتا چلا جا رہا تھا۔ بس جناب......'' ذرا دیر کو رک کر اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''آج میرا صبر جواب دے گیا اور...... میرے ہاتھ اس کے گریبان تک جا پہنچے......''

منطقی طور پر جھورا کی بات میں وزن نظر آتا تھا۔ اس کا تجزیہ انسانی نفسیات کے عین کے مطابق تھا لیکن میرے لیے یہ جاننا بہت ضروری تھا کہ ماسٹر عنایت نے جھورا کے ساتھ ایسا کیا کر دیا تھا جس کے نتیجے میں اس کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا تھا۔

''ماسٹر عنایت...... تم سے کیا کہتا تھا؟'' میں نے جھورا سے پوچھا۔ ''اور تم اس کی کون سی باتوں پر عمل کرتے چلے جا رہے تھے؟''

میرے سوال کے جواب میں جھورا نے ایک دلچسپ کہانی سنائی۔ میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ کہانی کی سنجیدہ فضا میں کچھ لطافت پیدا ہو اور آپ بھی تھوڑا انجوائے کر سکیں۔

جھورا نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنے ٹھیلے پر ایک بورڈ نصب کر رکھا تھا جس پر جلی حروف میں یہ عبارت درج تھی۔ ''یہاں پر تازہ مچھلی فروخت ہوتی ہے۔'' ایک روز ماسٹر عنایت جھورا کے ٹھیلے پر پہنچا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے جھورا سے پوچھا۔

''کیا اس قصبے میں کوئی اور شخص بھی مچھلی فروخت کرتا ہے؟''

ماسٹر عنایت کو مچھلی کا کوئی گاہک سمجھ کر جھورا نے خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ ماسٹر عنایت مچھلی کے نرخ دریافت کرتا اور بھاؤ تاؤ کے بعد اس سے مچھلی خریدتا، اس نے جھورا سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

جھورا نے اس کے استفسار کا برا نہیں منایا اور پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''نہیں ماسٹر جی! نجیب آباد میں مچھلی بیچنے والا میں واحد بندہ ہوں۔''

''اور یہ بات نجیب آباد میں بسنے والے لگ بھگ ایک ہزار افراد کو معلوم بھی ہے؟'' ماسٹر عنایت نے سوالیہ انداز میں جھورا کی طرف دیکھا۔

قصبہ نجیب آباد میں کافی گھر تھے۔ اس حساب سے نجیب آباد کو ایک ہزار نفوس کا قصبہ کہا جا سکتا تھا۔

''جی...... سب کو پتا ہے۔'' جھورا نے بڑے فخر سے جواب دیا۔

''اللہ کے بندے......!'' ماسٹر عنایت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جب اس قصبے میں بسنے والے بچے بچے کو یہ بات معلوم ہے کہ تم نجیب آباد کے واحد مچھلی فروش ہو تو پھر تم نے بورڈ پر ''یہاں پر'' کے الفاظ کیوں لکھوا رکھے ہیں۔ اس سے تو یہی تاثر ابھرتا ہے کہ ''یہاں'' کے علاوہ ''وہاں'' یعنی کہیں اور بھی مچھلی فروخت ہو رہی ہے۔''

ماسٹر عنایت اللہ کی بات جھورا کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے بورڈ پر سے ''یہاں پر'' کے الفاظ مٹوا دیے۔ اب وہاں پر یہ عبارت رہ گئی۔ ''تازہ مچھلی فروخت ہوتی ہے۔''

دو روز کے بعد ماسٹر عنایت پھر ادھر سے گزر رہا تھا تو جھورا نے بڑے ادب سے اسے سلام کیا۔ ''ماسٹر جی! السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام!'' ماسٹر عنایت نے بڑی کراری آواز میں اس کے سلام کا جواب دیا اور کہا۔ ''جھورا...... ایک بات تو بتاؤ!''

''جی پوچھیں......!'' جھورا اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''کیا کبھی تم نے اپنے ٹھیلے پر باسی مچھلی بھی فروخت کی ہے؟'' ماسٹر عنایت نے اس سے پوچھا۔

''نہیں جی۔ کبھی نہیں۔'' جھورا نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''میں روزانہ صبح تالاب میں سے تازہ مچھلی پکڑتا ہوں اور دن بھر اپنے ٹھیلے پر رکھ کر بیچتا ہوں۔ جب مچھلی ختم ہو جاتی ہے تو میں گھر چلا جاتا ہوں اور اگلے روز دوبارہ تازہ مچھلی کے ساتھ بازار میں آ جاتا ہوں۔''

''ہوں......!'' ماسٹر عنایت نے پرسوچ انداز میں گردن ہلائی پھر بولا۔ ''اور پورا نجیب آباد اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ تم روزانہ تازہ مچھلی ہی فروخت کرتے ہو؟''

''جی، ماسٹر جی! آج تک کسی نے شکایت نہیں کی۔''

''تو پھر......'' ماسٹر عنایت بورڈ کی جانب انگلی سے

اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ ”تازہ“ کا لفظ غیر ضروری ہے۔ اسے بھی مٹوا دو۔“

ماسٹر عنایت کے مشورے میں اچھا خاصا وزن تھا۔

جھورا نے اسی روز ماسٹر عنایت کی بات پر عمل کرتے ہوئے بورڈ پر سے لفظ ”تازہ“ حذف کرا دیا چنانچہ مذکورہ بورڈ کی عبارت اس ترمیم کے بعد کچھ اس طرح ہوگئی۔ ”مچھلی فروخت ہوتی ہے۔“

چند روز کے بعد ایک مرتبہ پھر ماسٹر عنایت، جھورا کے ٹھیلے پر موجود تھا۔ اب کی بار اس نے جھورا سے کہا۔

”یار! تمہارے ٹھیلے سے دو سو قدم دور ہوں تو مخصوص بو کی وجہ سے یہ خوبی پتا چل جاتا ہے کہ یہاں آس پاس کہیں مچھلی رکھی ہوئی ہے۔ تھوڑا آگے بڑھیں تو تمہارا ٹھیلا اور اس پر سجی ہوئی مچھلیاں بھی نظر آ جاتی ہیں۔ میرے خیال میں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تمہارے بورڈ پر ”مچھلی“ کا لفظ لکھا ہوا ہے یا نہیں۔ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟“

”آپ کی بات دل کو لگ رہی ہے ماسٹر جی۔“ جھورا نے کسی فرماں بردار شاگرد کی طرح جواب دیا۔

ماسٹر عنایت نے پوچھا ”پھر کیا ارادہ ہے؟“

”میں آج ہی لفظ ”مچھلی“ کو صاف کرا دوں گا۔“

”شاباش!“ ماسٹر عنایت نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔

اسی شام جھورا نے بورڈ پر سے ”مچھلی“ کا لفظ کھرچ ڈالا۔ بورڈ پر اب ”فروخت ہوتی ہے“ کے الفاظ باقی رہ گئے تھے۔

اسی بورڈ کو اپنے ٹھیلے پر سجائے اگلے روز بھی جھورا اپنے دھندے پر نکل کھڑا ہوا اور پورا دن وہ ماسٹر عنایت کا انتظار کرتا رہا تاکہ اس سے پوچھ سکے کہ ”فروخت ہوتی ہے“ کا کیا کرنا ہے لیکن ماسٹر عنایت اسے کہیں دکھائی نہیں دیا۔

لوگوں نے اس نوعیت کا انوکھا بورڈ ٹھیلے پر لگا دیکھا تو جھورا کا خوب مذاق اڑانا شروع کر دیا...... بھئی، کیا فروخت ہوتی ہے یہ تم نے کون سا دھندا شروع کر دیا کہ برائے فروخت چیز کا نام پتا معلوم نہیں؟ کہیں تم نے منشیات فروشی تو شروع نہیں کر دی؟ الغرض جتنے منہ، اتنی باتیں۔ جھورا نے لوگوں کے طعنوں سے تنگ آ کر ”فروخت ہوتی ہے“ کے الفاظ کو بھی صاف کروا دیا۔ اب بورڈ پر کوئی بھی تحریر باقی نہیں تھی۔

اکتیس مارچ کی سہ پہر ماسٹر عنایت ایک طرف سے نمودار ہوا۔ اس کا رخ جھورا کے ٹھیلے کی جانب تھا۔ قریب پہنچ کر اس نے نارمل انداز میں جھورا کو سلام کیا۔ جھورا نے بھی حسب معمول اس کے سلام کا جواب دیا۔ ان کے بیچ رسمی علیک سلیک ہوئی پھر اچانک ماسٹر عنایت بورڈ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تادیبی انداز میں بولا۔

”جھورا! تم بھی عجیب قسم کے احمق ہو۔ ٹھیلے پر سادہ بورڈ لٹکا رکھا ہے۔ اس طرح کیا خاک دھندا کرو گے۔ پاگل انسان! یہ پبلسٹی کا زمانہ ہے۔ اگر کاروبار کو چلانا ہے تو اس بورڈ پر اپنے دھندے کی مناسبت سے چند تعریفی کلمات لکھوا لو اور......“

ماسٹر عنایت کا بیان یہیں تک پہنچا تھا کہ جھورا کو اپنے جذبات پر قابو نہ رہا اور وہ کام دھندا چھوڑ کر تیزی سے ماسٹر عنایت پر جھپٹا پھر اس کا گریبان پکڑ کر غصیلے انداز میں اس کی ”مزاج پرسی“ کرنے لگا۔

یہ تھے وہ حالات جن کی روشنی میں منظور احمد عرف جھورا اس وقت میرے سامنے کھڑا تھا۔ ماسٹر عنایت نے اس بے چارے کے ساتھ جو ہینڈ کیا تھا، اس کے نتیجے میں جھورا کا ردعمل مجھے انتہائی فطری لگا تھا۔ میں جھورا کو اتنا خطاوار نہیں سمجھتا تھا کہ رات بھر کے لیے اسے حوالات میں بند کر دیتا۔ وہ کوئی عادی مجرم نہیں تھا۔ ماسٹر عنایت نے اس کے جذبات کے ساتھ جو کھلواڑ کی تھی، اس کے رزلٹ میں تو جھورا کو اسی طرح بلاسٹ ہونا چاہیے تھا۔ میں نے جھورا کی طرف دیکھتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں سرزنش کی۔

”جھورا! اپنے دماغ کو قابو میں رکھو۔ غصہ اچھی چیز نہیں ہے۔ ابھی تو گرمی صحیح معنوں میں شروع بھی نہیں ہوئی اور تم نے لوگوں پر گرمی دکھانا شروع کر دی ہے!“

”جی سرکار...... مجھے معاف کر دیں۔“ وہ عاجزی سے بولا۔ ”میں آئندہ اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھوں گا۔“

”یہ تمہاری پہلی شکایت مجھ تک پہنچی ہے اس لیے میں تمہیں معاف کر رہا ہوں۔“ میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ”اگلی بار اگر تم نے ایسی کوئی حرکت کی تو سیدھا جیل بھیج دوں گا۔“

”جی سرکار...... میں سمجھ گیا۔“ وہ ممنونیت بھرے انداز میں بولا۔

میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

اے ایس آئی کو میری یہ ادا عجیب سی لگی۔ وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ”ملک صاحب! یہ آپ نے کیا کیا؟ اب اس مخصوص کوٹے کا کیا ہوگا جو ہم نے آج کی تاریخ میں پورا کرنا ہے؟“

”اگر ہم نے وہ کوٹا پورا نہ کیا تو اوپر سے باز پرس کس سے کی جائے گی؟“ میں نے اے ایس آئی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تم سے یا مجھ سے؟“

''ظاہر ہے جی، باز پرس تو آپ ہی سے کی جائے گی۔'' وہ بہ دستور الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیونکہ اس تھانے کے انچارج آپ ہی ہیں۔''

''پھر تمہیں کس بات کی فکر لگی ہوئی ہے؟''

''وہ جناب ...... تھانے کی ساکھ کا خیال بھی تو رکھنا پڑتا ہے نا...... !'' میرے کڑے استفسار پر وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ہاں ...... تمہاری اس بات میں خاصا وزن ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ذرا روزنامچہ لے کر آؤ۔ تھانے کی ساکھ کو بھی دیکھ لیتے ہیں......'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر خود کلامی کے انداز میں کہا۔

''تھانے کی ساکھ کے ساتھ ہماری عزت و آبرو جڑی ہوئی ہے۔ اس کا خیال ہم نہیں رکھیں گے تو کون رکھے گا......؟''

اے ایس آئی کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اٹھا اور روزنامچہ لے کر واپس آ گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے روزنامچہ لے کر اس میں کچھ اندراج کیا پھر اے ایس آئی کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''چیک کرلو...... آج کی تاریخ میں تھانے کی ساکھ محفوظ ہوگئی ہے یا کوئی کسر باقی ہے؟''

میں نے روزنامچے میں اکتیس مارچ کی دوپہر میں منظور احمد عرف جھورا کی گرفتاری دکھائی تھی اور کڑی باز پرس کے بعد اسی تاریخ کی شام میں اس کی رہائی کا ذکر کیا تھا۔ وجۂ گرفتاری دنگا فساد اور سبب رہائی صلح صفائی بتایا گیا تھا۔ دونوں پارٹیوں کو روزنامچے کے ریکارڈ کے مطابق، گلے ملا کر خوشی خوشی تھانے سے رخصت کر دیا گیا تھا۔

''ملک صاحب! آپ نے بڑی کاریگری دکھائی ہے۔'' وہ روزنامچے کا جائزہ لینے کے بعد بولا۔ ''اس کو کہتے ہیں، نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آئے۔''

''جہاں زیب! میری ایک بات ذہن میں رکھنا'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر تم کسی گناہ گار کو سزا نہ دلوا سکو تو یہ اتنا سنگین جرم نہیں ہے جتنا یہ کہ تم کسی بے گناہ کو سزا دلوا دو۔''

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''تم جو کیس پکڑ کر لائے تھے، میں اس میں ماسٹر عنایت کو زیادہ قصوروار سمجھتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے رویے نے جھورا کے جذبات کو بری طرح مجروح کیا تھا جس کے نتیجے میں وہ ایک روز مشتعل ہو کر ماسٹر عنایت پر جھپٹ پڑا۔ کسی دن اس ماسٹر جی کو پکڑ کر تھانے لانا۔ میں اس کا خصوصی انٹرویو کرنا چاہتا ہوں۔ ذرا معلوم تو ہو کہ اس نے جھورا کے ساتھ یہ سب کیوں کیا؟''

''آپ جب کہیں، میں ماسٹر عنایت کو پکڑ لاؤں گا۔'' وہ بڑے عزم سے بولا۔

''ایسی کوئی جلدی نہیں ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا وہ نجیب آباد کے اسکول ہی میں پڑھاتا ہے؟''

قصبہ نجیب آباد میں ایک ہی پرائمری اسکول تھا جس میں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ ماسٹر عنایت کے جھورا کے ساتھ برتاؤ کو دیکھ کر مجھے اس بات کی فکر ہوگئی تھی کہ وہ کھسکا ہوا ماسٹر معصوم ذہنوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوگا...... !

''عنایت اسکول ماسٹر نہیں ہے ملک صاحب۔'' جہاں زیب نے مجھے بتایا۔

''پھر اس کے نام کے ساتھ ''ماسٹر'' کا دم چھلا کیوں لگا ہوا ہے؟''

''اس بارے میں مجھے زیادہ پتا نہیں ہے۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''وہ اس علاقے کا پرانا رہنے والا نہیں۔ وہ کچھ عرصہ پہلے ہی نجیب آباد آیا ہے۔ سنا ہے، اس سے پہلے وہ ضلع قلعہ شیخوپورہ میں رہتا تھا۔ میں اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنے کے بعد آپ کو بتاؤں گا ملک صاحب۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

ضلع لائل پور اور ضلع قلعہ شیخوپورہ ازلی ابدی پڑوسی اضلاع ہیں لیکن امتدادِ زمانہ نے ان میں کافی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ لائل پور، فیصل آباد بن گیا ہے اور قلعہ شیخوپورہ میں سے ''قلعہ'' غائب ہو گیا ہے۔ نئی نسل اسے صرف ''شیخوپورہ'' کے نام ہی سے جانتی ہے لیکن ایک اچھی بات یہ ہے کہ یہ دونوں اضلاع آج بھی ایک دوسرے کے ''پڑوسی'' ہی ہیں!

☆☆☆

چار اپریل کی صبح میں حسب معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو پتا چلا، ایک عورت میرے انتظار میں بیٹھی ہے۔ میں نے مذکورہ عورت کو فوراً اپنے کمرے میں بلا لیا۔ اتنی صبح کسی عورت کا تھانے آنا تو یہی ظاہر کرتا تھا کہ وہ کسی مصیبت میں ہے۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد کانسٹیبل نے اس عورت کو میرے پاس پہنچا دیا۔ میرے اندازے کے مطابق، اس کی عمر پینتیس کے اریب قریب تھی۔ وہ درمیانے قد کی مالک، گندمی

رنگت والی ایک خوش شکل عورت تھی۔ چہرے سے وہ کافی فکر مند دکھائی دیتی تھی۔ میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''بیٹھو بی بی......!''

وہ اپنی چادر کو سنبھالتے ہوئے میری میز کی دوسری جانب بچھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''تم کافی پریشان نظر آرہی ہو؟'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بتاؤ، مسئلہ کیا ہے؟''

''میں اپنے گھر والے کی طرف سے بہت پریشان ہوں تھانے دار صاحب۔'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔

''تمہارے خاوند کا نام کیا ہے؟'' میں نے ہمدردی بھرے انداز میں پوچھا۔ ''اور اسے کیا ہوا ہے جو تم اس قدر گھبرائی ہوئی ہو؟''

''جھورا رات کو گھر نہیں پہنچا......'' وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

جھورا کے نام پر میں چونکا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر پوچھا۔ ''کیا تم اسی جھورا کی بیوی ہو جو نجیب آباد کے مین بازار میں مچھلی کا ٹھیلا لگاتا ہے؟''

''جی...... جی......'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''کیا آپ میرے گھر والے کو جانتے ہیں؟'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''کچھ خاص تو نہیں جانتا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بس، ایک آدھ بار ملاقات ہوئی ہے......'' لمحاتی توقف کے بعد میں نے اضافہ کیا۔ ''کیا جھورا کا ماسٹر عنایت سے دوبارہ جھگڑا تو نہیں ہو گیا؟''

''نہیں جی۔ ماسٹر عنایت سے تو اس کی بات چیت ہی بند ہے۔''

''پھر...... کسی اور گاہک کے ساتھ کوئی منہ ماری......؟''

''نہیں تھانے دار صاحب! کل تو جھورا نے ٹھیلا لگایا ہی نہیں۔'' اس نے بتایا۔

''پھر وہ کہاں گیا ہوا تھا جو رات کو واپس گھر نہیں آیا؟'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''میں بتاتی ہوں جی......'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے بولی۔ ''جھورا ہفتے میں ایک دن ٹھیلا نہیں لگاتا۔ سمجھ لیں کہ اس کی چھٹی ہوتی ہے۔ کل بھی اس کا چھٹی کا دن تھا اس لیے وہ چنی وال چلا گیا تھا اور یہ کہہ کر گیا تھا کہ رات کو واپس آجاؤں گا مگر وہ نہیں آیا......'' بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''میں نے ساری رات بڑی اذیت میں گزاری ہے اور صبح ہوتے ہی میں آپ کے پاس چلی آئی ہوں......''

بات کے اختتام پر وہ دوپٹے کے پلو سے اپنی نم آنکھوں کے گوشے خشک کرنے لگی۔

موضع چنی وال، قصبہ نجیب آباد سے پانچ میل کے فاصلے پر مغرب میں واقع تھا۔ ان دونوں گاؤں کے بیچ گھنا جنگل پایا جاتا تھا اور اس جنگل کے وسط میں ایک نہر شمالاً جنوباً بہتی تھی۔ یہ دونوں دیہات میرے تھانے کی حدود میں آتے تھے۔ میرے استفسار پر جھورا کی بیوی نے اپنا نام صفیہ بتایا تھا اور یہ بات بھی میرے علم میں آگئی تھی کہ ان کی شادی کو لگ بھگ پندرہ سال کا عرصہ گزر گیا تھا مگر وہ ابھی تک اولاد ایسی نعمت سے محروم تھے۔ بچوں کے نہ ہونے کا دکھ کوئی بے اولاد ہی محسوس کر سکتا ہے......!

''صفیہ! جھورا چنی وال کیا لینے گیا تھا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہاں اس کا ایک دوست رہتا ہے۔'' اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''اس کا نام تنویر جٹ ہے۔ جھورا تنویر جٹ سے کچھ رقم لینے گیا تھا۔''

رقم کے نام پر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ''کتنی رقم؟''

''ایک ہزار روپے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اوہ......!'' میں ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

میری حیرت کا سبب یہ تھا کہ جس زمانے کا یہ واقعہ ہے تب ایک ہزار روپے خاصی بڑی رقم شمار ہوتی تھی۔ آج کل اگر اس زمانے کا ذکر کریں تو نئی نسل اسے کوئی فکشن اسٹوری سمجھتی ہے۔ آپ خود سوچیں کہ موجودہ زمانے کے ممی ڈیڈی چکن برگر بچوں کو کس طرح یقین آئے گا کہ اس زمانے میں سونا اسّی نوّے روپے تولہ یعنی دس روپے فی گرام اور اعلیٰ درجے کی گندم پانچ روپے فی من (چالیس کلوگرام) فروخت ہوتی تھی۔ نئی نسل تو اس بات کا مذاق ہی اڑائے گی ناکہ...... میں جس ایک ہزار روپے کو بہت بڑی رقم کہہ رہا ہوں اتنے پیسوں کی تو وہ ایک وقت میں آئس کریم کھا جاتے ہیں۔ ایسی سوچ رکھنے میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کے علاوہ روپے پیسے کی عزت و توقیر بھی جاتی رہی ہے...... شاید اسی کو انقلاباتِ زمانہ اور نیرنگیِ دوراں کہا جاتا ہے!

''یہ ایک ہزار روپے جھورا، تنویر جٹ سے کس سلسلے میں لینے گیا تھا؟'' میں نے صفیہ سے پوچھا۔

''ادھار!'' اس نے بتایا۔ ''اصل میں بات یہ ہے کہ نہر کے کنارے زمین کا ایک ٹکڑا ہمیں پندرہ سو روپے میں مل رہا ہے۔ پانچ سو روپے ہمارے پاس رکھے ہیں۔ جھورا اپنے دوست سے ایک ہزار روپے قرض مانگنے چنی وال گیا تھا تاکہ ہم زرعی زمین کا یہ ٹکڑا خرید لیں۔''

نجیب آباد اور چنی وال کے درمیان جیسا کہ میں نے پہلے بتایا، ایک گھنا جنگل پایا جاتا تھا جس میں انسان یا تو ذاتی سواری یعنی گھوڑے وغیرہ پر سفر کرسکتا تھا اور یا پھر پیدل۔ لوگ عموماً پیدل سفر سے گریز کرتے تھے کیونکہ جنگل کے ساتھ ڈاکوؤں کے بعض قصے جڑے ہوئے تھے۔ میرے لیے یہ سب سنی سنائی باتیں تھیں۔ اگر میں کچھ عرصے کے لیے اس تھانے میں ٹک جاتا تو پھر ذاتی تجربہ حاصل کرنے کا موقع مل سکتا تھا۔ میں نے صفیہ سے پوچھا۔

''جھورا کس چیز پر بیٹھ کر چنی وال گیا تھا؟''

''وہ پیدل ہی گیا تھا جی۔'' اس نے بتایا۔ ''جھورا کو پیدل چلنے کا بہت شوق ہے۔ دس بیس میل تو اس کے لیے کوئی بات ہی نہیں۔ وہ کہتا ہے، دس میل چلنے کے بعد تو انسان کا انجن اسٹارٹ ہوتا ہے......''

بات کے اختتام پر اس کے آنسو نکل آئے۔ میں نے تسلی تشفی دے کر اسے قدرے نارمل کیا۔ جب وہ میری بات سننے کے قابل ہوگئی تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ جھورا رات کو اپنے دوست ہی کے پاس رک گیا ہو اور آج دن میں کسی وقت نجیب آباد واپس آجائے!''

''تھانے دار صاحب! یہ ناممکن ہے۔'' وہ بڑے وثوق سے بولی۔ ''وہ مجھ سے وعدہ کرکے گیا تھا کہ سورج غروب ہونے سے پہلے وہ لوٹ آئے گا اسی لیے تو میں اتنا پریشان ہو رہی ہوں۔''

صفیہ کی بات اپنی جگہ۔ عین ممکن ہے کہ اس کا اعتماد بہت مضبوط ہو لیکن میں منطقی طور پر اس امکان کو نظر انداز نہیں کرسکتا تھا کہ...... جھورا کسی سبب چنی وال میں رک گیا ہو۔

میں تھوڑی دیر تک چپ بیٹھا اسے آنسو بہاتے دیکھتا رہا۔ اس کا غبار قدرے ڈھل گیا تو میں نے محتاط انداز میں سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔

''کیا نجیب آباد میں تمہارے اور رشتے دار بھی رہتے ہیں؟''

یہ سوال میں نے اس لیے کیا تھا کہ وہ اپنے گمشدہ شوہر کی رپورٹ لکھوانے اکیلی تھانے آئی تھی۔ اس نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

تیر کام

گاڑیوں میں ذاتی طور پر ہمیں گدھا گاڑی بہت پسند ہے اس کی وجہ اس کا یا ہمارا گدھا پن نہیں بلکہ اس میں ہینگ لگتی ہے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آتا ہے، بس ایک گدھے کی ضرورت ہوتی ہے جن کی ہمارے ہاں کبھی کمی نہیں رہی، اس پر جتنا چاہے وزن لاد دیجئے اور دوسری گاڑیوں کی طرح یہ پنکچر ہوتا ہے نہ اس کا انجن جواب دیتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ گدھا ڈھینچوں ڈھینچوں کرکے ہلکا سا رسمی احتجاج کرے گا، بہت ہوا تو ایک آدھ ہوائی دولتی جھاڑ دے گا لیکن بھرے بازار میں کون اس کی سنے گا، نقار خانے کی طوطی کی طرح اس کی ڈھینچوں ڈھینچوں بھی صدا بالصحرا ثابت ہوگی، ایک یہ پیدائشی گدھا ہے اور دوسرا یہ کہ آپ کے ہاتھ میں پکڑے چابک پر بھی منحصر ہے کہ آپ اسے مزید کہاں تک گدھا بنا سکتے ہیں۔ گدھا گاڑی اور کار کا فرق تو آپ کو پتا ہے کہ گدھا گاڑی میں گدھا باہر ہوتا ہے۔

یہ زمانہ پہیوں کا زمانہ ہے، پتھر اور دھات کے زمانوں سے انسان بخیریت گزر آیا ہے لیکن ''پہیے'' کے دور میں اس کی خیریت مشکوک ہوگئی ہے۔ ایک پروفیسر صاحب آخری شو دیکھ کر نکلے، اسکوٹر اسٹارٹ کیا، ساری رات اسکوٹر چلتا رہا لیکن گھر نہ آیا، صبح ہوگئی، غور کیا تو پتا چلا کہ آپ اسکوٹر کو اسٹینڈ سے اتارنا بھول گئے تھے اور کچھ لوگ تو سلوک کی آخری منزل تک جا پہنچتے ہیں، ایک صاحب بے تحاشا پیے ہوئے تھے، ٹیکسی کا دروازہ کھول کر دھڑام سے سیٹ پر گرتے ہوئے ڈرائیور سے گویا ہوئے ''ریگل چوک چلو۔''

''جناب، یہ ریگل چوک ہے۔'' ڈرائیور نے جواب دیا۔

انہوں نے دوسرا دروازہ کھولا اور بہ مشکل اترتے ہوئے کہا ''ٹھیک ہے، یہ لو پیسے لیکن آئندہ اتنا تیز مت چلنا۔''

(چلتی کا نام......از عطاء اللہ عالی)

"جھورا کے چند رشتے دار نجیب آباد میں بستے ہیں لیکن میری ان سے زیادہ نہیں بنتی۔"

"کیا تم نے کسی رشتے دار سے جھورا کے بارے میں پوچھا؟"

"نہیں جی۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "میرا سسرالی رشتے داروں سے ملنا جلنا نہیں ہے اس لیے میں نے کسی سے کچھ نہیں پوچھا اور نہ ہی میں نے کسی کو اپنی پریشانی کے بارے میں بتایا ہے۔"

"یہ بات تمہارے علاوہ اور کس کس کو معلوم تھی کہ جھورا، چنی وال پیسے لینے گیا ہے؟" میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

"کسی کو بھی نہیں تھانے دار صاحب۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ جھورا صرف چنی وال ہی گیا تھا؟"

اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولی۔

"میں کچھ سمجھی نہیں جی......!"

"میرا مطلب یہ ہے کہ......" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ہوسکتا ہے، چنی وال کے علاوہ بھی جھورا نے کہیں اور جانے کا پروگرام بنا رکھا ہو اور وہ اپنے پروگرام کے مطابق، آگے کہیں اور نکل گیا ہو!"

"جھورا جب بھی نجیب آباد سے باہر جاتا ہے تو مجھے اپنے پروگرام کے بارے میں تفصیل سے بتاتا ہے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "اس سلسلے میں اس نے کبھی مجھ سے غلط بیانی نہیں کی۔ اگر اسے چنی وال کے علاوہ بھی کہیں جانا ہوتا تو مجھے ضرور بتاتا۔"

"اور تمہیں اس بات کا بھی یقین ہے کہ......" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ "جھورا کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ بھی نہیں تھی؟"

"دیکھیں جی......" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "بندے کے جہاں دس دوست ہوتے ہیں، وہاں ایک آدھ دشمن بھی ہوتا ہے مگر آج تک کسی سے اس کا کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔"

"یہ تو نہ کہو کہ جھورا نے کبھی کسی کے ساتھ دنگا فساد نہیں کیا۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "شاید تمہیں ماسٹر عنایت والے واقعے کا علم نہیں ہے اس لیے یہ بات کہہ رہی ہو......!"

"جھورا نے مجھے اس واقعے کے بارے میں بتایا تھا۔" وہ بولی۔ "ماسٹر عنایت ایک جھکی اور کھسکا ہوا انسان ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ وہ اس دن والے واقعے کی وجہ سے جھورا کو کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ماسٹر عنایت کی تو اکثر لوگوں سے ایسی منہ ماریاں ہوتی رہتی ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں جنگل میں اس کے ساتھ کوئی اونچ نیچ نہ ہوگئی ہو۔"

"ٹھیک ہے صفیہ!" میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ "میں تمہارے شوہر کو جنگل اور آس پاس کے علاقوں میں تلاش کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ تم بے فکر ہوکر گھر جاؤ۔ جیسے ہی مجھے جھورا کا سراغ ملتا ہے، میں تمہیں بتادوں گا۔ ویسے پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں۔ مجھے امید ہے کہ جھورا جہاں بھی گیا ہے، وہ آج شام تک گھر واپس آجائے گا۔"

"اللہ آپ کی زبان مبارک کرے جی۔" وہ تشکرانہ انداز میں بولی۔

وہ میرے کمرے سے نکلی تو میں جھورا کے بارے میں سوچنے لگا۔ پہلا امکان تو یہی تھا کہ وہ رات کو چنی وال میں تنویر جٹ کے پاس رک گیا ہوگا اور آج شام سے پہلے کسی وقت نجیب آباد پہنچ جائے گا۔ دوسرا امکان (جیسا کہ صفیہ نے بھی خدشہ ظاہر کیا تھا) اس بات کا تھا کہ چنی وال سے واپسی پر گھنے جنگل میں اسے کوئی حادثہ پیش آگیا ہو۔ اس کے پاس ایک موٹی رقم تھی (اگر تنویر جٹ نے واقعتاً اسے ایک ہزار روپے ادھار دے دیے تھے تو......) اگر کسی مجرمانہ ذہن والے شخص کو اس رقم کی خبر تھی تو وہ مذکورہ رقم کے حصول کے لیے جھورا کے ساتھ کوئی بھی ناروا سلوک کرسکتا تھا جس میں جھورا کی جان لینا بھی شامل تھا۔ پھر میں نے گھنے جنگل میں ڈاکوؤں کی کارروائیوں کی کہانیاں بھی سنی تھیں۔ ایک امکان یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ واپسی کے سفر میں ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گیا ہو...... اور آخری امکان ماسٹر عنایت کا تھا۔ اکتیس مارچ والے ناخوشگوار واقعے میں جھورا نے ماسٹر عنایت کو برا بھلا کہنے کے علاوہ دو چار ہاتھ بھی چھوڑ دیے تھے۔ عین ممکن تھا کہ ماسٹر عنایت نے اس دن کی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے جھورا کے ساتھ کوئی الٹی سیدھی حرکت کردی ہو۔ جب میرا دماغ تفتیشی انداز میں سوچتا تھا تو پھر میں معمولی سے معمولی بات کو بھی نظرانداز نہیں کرتا تھا۔

میں اسی ادھیڑبن میں مصروف تھا کہ ایک کانسٹیبل نے آکر مجھے بتایا۔ "ملک صاحب! باہر بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔"

"کیسی گڑبڑ؟" میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

"ابھی جو بی بی آپ سے مل کر گئی ہے، باہر کسی بندے سے اس کا پھڈا ہوگیا ہے۔" کانسٹیبل نے انکشاف

انداز میں بتایا۔

صفیہ اکیلی تھانے آئی تھی اور تھانے سے نکلتے ہی کسی بندے سے اس کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ لامحالہ میرا ذہن ماسٹر ہدایت کی طرف چلا گیا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کانسٹیبل سے کہا۔

''چلو دیکھتے ہیں، مسئلہ کیا ہے......''

میں تھانے سے باہر آیا تو میں نے صفیہ کو ایک شخص کے روبرو کھڑے پایا۔ دونوں میں کسی بات پر تکرار ہو رہی تھی۔ میں ان کے قریب چلا گیا اور میں نے صفیہ کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ اس کا مخاطب وہی شخص تھا۔

''تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟'' صفیہ کے استفسار سے شدید نوعیت کی نفرت جھلکتی تھی۔

اس بندے نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ''آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ اکیلی ہی تھانے چلی آئیں؟''

''کیا اب کہیں آنے جانے کے لیے مجھے تم سے اجازت لینا ہوگی؟'' صفیہ نے جارحانہ انداز میں کہا۔

''میرا مطلب تھا......'' وہ کھسیانا سا ہو کر بولا۔ آپ نے مجھے بتایا ہوتا۔ میں آتا آپ کے ساتھ......'' اس شخص کے انداز میں شکوہ تھا۔

''ہاں جوان......!'' میں نے اس بندے کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کون ہو اور اس بی بی کو کیوں تنگ کر رہے ہو؟''

''جناب! میرا نام جمیل ہے۔'' وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ ''صفیہ میری بھابی ہیں...... بھائی جھورا کی گھر والی۔''

اب بات میری سمجھ میں آگئی کہ وہ شخص یعنی جمیل، صفیہ کا دیور تھا۔ جمیل کی عمر تیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ اس نے اوباشوں کی طرح اپنی قمیص کے سامنے والے بٹن کھول رکھے تھے اور اس کے خال و خط بڑی حد تک جھورا سے مشابہت رکھتے تھے۔ صفیہ نے سرسری انداز میں مجھے بتایا تھا کہ سسرالی رشتے داروں سے اس کا میل جول نہیں تھا اور اس کا حالیہ رویہ بھی اسی امر کی غمازی کرتا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ صفیہ اپنے دیور کو سخت ناپسند کرتی تھی۔

میں صفیہ کو ایک طرف لے گیا اور دھیمی آواز میں پوچھا۔ ''لگتا ہے، تم اپنے دیور سے سخت ناراض ہو......؟''

''ناراض...... بہت چھوٹا لفظ ہے تھانے دار صاحب!'' وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولی۔ ''اگر میرے بس میں ہو تو

ظلم وانصافی

ایک گاؤں سے طوطا اور طوطی گزر رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ گاؤں کی حالت بہت خستہ ہے، پیڑ پودے مرجھائے ہوئے ہیں۔ صرف چند قلعہ نما حویلیاں کھڑی نظر آ رہی ہیں۔ طوطے کی نظر ایک سوکھے ہوئے درخت پر پڑی۔ اس پر ایک الو بیٹھا ہوا تھا۔

طوطے نے کہا۔ ''اس الو کی وجہ سے گاؤں پر نحوست ہے۔'' الو نے جب یہ الفاظ سنے تو فوراً ان کے پاس پہنچا اور کہا۔

''یہ طوطی میری بیوی ہے۔'' طوطے نے کہا۔

''کچھ عقل سے کام لو، یہ میری بیوی ہے۔ اس کا رنگ آواز غرض کوئی بھی چیز تم سے نہیں ملتی۔''

الو نے کہا۔ ''چلو گاؤں والوں سے اس کا انصاف کروا لیتے ہیں۔'' گاؤں کے چودھری نے فیصلہ الو کے حق میں دے دیا۔ الو نے لوگوں کی طرف دیکھا وہ صرف سر ہلا رہے تھے۔ انہوں نے اس ظلم اور ناانصافی پر کوئی احتجاج نہ کیا۔ طوطا روتا پیٹتا چلا گیا تو الو اس کے پیچھے طوطی کو لے کر گیا اور اس سے کہا۔

''اپنی بیوی کو ساتھ لے جا...... نحوست میری وجہ سے نہیں اس ظلم اور ناانصافی کی وجہ سے ہے جس کا سب ساتھ دے رہے ہیں۔''

(مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ)

میں اس مردود کی گچی مروڑ ڈالوں......''

وہ جمیل کی گچی یعنی گردن مروڑنے کی بات کر رہی تھی۔ اس کے لہجے کی سنگینی سے پتا چلتا تھا کہ اگر واقعی صفیہ کو ایسا کوئی موقع میسر آ گیا تو وہ اپنے عزائم کو عملی جامہ پہنانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرے گی۔

''اس بے پناہ نفرت کا سبب جان سکتا ہوں؟'' میں نے صفیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں پوچھا۔

''جیلا ایک زہریلا سانپ ہے تھانے دار صاحب!'' وہ اذیت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''جس شخص سے ہر لمحے نقصان پہنچنے کا اندیشہ رہے، اس سے محبت کیونکر کی جا سکتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جیلا میرا دیور ہے لیکن میرے دل و دماغ میں اس کمینے کے لیے نفرت ہی نفرت ہے......''

''تم میرے سوال کو سمجھ نہیں پائی ہو۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''جمیل عرف جیلا کے لیے تمہارے دل میں

تمہاری نفرت کو تو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ لیا ہے۔ اب میں اس نفرت کا سبب جاننا چاہتا ہوں؟''

''یہ ایک لمبی چوڑی داستان ہے۔'' صفیہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''کبھی فرصت ملی تو آپ کو ضرور سناؤں گی۔ بس اتنا جان لیں تھانے دار صاحب...... مجھے اپنی سسرال والوں کی جانب سے آج تک کوئی سکھ نہیں ملا۔''

میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ صفیہ نے جیلا والے موضوع کو دانستہ ٹالنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا اور چند لمحات تک چپ چاپ کھڑا اس دکھی عورت کو دیکھتا رہا۔ صفیہ جیسی دل کش عورت کو رنجیدہ اور ملول دیکھنا بڑے افسوس اور دکھ کی بات تھی۔ میں ان لمحات میں اپنے دل میں صفیہ کے لیے بے پناہ ہمدردی محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنے گھر والے کے لیے پریشان اور فکر مند تو تھی ہی، اس کے علاوہ وہ اپنے چہرے سے ظلم وستم کا شکار بھی نظر آتی تھی۔

''اس بدذات کے بارے میں زیادہ نہ سوچیں تھانے دار صاحب!'' وہ سلگتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''آپ اپنی ساری توانائی میرے گھر والے کو تلاش کرنے پر لگائیں۔''

''صفیہ! تم فکر نہ کرو۔'' میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ''میں جھورا کی تلاش میں چنی وال جا رہا ہوں۔ وہ جہاں بھی ہوگا، میں اسے ڈھونڈ کر تمہارے پاس لاؤں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔''

''بہت بہت شکریہ تھانے دار صاحب۔'' وہ ممنونیت بھرے انداز میں بولی۔ ''میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی۔''

میں صفیہ کو رخصت کرنے کے بعد جمیل عرف جیلا کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''اگر صفیہ تمہاری بھابی ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم اسے تنگ کرتے پھرو......؟''

''جناب! میں نے بھابی کو بالکل بھی تنگ نہیں کیا۔'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔

''جب وہ تم سے کوئی بات کرنے کی روادار نہیں...... میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''حتیٰ کہ تمہارا بار بار 'بھابی' کہنا بھی اسے ناگوار گزر رہا ہے تو پھر تم اس سے دور کیوں نہیں ہو جاتے؟''

''تھانے دار صاحب! مجھے پتا چلا ہے کہ جھورا بھائی رات کو گھر نہیں پہنچا تو میں پریشان ہو گیا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں اسی لیے تھانے آیا تھا کہ جھورا کی گمشدگی کے بارے میں آپ کو بتاؤں اور یہاں پہنچ کر پتا چلا کہ صفیہ بھابی اکیلی ہی تھانے پہنچی ہوئی ہے تو میں نے ان سے پوچھ لیا۔ بس اتنی سی بات ہے......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا، بھابی مجھ سے اکھڑی اکھڑی کیوں رہتی ہے؟''

''یہ راز میں بھی جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔ ''آؤ...... اندر بیٹھ کر دونوں اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔''

صفیہ نے جیلا کے لیے ''کمینہ، بدذات، مردود، زہریلا سانپ'' ایسے الفاظ استعمال کر کے اس امر کی تصدیق تو کر دی تھی کہ ان دونوں کے بیچ کوئی گمبھیر معاملہ چل رہا تھا لیکن میرے استفسار پر وہ بڑی خوب صورتی سے ٹال گئی تھی۔ عین ممکن تھا کہ میں فریقِ ثانی یعنی جمیل عرف جیلا کی زبان سے کچھ اگلوانے میں کامیاب ہو جاتا۔ اسی خیال سے میں نے اسے اندر چلنے کو کہا تھا۔

وہ میری اس پیشکش پر بدک گیا۔ ''آپ مجھے تھانے کیوں لے جانا چاہتے ہیں؟'' وہ ہراساں نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''تمہیں اندر جاتے ہوئے ڈر کیوں لگ رہا ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''کیا تم نے کوئی سنگین جرم کیا ہے؟''

''نن...... نہیں جناب......'' وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں نے تو کچھ نہیں کیا تھانے دار صاحب۔''

''جب تم نے کچھ نہیں کیا تو پھر تھانے سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''صرف مجرموں کو تھانے کے اندر جاتے ہوئے گھبراہٹ محسوس ہوتی ہے۔ تمہارے ہاتھ پاؤں اور دامن تو صاف ہے نا......؟''

''جی، جی...... تھانے دار صاحب۔'' وہ جلدی سے بولا۔

میں جیلا کو اپنے ساتھ لے کر تھانے کے اندر آ گیا۔

قبل اس کے کہ میں جیلا کا انٹرویو شروع کرتا، میں نے اے ایس آئی کو اپنے پاس بلا کر کہا۔

''جہاں زیب! تم جا کر ماسٹر عنایت کو پکڑ لاؤ۔ اب اس سے پوچھ گچھ ضروری ہو گئی ہے۔ ذرا میں بھی تو سنوں کہ مچھلی کے بزنس پر اس نے کون کون سا مقالہ لکھ رکھا ہے......!''

''ٹھیک ہے ملک صاحب۔'' جہاں زیب نے فرماں برداری سے کہا۔ ''میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔''

پھر میں جیلا کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ شکایتی لہجے میں

بولا۔ ''تھانے دار صاحب! یہ تو بڑی ناانصافی والی بات ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جناب! یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ بھائی جھورا کہیں غائب ہو گیا ہے۔'' وہ خفگی بھرے انداز میں بولا۔ ''اور بھابی صفیہ نے مجھے بتانا تک گوارا نہیں کیا۔ وہ اکیلی ہی تھانے چلی آئی ہے۔ میرا بھائی گم ہوا ہے اور مجھے ہی اس معاملے سے الگ رکھا جا رہا ہے۔ یہ ناانصافی نہیں تو اور کیا ہے!''

''تمہیں اس معاملے سے الگ تمہاری بھابی نے رکھا ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اور میں نے دیکھا ہے، صفیہ تم سے کافی ناراض ہے۔ یہ تم لوگوں کا خاندانی معاملہ ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تم دیور بھابی کے بیچ کون کون سے اختلافات پل رہے ہیں لیکن تم دل چھوٹا نہ کرو۔ میں تمہیں جھورا کی گمشدگی والے معاملات سے علیحدہ نہیں رکھوں گا۔''

''بہت بہت شکریہ تھانے دار صاحب!'' وہ آسودگی بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''اللہ آپ کا بھلا کرے۔ ذرا مجھے بتائیں تو سہی، بھائی جھورا کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے؟''

''اس بارے میں تو میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ صفیہ کی تم سے کیا دشمنی ہے؟ وہ تم سے اتنی بیزار کیوں نظر آتی ہے؟''

''مجھے تو لگتا ہے، بھابی جی کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' وہ بُرا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''بے اولادی کے دکھ نے اسے ذہنی اور نفسیاتی مریض بنا دیا ہے۔''

مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ وہ بھی صفیہ کے لیے اپنے دل میں بھلائی اور اچھائی کے جذبات نہیں رکھتا تھا۔ گویا رنجشوں اور عداوتوں کی یہ تالی دو ہاتھوں سے بج رہی تھی جن میں ایک ہاتھ صفیہ کا تھا اور دوسرا جیلا کا۔ میں نے اس سلسلے میں صفیہ کو کریدنے کی کوشش کی تھی مگر مجھے اس مقصد میں سرِدست کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اب یہی کوشش میں نے جیلا پر کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ تمہاری بھابی کا دماغ ٹھکانے پر نہیں ہے ورنہ پریشانی کے وقت تو ہمیشہ اپنوں کی طرف دیکھا جاتا ہے اور تم تو صفیہ کے

انتظار

امریکی عدالت میں ایک عورت نے درخواست دی کہ میری شادی کو ایک سال گزر گیا ہے لیکن میرے شوہر نے آج تک مجھ سے ایک بات بھی نہیں کی۔ عدالت نے شوہر کو بلا کر وجہ پوچھی تو وہ بڑی معصومیت سے بولا۔ ''جناب! میں اپنی بیوی کی قطع کلامی نہیں کرنا چاہتا تھا اور اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔''

(مرسلہ: جاوید اختر رانا۔ پاکپتن شریف)

دیور بعد میں اور جھورا کے بھائی پہلے ہو......!''

میرا چلایا ہوا تیر جا کر نشانے پر بیٹھا تھا۔ میں نے ٹٹول کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ذرا کھل کر بتاؤ۔ صفیہ کو اپنے سسرالیوں سے آخر مسئلہ کیا ہے؟''

وہ متذبذب انداز میں مجھے تکنے لگا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ اس بات کا فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے مجھ پر بھروسا کرنا چاہیے یا نہیں۔ میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔

''جیلا! اگر تمہارا دل مانے تو تم مجھ پر مکمل اعتماد کر سکتے ہو۔ یہاں پر ہونے والی گفتگو ہم دونوں کے بیچ ہی رہے گی۔ تم جو بھی بتانا چاہتے ہو، بلاخوف وخطر بے دھڑک کہہ ڈالو۔''

''آپ پر اعتماد ہے جبھی تو میں آپ کے ساتھ تھانے کے اندر آ گیا ہوں۔'' وہ قدرے مطمئن ہوتے ہوئے بولا۔ ''مگر بھابی صفیہ کوئی اچھی عورت نہیں ہے جناب۔''

''میں بھی تو یہی جاننا چاہتا ہوں کہ تمہاری بھابی میں برائی کیا ہے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے جیلا کی طرف دیکھا۔

''جناب! صفیہ بڑی تیز عورت ہے۔ چھل فریب میں کوئی دوسری عورت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔'' وہ اپنی بھابی کی شان میں زہر فشانی کرتے ہوئے بولا۔ ''اس چالاک عورت نے اپنی مکارانہ چالوں سے جھورا بھائی کو پورے خاندان سے کاٹ کر الگ کر دیا ہے اور مجھ پر تو ایسا گھناؤنا الزام لگایا کہ......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے اور نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''جناب! مجھے تو بتاتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے......!''

"کیا اس گھناؤنے الزام کا تعلق شریعت کے کسی شعبے سے ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "جی، جی ...... بالکل۔"

"جیلا! تم نے یہ تو سنا ہوگا کہ شرع میں کوئی شرم نہیں ہوتی؟" میں نے کہا۔

"جی، میں نے جمعے کی تقریر میں مولوی صاحب کو ایسا بتاتے ہوئے سنا ہے۔"

"مولوی صاحب نے غلط نہیں بتایا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "شرعی معاملات کو بیان کرتے ہوئے جھجک اور شرم کو ایک طرف رکھ دینا چاہیے۔"

میرے حوصلہ بڑھانے پر اس نے صفیہ کے "گھناؤنے الزام" کی جو تفصیل بیان کی اس کے مطابق، کچھ عرصہ پہلے تک جھورا، جیلا سے بہت محبت کرتا تھا اور اپنے چھوٹے بھائی پر جان چھڑکتا تھا۔ جیلا کا اکثر اس کے گھر میں آنا جانا بھی رہتا تھا لیکن اپنے گھر میں جیلا کی آمدورفت صفیہ کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اس نے جب دیکھا کہ اس کا آزمایا ہوا ہر حربہ ناکام ہو رہا ہے اور کسی بھی طور جیلا کے لیے جھورا کی محبت میں کوئی کمی واقع نہیں ہو رہی تو اس نے دونوں بھائیوں میں نفاق ڈالنے کے لیے ایک شیطانی چال چلی۔ ایک روز جب جھورا اپنے گھر پر نہیں تھا، وہ کسی دوسرے گاؤں گیا ہوا تھا اور اسے اگلی صبح ہی واپس آنا تھا۔ حسبِ معمول، جیلا خیر خیریت معلوم کرنے جھورا کے گھر پہنچا تو اسے پتا چلا کہ بھائی گھر میں موجود نہیں ہے۔ وہ واپس جانے کے لیے پلٹا تو صفیہ نے کہا۔

"آج اندر نہیں آؤ گے......؟"

صفیہ کے لہجے میں اپنائیت کی موجودگی نے جیلا کو چونکا دیا۔ آج سے پہلے صفیہ نے اتنی نرمی سے کبھی اس سے بات نہیں کی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ بہرحال، اس نے کہہ دیا۔

"بھائی گھر پر نہیں ہے اور ابھی رات بھی ہو رہی ہے۔ میں بعد میں آجاؤں گا۔"

"تو اس کا مطلب ہے، تم مجھے اپنا دشمن سمجھتے ہو۔" وہ جیلا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑی لگاوٹ سے بولی۔ "تم یہاں پر صرف اپنے بھائی سے ملنے آتے ہو......؟"

صفیہ کا بدلا ہوا دوستانہ انداز جیلا کو حیرت میں ڈال رہا تھا۔ وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں بھابی! تم خود ہی مجھ سے کھنچی کھنچی رہتی ہو۔"

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے......!" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"میں سمجھا نہیں؟" وہ سوالیہ نظر سے صفیہ کو تکنے لگا۔

"اس لیے کہ...... تم نے کبھی مجھے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔" صفیہ شکایتی انداز میں بولی۔ "میں اتنی بھی بری نہیں جتنی تمہارے خاندان والوں نے مجھے مشہور کر رکھا ہے۔ اندر آجاؤ۔ دروازے پر کھڑے کھڑے ہی کچہری کرتے رہو گے تو دیکھنے والے یہی سمجھیں گے کہ دونوں بھائیوں میں کوئی ناراضی ہوگئی ہے جو تم بڑے بھائی کے گھر کے اندر قدم نہیں رکھ رہے ہو......!"

اگرچہ صفیہ کا بدلا ہوا رویہ جیلا کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا لیکن صفیہ کی آخری بات میں وزن محسوس کرتے ہوئے وہ جھورا کے گھر کے اندر داخل ہوگیا۔

جیلا نے مجھے بتایا کہ اس روز وہ پہلے والی صفیہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ جتنی محبت اور اپنائیت سے کھل مل کر اس سے بات چیت کر رہی تھی، اس سے جیلا کو یہی محسوس ہوا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے کیونکہ حقیقت کی دنیا میں صفیہ نے کبھی اس کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں کیا تھا۔ اس رات صفیہ نے اصرار کر کے اسے کھانا کھلایا پھر جب وہ جانے کے لیے کھڑا ہوا تو صفیہ نے اچانک پینترا بدلا اور شور مچانا شروع کر دیا۔

اس کی چیخ پکار پر اڑوسی پڑوسی جمع ہوگئے پھر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق صفیہ نے رو رو کر لوگوں کو بتایا۔ "اس شیطان نے مجھے بے آبرو کرنے کی کوشش کی ہے۔" ساتھ ہی وہ انگلی سے جیلا کی جانب اشارہ بھی کر رہی تھی۔ "میں نے اس کمینے کو ہمیشہ اپنا چھوٹا بھائی سمجھا ہے اور اس نے بے غیرتی کی ساری حدیں پھلانگ دیں۔ مجھے گھر میں اکیلا دیکھ کر اس نے میری عزت پر حملہ کر دیا۔ وہ تو اللہ کا شکر ہے، آپ لوگوں کے آنے سے اسے اپنے شیطانی عزائم پورے کرنے کا موقع نہیں مل سکا ورنہ......" وہ رک رک کر سسکیاں لیتے ہوئے دردبھری آواز میں بولی۔

"ورنہ...... میں تو آج ...... تباہ و برباد ہو جاتی...... ایک عورت کے پاس...... سب سے بڑا سرمایہ اس کی...... عزت ہی تو ہوتی ہے...... اگر یہ مردود مجھ پر حاوی آجاتا تو...... میں جھورا کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی......" بات کے اختتام پر وہ باقاعدہ ہچکیوں سے رونے لگی تھی۔

لوگوں کی ہمدردیاں اس قسم کی سچویشن میں عموماً عورت کے ساتھ ہوتی ہیں لہٰذا انہوں نے لعن طعن کر کے جیلا کو وہاں سے بھگا دیا۔ نجیب آباد ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اگلی

صبح ہونے سے پہلے ہی اس واقعے کی خبر گھر گھر پہنچ گئی تھی اور ان گھروں میں ایک گھر جیلا کا اپنا گھر بھی تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا۔ اس کی پوزیشن کا جو حال ہوا ہوگا، اس کا اندازہ بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے۔

جب وہ اس افسوسناک واقعے کو بیان کر چکا تو ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''تھانے دار صاحب! اور تو جو ہوا سو ہوا لیکن اس واقعے کے دو پہلو نہایت ہی اہم ہیں۔''

جیلا نے مجھے جو کہانی سنائی تھی، اس کی روشنی میں اگر وہ سچا تھا تو پھر صفیہ بہت ہی خطرناک عورت تھی اور اگر جیلا نے کسی حرام زدگی کی پردہ پوشی کی خاطر اپنی پوزیشن کو صاف کرنے کے لیے دروغ گوئی سے کام لیا تھا تو پھر صفیہ کا کہا ہوا درست تھا کہ اس کا دیور ایک زہریلا سانپ تھا جس سے خیر کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ حقیقت کیا تھی، اس کا فیصلہ اسی وقت ہوسکتا تھا جب اس حوالے سے میں صفیہ کا موقف بھی سن لیتا۔ خیر...... یہ بعد کی باتیں تھیں۔

''کون سے دو اہم پہلو؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''پہلو نمبر ایک ......'' وہ انگلیوں پر حساب کرنے والے انداز میں بولا۔ ''صفیہ نے مجھے بدنام کرنے کی جو سازش کی تھی اس سے میری بیوی زرینہ کے دل میں میرے کردار کے حوالے سے ذرا سا بھی شک پیدا نہیں ہوا' یعنی میری گھریلو زندگی میں کوئی طوفان نہیں آیا۔ گاؤں والے میرے بارے میں جو بھی کہتے ہیں، اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا......'' اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے اور لمحاتی توقف کے بعد سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''پہلو نمبر دو بڑا ہی افسوسناک اور تکلیف دہ ہے۔ بھائی جھورا نے صفیہ کی فریاد کو قرآن اور حدیث کا لکھا مان لیا اور مجھ سے شدید نفرت کرنے لگا۔ اس روز سے میرے لیے بڑے بھائی کے گھر کا دروازہ بند ہوگیا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ دونوں بھائیوں کے بیچ میلوں کا فاصلہ پیدا کرنے کی صفیہ کی کوشش کامیاب ہوگئی ہے لیکن میرے دل میں بھائی جھورا کے لیے آج بھی وہی محبت ہے اور اسی رشتے کے حوالے سے میں بھابی صفیہ کا بھی احترام کرتا ہوں۔ آپ دیکھ لیں، میں نے جیسے ہی بھائی کی گمشدگی کا سنا تو پریشان ہوگیا پھر میں دوڑتے بھاگتے ہوئے سیدھا تھانے پہنچا ہوں اور...... آپ نے بھابی صاحبہ کا رویّہ بھی ملاحظہ فرمالیا ہے......!''

آخری جملہ اس نے بڑے طنزیہ انداز میں ادا کیا تھا جس سے صفیہ کے لیے اس کی سخت ناپسندیدگی ظاہر ہوتی تھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''جیلا! تم نے مجھے جو کچھ بتایا ہے اگر وہ سب بنی برحقیقت ہے اور تم نے اس میں ذرا سا بھی جھوٹ شامل نہیں کیا تو پھر قانون کی نظر میں تمہاری بھابی کوئی اچھی عورت نہیں ہے۔''

''یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں تھانے دار صاحب!'' وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ ''آپ بھابی کی معصوم، بھولی بھالی صورت پر نہ جائیں۔ وہ رونی شکل بنا کر خود کو بے قصور اور مظلوم ثابت کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ آپ اس عورت کو بالکل نہیں جانتے۔ یہ کسی وقت کچھ بھی کرسکتی ہے اور دولت کی خاطر تو یہ سنگین سے سنگین تر قدم بھی اٹھا سکتی ہے......''

''دولت کی خاطر......؟'' میں نے چونکے ہوئے انداز میں اس کے الفاظ دہرائے۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

صفیہ کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ ایک ہزار روپے والا معاملہ صرف دو افراد کے علم میں تھا یعنی یہ راز صرف صفیہ اور جھورا ہی جانتے تھے یا پھر تنویر جٹ جس سے ایک ہزار روپے ادھار لینے جھورا چنی وال گیا تھا۔ ابھی تک اس بات کی بھی تصدیق نہیں ہوسکی تھی کہ تنویر جٹ نے جھورا کو قرض دیا بھی تھا یا نہیں...... جیلا کے منہ سے دولت کا ذکر سن کر تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ وہ بھی ایک ہزار والی اس رقم کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ یہ بات میرے لیے حیران کن اور باعثِ تشویش تھی۔ یہ تو ممکن نظر نہیں آتا تھا کہ صفیہ نے خود یہ بات جمیل عرف جیلا کو بتائی ہو......!

''مجھے پتا چلا ہے کہ بھائی جھورا کہیں سے ایک موٹی رقم لے کر آنے والے تھے۔'' میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے جیلا نے بتایا۔

''تمہیں یہ بات کہاں سے پتا چلی ہے؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''بس جی، کہیں سے کان میں پڑگئی ہے۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ''یہ بات میرے علم میں ہے کہ بھائی جھورا، مشتاق مہر سے زمین کا کوئی ٹکڑا خریدنے والا تھا اور اسی سلسلے میں پیسوں کا بندوبست کرنے وہ چنی وال گیا تھا۔ مذکورہ زمین کی قیمت میں ایک ہزار روپے کم پڑ رہے تھے۔ میں چنی وال والے تنویر جٹ کی طرح کوئی بڑا آڑھتی تو نہیں ہوں لیکن میری زمین داری ٹھیک ٹھاک چل رہی ہے۔ ایک ہزار روپے تو میں بھی بھائی جھورا کو دے دیتا......''

میں دل ہی دل میں جیلا کی ہوشیاری کی داد دیے بنا نہ

رہ سکا۔ اگرچہ جھورا کے گھر کا دروازہ اس کے لیے بند ہو چکا تھا تاہم اس نے بھائی کے گھر کے اندرونی معاملات کی مکمل جانکاری رکھی ہوئی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جھورا چنی وال تنویر جٹ کے پاس ایک ہزار روپے ادھار لینے گیا تھا۔

''تم نے یہ کیوں کہا کہ صفیہ دولت کی خاطر کچھ بھی کر سکتی ہے؟'' میں نے اپنے سوال کو دہرانا ضروری سمجھا کیونکہ ابھی تک مجھے اس کا تسلی بخش جواب نہیں ملا تھا۔ ''مجھے بتاؤ، صفیہ ایک ہزار روپے کی خاطر تمہارے جھورا بھائی کے ساتھ کیا کر سکتی ہے؟''

''یہ تو...... مجھے پتا نہیں جناب......'' وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میرا خیال ہے، آپ کو بھائی جھورا کے گھر کی تلاشی ضرور لینا چاہیے۔''

''کہیں تم یہ تو بتانے کی کوشش نہیں کر رہے کہ صفیہ نے جھورا کو اپنے گھر کے اندر ہی کہیں چھپا رکھا ہے......'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''یا زمین کے اوپر اور یا پھر...... منوں مٹی کے نیچے......؟''

میرے استفسار میں بڑی خاص قسم کی سنگینی اور سفاکی پائی جاتی تھی۔ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''کچھ بھی ہو سکتا ہے تھانے دار صاحب اور یہ بھی ممکن ہے کہ ابھی جن ایک ہزار روپے کا ذکر ہو رہا ہے، وہ رقم بھی بھائی جھورا کے گھر کے اندر ہی سے برآمد ہو جائے!''

''جیلا! تم خوامخواہ اپنی بھابی پر شک کر رہے ہو۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''وہ عورت ذات اتنا خطرناک قدم نہیں اٹھا سکتی۔''

''تھانے دار صاحب! میں نے اپنے محسوسات آپ تک پہنچا دیے ہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ کی مرضی ہے کہ میری بات کا یقین کریں یا مجھے جھوٹا سمجھیں۔ میں اپنی بھابی کو بڑی چنگی طراں جانتا ہوں۔ آپ کا واسطہ اس عورت سے پہلی بار پڑا ہے......!''

وہ بڑے کھلے ڈلے انداز میں اپنی بھابی کے خلاف بول رہا تھا اور یہ مخالفت و ناپسندیدگی یک طرفہ نہیں تھی۔ میں نے صفیہ کی آنکھوں میں بھی جیلا کے لیے نفرت کی چنگاریاں اڑتے دیکھی تھیں۔ وہ بھی اپنے دیور کے بارے میں ایسے ہی مخاصمانہ خیالات رکھتی تھی۔ دونوں میں سے کون حق پر تھا اور کس نے باطل کی مسافرت اختیار کر رکھی تھی، اس بات کا فیصلہ آنے والے وقت ہی نے کرنا تھا۔ بہر حال، میں نے جیلا کے اطمینان کی خاطر کہہ دیا۔

''تم فکر نہیں کرو۔ میرا صفیہ سے پہلی بار واسطہ پڑا ہے اور میں ایک ہی تجربے میں اسے اچھی طرح سمجھ لوں گا۔ باقی جہاں تک اس کے گھر کی تلاشی کا معاملہ ہے تو میں تمہاری بات کو یکسر رد نہیں کروں گا۔ تمہارا مطالبہ جائز ہے۔ ضرورت پڑنے پر میں جھورا کے گھر کی تفصیلی تلاشی بھی لوں گا۔''

اس نے میرے عزم پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ نے کہا تھا کہ میں دل چھوٹا نہ کروں۔ آپ مجھے بھائی جھورا کی گمشدگی والے معاملات سے علیحدہ نہیں رکھیں گے۔''

''میں نے تم سے غلط نہیں کہا تھا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم کل صبح تھانے حاضر ہو جاؤ۔ میں تمہیں اپنے تھانے کے عملے کے ساتھ جنگل کی طرف روانہ کروں گا۔ تم لوگ وہاں جھورا کو تلاش کرو گے۔ ابھی تک جو حالات میرے علم میں آئے ہیں، ان کی روشنی میں یہی نظر آ رہا ہے کہ تمہارے بھائی جھورا کے ساتھ جو بھی ہوا ہے، وہ نجیب آباد اور چنی وال کے بیچ پائے جانے والے گھنے جنگل کے کسی حصے میں پیش آیا ہے۔ ہمیں اپنی تلاش کا آغاز جنگل ہی سے کرنا چاہیے اور اِدھر اُدھر گھوم پھر کر جھورا کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنا چاہیے۔''

اس نے میری تجویز سے اختلاف نہیں کیا اور نہ ہی اس کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر نمودار ہوا کہ اسے مجھ سے مکمل اتفاق ہے۔ وہ چند لمحات تک سپاٹ چہرے کے ساتھ مجھے تکتا رہا پھر اٹھ کر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

''تھانے دار صاحب! اب مجھے اجازت دیں۔''

''جیلا!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تاکیدی انداز میں کہا۔ ''ایک بات کو اچھی طرح اپنے ذہن میں بٹھا لو کہ اس مشن کے بارے میں تمہاری بھابی کو کہیں سے بھنک نہیں پڑنا چاہیے۔ وہ اپنے خاوند کی تلاش کے سلسلے میں تمہاری شمولیت کو قطعاً برداشت نہیں کرے گی۔ وہ تمہیں سخت ناپسند کرتی ہے۔ اگر وہ بھڑک کر پٹری سے اتر گئی تو بنا بنایا کھیل خراب ہو جائے گا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''چنگی طراں سمجھ رہا ہوں تھانے دار صاحب۔'' وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ میں گاؤں میں اس حوالے سے کسی سے کوئی بات نہیں کروں گا اور کل صبح چپ چاپ سیدھا یہاں آ جاؤں گا۔''

''شاباش!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اب تم واپس جاؤ اور کل والی سرگرمی کے بارے میں تمہارا زبان بند رکھنا ہی فائدہ مند ہے۔''

اس نے میری ہدایات پر عمل کرنے کا وعدہ کیا پھر مجھ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کانسٹیبل الطاف کو اپنے پاس بلوالیا۔ جھورا کی گمشدگی کے حوالے سے میرے تھانے کا سارا عملہ باخبر ہو چکا تھا۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں الطاف کو اپنے منصوبے سے آگاہ کیا اور کہا۔

''کل صبح جیسے ہی جیلا تھانے پہنچے، تم اسے اور کھوجی تاج دین کو اپنے ساتھ لے کر جنگل کی طرف نکل جانا۔''

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر ملک صاحب۔'' وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا پھر پوچھا۔ ''کیا آپ جیلا کو واقعی اس مشن میں ساتھ رکھنا چاہتے ہیں؟''

مجھے محسوس ہوا کہ الطاف کے ذہن میں جیلا کے حوالے سے کچھ خاص چل رہا ہے۔ اس کی سوچ تک رسائی حاصل کرنے کی غرض سے میں نے الٹا اسی سے سوال کر ڈالا۔

''کیوں...... کیا اس میں کوئی قباحت ہے؟''

''قباحت تو کوئی نہیں ملک صاحب لیکن......!''

وہ بولتے بولتے رکا تو میں نے اس کی ادھوری بات کے جواب میں پوچھا۔ ''لیکن کیا؟''

''میں نے دیکھا ہے، یہ بندہ تھانے کے باہر اپنی بھابی کے ساتھ بڑی بدتمیزی سے پیش آرہا تھا۔ آپ کی آمد پر یہ آپ کو دکھانے کے لیے نرم لہجے میں بات کرنے لگا تھا۔'' کانسٹیبل نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''جیلا مجھے قابلِ بھروسا نہیں لگ رہا۔''

''الطاف! ہم نے جیلا کو نوٹوں کی گڈیوں سے بھرا ہوا بریف کیس تھما کر یا سونے کی اینٹوں سے بھرا ہوا صندوق اٹھوا کر ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں نہیں بھیجنا جو اس کا بھروسا مند ہونا ضروری ہو۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''صفیہ کے ساتھ اس کا جو بھی رویہ ہے، وہ دونوں بھائیوں کے بیچ پائے جانے والے ناخوشگوار تعلقات کی وجہ سے ہے اور ایک بات ذہن میں رکھنا کہ جیلا میری نظر میں بھی کلیئر نہیں ہے۔ میں اسے تمہارے ساتھ اس لیے بھیج رہا ہوں کہ تم اس پر گہری نظر رکھ سکو۔ اپنی ضرورت کے تحت اگر تم چاہو تو اپنے ساتھ ایک دو کانسٹیبلو اور بھی لے جا سکتے ہو مگر اس پارٹی کے لیڈر تم ہی ہو گے۔ واپسی پر میں ہر سوال تم ہی سے کروں گا اور جواب بھی تمہیں ہی دینا ہوگا۔''

''آپ بے فکر ہو جائیں ملک صاحب۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''میں آپ کی توقع پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔ میں جیلا کی کڑی نگرانی کروں گا اور اس کی ایک ایک حرکات وسکنات کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لوں گا۔''

''میں کل صبح چنی وال جا رہا ہوں۔'' میں نے الطاف کو اپنے پروگرام سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور شام سے پہلے واپس آجاؤں گا۔ مجھے امید ہے کہ اس دوران میں تم لوگ بھی جنگل یاترا سے کسی اچھی خبر کے ساتھ واپس آچکے ہو گے......!''

''ان شاء اللہ......!'' وہ پُر وثوق انداز میں بولا۔

میں نے الطاف کو فارغ کیا تو جہاں زیب تھانے پہنچ گیا۔ میں نے اے ایس آئی جہاں زیب کو ماسٹر عنایت کی طرف روانہ کیا تھا اور مجھے قوی امید تھی کہ وہ خالی ہاتھ نہیں لوٹے گا لیکن جب میں نے اسے تنہا واپس آتے دیکھا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔

''ملک صاحب! بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔'' وہ میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

میں نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا۔ ''کیسی گڑبڑ؟''

''ماسٹر عنایت کے گھر پر تالا لگا ہوا ہے۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''مطلب یہ کہ ماسٹر عنایت غائب ہے......''

''کب سے؟'' میں نے استفسار کیا۔

اے ایس آئی کی اطلاع نے مجھے گمبھیرتا میں ڈال دیا تھا۔

''لوگ بتاتے ہیں کہ کل دوپہر کے بعد اسے کسی نے نجیب آباد میں نہیں دیکھا۔''

''اوہ......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر پوچھا۔ ''لوگ بتاتے ہیں...... سے تمہاری کیا مراد ہے؟ اس کے گھر والے کہاں ہیں؟''

''ماسٹر عنایت کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے ملک صاحب۔'' اے ایس آئی نے بتایا۔ ''وہ اس گھر میں اکیلا ہی رہتا تھا۔''

''اور مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ وہ نجیب آباد کا پرانا وسنیک نہیں ہے۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ پہلے شیخوپورہ میں کہیں رہتا تھا۔ کہیں وہ اپنے آبائی علاقے کی طرف تو نہیں نکل گیا......!''

''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے ملک صاحب۔'' اے ایس آئی اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے فیکا درزی سے خاصی تفصیلی بات کی ہے اور اس سے ماسٹر عنایت کا شیخوپورہ والا ایڈریس بھی لے لیا ہے۔''

''اس فیکا درزی کا کیا حدود اربعہ ہے؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میرا مطلب یہ ہے کہ کیا تم فیکا کے تاریخ اور جغرافیہ سے کچھ واقفیت رکھتے ہو؟''

''تھوڑی بہت معلومات ہیں میرے پاس۔'' اے ایس آئی نے بتایا۔ ''ماسٹر عنایت کا مکان، فیکا درزی کے گھر کے ساتھ جڑا ہوا ہے یعنی یہ دونوں پڑوسی ہیں۔ پورے گاؤں میں فیکا درزی وہ واحد شخص ہے جس کے ساتھ ماسٹر عنایت کی خوب بنتی تھی۔ فیکا درزی کی باقاعدہ کوئی ٹیلرنگ شاپ نہیں ہے۔ وہ سلائی کا کام اپنے گھر کی بیٹھک میں کرتا ہے اور دن کا بیشتر حصہ ماسٹر عنایت اس کے پاس بیٹھا گپ شپ کرتا رہتا ہے۔ فیکا نے مجھے بتایا ہے کہ کسی زمانے میں ماسٹر عنایت بھی کپڑوں کی سلائی کا کام کیا کرتا تھا اسی لیے اس کے نام کے ساتھ ''ماسٹر'' لگا ہوا ہے۔ وہ اپنے گھر والوں سے ناراض ہوکر یہاں آ گیا تھا۔ فیکا درزی نے اس بات کا امکان ظاہر کیا ہے کہ شاید ماسٹر عنایت شیخوپورہ کی طرف نکل گیا ہو......''

''فیکا نے امکان ظاہر کیا ہے۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''مطلب یہ کہ اسے یقین نہیں کہ ماسٹر عنایت شیخوپورہ ہی گیا ہوگا؟''

''وہ فیکا درزی سے مل کر یا اسے بتا کر نہیں گیا ملک صاحب۔'' اے ایس آئی نے کہا۔ ''فیکا نے مجھے بتایا ہے کہ کل دوپہر کے وقت وہ اس کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا اور خاصا اداس بھی تھا۔ اسی اداسی کی کیفیت میں اس نے فیکا درزی کو تین مرتبہ ایک مختصر سی کہانی بھی سنا ڈالی تھی اور ہر بار کہانی کے اختتام پر اس نے گردن جھٹکتے ہوئے بڑے دردناک انداز میں ایک ہی ڈائیلاگ بولا تھا، پھر وہ فیکا درزی کے پاس سے اٹھ کر کہیں چلا گیا تھا۔ کہاں......؟ اس بارے میں فیکا وثوق کے ساتھ کچھ بھی بتانے سے قاصر ہے۔ ماسٹر عنایت کے گھر پر لٹکے ہوئے تالے کو دیکھ کر وہ یہی سمجھا تھا کہ شاید وہ شیخوپورہ کی طرف نکل گیا ہے۔''

اے ایس آئی نے اپنی بات پوری کی تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا فیکا درزی نے تمہیں بتایا کہ ماسٹر عنایت نے گردن جھٹک کر کون سا ڈائیلاگ بولا تھا؟''

''جی ملک صاحب! فیکا نے مجھے وہ مختصر سی کہانی بھی سنائی ہے اور ڈائیلاگ کے بارے میں بھی بتایا ہے۔'' اے ایس آئی نے جواب دیا۔ ''کہانی کے اختتام پر ماسٹر عنایت نے افسوسناک انداز میں کہا تھا...... دنیا والے کسی حال میں انسان کو جینے نہیں دیتے!''

''ماسٹر عنایت نے بات تو بڑے پتے کی کی ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اب لگے ہاتھوں وہ مختصر کہانی بھی سنا ڈالو۔ ممکن ہے، اس کہانی میں ہمیں ایسا کوئی اشارہ مل جائے جس سے جھورا کی تلاش میں مدد مل سکے......!''

میری فرمائش پر جہاں زیب نے مجھے وہ مختصر سی کہانی سنا دی۔ یہ کہانی بھی ''مچھلی'' والے واقعے کی طرح خاصی دلچسپ ہے۔ آپ بھی سن لیں...... میرا مطلب ہے، پڑھ لیں!

ایک بوڑھا شخص اپنے نوعمر بیٹے کے ہمراہ کسی راستے پر چلا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کا مریل سا گدھا بھی محوِ سفر تھا۔ کوئی پاس سے گزرا اور اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

''تین گدھے جا رہے ہیں......!''

بوڑھے نے اس شخص کے تبصرے کا برا منایا اور کہا۔ ''ہم دونوں انسان ہیں۔ گدھا صرف یہ ہے۔'' پھر اس نے اپنے گدھے کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

''اگر تم دونوں انسان ہوتے تو تم میں عقل نام کی کوئی چیز بھی ہوتی۔'' اس شخص نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''ایک سواری کی موجودگی میں پیدل چلے جا رہے ہو......!''

وہ شخص تو بات کر کے آگے بڑھ گیا اور بوڑھا سوچ میں پڑ گیا۔ بوڑھے کو اس شخص کی بات میں خاصا وزن محسوس ہوا اور اس نے اپنے بچے کو گدھے کی پیٹھ پر بٹھا دیا اور خود ساتھ ساتھ پیدل چلنے لگا۔

چند منٹ بعد ایک دوسرا شخص ان کے قریب سے گزرا اور یہ جملہ چست کر کے آگے بڑھ گیا۔

''قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں۔ نوجوان اولاد مزے سے گدھے پر سوار ہے اور ضعیف باپ کو پیدل چلایا جا رہا ہے۔ اس سے بڑی بے غیرتی اور کیا ہوگی۔ اللہ ایسی بے حس اولاد کو غارت کرے...... آمین...... ثم آمین!''

بوڑھے شخص نے فوراً سے پیش تر اپنے بیٹے کو نیچے اتارا اور خود گدھے کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ اگر اس نے تاخیر کر دی تو اس بندے کی بددعا بیٹے کو لگ جائے گی۔ چند قدم کا فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک تیسرا آدمی سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ جب وہ بندہ ان کے نزدیک پہنچا تو ہونٹ بھینچ کر خاصے غصے سے بولا۔

''چائلڈ لیبر کا قانون گاؤں دیہات میں بھی نافذ ہونا چاہیے تاکہ بچوں سے کوئی بیگار لینے یا کوئی انہیں تکلیف دینے کے بارے میں سوچ بھی نہ سکے۔ اس بے شرم بڈھے کو دیکھو۔ کتنے آرام سے گدھے کی پشت پر بیٹھا ڈنکی رائڈ

کا لطف اٹھا رہا ہے اور معصوم بالک بے چارہ پیّوں پیّوں پیچھے چلنے پر مجبور...... کوئی شرم ہوتی ہے، کوئی حیا ہوتی ہے۔‘‘

بوڑھے شخص کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کرے تو کیا کرے۔ جو شخص جو بھی بول کر جا رہا تھا، اس کی بات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بالآخر اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ دونوں باپ بیٹا گدھے پر سوار ہو جاتے ہیں چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔

مگر آج کا دن تو ہر طرف سے کم بختی لیے ہوئے تھا۔ وہ دونوں گدھے پر سوار تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ ایک چوتھا آدمی ان کے پاس سے گزرا اور یہ کہہ کر وہ بندہ رہی سہی کسر بھی پوری کر گیا۔

’’غضب خدا کا...... ایک مریل سے گدھے پر دو دو افراد سوار ہیں۔ یہ ظلم و زیادتی کی انتہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ گدھا ہے...... بے زبان ہے...... لیکن روز قیامت اللہ اس جانور کو بھی قوتِ گویائی عطا فرمائے گا۔ پھر یہ گدھا اس بڈھے کے ایک ایک ستم کو کھول کر بیان کرے گا اور...... بے شک اللہ زبردست انصاف کرنے والا ہے۔‘‘

بوڑھے شخص کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ جب کسی کے ضبط کا پیمانہ چھلک جائے تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس بوڑھے شخص نے بھی ایک عجیب اور انوکھا فیصلہ کیا اور بیٹے کی مدد سے ہمت کوشش کر کے اس نے اپنے مریل سے گدھے کو سر پر اٹھا لیا۔ اسی لمحے ایک پانچواں بندہ ان کے قریب سے گزرا اور ایک بلند آہنگ قہقہہ لگاتے ہوئے استہزائیہ انداز میں بولا۔

’’اسے کہتے ہیں مکافاتِ عمل یعنی لاء آف نیچر...... آج کے انسان کے جیسے کرتوت ہیں ان کی پاداش میں قدرت مستقبل میں اسے حیوانوں کی مٹھی چاپی پر مامور کر دے گی۔ جانور آرام کریں گے اور انسان ان کی چاکری کے لیے ہر لحہ مستعد...... شاید یہ پرومو جانوروں کے تابناک مستقبل کی ایک جھلک ہے!‘‘

اس بوڑھے شخص نے جھنجلا کر گدھے کو زمین پر پٹخ دیا۔ گدھا ’’ڈھینچو ڈھینچو‘‘ کرتا ہوا ایک طرف جا کھڑا ہوا۔ گدھے کو رسید کیے جانے والے اس دھوبی پاٹ کے نتیجے میں وہ بوڑھا شخص بھی زمین پر جا گرا تھا۔ کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہوتے ہوئے اس نے شکستہ دلی سے کہا۔

’’دنیا والے کسی حال میں انسان کو جینے نہیں دیتے۔‘‘

اے ایس آئی کی کہانی مکمل ہوئی تو میں نے کہا۔ ’’یہ جو پہلا، دوسرا، تیسرا، چوتھا اور پانچواں شخص اس بڈھے کے پاس سے گزرا تھا ان کا چھوٹا بھائی ماسٹر عنایت ہے کیونکہ اس نے بھی پچھلی والے معاملے میں جھورا سے کچھ اسی نوعیت کا سلوک کیا تھا لہٰذا......‘‘ میں نے لحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

’’تم ابھی اور اسی وقت شیخوپورہ روانہ ہو جاؤ اور آج ہی کی تاریخ میں ماسٹر عنایت کو پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔ اس ٹائپ کے سنکی لوگ اپنی باتوں سے دوسروں کو زچ کر کے کچھ بھی کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ میں اس فلاسفر کا دیدار کرنا چاہتا ہوں اور اسے بھی ویسی ہی چند کہانیاں سنانا چاہتا ہوں جیسی وہ دوسروں کو سنا کر انہیں ٹینشن دیتا ہے۔ تم نے اس کا شیخوپورہ والا ایڈریس وغیرہ تو نوٹ کر لیا ہے نا؟‘‘

’’جی ملک صاحب!‘‘ اے ایس آئی نے اثبات میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ’’وہ نجیب آباد آنے سے پہلے شیخوپورہ کے محلہ اسلام گنج میں رہتا تھا۔‘‘

’’بس ٹھیک ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’اگر ماسٹر عنایت کسی حوالے سے جھورا کی گمشدگی میں ملوث پایا گیا تو میں اس کا وہ حشر کروں گا کہ اسے گنج کی ساری اقسام زبانی یاد ہو جائیں گی، خاص طور پر...... سر والا گنج......!‘‘

☆☆☆

موضع چنی وال اگرچہ ایک چھوٹا گاؤں تھا لیکن اس کی وجہِ شہرت وہاں کی غلہ منڈی تھی۔ گمشدہ جھورا کا دوست تنویر جٹ اسی غلہ منڈی میں آڑھت کا کام کرتا تھا اور جھورا تین اپریل کو اپنے اسی دوست سے ایک ہزار روپے ادھار لینے آیا تھا لیکن، وہ واپس اپنے گھر نہیں پہنچا تھا۔ مجھے امید تھی کہ تین اپریل کی شام نہ سہی، جھورا چار اپریل کا سورج غروب ہونے سے پہلے لازمی اپنے گھر پہنچ جائے گا مگر میری یہ امید پوری نہیں ہو سکی تھی لہٰذا میں پانچ اپریل کی صبح کانسٹیبل اشفاق کے ہمراہ چنی وال آ گیا تھا۔ گزشتہ روز اے ایس آئی جہاں زیب بھی شیخوپورہ سے واپس نہیں آیا تھا۔ میں جہاں زیب کے لیے پریشان تو تھا لیکن وہ آج کل جیسا فاسٹ زمانہ نہیں تھا کہ میں فوراً سیل فون کا استعمال کر کے اس کی خیریت دریافت کر لیتا۔ مجھے ہر حال میں اس کی واپسی کا انتظار کرنا تھا۔

غلہ منڈی میں تنویر جٹ کی دکان تک رسائی حاصل کرنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ تنویر جٹ ایک مشہور آڑھتی تھا۔ چنی وال کی غلہ منڈی میں ہر شخص اسے جانتا تھا۔ گزشتہ رات اچھی خاصی بارش بھی ہو گئی تھی جس کی وجہ سے غلہ منڈی کے اندر کیچڑ نظر آ رہی تھی۔ اس کا

ایک سبب ٹرکوں کی مسلسل آمدورفت بھی تھی جو اناج کی بوریوں کو یہاں سے وہاں پہنچانے میں مصروف رہتے تھے۔

تنویر جٹ اپنی دکان میں موجود نہیں تھا۔ اس کے منشی نے بتایا۔ ''آج وہ دکان پر نہیں آئیں گے۔''

مجھے اور کانسٹیبل کو پولیس یونیفارم میں دیکھ کر منشی ہائی الرٹ ہوگیا تھا۔ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''میرا نام ملک صفدر حیات ہے اور میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں۔ چنی وال اور آس پاس کے تمام گاؤں دیہات میرے تھانے کی حدود میں آتے ہیں۔''

منشی نے نہایت ہی ادب و احترام کے ساتھ ہمیں دکان کے اس حصے میں بٹھایا جو تنویر جٹ کے آفس کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہاں پر مکمل پرائیویسی والا ماحول میسر تھا۔ اونچی چھت والی اس وسیع وعریض دکان کا عقبی حصہ اناج کے گودام کے طور پر استعمال ہوتا تھا جہاں فرش سے چھت تک گندم، چاول، دالوں اور دیگر اناج کی بوریاں بڑے سلیقے سے رچی ہوئی تھیں۔ اس گودام اور دفتر کے آگے برآمدہ نما ایک کشادہ حصہ ضروری امور کے لیے کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ آفس کی بیرونی دیوار شیشے کی بنی ہوئی تھی یعنی اس دیوار میں اوپر سے نیچے اور دائیں سے بائیں تک ایک بڑا سا شیشہ لگا ہوا تھا جس میں سے باہر کا منظر بڑا واضح نظر آتا تھا۔ دکان کے باہر منڈی کے صحن میں اس وقت بھی دو ٹرک کھڑے دکھائی دے رہے تھے جن پر اناج کی لوڈنگ کا سلسلہ جاری تھا۔

تنویر جٹ کے منشی کا نام محمد الیاس معلوم ہوا۔ الیاس ایک دبلا پتلا، دراز قامت اور ملنسار شخص تھا۔ ہمیں آفس والے حصے میں بٹھانے کے بعد اس نے کہا۔

''اب بتائیں ملک صاحب! میں آپ کی کیا سیوا کروں!''

''منشی جی! میں یہاں سیوا کرانے نہیں آیا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں ایک ضروری تفتیش کے سلسلے میں چنی وال پہنچا ہوں اور فوری طور پر تنویر جٹ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ تنویر جٹ آج دکان پر کیوں نہیں آیا؟''

''وہ تو کل بھی نہیں آئے تھے۔'' منشی نے بتایا۔ ''اگر آپ کا ان سے ملنا ضروری ہے تو گھر چلے جائیں۔''

''خیریت......'' منشی کی بات نے مجھے چونکا دیا تھا۔ ''تنویر جٹ دو دن سے منڈی کیوں نہیں آرہا؟''

''ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ملک صاحب۔'' منشی نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''اگر آپ کا حکم ہو تو میں تانگا منگوا کر آپ کو ان کے گھر تک پہنچا دیتا ہوں۔ آپ چاہیں تو اپنے گھوڑے ادھر منڈی ہی میں چھوڑ جائیں لیکن......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر آفس کے باہر ایک شخص کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا پھر بولا۔

''میں پہلے آپ کی خاطر تواضع کے لیے جھورا سے کچھ منگواتا ہوں۔ اس کے بعد آپ جٹ صاحب سے ملنے جائیں۔'' پھر اس نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔ ''ملک صاحب! سب خیریت تو ہے نا...... آپ کس سلسلے میں چنی وال تشریف لائے ہیں؟''

منشی الیاس کی تشویش کو میں بے موقع نہیں کہوں گا۔ ہر انسان کے اندر ایک خاص مقدار میں تجسس کا مادہ پایا جاتا ہے اور جہاں معاملہ پولیس کا ہو تو یہ مادہ کچھ زیادہ ہی متحرک ہوجاتا ہے۔ منشی نے بھی اس مادے کی تحریک کے زیر اثر مجھ سے سوال کیا تھا۔ منشی کی زبان سے جھورا کا نام سن کر میں چونک اٹھا تھا اور ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ کیا صفیہ کا گھر والا جھورا ابھی تک چنی وال کی فضا ہی میں سانس لے رہا ہے......!

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ میری خاطر تواضع کی زحمت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دوسری بات یہ کہ تم نے ابھی کسی جھورا کا ذکر کیا ہے...... یہ کون ہے؟ تیسری بات یہ کہ اگر تم نے میری دوسری بات کا جواب دے دیا تو پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ میں کس مقصد سے چنی وال آیا ہوں۔''

''ملک صاحب! جھورا جٹ صاحب کا ملازم ہے۔'' وہ بڑی رسان سے بولا۔ ''اس کو دکان کے اوپری کاموں کے لیے رکھا ہوا ہے۔ میں ابھی جھورا سے کہہ کر آپ کے لیے چائے پانی کا بندوبست کراتا ہوں۔''

''چائے پانی ادھار رہا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''میں جھورا کی تلاش میں چنی وال آیا ہوں۔ بس تم جلدی سے اسے یہاں بلالو۔''

''جھورا کی تلاش میں......'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں ملک صاحب!''

اسی وقت ایک شخص آفس میں داخل ہوا۔

''لیں جی...... جھورا آگیا ہے۔'' منشی الیاس نے کہا۔ ''آپ کو اسی بندے کی تلاش تھی نا؟''

یہ شخص وہ جھورا نہیں تھا جس کی کھوج میں ہم چنی وال آئے تھے۔ حاضر اسٹاک جھورا دو پولیس والوں کو اپنے سامنے دیکھ کر گھبرا گیا تھا پھر منشی کے اس جملے نے تو اسے بے

حد ہراساں کر دیا تھا..... آپ کو اسی بندے کی تلاش تھی نا؟
جھورا نے سہمی ہوئی نظر سے پہلے مجھے دیکھا پھر منشی کی جانب تکتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کچھ نہیں کیا منشی جی...... خدا کے لیے مجھے پولیس سے بچالیں......''

اس کی سادگی پر مجھے بہت پیار آیا لیکن میں نے تفریح کی غرض سے سوال کیا۔ ''کیا تم نے واقعی کچھ نہیں کیا......؟''

''نہیں جی۔'' وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں نے تو کبھی ایک مکھی بھی نہیں ماری۔''

''تمہارا یہ جرم کیا کم ہے کہ یہاں جو بھی مہمان آتا ہے۔'' میں نے اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم فوراً اس کے لیے چائے پانی کے بندوبست میں لگ جاتے ہو......؟''

اس نے ایک مرتبہ پھر منشی الیاس کی جانب دیکھا پھر مجھ سے بولا۔ ''یہ سب تو میں ان کے حکم پر کرتا ہوں جی۔'' اس کے انداز میں بڑی سادگی تھی۔

''حکم کسی کا بھی ہو مگر کرتے تو تم ہی ہونا......'' میں نے اسے گھورا۔ ''لہٰذا سزا بھی تمہیں ہی ملے گی۔''

جھورا منشی کی منت خوشامد میں لگ گیا کہ وہ سفارش کر کے اسے پولیس سے بچالے۔ منشی الیاس میری اس ''حرکت'' کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا اس لیے یہ تماشا دیکھتے ہوئے وہ زیرِلب مسکرا رہا تھا۔ میں نے جھورا کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو جھورا! اگر تمہارے ذہن میں یہ خناس ہے کہ منشی الیاس تمہیں بچالے گا تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ تمہیں تو آج میرے ہاتھ سے تنویر جٹ بھی نہیں بچاسکتا۔ سزا تو تمہیں مل کر رہے گی اور تمہاری سزا یہ ہے کہ......'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو جھورا کا مارے خوف کے برا حال ہو گیا۔ میں نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں تنویر جٹ سے ملاقات کرنے اس کے گھر پر جا رہا ہوں، اس دوران میں تم ہمارے گھوڑوں کی خدمت پر مامور رہو گے۔ ان کا پوری طرح خیال رکھو گے اور ان کے لیے چارے پانی وغیرہ کا بندوبست بھی کرو گے جس طرح انسانوں کے لیے تم چائے پانی کا انتظام کرتے ہو... بات سمجھ میں آئی کہ نہیں؟''

''آ گئی جی، آ گئی......'' وہ جلدی سے سر کو اثبات میں حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ''سمجھ میں آپ کی بات آئی اور جان میں میری جان آئی۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ میں آپ کے گھوڑوں کو نہلا دھلا کر اور کھلا پلا کر ایک دم تازہ کر دوں گا۔''

جھورا جب اپنی ''ذمے داری'' کو ''نبھانے'' کے لیے آفس سے نکل گیا تو منشی نے کہا۔

''ملک صاحب! آپ نے تو اس بے چارے کی جان ہی نکال دی تھی۔''

''اس یونیفارم کی اپنی ایک دہشت اور ہیبت ہوتی ہے منشی جی۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن بعض خطرناک مجرم اتنے دیدہ دلیر ہوتے ہیں کہ وہ اس یونیفارم کو خاطر میں لائے بغیر پورے پولیس ڈیپارٹمنٹ کو چیلنج کرتے رہتے ہیں۔''

''آج کس خطرناک مجرم کی سرکوبی کے لیے آپ نے چنی وال کا رخ کیا ہے ملک صاحب؟'' وہ ٹٹولنے والے انداز میں بولا۔

''مجرم نہیں، ایک گمشدہ مظلوم کی تلاش میں، میں یہاں آیا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں منشی الیاس کو بتایا۔

''کون مظلوم؟'' اس کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے
''وہ.... مظلوم جو نجیب آباد میں مچھلیاں فروخت کرتا ہے۔ وہ تنویر جٹ کا دوست ہے اور اس سے ملنے دو روز پہلے یہاں آیا تھا۔'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اور ابھی تک وہ واپس اپنے گھر نہیں پہنچا۔''

''اوہ......'' منشی نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''تو آپ اس جھورا کی تلاش میں یہاں آئے ہیں......!''

''جب تم سمجھ ہی گئے ہو تو پھر تمہیں یہ بات بھی پتا ہو گی کہ جھورا کس مقصد سے تنویر جٹ سے ملنے چنی وال آیا تھا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''اور تمہیں یہ بات بھی معلوم ہو گی کہ وہ ابھی تک گھر کیوں نہیں پہنچا؟''

''ملک صاحب! جھورا پرسوں یعنی تین اپریل کو لگ بھگ گیارہ بجے دن میں یہاں پہنچا تھا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بتانے لگا۔ ''اس نے وڑائچ صاحب سے کافی تفصیلی ملاقات کی تھی اور دوپہر کا کھانا بھی ادھر دفتر ہی میں کھایا تھا پھر کوئی چار بجے کے قریب وہ یہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔ وہ پیدل سفر کرنے کا عادی ہے اور خاصا تیز بھی چلتا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق، اسے زیادہ سے زیادہ پانچ بجے اپنے گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ باقی جہاں تک جھورا کی آمد کے مقصد کی بات ہے تو....'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اس بارے میں مجھے کچھ پتا نہیں۔ اس سلسلے میں وڑائچ صاحب سے میری بات نہیں ہو سکی۔ وہ نہ تو کل دکان

پر آئے تھے اور نہ ہی آج آئیں گے۔‘‘

’’وڑائچ‘‘ کا لفظ منشی نے تنویر جٹ کے لیے استعمال کیا تھا۔ جس طرح کشمیری قوم کی بہت ساری اقسام ہیں مثلاً میر، راجا، بٹ، راٹھور، ڈار، ملک...... اسی طرح جٹ قوم کی بھی ڈھیروں اقسام ہیں جن میں وڑائچ بھی شامل ہے۔ میں نے منشی کو جھورا کی چنی دال آمد کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کرنا ضروری نہ سمجھا اور اس کے منگوائے ہوئے تانگے میں بیٹھ کر تنویر جٹ کی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔

تنویر جٹ کا گھر چنی وال کے وسط میں واقع تھا۔ یہ ایک عالی شان رہائش گاہ تھی جہاں خدمت کے لیے نوکر چاکر بھی موجود تھے۔ ایک ملازم نے ہمیں سیدھا تنویر جٹ کے پاس پہنچا دیا۔ اپنی سیٹنگ کے اعتبار سے وہ کمرا ایک بیڈ روم تھا۔

تنویر جٹ بھاری تن و توش کا مالک ایک دبنگ انسان تھا۔ وہ ایک کشادہ بیڈ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق، اس کی عمر پچاس اور پچپن کے درمیان ہوگی۔ ہم پر نگاہ پڑتے ہی وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے پُرتپاک نظر سے ہمارا استقبال کیا۔ میں نے بہ آہستگی تنویر جٹ سے مصافحہ کیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کانسٹیبل اشفاق نے بھی میری تقلید کی۔

ہمارے درمیان رسمی علیک سلیک کا مرحلہ طے ہو گیا تو اس نے ملازم سے کہا۔ ’’جاؤ، جلدی سے ملک صاحب کے لیے کھانے پینے کا بندوبست کرو۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ملک صاحب یہاں تشریف لائے ہیں۔‘‘

تنویر جٹ کے لہجے سے بیزاری اور نقاہت ٹپکتی تھی۔ منشی الیاس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور وہ پچھلے دو دن سے دکان پر بھی نہیں گیا تھا۔ اسی تناظر میں، میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

’’وڑائچ صاحب! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ میں نے سنا ہے، آپ دو دن سے منڈی بھی نہیں جا رہے......!‘‘

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ ’’آپ نے کہاں سے سن لیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں؟‘‘

وہ خاصا ہوشیار آدمی تھا جو اس نے میری بات کو پکڑ لیا تھا۔ میں نے بڑی رسان سے جواب دیا۔ ’’آپ کے منشی محمد الیاس نے مجھے آپ کی طبیعت کے بارے میں بتایا ہے۔ ہم ابھی منڈی ہی سے آ رہے ہیں اور آپ کا ملازم جھورا ہمارے گھوڑوں کی مٹھی چاپی کر رہا ہے......

’’اوہ......!‘‘ اس نے چوکنا نظر سے مجھے اور کانسٹیبل کو باری باری دیکھا۔ ’’اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ اس وقت کارِ سرکار پر نکلے ہوئے ہیں؟‘‘

’’آپ کا اندازہ درست ہے وڑائچ صاحب۔‘‘ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ’’میں ایک بندے کے بارے میں ضروری معلومات لینے آپ کے پاس آیا ہوں۔‘‘

’’کون بندہ؟‘‘ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

’’پہلے آپ اپنی طبیعت کا سنائیں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’بندے کے بارے میں بعد میں بات کریں گے۔‘‘

’’بس جناب، کیا بتاؤں......‘‘ وہ بیزاری سے بولا۔ ’’دانت کی تکلیف نے جان عذاب کی ہوئی ہے۔ کل کا پورا دن تو تیز بخار بھی رہا ہے۔ آج طبیعت قدرے بہتر ہے۔ میں نے سوچا ایک دن اور آرام کرلوں۔ کل سے دکان پر جاؤں گا۔ آپ کو تو پتا ہی ہے کہ دانت کا درد کتنا ظالم ہوتا ہے......؟‘‘

’’جی...... بہت ظالم۔‘‘ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ’’ایک میڈیکل ریسرچ کے مطابق، انسان کے لیے ناقابلِ برداشت اور چیخیں نکلوا دینے والے درد کی فہرست میں دانت کے درد کو دوسری پوزیشن حاصل ہے۔‘‘

’’اوہ......!‘‘ تنویر جٹ نے ایک گہری سانس خارج کی اور دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ’’پہلا نمبر کون سے درد کا ہے؟‘‘

’’پہلے نمبر پر دل کا درد ہے یعنی ہارٹ پین۔‘‘ میں نے بتایا۔ ’’دوسرا نمبر دانت کے درد کا ہے۔ تیسرے نمبر پر دو قسم کے درد بتائے جاتے ہیں۔ اول، دردِ شقیقہ یعنی آدھے سر کا درد یا مائیگرین۔ دوم دردِ زہ یعنی ڈیلیوری پین۔ اس کے بعد مختلف قسم کے دوسرے درد آتے ہیں۔‘‘

’’ماشاء اللہ......!‘‘ وہ تعریفی انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’آپ کی میڈیکل کی معلومات تو زبردست ہیں۔‘‘

’’ہر نوعیت کی معلومات رکھنا پڑتی ہیں وڑائچ صاحب۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’تھانے داری کوئی آسان کام نہیں ہے۔ آپ بتائیں، آپ کے دانت میں کس طرح کی تکلیف ہے۔‘‘

’’ایک ڈاڑھ کھوکھلی ہو چکی ہے اور اپنے برابر والی دوسری ڈاڑھ کو بھی متاثر کر رہی ہے۔‘‘ اس نے بتایا۔ ’’آپ کے ذہن میں میرے مسئلے کا کوئی حل ہے؟‘‘

’’علاجِ دنداں، اخراجِ دنداں!‘‘ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

”مطلب یہ کہ میں اس کھوکھلی ڈاڑھ کو نکلوا دوں......؟“ اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

”ملک صاحب! ان دانتوں سے دیرینہ تعلق ہے میرا......“

میں نے کہا۔ ”تعلق روگ بن جائے تو اسے توڑنا اچھا۔“

”میں غور کروں گا۔ فی الحال تو آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کس شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میرے پاس تشریف لائے ہیں؟“

اس دوران جٹ کے ملازم نے ہماری خاطر مدارات میں پوری ٹیبل سجادی تھی۔

”جھورا کے بارے میں۔“ میں نے جواب دیا۔

”جھورا کو تو آپ اپنے گھوڑوں کی دیکھ ریکھ پر لگا آئے ہیں!“ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

”میں اس جھورا کی نہیں بلکہ اُس جھورا کی بات کر رہا ہوں وڑائچ صاحب۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ جھورا مچھلی فروش جو قصبہ نجیب آباد کا وسنیک ہے اور آپ کا دوست بھی ہے۔ وہ پرسوں مورخہ تین اپریل آپ سے ملنے موضع چنی وال آیا تھا...... آیا تھا یا نہیں؟“

”بالکل آیا تھا جناب۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اس نے پورے پانچ گھنٹے میری دکان پر گزارے تھے۔ ہم نے دوپہر کا کھانا ایک ساتھ کھایا تھا پھر ہمارے بیچ مختلف امور پر بات چیت ہوتی رہی تھی۔ وہ چار بجے یہاں سے رخصت ہوگیا تھا......“ لمحاتی توقف کرکے اس نے تشویش بھری نظر سے مجھے دیکھا پھر پوچھا۔

”آخر ہوا کیا ہے؟ سب خیریت تو ہے نا؟“

”اگر خیریت ہوتی تو پھر مجھے نجیب آباد سے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی وڑائچ صاحب۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا دوست تین اپریل کی سہ پہر چار بجے آپ کے پاس سے رخصت تو ہوگیا تھا لیکن ابھی تک وہ نجیب آباد نہیں پہنچا۔ میں اسی کی تلاش میں چنی وال آیا ہوں۔ اس کی بیوی صفیہ اپنے خاوند کی پراسرار گمشدگی پر سخت پریشان ہے۔“

”یہاں سے تو وہ صحیح سلامت رخصت ہوا تھا۔“ وہ متفکر انداز میں بولا۔ ”اس کے پاس تو اچھی خاصی رقم بھی تھی۔ کہیں وہ کسی ڈاکو یا راہزن کے ہتھے تو نہیں چڑھ گیا؟“

تنویر جٹ کی تشویش بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ”میں نے اسے کئی بار سمجھایا تھا کہ وہ اپنا پیدل چلنے کا شوق صاف ستھرے علاقے میں پورا کرلیا کرے۔ اس گھنے جنگل میں تن تنہا سفر کرنا اور وہ بھی پیدل، خطرے سے خالی نہیں ہے جناب مگر جھورا نے کبھی میری بات پر توجہ نہیں دی......“

میں نے ابھی تک تنویر جٹ کے سامنے رقم کا ذکر نہیں کیا تھا اور وہ بتا رہا تھا کہ جھورا کے پاس اچھی خاصی رقم موجود تھی۔ صفیہ نے مجھے بتایا تھا کہ جھورا، تنویر جٹ سے ایک ہزار روپے ادھار لینے گیا تھا۔ میں نے اپنے اطمینان کی خاطر پوچھ لیا۔

”جھورا کی بیوی سے پتا چلا ہے کہ وہ آپ سے کچھ رقم لینے آیا تھا۔ آپ نے اسے کتنے پیسے دیے تھے؟“

”پورے دو ہزار روپے۔“ اس نے ٹھوس انداز میں جواب دیا۔

تنویر جٹ کے جواب نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ میں نے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔ ”کیا واقعی وہ آپ سے دو ہزار روپے لے کر گیا تھا؟“

”میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا ملک صاحب۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”جھورا مجھ سے جتنی رقم لے کر گیا ہے، میں وہی بتا رہا ہوں۔“

”لیکن صفیہ کا کہنا تو یہ ہے کہ جھورا آپ کے پاس ایک ہزار روپے لینے آیا تھا؟“

”وہ بھی غلط نہیں کہہ رہی۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

”یہ کیا بات ہوئی وڑائچ صاحب؟“

”بات یہ ہوئی ملک صاحب کہ......“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جھورا آیا تو ایک ہزار لینے ہی تھا لیکن میں نے زبردستی اسے دو ہزار دے دیے تھے۔“

”وڑائچ صاحب! آپ نے تو بات کو اور زیادہ الجھا دیا ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس ”زبردستی“ کا سبب بتانا پسند کریں گے؟“

”جی ضرور۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”جھورا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ادھر نجیب آباد میں مشتاق مہر سے زمین کا ایک ٹکڑا خریدنا چاہتا ہے۔ مشتاق مہر مذکورہ اراضی کے ڈیڑھ ہزار روپے مانگ رہا تھا۔ جھورا کے پاس پانچ سو روپے رکھے ہوئے تھے اور وہ ایک ہزار روپے مجھ سے ادھار لینے آیا تھا......“

”یہ ساری باتیں صفیہ مجھے بتا چکی ہے۔“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

”اب جو میں بتانے والا ہوں، وہ بھی سن لیں سرکار۔“ وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میں نے وہ قطعۂ اراضی دیکھ رکھا ہے، جھورا جسے خریدنے کی بات کر رہا تھا۔ میری ساری زندگی زمین داری میں گزری ہے ملک

صاحب۔ زمین کا وہ ٹکڑا کسی بھی طرح تین ہزار روپے سے کم کا نہیں ہے اور میں مشتاق مہر کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس بندے نے زندگی بھر نقصان کا سودا نہیں کیا پھر وہ زمین کا مذکورہ ٹکڑا آدھی قیمت میں کیونکر فروخت کرسکتا ہے۔ اسی خیال کے پیشِ نظر......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے جھورا کو ایک کے بجائے دو ہزار روپے زبردستی دے دیے تھے تاکہ زمین کا سودا کرتے ہوئے اسے کوئی پریشانی نہ ہو۔''

''آپ نے تو بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا تھا وڑائچ صاحب لیکن جھورا گھر پہنچا اور نہ ہی آپ کے دیے ہوئے دو ہزار روپے۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا یہاں چنی وال میں کسی کو یہ بات معلوم تھی کہ جھورا آپ سے دو ہزار روپے لے کر جارہا تھا؟''

''قطعی نہیں ملک صاحب!'' وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ ''یہ معاملہ صرف میرے اور جھورا کے بیچ میں تھا حتیٰ کہ میرے منشی الیاس کو بھی اس رقم کی کوئی خبر نہیں۔ یہ پیسے میں نے جھورا کو اپنی جیبِ خاص سے دیے تھے۔''

''ہوں......'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ چنی وال سے کوئی بندہ جھورا کے تعاقب میں نہیں گیا تھا......!''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ملک صاحب۔'' وہ پُروثوق انداز میں بولا۔ ''مجھے تو یہ سیدھی سیدھی ڈاکوؤں کی کارروائی لگتی ہے۔ کیا آپ نے جنگل کو چیک کیا ہے؟''

''میں نے چنی وال کا قصد کرنے سے پہلے ایک متلاشی پارٹی کو جنگل والے حصے کا کونا کونا چھان مارنے کی ہدایت کے ساتھ جنگل کی جانب روانہ کردیا تھا۔'' میں نے تنویر جٹ کو بتایا۔ ''اس پارٹی میں ایک تجربہ کار کھوجی بھی شامل ہے۔ اگر جھورا کے ساتھ جنگل کے اندر کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آیا ہے تو شام تک اس کا پتا چل جائے گا۔''

''ان شاء اللہ......!'' وہ خلوص بھرے انداز میں بولا۔ ''جھورا خیریت ہی سے ہوگا۔''

جھورا کے لیے تنویر جٹ کی فکرمندی اور پریشانی میں مجھے کوئی کھوٹ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ جھورا کا سچا اور مخلص دوست تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وڑائچ صاحب! جھورا کی تلاش کے سلسلے میں آپ مجھ سے کیا تعاون کرسکتے ہیں؟''

''جو آپ کا حکم ہو!'' اس نے بال کو میری کورٹ میں پھینک دیا۔

میں نے کہا۔ ''آپ اپنے چند قابلِ اعتماد افراد پر مشتمل ایک ٹیم تشکیل دیں اور انہیں جھورا کی تلاش میں چنی وال اور اردگرد کے گاؤں دیہات کی جانب روانہ کردیں۔''

''آپ فکر نہ کریں ملک صاحب! یہ کام آج ہی ہوجائے گا۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''جھورا میرا بہت سچا دوست ہے۔ میری پوری کوشش ہوگی کہ وہ جلدازجلد بازیاب ہوجائے۔''

''جھورا کی تلاش کا سلسلہ تو آپ پہلی فرصت میں شروع کرادیں۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''اس کے علاوہ آپ مجھے یہ بھی بتائیں کہ یہاں چنی وال میں جھورا کی کسی سے کوئی دشمنی تو نہیں تھی؟''

''جھورا اپنے کام سے کام رکھنے والا ایک سیدھا سادہ انسان ہے ملک صاحب۔'' وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ ''اسے دشمن اور دشمنی پالنے کا کبھی شوق نہیں رہا۔ میں چنی وال میں اس کے کسی دشمن سے واقف نہیں ہوں۔''

''اور وہاں نجیب آباد میں......؟''

''وہاں بھی جھورا کا کوئی دشمن میرے علم میں نہیں ہے۔''

''جیلا کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

وہ چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''جمیل عرف جیلا جھورا کا چھوٹا بھائی ہے۔''

''یہ بات میں بھی جانتا ہوں۔'' میں نے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا جیلا، جھورا کی گمشدگی میں ملوث ہوسکتا ہے؟''

''یہ بات آپ کسی خاص بنا پر کہہ رہے ہیں؟'' اس نے الٹا مجھ سے سوال کرڈالا۔

میں نے کہا۔ ''میں نے صفیہ کے رویّے میں جیلا کے لیے ایک خاص نوعیت کی سردمہری بلکہ نفرت دیکھی ہے اور کم وبیش اسی درجے کی عداوت اور ناپسندیدگی جیلا کے انداز میں بھی پائی جاتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں ہیں۔''

''دونوں بھائیوں میں کافی عرصے سے ناراضی اور چپقلش چل رہی ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ان کا ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا بھی نہیں ہے۔''

''آپ کو اس ناراضی اور چپقلش کا سبب بھی معلوم

ہوگا؟‘‘ میں نے کریدنے والے انداز میں کہا۔
’’دراصل، جیلا اور جھورا کے مزاج اور عادات واطوار میں زمین آسمان کا فرق ہے۔‘‘ وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔’’جب تک ان کے ماں باپ زندہ تھے، کسی نہ کسی طور نباہ ہورہا تھا۔ پھرایسی جدائی پڑی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی چلی گئی......‘‘
’’آپ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش تو نہیں کررہے؟‘‘
’’نہیں تو......‘‘ وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔’’آپ کو ایسا کیوں محسوس ہوا؟‘‘
’’میں نے جیلا اور جھورا کے بیچ جدائی کے اسباب تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔‘‘ میں نے تنویر جٹ کے چہرے پرنگاہ جماتے ہوئے کہا۔’’اور مجھے پتا چلا ہے کہ ایک ناخوشگوار واقعے کی وجہ سے دونوں بھائیوں کے درمیان اتنے طویل فاصلے پیدا ہوگئے ہیں......ورنہ پہلے تو جیلا کا جھورا کے گھر بہت آنا جانا تھا۔‘‘
اس نے بڑے محتاط انداز میں استفسار کیا۔’’کون سا ناخوشگوار واقعہ ملک صاحب؟‘‘
میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں تنویر جٹ کو اس واقعے سے آگاہ کردیا جو جیلا کی زبانی مجھ تک پہنچا تھا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور کہا۔
’’یہ واقعہ جھورا نے مجھے سنایا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ جیلا بکواس کرتا ہے۔ صفیہ ایسی گری ہوئی حرکت نہیں کر سکتی۔ ہاں، یہ ممکن ہے کہ جیلا نے موقع پا کر صفیہ سے دست درازی کی کوشش کی ہو اور جب صفیہ نے اپنی عزت کے تحفظ کے لیے شور شرابا مچایا ہو تو جیلا نے اپنا دامن بچانے کے لیے صفیہ کو موردالزام ٹھہرادیا ہو بلکہ......میں سمجھتا ہوں، ایسا ہی ہوا تھا۔‘‘
تنویر جٹ کے جواب سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ وہ صفیہ کو سچا اور جیلا کو جھوٹا سمجھتا تھا، یعنی اس کی ساری ہمدردی صفیہ کے ساتھ تھی۔
’’گویا آپ کی نظر میں جیلا صاف کردار کا مالک نہیں ہے؟‘‘ میں نے کہا۔’’اس کی بکواس پر توجہ نہیں دینا چاہیے؟‘‘
’’میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں ملک صاحب۔‘‘ وہ مستحکم انداز میں بولا۔
جیلا کے حوالے سے تنویر جٹ کے خیالات سے مکمل آگاہی حاصل کرنے کے بعد میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اسے بتاؤں کہ میں نے جیلا کو جنگل کی جانب جانے والی

چھاپا مار پارٹی میں شامل کر رکھا ہے اور ...... یہ کہ جیلا کے خیال میں، جھورا کی گمشدگی میں صفیہ کا بھی ہاتھ ہو سکتا ہے۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ جیلا کے حق میں کی گئی میری کسی بات کا بھی تنویر جٹ پر مثبت اثر نہیں ہوگا۔ وہ اس حوالے سے ایک مخصوص ذہن بنا چکا تھا۔ میں نے اس کے جواب کی روشنی میں کہا۔

''اگر آپ کی نگاہ میں جیلا قابلِ بھروسا نہیں ہے تو پھر کیا جھورا کی گمشدگی کے سلسلے میں اس پر بھی شک کیا جا سکتا ہے؟''

''میں سمجھتا ہوں، جیلا اس حد تک نہیں جا سکتا۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ دونوں بھائیوں کے بیچ رنجشوں اور تنازعات کے انبار لگے ہوئے تھے مگر اسے دشمنی نہیں کہا جا سکتا۔ میں نے ایسے آثار نہیں دیکھے جن کی بنیاد پر میں ان دونوں کے درمیان کسی سنگین دشمنی کی تصدیق کر سکوں۔''

دس پندرہ منٹ مزید گفتگو کے بعد میں نے کہا۔ ''وڑائچ صاحب! آپ کے تعاون کا بہت شکریہ۔ اپنی بیماری کے باوجود بھی آپ نے مجھے اتنا وقت دیا۔ اب اجازت چاہوں گا۔''

وہ اصراری لہجے میں بولا۔ ''آپ دوپہر کا کھانا کھا کر جائیں ملک صاحب۔''

''کھانا آپ کا مجھ پر قرض رہا۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''پھر کبھی چنی وال کا چکر لگا تو کھانا آپ کے گھر پر ضرور کھاؤں گا۔ فی الحال کارِ سرکار زیادہ اہم ہے۔''

''ضرور، ضرور...... کیوں نہیں۔'' وہ بڑی محبت اور اپنائیت سے بولا۔ ''آپ کا جب جی چاہے، چنی وال تشریف لائیں۔ میرے دل اور گھر کے دروازے آپ کو ہمیشہ کھلے ملیں گے۔''

الوداعی مصافحہ کرنے کے بعد ہم اس کے گھر سے نکل آئے۔

☆☆☆

میرے تھانے پہنچنے سے پہلے اے ایس آئی جہان زیب شیخوپورہ سے لوٹ آیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں جا کر بیٹھا تو وہ میرے پاس آ گیا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا رپورٹ ہے؟''

''ماسٹر عنایت کو لے آیا ہوں ملک صاحب۔'' اس نے بتایا۔

''اتنی دیر کہاں لگ گئی؟'' میں نے استفسار کیا۔ ''تمہیں تو کل رات ہی کو واپس آنا تھا؟''

''میں ضرور کل ہی واپس آ جاتا اگر یہ بندہ مجھے مل گیا ہوتا۔'' اس نے کہا۔ ''میں ڈھونڈتا ڈھانڈتا اس کے گھر پہنچا تو پتا چلا کہ یہ اپنی بیٹی سے ملنے دوسرے محلے گیا ہوا ہے۔ میں اس کے تعاقب میں دوسرے محلے پہنچا تو معلوم ہوا، یہ اپنی دوسری بیٹی کی طرف نکل گیا ہے۔ میں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا اور ایک گھر سے دوسرے گھر میرا سفر جاری رہا اور جب یہ اللہ کا بندہ ہاتھ لگا تو رات ہو چکی تھی۔ یہاں آنے کے لیے اس وقت کوئی بس نہیں مل سکتی تھی اس لیے میں ادھر شیخوپورہ ہی میں اپنی ایک خالہ کے گھر رک گیا تھا۔''

اے ایس آئی اپنی کارگزاری کی رپورٹ پیش کر چکا تو میں نے کہا۔ ''تم نے ابھی جس اللہ کے بندے کا ذکر کیا ہے اس نے تو اپنے خاندان کو اچھا خاصا پھیلا رکھا ہے!''

''جی جناب ......'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ماسٹر عنایت نے تین شادیاں کی تھیں اور اس کی پندرہ اولادیں ہیں۔ پانچ بیٹے اور دس بیٹیاں لیکن اس بے چارے کو اولاد کا سکھ نہیں مل سکا۔ بیٹیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں ملک صاحب۔ ماسٹر عنایت کی دس کی دس بیٹیاں شادی شدہ ہیں اور اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں مگر اس کے بیٹے گستاخ اور ناخلف نکلے ہیں۔ سب کے سب شادی شدہ اور زن مرید۔ اسی لیے وہ بے چارہ در در کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے......''

''اور اس کی تین بیویاں؟'' اے ایس آئی کی بات پوری ہونے سے پہلے میں نے پوچھ لیا۔ ''وہ ان کے پاس کیوں نہیں رہتا؟''

''وہ ایک ایک کر کے سب اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''بے چارہ بہت دکھی ہے۔ مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ وہ ایک جگہ ٹک کر نہیں رہتا۔ چند ماہ کہیں تو چند ماہ کسی اور جگہ۔ نجیب آباد میں آباد ہوئے اسے صرف دو ماہ ہوئے ہیں۔ فیکا درزی کے ساتھ اس کا دل یوں بھی لگ گیا ہے کہ کسی زمانے میں اس نے بھی ٹیلرنگ کا کام کیا تھا اسی لیے اس کے نام کے ساتھ 'ماسٹر' لگا ہوا ہے۔''

''تم ماسٹر عنایت کو لے ہی آئے ہو تو ذرا مجھے بھی اس کا دیدار کرا دو۔'' میں نے کہا۔

''جی ضرور......'' وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

ایک منٹ کے بعد ماسٹر عنایت میرے سامنے حاضر تھا۔ ماسٹر عنایت کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور کمزور سا انسان تھا۔ اے ایس آئی نے مجھے اس کی جو دکھ بھری کہانی سنائی تھی وہ بالکل ویسا ہی نظر بھی آتا تھا۔ اگر اولاد کی جانب سے انسان کو سکھ نہ ملے تو اس کی یہی حالت

ہوجاتی ہے۔

میں نے پندرہ بیس منٹ تک ماسٹر عنایت کو اپنے سوالات کی باڑ پر رکھا لیکن میرے پیشہ ورانہ تجربے نے مجھے بتادیا کہ کسی بھی حوالے سے جھورا کی گمشدگی میں اس کا ہاتھ نہیں تھا۔ اس نے جھورا کے ساتھ ''مچھلی'' والا جو سین کیا تھا، اس نوعیت کی دل جلانے والی اوٹ پٹانگ حرکتیں وہ اکثر لوگوں کے ساتھ کرتا رہتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں، وہ اولاد خصوصاً اپنے بیٹوں کے رویّے کی وجہ سے جن صدمات سے گزرا تھا، اس میں انسان کی ذہنی کیفیت ایسی ہی ہوجاتی ہے۔ وہ جان بوجھ کر کسی کو ٹارچر نہیں کرتا تھا۔ بس، مسلسل ملنے والے دکھوں کی وجہ سے یہ اس کا اسٹائل بن گیا تھا۔

میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی کیونکہ مجھے یقین ہوگیا تھا کہ جھورا کی گمشدگی میں وہ ملوث نہیں ہے بلکہ جب اسے پتا چلا کہ جھورا دو دن سے غائب ہے تو اس کے چہرے پر افسردگی اتر آئی۔ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے اس نے کہا۔

''کاش! میرے پانچوں بیٹے بھی جھورا کی طرح ہوتے......!''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا بتاؤں جی......!'' وہ خیالوں میں کھو گیا۔

میں نے کہا۔ ''اس وقت جو بھی ذہن میں ہے، سب بتادو۔''

''جھورا بڑا ہی بی با...... بہت فرمانبردار بندہ تھا تھانے دار صاحب۔'' وہ خوابناک لہجے میں بولا۔ ''میں جیسے جیسے کہتا گیا، وہ چپ چاپ کرتا چلا گیا۔ کاش، میرے بیٹے بھی جھورا جیسے فرمانبردار اور تحمل مزاج ہوتے......!''

ماسٹر عنایت اس وقت جس ذہنی کیفیت سے گزر رہا تھا، اس میں، میں نے اسے یہ یاد دلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ اس کی حرکت کی وجہ سے بالآخر جھورا کی تحمل مزاجی اور فرمانبرداری کی انتہا کردی تھی اور اس نے مجبور ہوکر صبر وضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا اور بے قابو ہوکر اس پر جھپٹ پڑا تھا۔

اے ایس آئی کو میں نے ماسٹر عنایت کے جانے کے بعد اپنے کمرے میں بلالیا اور تازہ ترین حالات پر اس سے گفتگو کرنے لگا۔ میں نے اسے اپنے دورۂ چنی وال کی تفصیل سے بھی آگاہ کیا۔ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''میں تنویر جٹ کی بات سے متفق ہوں ملک صاحب۔''

''مطلب تم بھی یہی سمجھتے ہو کہ جھورا کے ساتھ جنگل میں کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''فی الحال...... اور کوئی وجہ بھی تو نظر نہیں آ رہی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جھورا چنی وال سے دو ہزار روپے لے کر روانہ ہوا اور پھر وہ نجیب آباد نہیں پہنچا۔ نجیب آباد اور چنی وال کے درمیان تو جنگل ہی جنگل ہے ملک صاحب...... گھنا جنگل!''

''اسی گھنے اور خطرناک جنگل میں، میں نے ایک متلاشی ٹیم کو روانہ کر رکھا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور مجھے امید ہے کہ وہاں سے کوئی اچھی خبر آئے گی۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ویسے جھورا کی تلاش کے سلسلے میں ہمیں نجیب آباد کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔''

اے ایس آئی نے اگرچہ ایک عام سی بات کی تھی لیکن میں اس کی بات سن کر چونک اٹھا تھا۔ میں نے کہا۔

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو جہاں زیب۔ نجیب آباد کوئی زیادہ بڑا قصبہ نہیں۔ میں یہ کام تمہارے ذمے لگاتا ہوں اگر تم تھکے ہوئے نہ ہو تو......!''

''تھکن کا کیا سوال ملک صاحب۔'' وہ ہشاش بشاش لہجے میں بولا۔ ''رات بھر میں نے ادھر خالہ کے گھر میں آرام ہی کیا ہے۔''

''تو پھر تم نجیب آباد کے سروے پر نکل جاؤ۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''ذرا گھوم پھر کر لوگوں سے پوچھو۔ شاید کسی نے تین اپریل کی شام جھورا کو قصبے میں دیکھا ہو۔ ویسے اس بات کا امکان تو نظر نہیں آتا کہ جھورا نجیب آباد پہنچا ہو لیکن پھر بھی تفتیش کا تقاضا یہی ہے کہ ہمیں اس پہلو کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔''

اے ایس آئی مجھے سلام کر کے رخصت ہوگیا۔

تھوڑی دیر کے بعد کانسٹیبل الطاف کی ٹیم جنگل سے واپس آ گئی۔ اس ٹیم میں الطاف کے علاوہ کھوجی تاج دین عرف تاجو چاچا، کانسٹیبل جنید خان اور جھورا کا چھوٹا بھائی جیلا شامل تھے۔ ان کی واپسی کا سب سے افسوسناک پہلو یہ تھا کہ وہ لوگ جنگل سے ناکام و نامراد لوٹے تھے۔ کانسٹیبل الطاف نے مجھے بتایا۔

''ملک صاحب! ہم نے نجیب آباد سے لے کر چنی وال تک پھیلا ہوا سارا جنگل چھان مارا ہے لیکن ہمیں جھورا کا کوئی سراغ نہیں ملا حتیٰ کہ ہم نے شمالاً جنوباً بہنے والی بڑی نہر کے کنارے میلوں تک دیکھے ہیں۔''

وہ اپنی بات ختم کرچکا تو میں نے پوچھا۔ ''جیلا نظر نہیں آرہا۔ اسے کہاں چھوڑ آئے ہو؟''

''وہ ہمارے ساتھ ہی نجیب آباد پہنچا تھا۔'' الطاف نے بتایا۔ ''وہ اپنے گھر گیا ہے۔ کہہ رہا تھا، بہت تھک گیا ہوں۔ اگر میری ضرورت ہوئی تو میں تھانے آجاؤں گا ورنہ گھر میں آرام کروں گا۔''

میں نے الطاف سے پوچھا۔ ''کیا تم نے جھورا کی تلاش کے دوران میں جیلا پر گہری نظر رکھی تھی؟''

''جناب! میں آپ کے حکم کو کیسے بھول سکتا تھا......!''

''پھر اس کڑی نگرانی کا کیا نتیجہ برآمد ہوا؟''

''جناب! میں نے تو یہی محسوس کیا ہے کہ جیلا کسی بھی حوالے سے اپنے بڑے بھائی کی گمشدگی میں ملوث نہیں ہے۔''

''گویا تم لوگوں کی رپورٹ یہ ہے کہ جھورا جنگل میں کہیں نہیں ہے؟''

''جی ...... ہماری تحقیق تو یہی کہتی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''جھورا تین اپریل کی سہ پہر چار بجے چنی وال سے نجیب آباد کی طرف پیدل روانہ ہوا۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''اسے زیادہ سے زیادہ پانچ بجے تک نجیب آباد پہنچ جانا چاہیے تھا کیونکہ میری معلومات کے مطابق وہ کافی تیز چلنے کا عادی ہے مگر وہ اپنے گھر نہیں پہنچا۔ تم بتا رہے ہو کہ گھنے جنگل میں اس کا کوئی نام ونشان نہیں ملا۔ وہ آخر گیا تو گیا کہاں ...... کیا اسے زمین نے نگل لیا یا آسمان کھا گیا......؟''

''تاجو چاچا نے ایک عجیب بات کی ہے۔'' الطاف نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''جو میرے پلے نہیں پڑی۔''

''وہ عجیب بات مجھے بھی بتاؤ۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''ہوسکتا ہے، میری سمجھ میں آجائے۔''

''جب ہم یہاں سے روانہ ہوئے تھے تو ہم نے جھورا کی بیوی سے جھورا کا ایک جوتا لے لیا تھا تاکہ تاجو چاچا کو اس کا کھرا تلاش کرنے میں آسانی رہے۔'' کانسٹیبل الطاف وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''گزشتہ رات چونکہ اچھی خاصی بارش ہوگئی تھی لہٰذا کھوجی چاچا کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں۔ ایک تو جنگل کی گھاس دار زمین اور اوپر سے وہ بھی بھیگی ہوئی، ہمیں کہیں بھی جھورا کا کھرا نہیں مل سکا لیکن نہر والے پل کے اس کنارے پر تاجو چاچا کو کچھ ایسے آثار مل گئے جن کی بنا پر اسے شک ہے کہ جھورا نجیب آباد میں داخل ہوا تھا......''

''اوہ...... یہ تو بڑی خبر ہے۔'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا پھر پوچھا۔ ''تاجو کہاں ہے؟''

''وہ حوالدار اللہ بخش کے پاس بیٹھا گپ شپ کررہا ہے۔'' کانسٹیبل نے بتایا۔

''اس سے کہو میں بلا رہا ہوں، فوراً میرے پاس پہنچے۔'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''گپ شپ بعد میں بھی کی جاسکتی ہے۔''

اگلے ہی لمحے تاج دین عرف تاجو چاچا میرے سامنے حاضر تھا۔ تاجو ساٹھ کا ہندسہ عبور کرچکا تھا تاہم اس عمر میں بھی اس کی نگاہ سکس بائی سکس یعنی ایک دم شاندار تھی۔ وہ بغیر چشمہ لگائے نزدیک و دور بالکل ٹھیک دیکھ سکتا تھا۔ شاید یہ جوانی میں کھائی ہوئی خالص دیسی غذاؤں اور اصلی گھی کا کمال تھا۔

میرے استفسار پر تاجو چاچا نے بتایا۔ ''ملک صاحب! نہر کے پل سے جو راستہ نجیب آباد کی طرف آرہا ہے، وہاں میں نے جھورا کے قدموں کے معدوم سے نشانات دیکھے ہیں جس میں آنے اور جانے دونوں طرح کے نشانات شامل ہیں۔''

''اتنی بڑی بات اور تم حوالدار کے پاس بیٹھے گپیں ہانک رہے ہو......؟'' میں نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں ملک صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بہ ظاہر تو یہ بات بڑی ہی نظر آرہی ہے لیکن میں نے اسے اس لیے زیادہ اہمیت نہیں دی کہ جس جگہ جھورا کے قدموں کے نشانات ملے تھے، وہاں قریب ہی وہ تالاب ہے جہاں جھورا روزانہ مچھلیاں پکڑنے جاتا تھا۔ میں نے سوچا، شاید یہ جھورا کی گمشدگی سے پہلے کے نشانات ہیں۔''

تاجو چاچا کی بات میں وزن تھا۔ میں نے اسے تو جانے کی اجازت دے دی لیکن کانسٹیبل اشفاق کو اپنے پاس بلالیا۔ وہ آج چنی وال بھی میرے ساتھ گیا تھا۔ اشفاق نجیب آباد ہی کا رہنے والا تھا۔ وہ میرے پاس پہنچ کر بولا۔

''جی ملک صاحب! حکم کریں؟''

''ہمیں ابھی صفیہ سے ملاقات کرنے جانا ہے۔'' میں نے کہا۔

''خیریت تو ہے نا......؟'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''ہاں۔ سب خیریت ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''تم نے دیکھا تھا نا، کل صفیہ کی کیسی بری حالت

ہو رہی تھی۔ جھورا کی گمشدگی نے اسے پریشان کر رکھا ہے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ چنی وال سے واپسی پر میں اسے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کروں گا۔ بس، اسی سلسلے میں ہمیں اسے تسلی تشفی دینے جانا ہے۔''

''میں تیار ہوں جی۔'' وہ ریڈ الرٹ انداز میں بولا۔

میں نے اشفاق کے اطمینان کے لیے یہ بات کہہ دی تھی کہ میں صفیہ کو تسلی دینے اس کے گھر جا رہا ہوں ورنہ میرے ذہن میں کچھ اور ہی چل رہا تھا۔ تاجو چاچا نے جو بات بتائی تھی، اس کا ایک مطلب یہ بھی نکالا جا سکتا تھا کہ تین اپریل کی شام جھورا واپس نجیب آباد آیا تھا۔ اس ''مطلب'' کے ساتھ ہی میرے دماغ میں جیلا کے کہے ہوئے الفاظ بھی گردش کر رہے تھے...... تھانے دار صاحب! یہ بڑی خطرناک عورت ہے۔ ہو سکتا ہے، اسی نے بھائی جھورا کے ساتھ کچھ کر دیا ہو۔ آپ کو بھائی کے گھر کی تلاشی لینا چاہیے......!

جب ہم جھورا کے گھر کے نزدیک پہنچے تو مغرب کی اذان ... ہو رہی تھی۔ ہم نے جھورا کے دروازے پر دستک دی تو فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی صفیہ نے اپنے شوہر کے بارے میں استفسار کیا۔ اس کی آواز سے فکرمندی جھلکتی تھی۔

''تھانے دار صاحب! جھورا کا کچھ پتا چلا؟''

میں نے اسے اپنی کارگزاری سے آگاہ کیا اور کہا۔ ''میں نے سارا جنگل چھان مارا ہے۔ چنی وال اور اردگرد کے گاؤں میں بھی تلاش کر لیا ہے۔ بس، ایک جگہ باقی رہ گئی تھی۔ میں نے سوچا، ذرا اسے بھی چیک کر لیتا ہوں......''

''کون سی جگہ؟'' اس نے گھبراہٹ آمیز انداز میں پوچھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''گمشدہ جھورا کا گھر۔''

''کک...... کیا...... آپ میرے گھر کی تلاشی لینے ...... آئے ہیں......؟'' وہ خوفزدہ ہو گئی۔ ''جھورا یہاں کیسے ہو...... سکتا ہے......!''

''ہاں......'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے۔ تم تو ایسے ڈر رہی ہو جیسے تم نے اپنے خاوند کو گھر کے اندر ہی کہیں چھپا رکھا ہے......؟''

''آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں...... تھانے دار صاحب!'' وہ قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اگر جھورا گھر میں ہوتا تو پھر میں اس کے لیے دو دن سے ماری ماری کیوں پھر رہی ہوتی۔''

''پھر تو گھر کی تلاشی دینے میں تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے......!''

''جی...... کوئی اعتراض نہیں مجھے۔'' وہ ہمیں راستہ دیتے ہوئے بولی۔ ''آپ اندر آ جائیں۔''

گھر کی تلاشی کا سن کر صفیہ کے چہرے پر جو گھبراہٹ نمودار ہوئی تھی، اس نے چند لمحات کے لیے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا اور مجھے جیلا کے خدشات سچ ہوتے دکھائی دینے لگے تھے لیکن جتنی آسانی سے اس نے ہمیں گھر کے اندر آنے کی دعوت دی تھی، اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ جھورا کی گمشدگی کے حوالے سے اس کا دامن صاف ہے۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں پریشانی کے جو آثار ابھرے تھے، وہ اس کی حالیہ ذہنی پریشانی کا عکس بھی ہو سکتے تھے۔ بلاشبہ وہ بڑے نازک حالات سے گزر رہی تھی۔

''یہ معمول کی ایک چھوٹی سی کارروائی ہے۔'' میں نے صفیہ کے گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔''

''کوئی بات نہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ ''آپ قانونی تقاضے ضرور پورے کریں۔ جھورا آپ کو اس گھر میں کہیں بھی نہیں ملے گا۔''

صفیہ کے آخری جملے میں بے پناہ اعتماد تھا۔ ایسا اعتماد انسان کے الفاظ میں اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب اسے کسی بات کا صد فیصد یقین ہوتا ہے۔

میں نے صفیہ کی معیت اور لالٹین کی موجودگی میں گھر کے دونوں کمرے، صحن، باورچی خانہ اور دیگر تمام حصے بھی دیکھ ڈالے لیکن مجھے کسی بھی جگہ پر جھورا یا اس کی موجودگی کے حوالے سے کوئی سراغ نہ ملا۔ ایک اندرونی کمرے کا کچھ حصہ مجھے قدرے گیلا نظر آیا جیسے وہاں کی زمین کو تازہ تازہ پوتا گیا ہو۔ میں نے کمرے کے فرش کے اس حصے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے صفیہ سے سوال کیا۔

''یہاں کیا ہوا ہے؟''

''میں نے بستروں کی پیٹی کو گھسیٹ کر ایک کونے میں کیا تھا۔'' وہ ایک چھ بائی چار فٹ کی جستی پیٹی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''جس کی وجہ سے کچے فرش پر کھرونچے پڑ گئے تھے۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے ہی اس اکھڑی ہوئی زمین پر پونچھا مارا ہے جس کی وجہ سے یہ گیلی ہو رہی ہے۔''

صفیہ کا جواب معقول تھا لیکن کسی اندرونی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں آگے بڑھ گیا۔ شاید میری یہ حرکت جیلا

کی اس بات کے زیرِ اثر تھی کہ ممکن ہے صفیہ نے بھائی جھورا کو گھر کے اندر ہی کہیں چھپا رکھا ہو......!

جستی پیٹی میں کوئی تالا وغیرہ نہیں لگا ہوا تھا۔ میں نے پیٹی کے قریب پہنچ کر صفیہ سے کہا۔ ''اگر تمہیں برا نہ لگے تو میں پیٹی کے اندر جھانک کر دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''اس میں برا ماننے والی کوئی بات نہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''پیٹی کے اندر بستر بھرے ہوئے ہیں۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں تو آپ پیٹی کو چیک کرلیں۔ میں لالٹین سے آپ کو روشنی دکھاتی ہوں۔''

بات کے اختتام پر اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لالٹین کو قدرے بلند کردیا تھا تاکہ میں آسانی سے پیٹی کے اندرونی ماحول کا جائزہ لے سکوں۔ جب سے میں نے تلاشی کا یہ سلسلہ شروع کیا تھا، لالٹین مسلسل صفیہ کے ہاتھ میں تھی۔ سورج کو غروب ہوئے ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے لیکن کمروں کے اندر اندھیرا چھا چکا تھا۔

میں نے اس جستی پیٹی کے اندر موجود تمام کپڑوں کو اچھی طرح چیک کرلیا۔ وہاں پر لحافوں، گدوں اور تکیوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا یا پھر بستر پر بچھانے والی چند چادریں تھیں گویا اس پیٹی میں مکمل طور پر بسترے ہی بھرے ہوئے تھے۔

میں نے پیٹی کو بند کردیا اور صفیہ کے ساتھ کمرے سے باہر آتے ہوئے کہا۔ ''تم فکر نہیں کرو۔ میں بہت جلد جھورا کو ڈھونڈ نکالوں گا۔''

''آپ کو یہ تسلی تو ہوگئی نا کہ میں نے جھورا کو گھر کے اندر کہیں چھپا کر نہیں رکھا ہوا؟'' اس کے استفسار سے گہری شکایت جھلکتی تھی۔

''اگر میرے کسی عمل سے تمہاری دل آزاری ہوئی ہو تو میں معذرت چاہتا ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں نے جو کیا وہ سب تفتیش کا حصہ ہے۔''

''کوئی بات نہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ معتدل انداز میں بولی۔ ''میرے لیے یہی بڑے اطمینان کی بات ہے کہ آپ کی نظر میں میرا دامن صاف ثابت ہوگیا ہے۔''

میں صفیہ کو تسلی دلاسا دینے کے بعد واپس تھانے آ گیا۔

میری واپسی پر اے ایس آئی جہاں زیب بھی تھانے میں موجود تھا۔ میں نے اس سے رپورٹ طلب کی تو اس نے بتایا کہ پچھلے دو دن سے کسی شخص نے جھورا کو نجیب آباد میں نہیں دیکھا۔

تفتیش کی گاڑی ایک مقام پر آ کر رک گئی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جھورا کہاں غائب ہوگیا۔ ابھی تک کوئی ایسا سرا ہاتھ نہیں لگا تھا جسے تھام کر میں جھورا تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاؤں۔

میں نے تمام تفکرات کو ذہن سے جھٹکا اور اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔

☆☆☆

کہتے ہیں تاریکی چاہے کتنی بھی گہری کیوں نہ ہو، اسے کبھی نہ کبھی روشنی کے سامنے گھٹنے ٹیکنا ہی پڑتے ہیں۔ جیسے ہر رات کے بعد لازی سحر نمودار ہوتی ہے، اسی طرح ہر الجھن کی کوئی نہ کوئی سلجھن بھی ہوتی ہے۔ میں بھی اپنے کوارٹر میں بستر پر لیٹا اپنی الجھن کو سلجھانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے چونکا دیا۔

وہ نصف شب کا عمل تھا۔ میرے تھانے کا عملہ عموماً رات میں مجھے ڈسٹرب نہیں کیا کرتا تھا۔ چھوٹے موٹے معاملات کو وہ لوگ خود ہی نمٹا لیا کرتے تھے۔ آدھی رات کو دستک کا ایک ہی مطلب تھا کہ معاملہ سنگین ہے لہٰذا میں بستر چھوڑنے پر مجبور ہوگیا۔

میں نے صحن عبور کر کے اپنے کوارٹر کا بیرونی دروازہ کھولا تو سامنے شبینہ ڈیوٹی والا ایک کانسٹیبل کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''ملک صاحب! جیلا تھانے میں بیٹھا ہوا ہے۔'' اس نے اضطراری لہجے میں بتایا۔ ''وہ فی الفور آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''مسئلہ کیا ہے؟''

''وہ ہمیں کچھ نہیں بتا رہا......'' کانسٹیبل نے کہا۔ ''کہتا ہے، میں تھانے دار صاحب ہی سے بات کروں گا۔''

''ٹھیک ہے، میں لباس تبدیل کر کے آ رہا ہوں۔''

کانسٹیبل مجھے سیلوٹ کر کے رخصت ہوگیا۔

یونیفارم پہننے کے دوران میں میرا ذہن مسلسل جیلا کے بارے میں ہی میں سوچ رہا تھا۔ کسی اہم معاملے کے ساتھ آدھی رات کو اس کی تھانے میں آمد کا ایک ہی مطلب تھا کہ اس کے پاس اپنے بھائی جھورا کی گمشدگی کے حوالے

سے کوئی سنسنی خیز اطلاع موجود تھی۔ میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔

مجھ پر نگاہ پڑتے ہی جیلا انکشاف انگیز انداز میں بولا۔ ”آپ کو ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ وہاں چلنا ہوگا......!“

”کہاں چلنا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”بھائی جھورا کے گھر......“

”کیوں؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”جھورا کے گھر میں ایسا کیا ہوگیا ہے کہ آدھی رات کو میرا وہاں جانا ضروری ہوگیا......؟“

”آپ بھی چلیں اور اپنے ساتھ تھوڑی نفری بھی لے لیں۔“ وہ اضطراری انداز میں بولا۔ ”میں نے چند منٹ پہلے مشتاق مہر کو جھورا کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔“

”آدھی رات کو وہ وہاں کیا کرنے گیا ہے......!“ میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ جیلا کی بات نے مجھے تشویش میں ڈال دیا تھا۔

”تھانے دار صاحب! آپ دیر نہ کریں۔“ وہ جھنجلاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ”آج اس کمینی کو رنگے ہاتھوں پکڑنا ہے۔“

”کمینی“ کا لفظ اس نے یقیناً اپنی بھابی صفیہ کے لیے استعمال کیا تھا۔ میں نے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔ ”یہ مشتاق مہر وہی ہے نا جس سے تمہارا بھائی جھورا کوئی زمین وغیرہ خرید رہا تھا؟“

”جی ...... یہ وہی بندہ ہے۔“ وہ نفرت بھرے لہجے میں بولا۔ ”آپ باتوں میں وقت ضائع نہ کریں تھانے دار صاحب۔ میں آپ کے سارے سوالوں کے جواب راستے میں دے دوں گا۔“ بات کے اختتام پر وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔

جیلا جتنی بڑی اور سنسنی خیز خبر لایا تھا، اگر وہ حقیقت تھی تو پھر واقعتاً ایک لمحہ ضائع کرنا بھی حماقت کے زمرے میں آتا۔ میں نے حوالدار اللہ بخش کو ساتھ لیا اور جیلا کی معیت میں جھورا کے گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔

راستے میں، میں نے جیلا سے کہا۔ ”اگر تمہاری اطلاع غلط ثابت ہوئی تو میں تمہارے ساتھ بہت سختی سے پیش آؤں گا، یہ بات ذہن میں رکھنا۔“

جیلا نے مجھے صفیہ کی جو کہانی سنائی تھی، تنویر جٹ کی نظر میں وہ ایک پروپیگنڈا سے زیادہ کچھ بھی نہیں تھا۔ تنویر جٹ کے مطابق، جیلا اپنی بھابی کو ناپسند کرتا تھا اس لیے وہ اس کے خلاف الٹی سیدھی باتیں کرتا رہتا تھا لہٰذا اس کی بکواس پر توجہ نہیں دینا چاہیے۔ تنویر جٹ نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ عین ممکن ہے، جیلا نے صفیہ پر مجرمانہ حملہ کرنے کی کوشش کی ہو اور ناکامی کی صورت میں اس نے سارا ملبا صفیہ پر ڈال دیا ہو۔ اگر تنویر جٹ کی رائے کو مستند مان لیا جاتا تو پھر یہ سوچا جاسکتا تھا کہ اس وقت بھی جیلا کوئی ڈراما رچانے کی کوشش میں تھا۔ اسی امکان کے پیشِ نظر میں نے اسے وارننگ دی تھی۔

”آپ سختی سے پیش آنے کی بات کر رہے ہیں۔“ وہ سینہ ٹھونک کر بولا۔ ”اگر میری اطلاع غلط نکلی تو میں گردن کٹوانے کے لیے بھی تیار ہوں۔ میں تو نگرانی کے لیے وہاں ایک بندہ بھی کھڑا کر آیا ہوں۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

”جناب! میں نے اپنے ایک دوست طارق کو بھائی جھورا کے دروازے سے تھوڑے فاصلے پر کھڑا کر دیا ہے۔“ اس نے فخریہ انداز میں بتایا۔ ”تاکہ آپ کے وہاں پہنچنے سے پہلے اگر مشتاق مہر گھر سے باہر نکل آئے تو طارق اسے دبوچ لے۔ میں آپ کی نظر میں جھوٹا ثابت نہیں ہونا چاہتا تھانے دار صاحب۔“

جیلا کے لہجے میں جھلکتا اعتماد اس امر کی گواہی دیتا تھا کہ وہ دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ میرے لیے یہ ایک بہت بڑا سوال تھا کہ آدھی رات کو مشتاق مہر جھورا کے گھر میں اکیلی صفیہ کے پاس کیا کر رہا تھا؟

اس سوال کے مختلف جواب ہوسکتے تھے...... ممکن ہے، جھورا واپس آگیا ہو اور مشتاق مہر زمین کی خریداری کے حوالے سے اس سے کوئی بات کرنے آیا ہو۔ یہ بہت کمزور جواب تھا کیونکہ مغرب کے وقت تو میں خود صفیہ کے گھر کے اندر موجود تھا اور تب تک جھورا کی واپسی نہیں ہوئی تھی اور پھر آدھی رات کو اس نوعیت کی ملاقات کا کوئی جواز بھی نہیں بنتا تھا لہٰذا میں نے اس امکان کو رد کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا امکان میرے ذہن میں ابھرا...... کہیں صفیہ اور مشتاق مہر کے بیچ کوئی خفیہ تعلق تو نہیں؟

یہ خاصا خطرناک خیال تھا اور جیلا کے بیان کردہ واقعے کو تقویت پہنچاتا تھا جس میں صفیہ کا کردار داغ دار دکھائی دیتا تھا۔ صفیہ کی ذات کے حوالے سے منفی انداز میں سوچتے ہوئے میرے ذہن میں کمرے کا وہ گیلا فرش تازہ ہوگیا جہاں صفیہ کے بقول اس نے پونچھا لگا رکھا تھا اور صفیہ نے پونچھے کا جو سبب بتایا تھا، وہ اس وقت تو مجھے ہضم ہوگیا تھا

لیکن اب میرا ذہن کسی اور انداز میں سوچ رہا تھا۔

بستروں والی جستی پیٹی کو کبھی بھی ایسے ہی زمین کے اوپر نہیں رکھ دیا جاتا بلکہ اس کے چاروں کونوں کے نیچے اینٹیں لگائی جاتی ہیں تاکہ پیٹی زمین کی سطح سے تھوڑی اوپر رہے۔ میں نے صفیہ کے گھر کے ایک کمرے کے کونے میں جو جستی پیٹی دیکھی تھی، وہ زمین کے ساتھ لگی ہوئی تھی جیسے عارضی طور پر اسے وہاں رکھ دیا گیا ہو۔ صفیہ کے بیان کے مطابق، اس نے پیٹی کو گھسیٹ کر کونے میں کیا تھا جس کی وجہ سے کچے فرش پر کھرونچے سے پڑ گئے تھے اور اسے پوچھا لگانا پڑا تھا۔ میرے ذہن نے چیخ کر کہا...... اس پیٹی کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہے......!

میں جب صفیہ کے گھر کے معائنے پر تھا تو میں نے مذکورہ جستی پیٹی کو کھول کر اس کے اندر کا تفصیلی جائزہ بھی لیا تھا۔ اس کے اندر رضائیاں، ولائیاں، تکیے اور بستر کی چادریں وغیرہ بھری ہوئی تھیں۔ مجھے اس پیٹی میں کہیں کوئی گڑبڑ دکھائی نہیں دی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ ساری گڑبڑ اسی پیٹی کے نیچے گیلے فرش کے اوپر یا...... گیلے فرش کے نیچے تھی۔

جب انسانی ذہن کو سوچنے کے لیے کوئی مخصوص زاویہ مل جائے تو پھر ہر گتھی خود بہ خود کھلتی چلی جاتی ہے۔ میں بھی صفیہ کی ذات کے حوالے سے ایک منطقی نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ میرے ذہن کا اخذ کیا ہوا نتیجہ حالاتِ حاضرہ سے لگا کھاتا ہے یا نہیں۔

ہم صفیہ کے گھر کے سامنے پہنچ گئے تو ایک شخص اندھیرے سے نکل کر تیزی سے ہماری جانب بڑھا۔ جیلا نے کہا۔ ”تھانے دار صاحب! یہ طارق ہے جسے میں نے نگرانی کے لیے یہاں کھڑا کر رکھا تھا۔“

طارق ہمارے قریب پہنچا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیا مشتاق مہرا بھی تک جیلا کے گھر کے اندر ہی ہے؟“

”جی، تھانے دار صاحب۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

”اگر دستک دی تو مشتاق مہر ہوشیار ہو جائے گا۔“ جیلا نے اضطراری انداز میں کہا۔ ”ہمیں دیوار پھلانگ کر گھر کے اندر داخل ہونا چاہیے ورنہ وہ بدمعاش نکل جائے گا۔“

اگرچہ جیلا کی یہ تجویز برمحل تھی لیکن اخلاقی اعتبار سے اسے موزوں قرار نہیں دیا جاسکتا تھا مگر اس وقت ایک تنہا نامحرم عورت کے گھر میں مشتاق مہر کی موجودگی اس معاملے کو قابلِ دخل اندازی پولیس بناتی تھی، خاص طور پر ایک ایسی اکیلی عورت جس کا گھر والا پچھلے دو دن سے گمشدہ تھا۔ ان حالات میں جیلا کی تجویز پر عمل کرنے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔

”تھانے دار میں ہوں یا تم؟“ میں نے جیلا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

وہ گڑبڑا گیا۔ ”ظاہر ہے جی...... تھانے دار تو...... آپ ہی ہیں......“

”پھر اس بات کا فیصلہ بھی مجھے ہی کرنے دو کہ جھورا کے گھر میں داخل ہونے کے لیے ہمیں کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا پھر اس کے چوکیدار دوست کو مخاطب کرتے ہوئے اضافہ کیا۔

”طارق! تم جیلا کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور وہیں اندھیرے میں کھڑے ہو کر انتظار کرو۔ اگر مجھے تم لوگوں کی مدد کی ضرورت ہوگی تو میں آواز دے کر بلا لوں گا۔“

”جی، ٹھیک ہے تھانے دار صاحب۔“ طارق نے فرمانبرداری سے کہا۔

وہ دونوں چلے گئے تو میں نے صفیہ کے دروازے کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے کہا۔ ”اللہ بخش! تم بہ آہستگی دیوار پھاند کر گھر کے اندر پہنچو گے اور دروازے کی کنڈی کھول دو گے تاکہ میں بھی گھر میں داخل ہو سکوں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا......؟“

”جی ملک صاحب! میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ یہ تھیلا پکڑیں، میں دیوار پر چڑھ رہا ہوں۔“

میں نے حوالدار کے ہاتھ سے وہ تھیلا لے لیا۔ مذکورہ تھیلے کے اندر دو ہتھکڑیاں اور کچھ دیگر سامان تھا۔ میں جب مجرموں کی سرکوبی کے لیے میدانِ عمل میں اترتا تھا تو ہر زاویے سے مکمل تیاری کر کے تھانے سے نکلتا تھا۔ میرا سروس ریوالور بھی اس وقت میرے پاس ہی تھا۔ میں ہر قسم کے ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔

وہ پانچ اپریل کی ایک معتدل رات تھی۔ اصولی طور پر چھ اپریل کی تاریخ شروع ہو چکی تھی۔ میری رسٹ واچ ایک بج کر دس منٹ کا وقت بتا رہی تھی۔ رات کے اس پہر مشتاق مہر کی صفیہ کے گھر میں موجودگی ذہن میں سیکڑوں خطرناک سوالات کو جنم دیتی تھی۔ میں نے کسی ایک سوال کے جواب کے لیے بھی اپنے ذہن کو زحمت دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ چند لمحات کے بعد میرے ہر سوال کا عملی جواب ”حاضرِ خدمت“ ہونے والا تھا۔ میں نے جیلا کو دانستہ باہر روک دیا تھا کیونکہ صفیہ اسے سخت

ناپسند کرتی تھی۔ جیلا کی وہاں موجودگی سے کوئی بھی بدمزگی پیدا ہوسکتی تھی اور میں ان سنسنی خیز لمحات میں کسی بدمزگی کے موڈ میں نہیں تھا۔

حوالدار نے میری ہدایت کے مطابق، گھر کے اندر پہنچ کر دروازے کی کنڈی کھول دی۔ اگلے ہی لمحے میں جھورا کے گھر کے اندر تھا۔ یہ مرحلہ چند سیکنڈ میں طے ہوگیا تھا اور ایک ذرا سی بھی آواز یا کھٹکا پیدا نہیں ہوا تھا۔ اندر پہنچتے ہی میں نے دروازے کی کنڈی لگا دی۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہر طرف خاموشی اور تاریکی کا راج تھا۔ گھر کا صحن خالی تھا۔ ویرانی اور سناٹا میرے پیشِ نظر تھے۔ ان دنوں موسم میں کافی گرمائش اتر آئی تھی۔ موسم کی مناسبت سے صفیہ کو گھر کے صحن یا پھر برآمدے میں محوِ نیند ہونا چاہیے تھا مگر وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دی۔ اس صورتِ حال نے میرے ذہن میں موجود شک کے گھوڑے کو مہمیز کیا اور میں دبے قدموں، گھر کے پچھلے حصے میں بنے کمروں کی سمت بڑھنے لگا۔

میں آج شام میں جھورا کے گھر کا تفصیلی معائنہ کرچکا تھا لہٰذا اس پیش قدمی میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میں اور حوالدار اللہ بخش برآمدے میں پہنچ گئے۔ دونوں کمرے ہمارے سامنے تھے جن میں سے ایک کا دروازہ کھلا ہوا تھا جبکہ دوسرے کا دروازہ بند تھا۔ بند دروازے کے پیچھے ہلکی سی روشنی بھی نظر آرہی تھی۔ یہ وہی کمرا تھا جس کے پتھریلے فرش پر میں نے ایک جستی پیٹی مشکوک انداز میں رکھی دیکھی تھی۔ کمرے کے اندر یقیناً لالٹین روشن تھی جس کی ہلکی سی روشنی دروازے کی درزوں سے چھن کر باہر آرہی تھی۔

میں نے دروازے کی ایک نسبتاً بڑی جھری سے کان لگا کر اندر کی صورتِ حال کو بھانپنے کی کوشش کی۔ اگلے ہی لمحے میں چونک اٹھا۔ اندر دو افراد کے دھیمے سروں میں باتیں کرنے کی آوازیں پیدا ہورہی تھیں۔ ان میں ایک آواز نسوانی اور دوسری مردانہ تھی۔ میں نے اپنی تمام تر قوتِ سماعت کو وہ آوازیں سننے اور سمجھنے پر مامور کردیا۔ اس کے ساتھ ہی میرا دماغ سلگ اٹھا۔ کمرے کے اندر سے جس نوعیت کی آوازوں نے میری سماعت تک رسائی حاصل کی، اس سے مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ صفیہ کمرے کے اندر کسی مرد کے ساتھ شرم ناک حالت میں تھی......!

وہ فیصلہ کن لمحات تھے۔ کمرے کے اندر صفیہ کے ساتھ یقیناً مشتاق مہر ہی تھا۔ جیلا نے بالکل درست کہا تھا...... تھانے دار صاحب! آج اس کمینی کو رنگے ہاتھوں پکڑنا ہے۔ مجھے صفیہ کے کردار سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ میں تو جھورا کی بازیابی کے لیے دن رات ایک کیے ہوئے تھا۔ جس عورت کو اپنے شوہر کی گمشدگی پر بے حد غمزدہ ہونا چاہیے تھا، وہ رات کے اس پہر ایک نامحرم کے ساتھ اپنا منہ کالا کررہی تھی۔ میرے ذہن نے فیصلہ سنا دیا...... اگر جھورا کی گمشدگی کا معما حل کرنا ہے تو صفیہ اور مشتاق مہر پر ہاتھ ڈالنا ہوگا...... ابھی اور اسی وقت......!

میں نے حوالدار اللہ بخش کو ریڈ الرٹ ہونے کا اشارہ دیا اور اپنا ہاتھ کمرے کے دروازے کی جانب بڑھا دیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے دروازے پر دستک دی اور کان کو ایک مرتبہ پھر جھری کے ساتھ چپکا دیا۔

دستک کی آواز پر ایک لمحے کے لیے کمرے کے اندر خاموشی چھا گئی تھی۔ میری تمام تر توجہ اندر کے معاملات پر لگی ہوئی تھی۔ اگلے ہی لمحے ایک تشویش بھری مردانہ آواز ابھری۔

’’صفیہ! اس وقت تمہارے گھر میں کون آگیا؟‘‘

’’میں تو خود حیران ہوں......‘‘ صفیہ کے لہجے سے پریشانی مترشح تھی۔

’’تم نے باہر والے دروازے کی کنڈی تو لگا دی تھی نا؟‘‘ مردانہ آواز نے استفسار کیا۔

’’ہاں مشتاق......‘‘ صفیہ کی الجھن بھری آواز ابھری۔

ان دونوں کی تشویش بھری گفتگو نے صورتِ حال کو روزِ روشن کی طرح عیاں کردیا تھا۔ اس کمرے میں آمدورفت کا واحد راستہ یہی دروازہ تھا گویا مشتاق مہر کے فرار کے لیے کوئی اور راستہ موجود نہیں تھا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر دروازے پر دستک دی اور کڑک دار آواز میں کہا۔ ’’صفیہ! دروازہ کھول دو۔ تمہارا ڈراما ختم ہوچکا۔‘‘

’’مشتاق! یہ تو تھانے دار کی آواز ہے......‘‘ صفیہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’اب کیا ہوگا......؟‘‘

’’تم فکر نہ کرو اور جاکر دروازہ کھول دو۔‘‘ مشتاق مہر نے کہا۔ ’’یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں یہاں ہوں۔ میں پیٹی کے اندر چھپ جاتا ہوں۔ تم کسی طرح تھانے دار کو مطمئن کرکے واپس بھیج دینا۔ ایک بات ذہن میں رکھو کہ تھانے دار بھی ایک مرد ہے اور تمہارا جوبن تو بڑے بڑوں کے ہوش اڑا دیتا ہے۔ اگر ضرورت محسوس کرو تو اپنے بدن کی تھوڑی سی سوغات تھانے دار کی خدمت میں بھی پیش کردینا۔ یہ وقت اور حالات کی مجبوری ہے......‘‘

''تم دروازہ کھول رہی ہو یا میں اسے توڑ کر اندر آؤں؟'' میں نے گرج دار آواز میں کہا اور ایک بار پھر زوردار دستک دی۔

مشتاق مہر کی باتوں نے میرے تن بدن میں شرارے بھر دیے تھے۔ یہ بندہ بے غیرتی کے آخری درجے پر فائز تھا۔ مجھے تیسری بار دستک نہیں دینا پڑی۔ صفیہ نے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور بے ترتیب لباس کے ساتھ نیند بھری آواز میں بولی۔

''تھانے دار صاحب ...... آپ اس وقت ...... خیریت تو ہے نا......؟''

میں نے ان کی بند کمرے کی گفتگو سن لی تھی اور مجھے معلوم تھا کہ مشتاق مہر اس وقت جستی پیٹی کے اندر چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے کمرے میں چاروں جانب نگاہ دوڑانے کے بعد سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''دولہا کہاں ہے......؟''

''دولہا......'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولی۔ ''آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟''

''میں اس بندے کا ذکر کر رہا ہوں جس کے ساتھ ابھی تمہارا نکاح پڑھایا جائے گا تاکہ تمہیں رات کی تاریکی میں چھپ چھپ کر اس کے ساتھ منہ کالا نہ کرنا پڑے۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''مشتاق مہر کہاں ہے؟''

میرے آخری جملے نے صفیہ کو لرزا کر رکھ دیا۔ وہ بکھری ہوئی آواز میں بولی۔ ''مشتاق......کون مشتاق......؟''

میں نے بے ساختہ اس کے گال پر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کرتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''وہ مشتاق مہر جس کے ساتھ اس وقت تم رنگ رلیاں منا رہی تھیں......!''

صفیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بولے۔ وہ خوفزدہ نظر سے یک ٹک مجھے دیکھے چلی جا رہی تھی۔ میں نے آواز دے کر حوالدار کو کمرے کے اندر بلا لیا اور تحکمانہ انداز میں کہا۔

''اللہ بخش! صفیہ کو ہتھکڑی پہنا دو......!''

جستی پیٹی کے اندر سے مشتاق مہر کو برآمد کرنے میں بھی مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کے پاس رات گئے صفیہ کی خواب گاہ میں اپنی موجودگی کا کوئی معقول جواز نہیں تھا لہٰذا کمال ڈھٹائی کے ساتھ اس نے باہر آتے ہی مجھے بھاری رشوت کی پیشکش کر دی۔ میں پہلے ہی اس کی طرف سے بھرا بیٹھا تھا۔ اس کی اس حرکت نے میرا پارا ساتویں آسمان تک پہنچا دیا۔ صفیہ کو عورت ذات جانتے ہوئے میں نے محض ایک طمانچے پر اکتفا کیا تھا لیکن مشتاق مہر کو میں نے جی بھر کر اپنے غضب کا نشانہ بنایا پھر گرفتار کر کے تھانے لے آیا۔

وہ دونوں رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے لہٰذا ان کی زبان کھلوانے کے لیے مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ انہوں نے منظور احمد عرف جھورا کے قتل کا اعتراف کر لیا۔ تفصیلات کے مطابق، صفیہ اور مشتاق مہر میں کافی عرصے سے دوستانہ چل رہا تھا اور ان کے معاملات کے حوالے سے جھورا کو کسی حد تک شک بھی تھا۔ انہوں نے جھورا کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے ایک منصوبہ بنایا چنانچہ مشتاق مہر نے تین ہزار کی زمین ڈیڑھ ہزار میں اس کے ہاتھ فروخت کرنے کا لالچ دیا۔ صفیہ نے اپنے آشنا کو بتا دیا تھا کہ جھورا رقم کا بندوبست کرنے اپنے دوست تنویر جٹ کے پاس چنی وال جائے گا۔ پروگرام کے مطابق، جھورا کی واپسی پر مشتاق مہر نے اسے موت کے گھاٹ اتار کر کمرے کے اندر ہی دبا دینا تھا۔ اس مقصد کے لیے مشتاق مہر تین اپریل کو جھورا کی آمد سے قبل ہی گھات لگا کر اس کے گھر میں بیٹھ گیا۔ اس کے بعد جھورا کے ساتھ جو حالات پیش آئے ہوں گے، اس کا آپ نے بہ خوبی اندازہ لگا لیا ہوگا۔

اسی رات کے آخری پہر میں نے جستی پیٹی کے نیچے والے کچے گیلے فرش کی کھدائی کر کے جھورا کی لاش کو بھی برآمد کر لیا تھا۔ اس ٹھوس ثبوت نے انہیں اقبال جرم کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان کا خیال یہی تھا کہ جھورا کی گمشدگی کو جنگلی ڈاکوؤں کی کسی بہیمانہ کارروائی کے کھاتے میں ڈال دیا جائے گا اور وہ دونوں اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہو جائیں گے اور ایسا ہوا بھی تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں بھی ڈاکوؤں کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا لیکن پھر مشتاق مہر کی بے احتیاطی اور جیلا کی پھرتی نے پاسا پلٹ دیا۔

صفیہ سارا الزام مشتاق مہر کو دے رہی تھی کہ وہ اس کے ورغلانے میں آ گئی اور مشتاق مہر کا موقف یہ تھا کہ صفیہ نے اپنے شوہر کو ٹھکانے لگانے کے لیے اسے اپنا مہرہ بنایا اور وہ اس شاطر عورت کے بہکاوے میں آ گیا ورنہ وہ جھورا کی جان لینے کے حق میں نہیں تھا۔

یہ ساری توضیحات، دلائل اور صفائیاں بے سود ہیں۔ صفیہ اور مشتاق مہر کا دوستانہ جھورا کا اصل قاتل تھا۔ اسی زہریلے دوستانے نے ایک معصوم انسان کی جان لے کر اس کے ہنستے بستے گھر کو اجاڑ دیا تھا اور...... اس بربادی میں صفیہ اور مشتاق مہر برابر کے حصے دار تھے۔

(تحریر: حُسام بٹ)



چوتھا خانہ

بابر نعیم

کسی کی تلپٹ ہوتی زندگی بعض لوگوں کے لیے تفریح کا سبب بن جاتی ہے وہ بھی ایک ایسی ہی دوشیزہ تھی جو بھوک اور افلاس کی چکی میں پستے پستے کسی کی ہوس کا شکار ہوگئی تھی مگر چٹ پٹی باتوں کی بھنبھناہٹ کا تسلسل اس کی سانس کی ڈوری ٹوٹ جانے کے باوجود قائم رہا..... کیونکہ یہ دنیا محض ایک تماشا گاہ ہی تو ہے۔

دل والوں کی دلچسپی کا محور و مرکز ایک دکھیاری کا قصہ

ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ گلی کے کونے سے نمودار ہوئی اور اپنے سیاہ برقع کی لشکارے مارتی چمک گلی میں چھوڑتی گزر گئی۔ گلی میں دکاندار بھی تھے، چند نوجوان اور معمر افراد بھی۔ انہوں نے روز کی طرح اسے دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں کیونکہ وہ شریف لوگ تھے اور یہ شریفوں کا محلہ تھا۔

گو یہ شریفوں کا محلہ تھا اور یہاں رہنے والے لوگ کسی برے یا غلط فعل کا تصور تک نہیں کرسکتے تھے، تاہم بعض ''منجھے'' ہوئے دکانداروں نے برقع کی اس چمک کو دیکھا پھر چمک کے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ سیاہ پردے سے پار دیکھنا تو ان کے لیے ناممکن تھا پھر بھی انہوں نے اندازے لگانے کی کوشش کی اور دل ہی دل میں یہ تبصرے کیے۔

''چال میں غضب کا لوچ اور ردھم ہے۔''

''کوئی...... کلی معلوم ہوتی ہے۔''

یہ تبصرے اور اس جیسی دوسری باتیں وہ سوچ سکتے

تھے۔ مگر ان پر عمل ان کے لیے ناممکن تھا۔ کیونکہ یہ خیالات اور ان پر کیا جانے والا عمل اخلاقیات سے ماورا تھا اور شریفوں کے محلے میں ایسی باتوں یا حرکتوں کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

شریفوں کے اس محلے کی عورتیں کہیں باہر نہیں جاتی تھیں۔ کیونکہ عورتوں کا گلیوں اور بازاروں میں آزادانہ گھومنا وہاں معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ برقع والی پہلی عورت تھی جو روزانہ محلے سے باہر جاتی تھی۔ محلہ کمیٹی کے ارکان کو یہ بات پسند نہ آئی کہ برقع والی محلے سے باہر جائے اور محلے کی دوسری عورتوں خصوصاً نوجوان لڑکیوں کا اخلاق تباہ کرنے کا باعث بنے۔ اس لیے وہ ایک متفقہ فیصلے کے تحت برقعے والی کے گھر پہنچے تاکہ اگر گھر میں کوئی مرد ہو تو اس سے بات کریں اور اپنی اسی کوشش میں وہ اس کے باپ سے جا ملے تھے جو بستر مرگ پر دراز تھا۔ کب سے؟ یہ محلہ کمیٹی والوں کو معلوم نہیں تھا حالانکہ وہ کمیٹی اسی مقصد کے لیے بنائی گئی تھی کہ غریب مریضوں اور غریب متوفین کو ان کے آخری وقت میں سہارا دے سکے۔ برقع والی کا باپ ہنوز موت کے انتظار میں تھا مگر نہ تو محلہ کمیٹی والوں نے اسے سہارا دیا، نہ فرشتۂ اجل اسے منزل پر پہنچانے کو تیار تھا۔ وہ ایک عرصے سے مرض یا موت کے اس پلنگ سے لپٹا ہوا تھا اور ڈاکٹروں کے لال پیلے شربت اور متعدد اقسام کی گولیاں بھی اسے بستر چھوڑنے پر آمادہ نہ کرسکیں۔

محلہ کمیٹی کے ارکان اسے یہ کہنے کے لیے گئے تھے کہ وہ اپنی بیٹی کو باہر نہ بھیجا کرے لیکن ان لوگوں کو دیکھتے ہی بوڑھے نے اپنی نہ رکنے والی کھانسی کو دباتے ہوئے یہ مشکل کہا۔ ''میرا کوئی بیٹا نہیں اور نوجوان بیٹی کام کرنے کے لیے باہر جانے پر مجبور ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ دوبارہ کھانسنے لگا۔ محلہ کمیٹی کے صدر اور جامع مسجد کے امام جو دونوں کمیٹی کے کرتا دھرتا افراد تھے، بولنے سے پہلے ہی خاموش ہو کر لفظوں کی ایسی ترتیب ڈھونڈنے لگے، جس سے وہ اپنے آنے کا مقصد واضح کرسکیں۔ محلہ کمیٹی کے صدر علاقے میں ہونے والے ہر الیکشن میں حصہ لیتے تھے اور باوجود ہارنے کے وہ سیاسی داؤ پیچ کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ اس بات کا واضح ثبوت ان کی تین بیویاں تھیں جو ایک ہی گھر میں رہ رہی تھیں۔ ان کے سیاسی اثر و رسوخ کا محلے والوں پر یہ اثر تھا کہ جب ان کی بیویوں کے جھگڑنے سے محلے میں ایک طوفان بدتمیزی برپا ہو جاتا تو بھی محلے والے یہی کہتے کہ ''دیکھو تو حاجی صاحب کے گھر میں کیسا اتفاق ہے، تین بیویوں اور بچوں سے بھرا ان کا گھر محلے کا بارونق ترین گھر ہے۔''

حاجی صاحب کو آج سے پہلے کبھی سوچ کر بولنے کی ضرورت نہیں پیش آئی تھی لیکن آج ایک نحیف بوڑھے نے انہیں الفاظ کے تانے بانے میں الجھا دیا تھا۔ ابھی انہوں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ برقع والی کے باپ کا ناتواں ہاتھ ان کے گھٹنے پر جم گیا۔ ہاتھ کی کپکپاہٹ سے حاجی صاحب کا گھٹنا بھی لرزنے لگا۔ بوڑھے نے اپنی معدوم ہوتی آواز میں ان سے درخواست کی کہ اگر وہ اس کی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں کچھ کرسکیں تو وہ ان کا ممنون ہوگا۔ اسے اپنی بیٹی کے لیے ایک اچھے رشتے کی ضرورت تھی۔ صدر محلہ کمیٹی کے کہنے پر محلے کا کوئی بھی نوجوان اس لڑکی سے شادی کرنے پر تیار ہوجاتا لیکن امام صاحب اور وہ خاموشی سے بوڑھے کو کوئی دلاسا دیے بغیر ہی اٹھ کر وہاں سے چلے آئے کیونکہ وہ کسی کو ایسی لڑکی سے شادی کرنے کا نہیں کہہ سکتے تھے جو محلے سے باہر جاتی ہو اور پبلک بسوں میں گھومتی ہو۔ آخر یہ شریفوں کا محلہ تھا۔

شریفوں کے اس محلے میں کئی سال گزر گئے اور کوئی بھی بوڑھے کی بیٹی کا ہاتھ تھامنے کو تیار نہیں ہوا۔ بوڑھے کی بیٹی کا برقع اپنی چمک کھو چکا تھا اور اب پھیکا پھیکا خاصا سوگوار سا نظر آنے لگا تھا۔ مگر بہرحال وہ واحد چیز تھی جو لڑکی کا ساتھ دے رہی تھی کیونکہ اس کا بوڑھا باپ بھی پچھلے سال اپنی باری آنے پر قبرستان میں جا لیٹا تھا۔

وہ پہلے لڑکی تھی اب عورت بن رہی تھی۔ برقع کے سیاہ پردے کے پیچھے سے بھی اس کے جسم میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کیا جاسکتا تھا۔ نئی کھلنے والی کلی پھول کی شکل اختیار کررہی تھی۔ دکانداروں کے تبصرے اب ایک نیا رنگ اختیار کررہے تھے۔ وہ سرگوشیوں میں تبصرے کرتے پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر کھی کھی کرنے لگتے لیکن برقع والی یہ سب کچھ دیکھ کر، سن کر بھی برداشت کررہی تھی اور کسی سے کچھ گلہ شکوہ کیے بغیر اپنے لگے بندھے معمولات پر کاربند تھی۔

محلے کے کئی نوجوان اس کے پیچھے جاکر یہ دیکھ چکے تھے کہ وہ ایک فیکٹری میں کام کرتی ہے اور راستے میں آتے جاتے بلکہ فیکٹری میں داخل ہونے تک برقع کا نقاب اس کے چہرے پر رہتا ہے۔ مگر وہ سارے نوجوان جو اس کی شرافت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے، کسی نہ کسی فرضی قصے کو اس کی ذات سے منسوب کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ گوکہ ان کا پول جلد ہی کھل جاتا لیکن وہ اپنی ان دل آزار حرکتوں سے باز نہ آتے۔ ایسے جھوٹے اور شرمناک قصے

لڑکی کے کانوں تک بھی پہنچ جاتے بلکہ پہنچا دیے جاتے لیکن وہ خاموش ہی رہتی۔ وہ اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتی تھی۔

اس کی عمر کی تمام لڑکیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ اس محلے میں لڑکیاں جوان ہوتے ہی بیاہ دی جاتی تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ یہ شریفوں کا محلہ تھا اور یہاں لڑکیوں کو گھر بٹھائے رکھنے کا خطرہ مول نہیں لیا جاتا تھا۔ بلکہ جلد از جلد ان کے ہاتھ پیلے کر دینے کی کوشش کی جاتی تھی لیکن وہ لڑکی ہنوز اپنے برقع کے ساتھ فیکٹری اور گھر کے درمیان پبلک بسوں میں دھکے کھانے پر مجبور تھی۔ باپ کے انتقال کے بعد اس نے کچھ عرصہ تک پڑوسیوں سے میل ملاپ بڑھانے کی کوشش کی تھی لیکن عورتوں کی جلی کٹی باتیں سن کر وہ دوبارہ اپنی ذات کے خول میں بند ہو گئی۔

محلے کے مرد اور نوعمر لڑکے بھی اس کے گھر کے سامنے سے گزرنے یا وہاں کھڑا ہونے سے کتراتے تھے کہ کہیں وہ بدنام نہ ہو جائیں۔ ان کے نظریے کے مطابق وہ اچھوت بن چکی تھی یا کوئی چڑیل جس کے قریب جاتے ہوئے ڈر محسوس ہوتا ہو، وہ سب بدنامی سے ڈرتے تھے کیونکہ یہ شریفوں کا محلہ تھا۔

شریفوں کے محلے میں ایک روز ہلکی سی ہلچل پیدا ہوئی جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ برقع والی گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے۔

اس روز بھیا پرچون والے اور راجو حمام کی دکانوں پر یہ تبصرے سنائی دیے۔

''کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہوگی۔''

''لیکن اس محلے میں تو سبھی شریف لوگ رہتے ہیں۔''

''اجی باہر کا کوئی آدمی ہوگا۔''

''باہر کے کسی آدمی سے تو وہ ملتی ہی نہیں تھی۔''

''تم کیسے جانتے ہو؟'' بات کرنے والے نے اس نوجوان کی طرف دیکھا۔

وہ تھوڑا سا کھسیانا ہوا پھر بولا۔ ''میں اس لیے جانتا ہوں کہ وہ ایک مقررہ وقت پر یہاں سے گزرتی ہے نا اگر وہ کسی سے ملتی ہوتی تو اس کے معمولات میں فرق آجانا چاہیے تھا۔'' اپنی بات ختم کرتے ہی اس نوجوان کے ذہن میں ایک شخص کا چہرہ ابھر آیا جسے اس نے برقع والی کے گھر کے سامنے کھڑے دیکھا تھا۔ تاہم وہ اپنے اس شبہے کا اظہار نہیں کر سکا کیونکہ سنسان دوپہر کو برقع والی کے گھر کے سامنے کھڑا ہونے والا وہ آدمی اس قدر شریف تھا کہ کوئی بھی نوجوان کی بات پر یقین نہ کرتا۔ اس لیے اس نے اپنے شبہے کو دبایا اور لوگوں کی رائے سننے لگا۔

''فیکٹری میں بھی تو کوئی ہو سکتا ہے۔'' ایک دوسری آواز سنائی دی۔ ''ایسے کام چار دیواری کے اندر ہی ہوتے ہیں۔''

یہ ہلچل معدوم ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی اگر اگلے دن کے اخبار میں یہ خبر نہ ہوتی۔ ''شہر کے باہر ندی کے پل سے چھلانگ لگا کر ایک لڑکی نے خودکشی کر لی۔ لڑکی چار ماہ کی حاملہ بتائی جا رہی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ مرنے کے بعد بھی اس کے چہرے پر برقع کا نقاب موجود تھا۔''

اس خبر کے ساتھ ہی برقع والی کی تصویر تھی۔ محلے کے بیشتر افراد پہلی بار اسے بغیر برقع کے دیکھ رہے تھے اور وہ بھی مردہ حالت میں۔ جن چند معمر افراد نے پہلے کبھی اتفاقاً اسے بغیر برقع کے دیکھا تھا، وہی اسے شناخت کر سکے تھے۔

شریفوں کے محلے میں سبھی حیران تھے کہ وہ کون تھا جس کے برقع والی کے ساتھ تعلقات تھے۔

محلہ کمیٹی کے ارکان میں بھی اس سلسلے میں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ تجسس سے سب کا برا حال تھا مگر سبھی جانتے تھے کہ یہ معما حل ہونے والا نہیں۔ صدر کمیٹی صاحب بھی اس گفتگو میں پیش پیش تھے لیکن ان کا دھیان کہیں اور تھا، وہ سوچ رہے تھے کہ انہوں نے اپنی ازدواجی بساط کا چوتھا خانہ کس خوب صورتی سے خالی رکھا تھا۔

ہ ہ ہ

کاروباری الجھن

میری صدارت میں مارکیٹ کا اجلاس چل رہا تھا۔ مارکیٹ میں سخت مندی ہمارا ایجنڈا تھا۔ ہر طریقہ آزمالیا مگر مندی ختم نہیں ہو رہی تھی۔ سب پریشان تھے، کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ میٹنگ کو بے نتیجہ ہوتے دیکھ کر چائے منگوالی کہ شاید تازہ دم ہو کر کچھ سمجھ آجائے۔

''ان پڑھ'' گل خان (باہر والا) چائے بانٹتے ہوئے بولا۔ ''ہم ایک بات بولے؟''

''ہاں بولو۔''

''حاجی صیب! آپ لوگ مارکیٹ گیارہ بجے کھولتا ہے۔ وہ زوال کا وقت ہے...... جب کاروبار زوال کے وقت شروع کرے گا تو عروج نہیں زوال ہی ملے گا۔''

(مرسلہ: راحیلہ شفیق۔ سندھی ہوٹل، نیو کراچی)



محفلِ شعر و سخن

❁ وزیر محمد خان ...... بٹل ہزارہ
اب نہ صورت ہے نہ وہ عکس گری ہے مجھ میں
خشک دریا کی طرح ریت بھری ہے مجھ میں

❁ ریاض بٹ ...... حسن ابدال
خواہشوں کی بھیڑ میں کچلے گئے ہیں ذہن یوں
لے اڑی دیوانگی انسان کا معیار بھی

❁ زین ...... تلہ گنگ، سکھر
یہ سارے حسین چہرے میری تسبیح کے دانے ہیں
نظر سے گرتے رہتے ہیں، عبادت ہوتی رہتی ہے

❁❁❁

❁ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان ...... فورٹ عباس
اتنا اداس تھا کہ سویا نہ رات بھر
پلکوں سے لکھ رہا تھا تیرا نام چاند پر

❁ ظہیر احمد ...... سرگودھا
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زودِ پشیماں کا پشیماں ہونا

❁ انیلا رشید سیال ...... خیرپور میرس
یاد آتا ہے روز و شب کوئی
ہم سے روٹھا ہے بے سبب کوئی

❁ اوشا راٹھی ...... مٹھی، سندھ
تجھ سے ملنے کی دیر ہے جاناں
زندگی مجھ میں لوٹ آئے گی

❁ زرین آفریدی ...... حیدرآباد
موضوعِ سخن کچھ ہو...... تادیر اسے تکنا
ہر لفظ پہ رک جانا، ہر بات پہ کھو جانا

❁ عروہ گڑیا ...... کراچی
کہا اس نے زمانہ درد ہے اور تم دوا جیسے
لگا، تم سے محبت ہے، مجھے اس نے کہا جیسے

❁ قدرت اللہ نیازی ...... خانیوال
ہے یہ بھی سچ کہ تیرے سامنے مجھے برسوں
کوئی رفیق، کوئی کام بھی یاد نہ آیا
یہ بھی نہیں جھوٹ کہ کل جو تجھے میں نے دیکھا
تو کتنی دیر تیرا نام بھی مجھے یاد نہ آیا

❁ محمد شہباز اکرم نوئی ...... پاکپتن شریف
ساری دنیا کی محبت سے کنارہ کرکے
دلنشیں ہم نے رکھا ہے خود کو فقط تمہارا کر کے

❁ مظہر بلال ...... سکھر
نہ آنا میری قبر پہ ہمراہِ رقیباں
مُردوں کو مسلماں جلایا نہیں کرتے

❁ بلال حسین ...... تلہ گنگ، سکھر
تیرے چہرے کی کشش تھی کہ پلٹ کر دیکھا
ورنہ سورج تو دوبارہ نہیں دیکھا جاتا

❄ ماہین فاطمہ......حجرہ شاہ مقیم
صحرا میں ڈھونڈتا ہوں سمندر کی ادائیں
مجھ کو میرے معیار کی دنیا نہ مل سکی

❄ ملائکہ حریم......حجرہ شاہ مقیم
ساتھ اس کے کوئی منظر، کوئی پس منظر نہ ہو
اس طرح میں چاہتا ہوں اس کو تنہا دیکھنا

❄ اشفاق شاہین......لاہور
لٹ کر سمجھ رہے ہیں کہ نادم ہے راہزن
کتنی حسین...... اہلِ مروت کی بھول ہے

❄ مہتاب احمد ......حیدرآباد
بدن کے قید خانے میں، عجب تھی روح کی حالت
اسیری بھی مقدم تھی، رہائی بھی ضروری تھی

❄ داؤد اشفاق......حجرہ شاہ مقیم
میرا مزاج تو تھا اس سے مختلف لیکن
عجیب شخص تھا خود سا بنا گیا مجھ کو

❄ لبنیٰ وکیل ......کوئٹہ
ضد کی ہے اور بات مگر خو بُری نہیں
بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

❄ جاوید اختر رانا ...... پاکپتن شریف
مبادا قصۂ اہلِ جنوں ناگفتہ رہ جائے
نئے مضمون کا لہجہ نیا کرنا پڑے گا

❄ رمضان پاشا ......گلشن اقبال کراچی
کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مرجاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

❄ اطہر حسین......کراچی
کتاب زندگی کا میری وہ خوبصورت باب تھا
یوں حرف حرف پڑھا جیسے وہ شخص مرا نصاب تھا

❄ سعدیہ اسلم......ٹنڈو الہیار
اسے کہنا سدا موسم بہاروں کے نہیں رہتے
سبھی پتے بکھرتے ہیں ہوا جب رقص کرتی ہے

❄ ارم کامران......کراچی
روز آجاتی ہے میرے پاس تسلی دینے
شبِ تنہائی بتا تُو میری کیا لگتی ہے

❄ تنویر لودھی......واہ کینٹ
تیرے غموں کی تشریح کچھ اتنی تھی
ہم...... لکھتے گئے صفحے بھرتے گئے

❄ سحر زاہد......کراچی
آؤ آنکھوں سے بات کرتے ہیں
لفظ مطلب بگاڑ دیتے ہیں

❄ عارفہ جاوید......سکھر
ہمارا تذکرہ چھوڑو ہم ایسے لوگ ہیں جن کو
محبتیں کچھ نہیں کہتیں وفائیں مار دیتی ہیں

❄ زاہد احمد ......شادمان ٹاؤن، کراچی
دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

❄ عاصم خان......کوئٹہ
بدل جاتے ہیں وہ لوگ وقت کی طرح
جنہیں ہم حد سے زیادہ وقت دیتے ہیں

❄ کمال احمد......کراچی
چراغِ طور نہ ملا تو کیا
شبِ ظلمت گزر ہی جائے گی
غموں نے دیکھ لیا ہے مرا در
انہی کے سہارے زندگی گزر جائے گی

❄ ادریس احمد خان......ناظم آباد کراچی
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

❄ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ......خانیوال
اس کے انکار سے کچھ تو پردہ رہ گیا
میں بھی کافی مطمئن ہوں وہ بھی اچھا رہ گیا

❄ ظفر اقبال ظفر......کامرہ شرقی
نوح کی کشتی کو طوفان سے بچایا تُو نے
یہ معجزہ بھی زمانے کو دکھایا تُو نے
کوئی تیرا شکر بجا لائے نہ لائے یا رب
بھوکا دنیا میں کسی کو نہ سلایا تُو نے

❄ پرویز علی ...... پشاور
کسی کے پیار کی خوشبو کو عام کردے گی
گزر کے جائے گی جب بھی ہوا درختوں سے

❄ مدثر اقبال وٹو ......منچن آباد
کہنے کو تو بہت کچھ تھا مگر کہہ نہ سکا
جب ملاقات ہوئی تو زبان چپ رہی

❄ بلقیس خان......واہ کینٹ
سروں میں خاک غریبی بھی ڈال دیتی ہے
یہ سارے لوگ محبت کے مارے تھوڑی ہیں

❁ شاہینہ مہتاب ...... چنیوٹ
آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے دوچار ہے

❁ عظیم احمد ...... جھنگ سٹی
ابھی آئی نہیں بہار کہ یاں
دل میں وحشت کے ولولے آئے

❁ جنید احمد ملک ...... کراچی
نہ خوشی وصل کی ہے اس کو نہ اندیشۂ ہجر
دل افسردہ کو ہو عیش کہ غم ایک سا ہے

❁ شاہد علی ...... فیصل آباد
دکھانے کو لوگوں کے ہے یہ رکاوٹ
نہ بیزار میں ہوں نہ بیزار وہ ہے

❁ عاطف علی ...... میر پور خاص
اٹھا دیتا ہے جو پردہ ذرا تو روئے زیبا سے
ابھی خلقِ خدا تجھ کو صنم کچھ اور کہتی ہے

❁ اسامہ جنید ...... کراچی
کہیں ایسا نہ ہو کھل جائے دل کا راز محفل میں
ہماری آنکھ پھر اس رونقِ محفل سے ملتی ہے

❁ اسما فیصل ...... ٹوبہ ٹیک سنگھ
سن کے احوال مرا گرچہ ہوں پتھر پانی
سنگدل پر نہ تری آنکھوں سے آنسو نکلے

❁ مہوش خان ...... حیدر آباد
یار نہیں غم خوار نہیں ہمدرو ظفر اب کوئی نہیں
کنجِ غم میں آپ ہی کیسے دل کو مرے بہلائے کون

❁ سائرہ نواب ...... پشاور
آنکھوں میں روتے روتے نم بھی نہیں ہے اب تو
تھے موجزن جو پہلے طوفان! اب کہاں ہیں

❁ امتیاز احمد ...... پھالیہ
ہم سے زمانہ آج اگر پھر گیا تو کیا
لاکھوں ہی اس کے دیکھ چکے انقلاب ہم

❁ عمران شیروانی ...... لاہور
اٹھ گیا ہے کون پہلو سے کہ گھبرائے ہوئے
دیکھتے ہیں گھر میں ہم دیوار و در چاروں طرف

❁ محسن خان ...... نواب شاہ
کب تلک ظلم اٹھائیں تری فرقت میں جان
بے بس اب جان ہی سے ہاتھ اٹھاتے ہم ہیں

❁ نعیم احمد ...... بہاولپور
نام ہے بدنام مے کا ورنہ اس سے بھی سوا
مست ہو جاتا ہے انساں نشۂ دولت کے وقت

❁ نوشتہ گلزار ...... بھکر
صیاد یہ دعا ہے نہ ہم کو خدا دکھائے
دام و قفس کوئی ترے دام و قفس کے بعد

❁ انعم کمال ...... حیدر آباد
دنیا ایک سرا ہے اس میں کرلو رین بسیرا
اپنے پاؤں پسارے تم نے، کس غفلت نے گھیرا

❁ آصف رضا ...... اسلام آباد
ہوں کشمکش نزع میں ہاں جذب محبت
کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

❁ میمونہ علی ...... سرگودھا
شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جایئے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

❁ فاطمہ خان ...... کراچی
عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

❁ شاہد حسن ...... اچھرہ، لاہور
اے زندگی ہمیں توڑ کر ایسے بکھیر دو اب کی بار
نہ خود کو جوڑ پائیں ہم نہ پھر سے توڑ پائے کوئی

❁ ریحان خان ...... کراچی
اب کشتیوں پہ کس کو بچانے چلے ہو تم
ساحل کے آس پاس تو گھر بھی نہیں رہے

کوپن برائے شمارہ نومبر 2017

محفلِ شعر و سخن

نام : ____________________

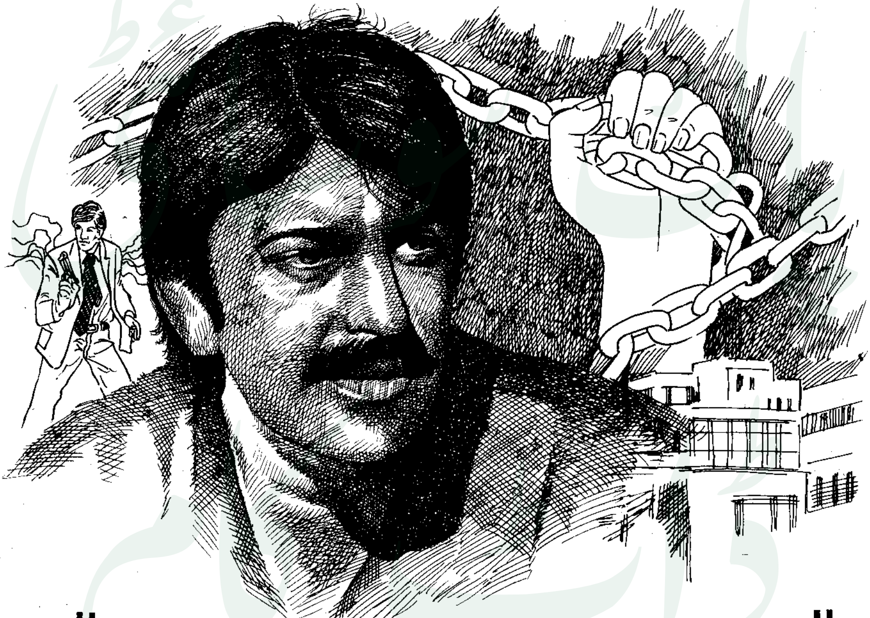
پتا : ____________________

انکشاف

محمد فاروق انجم

یوں تو زندگی میں بہت سے انکشافات انسان کو کچھ دیر کے لیے حیران کردیتے ہیں لیکن یہاں معاملہ چند لمحات کا نہیں بلکہ عمر قید کا تھا جبکہ اس کی آنکھوں میں خوابوں نے ایسا ڈیرا جمایا کہ اس کائنات میں اسے ہر ایک اپنا دشمن دکھائی دینے لگا اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ عشق کا دیوانہ پن اسی کو کہتے ہیں۔

اپنے کرداروں میں زندہ رہنے والے ایک لکھاری کا قصہ



میں جس کمپنی میں کام کرتا تھا، اس کا نفع نقصان کا حساب ہو رہا تھا۔ ہم اکاؤنٹس کے شعبے سے تعلق رکھنے والے مسلسل اس کام میں مصروف تھے اور ہمیں گھر جانے کی چھٹی بھی نہیں ملی تھی۔ کمپنی نے ہمارے لیے یہ اعلان کیا تھا کہ کام ختم ہوتے ہی وہ ہمیں دو چھٹیاں دے گی۔ کمپنی کے لوگ بھی بڑے سیانے تھے، انہوں نے کام اس دن شروع کیا تھا جس دن کام ختم ہونا تھا، اس سے اگلا دن اتوار تھا۔ اس طرح ہمیں صرف ایک ہی چھٹی ملتی۔

ہم سب کام میں اس قدر مصروف رہے کہ ہم میں سے کسی نے بھی دو گھنٹوں سے زیادہ نیند نہیں لی تھی۔ لمبا چوڑا حساب تھا۔ کمپنی کے شراکت دار ہمارے سروں پر سوار تھے۔

پھر جیسے ہی کام ختم ہوا تو دوسرے دن کے ساڑھے دس بج چکے تھے۔ اتوار کا دن تھا۔ یعنی کہ کمپنی نے ہماری عام تعطیل میں سے بھی کچھ گھنٹے اپنے کام کے لیے لے لیے تھے۔ نیند سے میری آنکھیں خود بخود بند ہو رہی تھیں اور میں نے سوچ لیا تھا کہ گھر جاتے ہی بستر پر ڈھیر ہو جاؤں گا اور خوب مزے سے نیند لوں گا۔

جب میں بائک پر بیٹھ کر گھر جانے کی تیاری میں تھا اور اپنے خوبصورت بالوں میں بائک کے ساتھ لگے شیشے میں اپنی صورت دیکھ کر ہاتھ کی انگلیوں سے بال سنوار رہا تھا تو دل ہی دل میں یہ اعتراف بھی کیا تھا کہ قدرت نے مجھے بنا بنایا ہیر اسٹائل عطا کیا ہے۔

میں نے ابھی بائک کو کک بھی نہیں ماری تھی کہ گھر سے فون آ گیا۔ دوسری طرف اماں تھیں۔

”ظہیر! تم کب گھر آ رہے ہو؟“ اماں نے پوچھا۔

”بس اماں نکلنے والا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اچھا آتے ہوئے شیو کرا کے آنا۔“ اماں نے کہا۔

”کیوں اماں...... خیر تو ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”چار بجے لڑکی والے تجھے دیکھنے کے لیے آ رہے ہیں۔“ دوسری طرف سے اماں کی خوش کن آواز آئی۔

”اچھا اماں۔“ یہ سن کر تو جیسے میرے دل میں جلترنگ سی بج اٹھی تھی۔ میں نے بائک کو کک ماری اور وہاں سے چل پڑا۔

اس سے قبل مجھے دو بار لڑکی والے دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ پہلی بار جب لڑکی والے دیکھنے کے لیے آ رہے تھے تو ان کے آنے سے ایک گھنٹا قبل دادی اماں کی طبیعت خراب ہو گئی اور ہم ان کو اسپتال لے گئے۔ اس طرح لڑکی والے رک گئے۔ دادی اماں کو دو گھنٹوں کے بعد گھر لے آئے تو ابا نے لڑکی والوں کو فون کیا کہ وہ اب آنا چاہیں تو آ جائیں۔ لڑکی والوں نے بتایا کہ ان کی نظر میں ایک اور رشتہ تھا اس لیے وہ وہاں چلے گئے تھے اور انہیں لڑکا پسند آ گیا ہے۔ اس طرح وہ رشتہ اسی جگہ ختم ہو گیا تھا۔

دوسری بار جب مجھے لڑکی والے دیکھنے کے لیے آ رہے تھے تو دادی اماں گلی میں ٹہل رہی تھیں۔ اچانک گلی میں کھیلتے بچوں کی گیند دادی اماں کو لگ گئی اور دادی اماں بے ہوش ہو گئیں۔ ان کو پھر اسپتال لے جایا گیا۔ لڑکی والوں کو فون کر کے پھر روک دیا گیا کہ گھر میں مسئلہ ہو گیا ہے۔

اس دن بھی دادی اماں دو گھنٹے تک اسپتال میں رہی تھیں۔ جب دادی اماں گھر آئیں تو ابا نے لڑکی والوں کو فون کیا اور انہیں کہا کہ وہ آ جائیں تو لڑکی والوں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے بتایا کہ لڑکی نے اب بات کی ہے کہ وہ اپنے کزن کو پسند کرتی ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ اس کی شادی اسی جگہ کر دیں۔

اس بار مجھے کوئی فکر نہیں تھی کیونکہ دادی اماں تایا ابا کے گھر شیخوپورہ گئی ہوئی تھیں اور اگر خدانخواستہ اس دوران دادی اماں کو کچھ ہو بھی جاتا تو لڑکی والوں کو گھر بلا کر اور ان کی خدمت کر کے، ہم آسانی سے ان کی خبر کے لیے نکل سکتے تھے۔

میں کاکا حمام والے کے پاس جا پہنچا۔ بائک ایک طرف کھڑی کی۔ اندر کرسیاں خالی تھیں۔ نیند کا خمار زوروں پر تھا لیکن دو دن کی بڑھی ہوئی شیو کرانی بھی ضروری تھی کیونکہ اگر میں گھر جا کر سو جاتا تو پھر شیو کا ہونا مشکل ہو جاتا۔

جب میں شیو کرانے کے لیے کرسی پر بیٹھ رہا تھا تو عین میرے ساتھ والی کرسی پر ایک اور نوجوان بیٹھ رہا تھا۔ ہم دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ میری شیو کر دو اور اس نے کہا تھا کہ میری ٹنڈ کر دو۔

میرے گلے کے گرد تولیا لپیٹ کر اس نے جیسے ہی اپنے ماہر ہاتھوں سے میرے ماتھے اور پھر آنکھوں کے اوپر کے حصے کو سہلایا مجھے فوراً ہی ایسا سکون ملا اور میں نیند کی وادی میں پہنچ گیا کہ مجھے ہوش ہی نہ رہا۔ جب میری آنکھ کھلی تو کاکا حمام والا مجھے کہہ رہا تھا۔ ”اٹھ جائیے......“

بڑے مزے کی نیند تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں تو مجھے کسی کے تیز بولنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے گردن گھما کر اس نوجوان کی طرف دیکھا جو میرے ساتھ ٹنڈ کرانے کے لیے بیٹھا تھا۔ وہ غصے سے بول رہا تھا۔

”مجھے تو نیند یوں آتی ہے جیسے نیند بنی ہی میرے لیے ہو۔ میں تم کو ٹنڈ کرنے کا کہہ کر سو کیا گیا، تم نے میری شیو کر دی...... میری اسٹائلش ڈاڑھی صاف کر دی......“

وہ مسلسل غصے سے بول رہا تھا۔ اسے اپنی اسٹائلش ڈاڑھی کے صاف ہونے کا بہت تاسف ہو رہا تھا۔ میں نے سر جھٹک کر سامنے شیشے میں دیکھا تو چونک پڑا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ سامنے میری شکل کا کون بیٹھا ہے جس کے سر کے بالوں کو استرے سے صاف کیا ہوا تھا۔

”یہ کون ہے......؟“ میں نے شیشے کی طرف اشارہ کر کے کاکا سے پوچھا۔

”یہ آپ ہو۔“ اس نے تولیا تہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں ہوں تو میرے سر کے بال کہاں ہیں؟'' مجھے ایک دھچکا لگا اور میری آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

''آپ نے ٹنڈ کرنے کا بولا تھا، وہ میں نے کر دی۔'' اس نے کہا، جب تک ساتھ والا نوجوان اپنی شیو ہونے پر مسلسل اس سے لڑ رہا تھا اور وہ چپ کھڑا اس کی سن رہا تھا۔

''اسے ٹنڈ کرنے کا تو اس نے بولا تھا۔ میں نے شیو کرنے کا کہا تھا۔'' مجھے غصہ آ گیا۔ میرا خوبصورت ہیئر اسٹائل ٹنڈ کی شکل میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ''میری ٹنڈ کیوں کر دی۔'' میں اپنی جگہ تڑپا۔

''تم دونوں بہرے اندھے ہو...... سنائی نہیں دیا تھا۔ میری اسٹائلش ڈاڑھی صاف کر دی...... گدھو......'' اس نوجوان کا غصہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا اور میرا غصہ بھی دو چند ہوتا جا رہا تھا۔

اس نوجوان نے بس 'گدھو' کہا ہی تھا کہ دونوں نے اس نوجوان کو پکڑ لیا اور اس کی دھلائی شروع کر دی۔ میں ایک طرف سہم کر کھڑا ہو گیا۔ جونہی وہ اس کی دھلائی سے فارغ ہوئے، میں نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالے اور ان کی طرف بڑھا کر اس شرافت سے حمام سے باہر نکلا کہ جیسے میری ٹنڈ میری عین منشا کے مطابق ہوئی ہو۔

سارے راستے میں روتا رہا۔ بس آنسو نہیں نکلے لیکن رہ رہ کر مجھے اپنا پیارا ہیئر اسٹائل یاد آتا رہا اور یہ سوچ سوچ کر تو میری جان نکلی جا رہی تھی کہ آج مجھے لڑکی والے دیکھنے کے لیے آ رہے ہیں۔

گھر میں داخل ہو کر میں نے بائیک ایک طرف کھڑی کی اور ابھی صحن میں قدم رکھا ہی تھا کہ اماں دیکھتے ہی چلائیں۔

''کون ہے تو...... ہمارے گھر دن دیہاڑے چور آ گیا ہے...... ارے کوئی پکڑ دا سے......''

اماں کا شور روکنے کے لیے میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''اماں! یہ میں ہوں ظہیر......''

میری آواز سنتے ہی اماں کے ہاتھ پیر رک گئے۔ انہوں نے میری طرف دیکھا اور مجھے پہچاننے کی کوشش کرنے لگیں۔ پھر جب مجھے... پہچان گئیں تو... میری طرف بڑھیں۔

''یہ تو کیا کرا کے آ گیا ہے...... میں نے شیو کا کہا تھا...... اس حالت میں تو تم مجھے اچھے نہیں لگ رہے ہو، لڑکی والوں کو خاک اچھے لگو گے......''

میں نے اماں کو ساری بات بتائی تو اماں میرا منہ حیرت سے دیکھتی رہیں۔ میں چپ ہوا تو بولیں۔

''اس کم بخت کو پکڑ لیتا تھا......''

''اچھی خاصی ٹھکائی کر کے آیا ہوں اماں۔ اپنی غلطی پر معافی مانگی تو چھوڑا تھا۔'' میں نے یہ جھوٹ بول کر دراصل اپنے آپ کو تسلی دی۔

''میں سوچ رہی تھی کہ آج تیری دادی نہیں ہے، سب ٹھیک رہے گا لیکن دادی کی کسر تو اس کم بخت نے نکال دی جس نے تیری ٹنڈ کی ہے۔'' اماں کو دکھ ہو رہا تھا۔ ابھی ہم اسی طرح کھڑے تھے کہ ابا بھی باہر سے آ گئے۔ وہ آتے ہی بولے۔

''یہ برخوردار کون ہے؟''

''ظہیر ہے اور کون ہے۔'' اماں نے مرجھائے سے انداز میں بتایا۔

ابا نے مجھے ایسے دیکھا جیسے میں ان کے سامنے ایکسرا ہوں اور وہ کوئی ڈاکٹر ہیں۔ ''بہت برا ہو گیا ہے۔ وہ تو ماڈرن لوگ ہیں۔ ایک گنجے کو کیسے پسند کریں گے۔''

''ابا! آپ ان کو روک دیں۔'' میں نے مشورہ دیا۔

''میں اس سے پہلے دو بار لڑکی والوں کو روک چکا ہوں۔ اب ایسا نہیں کروں گا۔ لڑکی والے آئیں گے اور آج ہی آئیں گے۔ تم اپنا کوئی بندوبست کرو۔'' ابا نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

میں سوچنے لگا کہ میں بالوں کا کیا بندوبست کروں؟ کہاں جاؤں، کیا کروں؟ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ وگ کہاں سے ملتی ہے؟ لیکن گنجے سر کے ساتھ لڑکی والوں کے سامنے جانا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ وہ تو مجھے دیکھتے ہی ناپسند کر دیتے۔ بہر حال مجھے کچھ تو کرنا تھا۔ ساری عمر کنوارا نہیں رہنا تھا۔

چار بجے لڑکی والوں نے آنا تھا، کچھ گھنٹے باقی بچے تھے۔ ان گھنٹوں میں میرے سر پر بال تو آنے سے رہے۔

''ایسا کریں لڑکی والوں کو آپ میری تصویر دکھا دیں اور ان کو بتا دیں کہ میں مصروفیت کی وجہ سے نہیں آ سکا۔'' میں نے تجویز پیش کی۔

''لڑکی والے آ رہے ہیں۔ تم ان سے ملو گے۔ بات کرو گے۔ بس یہ سوچو کہ تمہارا گنجا سر کور کیسے ہو سکتا ہے۔'' ابا تو فیصلہ کیے بیٹھے تھے۔ انہوں نے دوٹوک کہہ دیا۔

اچانک مجھے پروفیسر خلیل کا خیال آیا اور میں چونک سا گیا۔ پروفیسر خلیل تقریباً چار ماہ قبل ہمارے بالکل برابر والے گھر میں منتقل ہوئے تھے۔ وہ اکیلے ہی وہاں رہتے تھے۔ جب وہ شفٹ ہو رہے تھے تو ان کا ایک بیڈ، کچھ کرسیاں اور ضرورت کا سامان آیا تھا لیکن کتابیں اتنی آئی تھیں کہ سب کو گمان ہوا تھا کہ وہ

پرانی کتابوں کا کاروبار کرتے ہیں۔

پروفیسر خلیل بڑی پراسراری شخصیت کے مالک تھے۔ پہلے تو کسی کو پتا ہی نہ چلا کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ پھر کسی نے بتایا کہ وہ پروفیسر ہیں لیکن کسی کو نہیں پتا کہ وہ فال نکالنے والے پروفیسر ہیں کہ پڑھانے والے...... روزانہ وہ ایک کتاب بغل میں دبائے چلے جاتے تھے اور واپسی پر ان کے پاس وہ ایک ہی کتاب ہوتی تھی یا پھر دو ہو جاتی تھیں۔ وہ کسی سے بات نہیں کرتے تھے۔ کوئی بھی ان کی اصل حقیقت کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔

ایک دن تیز ہوا میں ان کے سر پر رکھی وگ اڑ کر نیچے گر گئی تھی۔ تب مجھ پر انکشاف ہوا تھا کہ اصل بالوں کے قریب تر دراصل وہ وگ ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے سوچا کہ اگر پروفیسر صاحب سے ایک دو گھنٹے کے لیے وگ ادھار مانگ لی جائے تو میرا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

''ساتھ والے پروفیسر صاحب کے سر پر بھی وگ ہے جو میں نے خود دیکھی تھی۔ میں ان سے وگ ادھار مانگ لاتا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''وہ تم کو وگ دے گا؟ وہ تو کسی سے بات نہیں کرتا، کسی کی طرف دیکھتا نہیں ہے۔ کسی کو پتا ہی نہیں ہے کہ وہ کرتا کیا ہے......'' ابا نے کہا۔

''ابا جی! اس مشکل گھڑی میں کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔'' میں نے سب کچھ جاننے کے باوجود امید کا پلو پکڑ لیا۔

''کوشش کر دیکھو لیکن جو بھی کرنا ہے، جلدی کرو۔ پونے تین ہو گئے ہیں۔ چار بجے انہوں نے آنا ہے۔''

''میں ابھی آتا ہوں۔'' میں نے اٹھ کر اپنے سر پر ٹوپی رکھی تاکہ میری ٹنڈ اس کے اندر چھپ سکے۔ میں باہر نکل کر پروفیسر صاحب کے گھر کے دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ بیل پر انگلی رکھی اور زور سے دبائی۔ بیل شاید خراب تھی اس لیے مجھے اس کے بجنے کی آواز نہیں آئی۔

میں نے دروازہ بجایا۔ چار بار دروازہ بجایا تو اندر سے آواز آئی۔ ''کون ہے؟''

''جی پروفیسر صاحب میں ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''مسٹر...... سوری میں آپ کو نہیں جانتا۔'' پروفیسر صاحب کی اندر سے آواز آئی۔

''جی میرا نام ظہیر ہے اور میں آپ کے برابر میں رہتا ہوں۔'' میں نے اپنا تعارف کرایا۔

''بولیں کیا کام ہے؟'' انہوں نے دروازہ کھولنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی۔

''سر! ذرا دروازہ کھول دیں تو میں آپ سے بات کروں۔'' میں نے کہا تو اندر ایسی خاموشی چھا گئی جیسے بیوی نے اچانک شوہر سے خرچہ مانگ لیا ہو اور شوہر کی بولتی بند ہو جائے۔

میں کم از کم دس منٹ تک کھڑا رہا، اس کے بعد جب میں مایوس سا ہو کر جانے لگا تو دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پروفیسر صاحب نے اتنا دروازہ کھولا جس سے ان کا صرف چہرہ باہر نکل سکے۔

میری نظر پروفیسر صاحب کے سر پر جمی وگ پر گئی اور پھر میں نے کہا۔ ''کیا ہم اندر بیٹھ سکتے ہیں؟''

میری بات سن کر پروفیسر صاحب کے ماتھے پر سلوٹیں مزید ابھریں اور پھر انہوں نے خشک لہجے میں کہا۔ ''کیوں......''

''وہ جی...... بات کرنی ہے آپ سے۔''

''ہاں تو کرو۔''

''ذرا اندر بیٹھ جاتے تو مہربانی ہوتی۔'' میں نے پھر استدعا کی اور پروفیسر صاحب سوچ میں پڑ گئے پھر انہوں بادلِ ناخواستہ دروازہ کھول دیا اور پیچھے ہٹ گئے۔

''آپ کے پاس بات کرنے کے لیے صرف پانچ منٹ ہیں۔'' پروفیسر صاحب نے کہتے ہی اپنی نگاہیں کلائی پر بندھی گھڑی پر مرکوز کر دی تھیں۔ ہم دروازہ پار کر کے ساتھ ہی کھڑے ہو گئے تھے۔

میں نے وقت کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے پہلے تو اختصار سے انہیں بتایا کہ میری ٹنڈ کس مغالطے میں ہو گئی تھی اور پھر بتایا کہ مجھے ابھی لڑکی والے دیکھنے کے لیے آرہے ہیں اور مجھے دو گھنٹوں کے لیے آپ کی وگ درکار ہے۔

وہ اپنی نگاہیں گھڑی پر مرکوز کیے میری بات سنتے رہے۔ جونہی میں نے بات مکمل کی، انہوں نے مجھے بڑے اپنایت بھرے لہجے میں کہا۔

''آپ ذرا باہر نکلیں گے......''

میں دروازے کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر باہر قدم رکھا تو انہوں نے ایک دم سے کہا۔

''سوری......''

ساتھ ہی انہوں نے دروازہ بند کر دیا اور میں بند دروازے کو دیکھتا رہ گیا۔

مجھے پروفیسر صاحب کے اس رویّے پر غصہ تو بہت آیا کہ یہ کونسا طریقہ ہے انکار کرنے کا۔ میں کچھ دیر اس جگہ کھڑا رہا اور پھر واپس اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

جوں ہی میں نے اپنے گھر کے اندر قدم رکھا، میں چونک گیا۔ مجھے اندر سے آوازیں آرہی تھیں۔ ابا پوچھ رہے تھے۔

''آپ نے تو چار بجے آنا تھا......آپ پہلے ہی آگئے......'' کہنے کے بعد ابا ہنسے بھی۔

ایک خاتون نے جواب دیا۔ ''دراصل ہم نے تین بجے ایک اور گھر رشتہ دیکھنے جانا تھا، وہاں گئے تو ہم لڑکے کو دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے......لڑکے کے سر کے بال اتنے تھے کہ بس گنجا ہی سمجھ لیں......''

''جی جی، کوئی بات نہیں آجائیں ڈرائنگ روم میں چلتے ہیں۔'' اماں کی آواز آئی۔ میں باتیں سنتے ہوئے رکا نہیں تھا بلکہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا اور جب میں صحن میں پہنچا تو وہ سب مہمان ڈرائنگ میں جاچکے تھے۔ بس ایک چھ سال کی بچی اندر کی طرف جارہی تھی کہ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ چلائی۔

''مما......یہاں بھی ایک انکل گنجے ہیں......جلدی سے آکر دیکھیں......''

بچی ایسے مما کو بلارہی تھی جیسے کوئی عیدالفطر کا چاند دیکھ کر شور مچادے۔

میں نے گھر میں داخل ہوتے ہی سر سے ٹوپی اتار لی تھی اس لیے میری ٹنڈ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے جلدی سے اوپر سیڑھیوں کی طرف دوڑ لگادی اور اوپر والے کمرے میں جاکر دم لیا۔

پانچ منٹ کے بعد اماں بھی میرے پیچھے ہی آگئیں۔

''لے آئے وگ؟''

''انہوں نے انکار کردیا ہے۔'' میں نے منہ بنا کر جواب دیا۔

''اب کیا کروگے؟ وہ تو ایسے لڑکے کو دیکھ کر بھاگ آئے ہیں جو ابھی پورا گنجا نہیں تھا......تمہارے سر پر استرے سے پورا کمال کیا ہوا ہے......اب جاؤ اور بازار سے وگ خرید لاؤ۔'' اماں نے پریشان ہوکر کہا۔

''اماں! جو وگ پروفیسر صاحب کے سر پر ہے، اسے دیکھ کر کوئی نہیں جان سکتا کہ وہ وگ ہے۔'' میں نے کہا۔

''پھر اب کیا کرنا ہے؟'' اماں نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''آپ جائیں، مہمانوں کے پاس بیٹھیں اور انہیں بتائیں کہ آفس میں کام تھا بس لڑکا آہی رہا ہے۔ میں سارا انتظام کرکے آتا ہوں۔'' میں نے ایک دم سے کچھ اور سوچ لیا۔

''کیا کروگے؟''

''بس آپ جائیں، میں اس سر کے ساتھ ان کے سامنے نہیں آؤں گا۔ آپ بے فکر رہیں۔'' میں نے اماں کو تسلی دی اور اماں پریشان سی نیچے چلی گئیں۔

میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ پروفیسر کی وگ اپنے سر پر جما کر ہی دم لوں گا کیونکہ وہ ایسی وگ تھی جو اصل بالوں کی طرح تھی۔ بالکل سلکی بال تھے اور پھر اتنی جلدی میں کسی دوسری وگ کا کہیں سے انتظام بھی نہیں کرسکتا تھا۔

میں نے ایک بار پھر اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے ساری زندگی کنوارا نہیں رہنا۔

چنانچہ میں اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کمرے سے باہر نکلا اور چارپائی پر کھڑا ہوکر اردگرد کے گھروں کی چھتوں کی طرف دیکھنے لگا۔ کسی چھت پر مجھے کوئی بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔

میں بغیر کوئی لمحہ ضائع کیے دیوار کے پاس پہنچا اور جست لگا کر اوپر چڑھا اور پھر دوسری طرف کود گیا۔ اب میں پروفیسر صاحب کے گھر کی چھت پر تھا۔ میں سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ سیڑھیوں پر کمزور سا دروازہ لگا ہوا تھا۔ ایک طرف سے ٹوٹا ہوا تھا جس کے اندر ہاتھ ڈال کر میں نے آسانی سے کنڈی کھول لی تھی۔ اس گھر میں میرا ایک دوست کرائے دار کی حیثیت سے رہ چکا تھا اس لیے میں اس گھر کو خوب جانتا تھا اور یہ دروازہ میرے دوست نے ہی توڑا تھا جب ایک بار وہ اپنی بیوی کے ساتھ باہر سے تالا لگا کر گیا تھا اور واپسی پر چابی گم گئی تھی۔ تب وہ دوست ہماری چھت سے اس طرف آیا تھا اور دروازہ اس جگہ سے توڑ کر اس نے کنڈی کھولی تھی۔

میں آہستہ قدم سے سیڑھیاں اترا اور آخری سیڑھی پر کھڑے ہوکر دائیں بائیں دیکھا۔ مجھے لگا کہ بیڈروم میں کوئی ہے۔ میں بغیر آہٹ پیدا کیے بیڈروم کے دروازے تک پہنچا اور ادھ کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔

پورا کمرا کتابوں سے لدا پھندا تھا۔ دائیں بائیں کتابیں تھیں۔ بیڈ کے سرہانے اور پاس پڑی میز پر بھی کتابیں تھیں۔ پروفیسر صاحب دوسری طرف منہ کیے براجمان تھے اور انہوں نے کان سے موبائل فون لگایا ہوا تھا۔ ان کا سر چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ انہوں نے وگ اتار کر بیڈ کے ایک طرف رکھی ہوئی تھی۔ اگر میں آگے بڑھتا تو بغیر آواز پیدا کیے ان کے پیچھے سے وہ وگ اٹھا کر الٹے پیر واپس جاسکتا تھا لیکن ان کی باتیں سن کر میں گھبرا کر اسی جگہ رک گیا تھا۔ وہ کسی سے کہہ رہے تھے۔

''میں نے سوچ لیا ہے کہ میں راشد کو مروا دوں...... اس کے قتل سے سحرش کی زندگی میں سکون آجائے گا......'' پروفیسر صاحب نے یہ بات اس قدر پُرسکون انداز میں کی تھی جیسے وہ مکھی کو مارنے کی بات کررہے ہوں جبکہ میں کانپ کر رہ گیا تھا۔ وہ دوسری طرف سے ہونے والی بات سننے لگے اور پھر بولے۔ ''میں نے پورا منصوبہ بھی بنالیا ہے۔ راشد جب آفس کے لیے لفٹ میں بیٹھ کر اوپر جائے گا تو اسے لفٹ میں موجود ایک اجرتی قاتل مار دے گا......''

ان کی باتیں سن کر تو میری سانس تیز ہوگئی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ محلے والے ٹھیک کہتے تھے کہ پروفیسر بہت پراسرار آدمی ہے۔ وہ لوگ تو انہیں پراسرار کہتے تھے جبکہ میری نظر میں پروفیسر صاحب ایک سفاک انسان تھے جو کسی کو بھی اجرتی قاتل کے ذریعے قتل کرواسکتے تھے...... میں سمجھ گیا تھا کہ پروفیسر صاحب دراصل کسی کو بھی قتل کرنے کے پیسے لیتے تھے۔

فی الحال مجھے وگ کی ضرورت تھی کیونکہ میرا رشتہ طے ہو رہا تھا۔ میں پروفیسر کو فون پر باتوں میں منہمک دیکھ کر آگے بڑھا اور ہاتھ بڑھا کر ان کی وگ اُٹھالی، اس دوران وہ بولے۔

''راشد کے بعد میں سحرش کے باپ کو بھی روڈ ایکسیڈنٹ سے مروا دوں گا...... یہ بہت ضروری ہے، وہ ایماندار ہے اور اپنی ایمانداری کی وجہ سے کامران کے غبن کا بتادے گا......''

مجھے تو ڈر لگنے لگا تھا۔ اچانک میرا موبائل فون بج اُٹھا۔ ایک دم سے فون کی بیل ہوئی اور میری تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ میں نے برق رفتاری سے جیب سے موبائل فون نکالا، اس کی بیل بند کی۔ ان لمحات میں فون سنتے ہوئے پروفیسر نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا، تب تک میں نیچے بیٹھ چکا تھا اور بیڈ کے نیچے گھس کر لیٹ گیا تھا۔ یہ سب اس قدر سرعت سے ہوا تھا کہ لمحوں میں سب کچھ ہوگیا تھا۔ جب میں نے کال نہ سنی تو بیل آنی بند ہوگئی تھی اور میں نے اسی وقت فون سائیلنٹ پر لگادیا۔

مجھے پروفیسر صاحب کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے فون پر کہا تھا۔ ''میں تمہیں دوبارہ کال کرتا ہوں۔''

میں نے بیڈ کے نیچے سے دیکھا کہ ان کے قدموں نے اس جگہ سے حرکت کی اور وہ چلتے ہوئے دروازے کی طرف آئے۔ وہاں کچھ دیر رکے اور پھر باہر چلے گئے۔ میں نے اماں کو کال کی اور جیسے ہی رابطہ ہوا میں نے سرگوشی کی۔

''کیا بات ہے اماں......''

''دیکھو اطمینان سے وگ کا انتظام کرلو...... لڑکی کے ماموں کا انتظار ہو رہا ہے اور وہ آدھے گھنٹے تک پہنچ رہے ہیں۔ میں نے بھی کہہ دیا ہے کہ ظہیر ضروری میٹنگ میں مصروف ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ کوئی بات نہیں، وہ اطمینان سے آجائے۔'' اماں بتاتے ہوئے خوش تھیں اور میں نے ''ا...'' کہہ کر فون بند کردیا۔

میں نے سوچا کہ میں جلدی سے باہر نکل کر یہاں سے نکلنے کی کوشش کروں لیکن اسی وقت پروفیسر کی ٹانگیں مجھے دکھائی دیں اور وہ دروازے کے پاس رک گئے۔ پھر مجھے ان کی آواز آئی۔

''فون کی بیل مجھے اپنے قریب سے سنائی دی تھی۔''

''ہوسکتا ہے آپ کے کان بج رہے ہوں۔'' ایک نسوانی آواز نے مجھے چونکادیا۔

''میرے کان ہیں کہ گھنٹیاں۔'' پروفیسر نے ناگواری سے کہا۔

''آپ نے پورا گھر دیکھ لیا ہے۔ کوئی نظر آیا آپ کو؟'' نسوانی آواز پھر آئی۔

''کچھ نظر نہیں آیا۔''

''پھر اطمینان سے بیٹھ کر فون کریں۔ آپ کا وہم ہوگا۔'' نسوانی آواز سنائی دی۔ میں نے پوری کوشش کی کہ دیکھ سکوں کہ کمرے میں جو خاتون ہیں، وہ کہاں کھڑی ہیں لیکن مجھے محض پروفیسر صاحب کی ہی دو بانس نما ٹانگیں دکھائی دے رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ، میرے لیے چائے بنا کر لاؤ۔'' پروفیسر یہ کہتے ہوئے اس کرسی کی طرف بڑھے جہاں وہ پہلے براجمان تھے۔ خاتون نے تنک کر جواب دیا۔

''مجھ سے نہیں بنتی چائے...... خود بنالیں۔''

''تم ہو بڑی بدتمیز......''

''بدتمیزی آپ سے ہی سیکھی ہے۔''

پروفیسر صاحب چپ ہوگئے۔ میں حیران تھا کہ کسی خاتون کی آواز بھی اسی کمرے سے آرہی تھی لیکن مجھے اس خاتون کی ٹانگیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ پروفیسر صاحب کھڑے تھے پھر ان کی آواز آئی۔ انہوں نے پھر موبائل فون پر رابطہ کیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

''ہیلو...... ہاں...... میں تمہارے پاس آتا ہوں۔ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ راشد کو قتل کرنے کا تم بھی اچھی طرح سے سوچ لو...... میں آرہا ہوں...... کیا تم آؤ گے؟ چلو تم آجاؤ، میں انتظار کررہا ہوں......'' انہوں نے فون بند کردیا۔

''کہاں جارہے ہیں آپ؟'' اچانک وہ نسوانی آواز پھر آئی اور میں نے چونک کر نیچے اپنی نگاہیں دوڑائیں کہ شاید مجھے اس کی بھی ٹانگیں دکھائی دے جائیں لیکن مجھے پروفیسر صاحب کی ٹانگوں کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''جہنم میں جارہا ہوں۔'' پروفیسر صاحب نے اکتا کر کہا۔

''آپ روز یہی کہہ کر جاتے ہیں اور پھر واپس آجاتے ہیں۔ وہ آپ کو واپس آنے کیسے دیتے ہیں؟'' خاتون کی آواز میں تمسخر تھا۔

''اچھے تعلق کی وجہ سے......'' پروفیسر صاحب بیڈ کے اردگرد چکر کاٹ رہے تھے۔ اب پتا نہیں جانے سے پہلے وہ کوئی چلہ کاٹ رہے تھے۔ پھر مجھے کچھ چیزیں ادھر سے ادھر کرنے کی بھی آوازیں آنے لگیں۔

پھر اچانک پروفیسر صاحب کی پریشان سی آواز آئی۔ ''ادھر آؤ اور دیکھو کہ میری وگ کہاں گئی ہے۔''

''اور کتنا ادھر آؤں......آپ کے ساتھ تو کھڑی ہوں۔'' خاتون کے اس جواب نے مجھے چونکانے کے ساتھ ساتھ ڈرا بھی دیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ وہ ان کے ساتھ ہی کھڑی ہے جبکہ مجھے بیڈ کے نیچے سے صرف پروفیسر صاحب کی دو ٹانگیں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ اگر وہ خاتون ان کے پاس تھی تو اس کی دو ٹانگیں کہاں تھیں؟ یہ سوچ کر مجھے تو خوف آنے لگا تھا۔

مجھے کمرے میں پھر ہلچل سی محسوس ہوئی۔ یقیناً پروفیسر صاحب اپنی وگ تلاش کررہے تھے۔ پھر مجھے ان کی دو ٹانگیں پورے کمرے میں گھومتی دکھائی دیں اور وہ غصے سے بولے۔

''میں نے یہاں وگ اتار کر رکھی تھی......کہاں چلی گئی......کوئی بھوت لے گیا ہے کیا......؟''

''تم سے بڑا کوئی بھوت ہے اس گھر میں۔'' خاتون کی آواز نے میرے جسم میں سنسنی سی پھیلا دی تھی اور مجھے یقین ہوگیا تھا کہ وہ پروفیسر انسان نہیں بلکہ بھوت ہی ہے اور جو خاتون اس کے ساتھ باتیں کررہی ہے، وہ بھی کوئی چڑیل ہے اس لیے تو وہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ پروفیسر صاحب ایک جگہ کھڑے تھے۔ شاید وہ کچھ سوچ رہے تھے پھر اچانک وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔ میں اسی وقت بیڈ کے نیچے سے نکلا، کمرے میں دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے دروازے کے پاس جاکر باہر جھانکا...... مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں اوپر جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف دوڑا، ٹھیک اسی وقت مجھے اوپر سے کسی کے اترنے کی آواز سنائی دی اور میں واپس پلٹا اور سوچنے لگا کہ کہاں جاؤں۔ سیڑھیوں کے نیچے باتھ روم کا دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے وہ دروازہ کھولا اور اندر جاکر کھڑا ہوگیا۔ دروازے میں ایک سوراخ بھی تھا جس کی مدد سے میں آسانی سے باہر دیکھ سکتا تھا۔

مجھے پروفیسر صاحب کی آواز سنائی دی۔ ''سیڑھیوں کا دروازہ کھلا ہوا ہے......اس کا مطلب ہے وہ بدتمیز ہمسایہ جو مجھ سے وگ لینے آیا تھا، وہ اس راستے سے آیا اور میری وگ اٹھا کرلے گیا اور وہ موبائل کی بیل بھی اسی کی تھی۔ اسے لڑکی والے دیکھنے کے لیے آرہے تھے، وگ لینا اس کی مجبوری تھی اس کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔''

میں حیران تھا کہ پروفیسر صاحب نے کس تیزی سے اندازہ بھی لگا لیا تھا اور بات کی تہ تک بھی پہنچ گئے تھے۔ ان کے دو ہی مطلب ہوسکتے تھے۔ ایک یہ کہ وہ پروفیسر صاحب غیر معمولی ذہین تھے اور یا پھر وہ واقعی بھوت تھے۔

اچانک وہ بولے۔ ''میں ابھی اس کے گھر جاتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ چوری کا انجام کیا ہوتا ہے۔'' یہ سن کر تو میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کہ اگر پروفیسر صاحب نے وہاں ہنگامہ کھڑا کردیا تو میری عزت خاک میں مل جائے گی۔

''آپ اس کے گھر جائیں گے؟'' خاتون کی آواز آئی۔

''اور کیا سیر کو جارہا ہوں۔'' پروفیسر صاحب غصے سے بولے۔

''کیا ثبوت ہے آپ کے پاس کہ وگ وہی اٹھا کر لے گیا ہے۔'' خاتون نے میری دانست کے مطابق عقل کی بات کی تھی۔

''کیونکہ وگ وہی مانگنے آیا تھا۔''

''یہ تو کوئی ثبوت نہیں ہے۔ الٹا ان کے گھر جانے پر اگر وہ آپ کے گلے پڑ گئے تو پھر......؟''

''پھر کیا کروں؟''

''تحمل سے کام لیں۔ اندر آئیں بتاتی ہوں کہ کیا کرنا ہے۔ کسی کے دروازے پر جاکر ہنگامہ کرنے کے بجائے بات کرنے کا دوسرا طریقہ بھی ہوسکتا ہے۔'' خاتون نے کہا تو مجھے لگا کہ پروفیسر صاحب چل رہے ہیں۔ میں نے تھوڑا سا دروازہ کھولا تو پروفیسر صاحب بیڈ روم کی طرف جارہے تھے۔ جیسے ہی وہ اندر گئے، میں باتھ روم سے باہر نکلا اور اوپر کی طرف دوڑ لگا دی۔

چھت پر جاتے ہی میں نے دیوار پھلانگی اور اپنی چھت پر چلا گیا۔ میں سیدھا باتھ روم میں گیا تو اماں کا فون آگیا۔

''جلدی آجاؤ۔ اس کے ماموں بھی آ گئے ہیں۔''

''میں نے وگ کا انتظام کر لیا ہے، بس دس منٹ میں تیار ہو کر آ رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور جلدی سے شیو کی، کپڑے تبدیل کیے، وہ وگ اپنے سر پر جمائی اور آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ بالکل بھی نہیں لگتا تھا کہ میرے سر پر وگ ہے۔ میں مسکراتا ہوا نیچے چلا گیا۔

جونہی میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا چونک گیا کیونکہ پروفیسر صاحب سر پر ٹوپی رکھے ایک طرف براجمان تھے۔ انہوں نے میری طرف دیکھ کر ایک معنی خیز سی مسکراہٹ عیاں کی۔ میں نے سب کو سلام کیا اور بیٹھتے ہوئے ابا سے آہستہ سے پوچھا۔

''پروفیسر صاحب یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

''انہوں نے بیل دی، میں باہر گیا تو مجھے بولے کہ اگر مجھے اندر لے کر نہیں گئے تو میں یہیں ہنگامہ کھڑا کر دوں گا کہ آپ کے بیٹے نے میرے گھر چوری کی ہے۔ میں انہیں اندر لے آیا اور اپنا بہت اچھا ہمسایہ بتا کر انہیں یہاں بٹھا دیا۔'' ابا نے سرگوشی میں مجھے ساری روداد بیان کی تو میں بیٹھ گیا۔

پہلی بار میں لڑکی والوں کو اپنا چہرہ دکھا رہا تھا۔ وہ چہرہ جسے وہ اپنی بیٹی کے لیے پسند کرنے آئے تھے۔ میرے اندر کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا مگر مجھے یہ خوف بھی کھل کر مسکرانے نہیں دے رہا تھا کہ جانے پروفیسر صاحب یہاں کیا گل کھلا دیں کہ میرا رشتہ ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائے۔

وہ مجھ سے گپ شپ کرتے رہے، مختلف سوال پوچھتے رہے۔ چائے کا دور بھی چلتا رہا اور پھر اچانک پروفیسر صاحب اُٹھ کر میرے بالکل برابر میں براجمان ہو گئے۔ جب اماں اور ابا ان مہمانوں کے ساتھ باتوں میں مشغول تھے تو پروفیسر صاحب نے مجھ سے سرگوشی کی۔

''ان کو بتاؤں کہ جس لڑکے سے آپ اپنی بیٹی کا رشتہ طے کر رہے ہیں، وہ گنجا ہے اور وہ میرے گھر سے میری وگ چوری کر کے اپنے سر پر جمائے بیٹھا ہے؟''

''آپ بتائیں گے تو میں بھی بتا دوں گا کہ آپ کسی راشد کو قتل کرنے والے ہیں۔ اس کے بعد آپ سحرش کے باپ کو بھی مار دیں گے۔ آپ پروفیسر کے روپ میں جرائم پیشہ ہیں......''

میری بات سن کر پروفیسر صاحب کا منہ کھل سا گیا اور وہ مجھے اس طرح حیرت سے دیکھنے لگے جیسے میں نے ان کے ہاتھ سے چائے کا کپ چھین لیا ہو۔

''ہمیں تو آپ کا بیٹا بہت پسند ہے۔ ہماری طرف سے تو ہاں ہے۔ اب آپ ہمارے گھر تشریف لائیں۔'' اچانک وہ جو لڑکی کا ماموں تھا، اس نے ایسا اعلان کیا کہ مجھے سمجھ نہ آئی کہ میں خوشی مناؤں کہ افسردہ منہ بنا کر بیٹھ جاؤں کیونکہ میرے برابر میں بیٹھے ہوئے پروفیسر صاحب میرے لیے کچھ اچھا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔

''میں ابھی تمہارا بھانڈا پھوڑتا ہوں۔'' پروفیسر صاحب نے اچانک کہا۔

''اور میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں۔'' میں نے بھی دھمکی دی۔

''کچھ لوگ سر سے بالکل گنجے ہوتے ہیں اور انہوں نے وگ لگائی ہوتی ہے۔'' اچانک پروفیسر صاحب بولے اور وہاں موجود ہر ایک نے ان کی طرف حیرت سے دیکھنا شروع کر دیا۔ ابا، اماں اور میں تو پروفیسر صاحب کی طرف ایسے دیکھ رہے تھے جیسے انہوں نے اچانک پستول نکال کر ہم پر تان لیا ہو۔

''بھائی جی، ہم آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھے۔'' لڑکی کے ماموں نے بڑی معصومیت سے دریافت کرنا چاہا۔

پروفیسر صاحب نے میری طرف گھوم کر اپنی شہادت کی اُنگلی اُٹھائی اور ابھی کچھ کہنے ہی والے تھے کہ میں نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر پیچھے موجود شیلف میں پڑی بھاری بھرکم ڈکشنری اُٹھائی اور پروفیسر صاحب کے سر پر پورے زور سے ماردی۔ بے چارے پروفیسر صاحب ضخیم ڈکشنری کا وار برداشت نہ کر سکے اور بے ہوش ہو گئے جبکہ یہ منظر دیکھ کر سب مہمان سہم گئے۔

میں نے کہا۔ ''گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ یہ دماغی طور پر بیمار شخص ہیں اور ہمارے ہمسائے ہیں۔ جیسے ہی ان کی طبیعت خراب ہونے لگتی ہے اگر ان کے سر پر ہلکی سی چوٹ لگا دی جائے تو یہ کچھ دیر اسی طرح پڑے رہنے کے بعد ٹھیک ہو جاتے ہیں۔''

میری وضاحت سے مہمانوں کی تسلی ہوئی کہ نہیں البتہ وہ مسکرائے اور اماں ابا کو جلد اپنے گھر آنے کی دعوت دے کر ڈرائنگ روم سے نکل گئے۔ میں بھی پیچھے ہی چل پڑا۔

جاتے ہوئے بھی مہمان باتیں کر رہے تھے اور میں یہ دیکھنے کے لیے کہ پروفیسر صاحب کا کیا حال ہے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا تو مجھے خاتون کی آواز سنائی دی، اسی خاتون کی جس کی آواز میں نے پروفیسر صاحب کے گھر سنی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''میں نے کہا بھی تھا کہ مت جاؤ ان کے گھر......''

''جھوٹ مت بولو...... تم نے ہی مجھے کہا تھا کہ اس طرح سے ان کے گھر جاؤ۔'' پروفیسر صاحب کی آواز آئی۔ میں تو ڈر گیا تھا کہ پروفیسر صاحب تو اکیلے ہی تھے پھر وہ خاتون کیسے آ گئی؟ میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں اندر جا کر ان کو دیکھ سکوں۔ میرے قدم دروازے پر ہی جم گئے تھے۔

کچھ وقت اور گزرا۔ اب اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ میں نے ہمت کی اور آہستہ سے اندر کی طرف بڑھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اندر جھانکا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اندر کوئی بھی نہیں تھا اور ہمارے ڈرائنگ کا وہ دروازہ جو باہر کی طرف کھلتا تھا، وہ کھلا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ پروفیسر صاحب اس دروازے سے باہر چلے گئے تھے لیکن وہ خاتون کیا اسی دروازے سے اندر آئی تھی؟ میرے لیے وہ معما بڑا حیران کن تھا۔

☆......☆......☆

میں، پروفیسر صاحب کی وگ واپس کرنا چاہتا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیسے وگ واپس کروں؟ مجھے ڈر بھی لگ رہا تھا۔ دو، تین دن میں یہی سوچتا رہا۔ ایک دن آفس سے واپس آیا تو اماں نے بتایا کہ پروفیسر صاحب اپنا سامان لے کر کہیں چلے گئے ہیں۔

مجھے افسوس بھی ہوا اور میں سوچنے بھی لگا کہ انہوں نے اچانک کرائے کا مکان کیوں چھوڑ دیا۔ اس کی وجہ کہیں یہ تو نہیں ہے کہ میں ان کے قتل کے منصوبے سے آگاہ ہو گیا تھا۔ میں تو ابھی یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ وہ خاتون کون تھی جو دکھائی نہیں دیتی تھی؟

اس بات کو کئی دن گزر گئے تھے۔ ایک دن مجھے میرا دوست اردو بازار لے گیا۔ ایک بڑی سی کتابوں کی دکان پر وہ کچھ کتابیں خریدنا چاہتا تھا کہ اچانک میں چونک گیا۔ کیونکہ اس دکان کے مالک کے پاس پروفیسر صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی میری طرف دیکھ لیا تھا۔ وہ اُٹھ کر میرے پاس آ گئے اور بولے۔

''میری وگ کہاں ہے؟''

''میرے پاس ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم نے میرے سر پر بڑے زور سے ڈکشنری ماری تھی۔'' انہوں نے مسکرا کر شکوہ کیا۔

''آپ بھی تو ولن بننے جا رہے تھے۔'' میں نے کہا۔

''جانتے ہو میں اچانک وہاں سے کیوں چلا گیا تھا؟'' پروفیسر صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

''کیوں چلے گئے تھے؟'' میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''کیونکہ تم نے میری بیوی کی آواز سن لی تھی۔'' انہوں نے انکشاف کیا۔ ''اور مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوا کہ تم نے میری بیوی کی آواز کیوں سنی۔''

میں حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا پھر بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ وجہ یہ تھی کہ میں جان گیا تھا کہ آپ راشد کو قتل کرنا چاہتے تھے۔''

انہوں نے میری طرف دیکھا اور مجھے ایک دوسری شیلف کی طرف لے گئے۔ انہوں نے سامنے اشارہ کیا تو وہاں ایک درجن سے زیادہ ناول لگے ہوئے تھے جن پر مصنف کا نام خلیل احمد لکھا ہوا تھا۔ پھر ایک ناول نکال کر انہوں نے اس ناول کی پشت پر اپنی تصویر بھی دکھائی اور بولے۔

''میں ناول نگار ہوں۔ جہاں تم کھڑے ہو یہ میرے پبلشر کی دکان ہے۔ اس دن میں اپنے اسی پبلشر سے کہانی کے کردار راشد کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ چاہو تو وہ سامنے بیٹھے ہیں، ان سے پوچھ لو۔''

میں ان کی بات سن کر اور بھی حیران ہو گیا تھا۔ پہلی بار مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ وہ ناول نگار ہیں۔

''آپ کی بیوی کی میں نے صرف آواز سنی تھی۔ اتنی سی بات آپ سے برداشت نہیں ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

وہ کچھ توقف کے بعد بولے۔ ''مجھے اپنی بیوی سے بہت محبت تھی۔ ہماری پندرہ سالہ رفاقت ہنستے مسکراتے، نوک جھوک کرتے گزری تھی۔ وہ اچانک مر گئی اور میں اکیلا رہ گیا۔''

پروفیسر صاحب اتنا کہہ کر اداس ہو گئے اور میں اور بھی ششدر رہ گیا کہ اگر ان کی بیوی مر چکی تھی تو وہ جو باتیں کرتی تھی، وہ کون تھی؟

پھر انہوں نے مزید کہہ کر مجھے اور بھی حیران کر دیا۔ وہ بولے۔ ''میں اپنی بیوی سے روز باتیں کرتا ہوں...... وہ میری تنہائی میں آتی ہے جس کا صرف مجھے پتا ہے...... کسی اور کو نہیں ...... لیکن تم کو پتا چل گیا اور تم نے اس کی آواز بھی سن لی......''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ مر چکی ہیں اور آپ کی تنہائی میں آتی ہیں۔ آپ ان سے باتیں کرتے ہیں؟ یہ کیسے ممکن ہے......؟'' میں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو رہا تھا۔

وہ مجھ پر یہ انکشاف کر کے اور مجھے مزید حیرت کے سمندر میں دھکیل کر اپنے پبلشر کے پاس چلے گئے۔ میں دم بخود کھڑا تھا.. ان کے الفاظ کچھ اس طرح تھے۔

''میں تنہائی میں اپنی مرحومہ بیوی کی ہو بہو آواز میں خود باتیں کرتا ہوں۔ کبھی اپنی آواز میں اور کبھی اس کی آواز میں۔''

قسط نمبر: 7

وقت

حسام بٹ

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب تھا۔ ایک ایسے پرعزم بازی گر کی بازی گری ...... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

وقت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن ... اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کردیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمرِ رواں کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے ۔کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھاؤ ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن ... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہوجائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لمحے کا اسیر تھا... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی، اس کے باوجود اس کی داستانِ حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔





گزشتہ اقساط کا خلاصہ

اس کا نام اسد علی رکھا گیا جسے ''علی'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔علی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔جب اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو علی سلطان کی نگہداشت میں پایا۔علی سلطان ٹیکساس (امریکا) کا ایک معتبر کاروباری شخص تھا۔ایک حادثے نے علی سلطان کو وہیل چیئر تک محدود کردیا تھا۔اس کی اپنی بیوی ریٹا میگڈالین سے علیحدگی ہوچکی تھی۔وقتِ رخصت ریٹا اپنی اکلوتی بیٹی لَفنی کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔علی سلطان نے اپنی اور علی کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ رکھی ہوئی تھی اور بچپن سے جوانی تک علی کی تعلیم و تربیت کے تمام تر اخراجات اٹھائے تھے۔وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد کا سا برتاؤ کرتا تھا جو اسے انکل کہتا تھا۔اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں سیکڑوں سوالات اس کے ساتھ ہی پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔اس نے جب بھی اپنے محسن و مربی انکل سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس بردبار شخص نے نہایت ہی خوب صورتی سے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا تھا...... ''میرے بچے! انتظار کرو۔وقت آنے پر تمہیں سب بتادوں گا۔'' یہ تشنگی علی کے تجسس کو ہوا دیتی تھی لہٰذا نتیجے کے طور پر اس کا ذہن بے سمت سوچوں کے جالے میں الجھ کر رہ جاتا تھا مگر اس اضطرابی کیفیت میں بھی اس نے زندگی کے سفر کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی تھی۔کالج میں قدم رکھتے ہی اس نے ٹیکساس کے علاقے ہنگلٹن میں واقع ''سرکل اے'' نامی ایک اسٹور پر جزوقتی ملازمت کرلی تھی۔بیس سال کی عمر میں جب علی نے سائیکالوجی میں بیچلر ڈگری حاصل کرلی تو نت نئے ہنگامے اس کے تعاقب میں لگ گئے۔ایک روز دو میکسیکن لڑکے ڈکیتی کی نیت سے ''سرکل اے'' میں گھس آئے۔تمام کیش لوٹنے کے بعد وہ ڈکیت علی کے ساتھ موجود سیلز مین نکار کو شوٹ کر گئے۔پولیس نے شک کی بنیاد پر علی کو بھی شاملِ تفتیش کرلیا۔علی کا دامن صاف تھا۔پولیس کے سوالات کے جواب میں اس نے انہیں مطمئن کردیا۔بعدازاں ان دونوں میکسیکن ڈکیت کو ٹی نکس (ایری زونا) سے گرفتار کرلیا گیا۔علی کا کالج لیک جیکسن (ٹیکساس) میں تھا جبکہ علی سلطان کی رہائش بے سٹی (ٹیکساس) میں تھی۔علی ایک ہوٹل میں رہتا تھا اور لیک جیکسن کے اکثر ریسٹورنٹس میں اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔''ونی لاؤنج'' نامی ایک ریسٹورنٹ میں اس کا زیادہ دل لگتا تھا کیونکہ وہاں ایک ہسپانوی دوشیزہ شارو اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔اس دل نشیں مہ جبیں نے علی کے درِ دل پر دستک دی تو اس کی زندگی میں بہار اتر آئی۔ایک رات ونی لاؤنج میں جب لیونارڈو نامی ایک میکسیکن غنڈے اور اس کے حواریوں نے شارو سے بدتمیزی کی کوشش کی تو علی بیچ میں کود پڑا۔اس مار امار ی کو ایک امیر و کبیر اسپینش لیڈی ڈیلفینا نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ علی کو تھما کر یہ کہتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوگئی...... ''مجھے بہادر لوگ بہت پسند ہیں۔زندگی میں جب بھی میری ضرورت محسوس کرو تو رابطہ کرلینا۔'' اس واقعے کے بعد گویا لیونارڈو سے علی کی دشمنی کا باقاعدہ آغاز ہوگیا تھا۔آنے والے دنوں میں علی اور لیونارڈو کے غنڈوں میں گاہے بہ گاہے مڈھ بھیڑ ہوتی رہی۔لیونارڈو نے اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے شارو کو ٹارگٹ کرنے کا منصوبہ بنالیا۔ونی لاؤنج والے ناخوشگوار واقعے کی بنا پر علی نے شارو کی ریسٹورنٹ والی جاب چھڑوا کر اسے انکل سلطان کی خدمت کے لیے گھر میں رکھ لیا تھا۔ایک روز جب شارو واشینلے اسٹورز سے گروسری خریدنے گئی تو لیونارڈو نے اسے اغوا کرلیا۔علی نے شارو کی تلاش میں ہمت نہ ہاری اور شارو کو ڈھونڈتا رہا بالآخر ایک رات لیونارڈو کا ایک قریبی ساتھی پیبلو اس کے ہتھے چڑھ گیا۔دونوں کے بیچ خونیں معرکہ ہوا مگر پیبلو، شارو اور لیونارڈو کے حوالے سے زبان کھولنے کو تیار نہیں ہوا۔علی نے طیش کے عالم میں مار مار کر پیبلو کو ادھ موا کردیا۔آئندہ روز پیبلو کے قتل کی خبر لیک جیکسن اور اس کے قرب و جوار میں گردش کررہی تھی۔پولیس قاتل کی تلاش میں تھی۔لیک جیکسن میں مزید قیام خطرناک ثابت ہوسکتا تھا لہٰذا علی نے انکل سلطان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور اپنی سرخ ہنڈائے اسپورٹ کار میں لیک جیکسن سے ہوسٹن پہنچ گیا۔پھر سرخ ہنڈائے اسپورٹس میں قاتل کے فرار ہونے کی خبر نے علی کے ہوش اڑا دیے۔اس سنگین صورتِ حال میں علی نے ڈیلفینا سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔رابطہ ہونے پر ڈیلفینا نے علی کی کتھا سننے کے بعد کہا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے تک باہر کی دنیا سے کٹ کر اس کے ساتھ بنگلے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلادے گی۔راضی ہونے پر ان بہتر گھنٹوں میں ہر پل علی پر حیرتوں کا ایک نیا در وا ہوتا رہا۔ڈیلفینا بہت اونچی پہنچ کی مالک ایک پراسرار لیڈی تھی۔اس نے اپنا اثر رسوخ استعمال کرکے علی کو پیبلو مرڈر کیس سے اس طرح نکال لیا جیسے مکھن سے بال......علاوہ ازیں ڈیلفینا نے ٹھوس ثبوت کی مدد سے علی کو بتایا کہ لیونارڈو، شارو کو اغوا کرکے کیوبا کے شہر ہوانا لے گیا ہے جہاں وہ شارو کو عصمت فروشی کے جہنم میں جھونکنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ڈیلفینا نے علی کو یقین دلایا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے پورے ہونے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کردے تو وہ شارو کو صحیح سلامت واپس لے آئے گی۔شارو کے حصول کی خاطر علی ڈیلفینا کی بات ماننے کے لیے تیار ہوگیا۔پریسٹن ہالو والے اس بنگلے میں ڈیلفینا کی سنگت میں گزرنے والے وہ طلسم ہوش ربا بہتر گھنٹے بڑے رنگین، سنگین، رومان پرور اور ناقابلِ یقین تھے۔ڈیلفینا کی شخصیت کسی معمے سے کم نہ تھی......اس پر مستزاد، ڈیلفینا نے اپنے ہی ایسی دو پراسرار شخصیات ربی آئزک باروخ لاؤ اور ایما ایپل بام سے علی کی ملاقات بھی کروادی۔تب علی پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تمام افراد یہودیوں کی ایک سیکرٹ اور بہت طاقتور سوسائٹی ''اسکل اینڈ بونز'' سے تعلق رکھتے تھے۔جو لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔یہ لوگ خود کو زمینی خدا سمجھتے تھے۔انہیں علی کے ہم عمر ایک ایسے نوجوان کی تلاش تھی جس کی ماں مسلمان اور باپ عیسائی تھا۔انہیں شک تھا کہ علی وہی نوجوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کرکے کہیں روپوش ہوگئے تھے۔ڈیلفینا کی تمنا تھی کہ علی ان کی شرائط پر صاد کرتے ہوئے ''اسکل اینڈ بونز'' کی رکنیت حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کردے لیکن علی نے ڈیلفینا کی خواہش کو ٹھکرا دیا اور ڈیلس سے بے سٹی اپنے انکل کے پاس آگیا۔یہاں حالات کی ایک نئی کروٹ اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔انکل نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے دیرینہ اور سربستہ راز سے آگاہ کردیا۔علی سلطان کے مطابق، انیس سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان) سے نیویارک (امریکا) مرزا عامر بیگ کے پاس پہنچایا گیا تھا۔مرزا عامر بیگ، علی سلطان کا دوست تھا۔اس نے علی کو علی سلطان کے حوالے کردیا تھا۔علی سلطان نے ایک گارجین کی حیثیت سے انیس برس تک علی کی پرورش کی تھی۔اس سلسلے میں ہونے والے تمام تر اخراجات کراچی میں مقیم ایک نیک خاتون برداشت کررہی تھیں مگر پچھلے چند ماہ سے اچانک کراچی سے یہ رقم آنا بند ہوگئی تھی جس سے مرزا عامر نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کسی مصیبت میں گرفتار ہوگئی ہے چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ علی کو فی الفور کراچی روانہ ہوجانا چاہیے۔علی سلطان اور مرزا عامر بیگ مذکورہ خاتون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔ان کا اندازہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی خونی رشتہ ہے۔مرزا عامر بیگ نے علی کو چند ایسے اشارے دیے جن کی مدد سے علی کراچی میں اس

خاتون کو تلاش کرسکتا تھا۔ اس صورتِ حال میں علی کا دل علی الاعلان یہ کہہ رہا تھا کہ وہ عورت اس کی ماں ہے۔ علی نے حتی الامکان سرعت سے تیاری کی اور یوں وہ کراچی آ گیا۔ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی نئے ہنگاموں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ ائرپورٹ سے ایک ٹیکسی پکڑ کر اپنے ہوٹل کی جانب روانہ ہوا تو ٹیکسی ڈرائیور نے اسے ویرانے میں جا کر لوٹنے کی کوشش کی مگر علی نے اسے ناکام بنا دیا۔ اگلے ہی لمحے ایک سیاہ ٹویوٹا کرولا اس کے سر پر آن پہنچی۔ علی ہر نوعیت کے حالات سے نمٹنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گیا۔ تاہم ٹیکسی ڈرائیور ناکام رہا اور علی کے ہاتھوں درگت بنوانے کے بعد گرفتار ہو گیا۔ علی کی مدد دو نوجوانوں نے کی جن میں سے ایک کا تعلق پولیس سے تھا۔ وہ دونوں کزن تھے۔ ان میں سے ایک عظیم نامی نوجوان سے علی کی دوستی ہو گئی۔ اس سے دوستی ہونے پر علی کی واقفیت اس کی فیملی سے بھی ہو گئی اور علی نے اپنی پاکستان آمد کے بارے میں عظیم کو بتایا کہ وہ کسی ہستی کی تلاش میں یہاں آیا ہے۔ اس نے عظیم کو اپنے پاس موجود ٹیلی فون نمبرز دیے۔ عظیم نے ان نمبرز پر ٹرائی کیا جس میں سے ایک اس کے کسی جاننے والے کا تھا۔ عظیم کے اس استفسار پر کہ وہ کسی سلمٰی نامی خاتون کو تلاش کر رہا ہے علی جذباتی ہو گیا اور عظیم کی کال سنتے سنتے اس کا سیل فون اس کے ہاتھ سے پھسل کر بیڈ پر جا گرا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میں کوئی ناتواں اور نحیف و نزار انسان نہیں تھا کہ عظیم کی زبان سے ادا ہونے والا ایک جملہ مجھ پر کپکپی طاری کر دیتا۔ عظیم کا استفسار محض ایک فقرہ نہیں تھا۔ اس جملے میں ایک ایسی ہستی کا نام بھی شامل تھا جو میری زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل تھی اور...... وہ ہستی تھی سلمٰی...... میری ماں!

ماں کا اپنی اولاد کے ساتھ بڑا گہرا جذباتی رشتہ ہوتا ہے۔ مالک اور بندے کے تعلق کے بعد یہ رشتہ دنیا کا سب سے مضبوط تعلق ہے۔ مالک اور ماں کے درمیان ایک چیز قدرِ مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے اور وہ شے ہے...... دونوں کا ''خالق'' ہونا۔ مالک کائنات کی ہر چیز کا خالق ہے اور مالک ہی کے حکم پر ایک ماں اپنی اولاد کو جنم دے کر ''خالق'' کا ٹائٹل حاصل کر لیتی ہے۔

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اپنی ماں کی گود میں پروان چڑھتے ہیں اور ساری زندگی انہیں اپنی ماں کا ساتھ میسر رہتا ہے۔ میں بیس سال کا ہونے والا تھا لیکن آج تک میں نے اپنی ماں کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ مجھے تو اپنی ماں کی آغوش کی نرمی اور گرمی بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ میں ممتا کی کیف آور نرماہٹ اور سکون بخش گرماہٹ سے ناآشنا تھا۔ میں اس کے لاڈ پیار اور محبت کو ترسا ہوا تھا۔ انیس سال کی مدت کوئی کم عرصہ نہیں ہوتا۔ میں نے یہ روز و شب کس تشنگی میں گزارے تھے، یہ میں ہی جانتا تھا یا میرے مالک کو اس کیفیت کی خبر تھی۔ میں نے برسوں اپنے والدین سے ملاقات کا انتظار کیا تھا اور اب جا کر میرے اس اذیت ناک انتظار کو بریک لگے تھے۔ افسوس! کہ میں اپنے باپ سے کبھی نہیں مل سکتا تھا۔ وہ کسی دشمنی کی بھینٹ چڑھ کر اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ میری امیدوں کا آخری سہارا میری ماں ہی تھی جو اب مجھ سے چند قدموں کی دوری پر تھی۔ یہی وجہ تھی، پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی مجھے ماں کی خوشبو محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کا تصور لہو بن کر میری رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ یہی سبب تھا کہ عظیم کے منہ سے اپنی ماں کا نام سنتے ہی مجھے اپنے جذبات پر اختیار نہیں رہا تھا اور شدتِ جذبات سے میرا ہاتھ لرز اٹھا تھا اور سیل فون ہاتھ سے نکل کر بیڈ پر جا گرا تھا۔

انسان جب کسی جذباتی کیفیت سے گزر رہا ہوتا ہے تو احساسات پر اس کا قابو نہیں رہتا چنانچہ بعض اوقات اس کا عمل اس کی مرضی اور سوچ کے طابع نہیں رہتا اور وہ بے اختیار کوئی بھی غیر ارادی حرکت کر بیٹھتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ان لمحات میں کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ جیسے ہی سیل فون میرے ہاتھ سے پھسل کر بیڈ پر پہنچا، میں نے عظیم سے ہونے والی گفتگو کی رو میں اس سے سوال کیا۔

''تم میری ماں کو کیسے جانتے ہو؟''

اگلے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ میں نے سیل فون کے بغیر ہی عظیم سے سوال کیا ہے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر سیل فون اٹھا لیا اور اسے کان سے لگا لیا۔ اسی وقت اس کی مخصوص آواز سماعت سے ٹکرائی۔

''اسد...... کیا ہوا...... تم چپ کیوں ہو...... سب ٹھیک تو ہے نا......؟''

''عظیم! میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے سنبھلے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''ہاں، تو تم کیا کہہ رہے تھے؟''

''میں نے تم سے یہ پوچھا تھا کہ تمہیں جس ہستی کی تلاش ہے، کیا اس کا نام سلمٰی ہے؟'' اس نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہاں...... بالکل۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے سلمٰی صاحبہ کی تلاش ہے اور میں دراصل ان سے ملاقات کرنے کے لیے ہی کراچی آیا ہوں۔ اس سے پہلے وہ جن چالیس افراد کے توسط سے کسی نہ کسی طرح مجھ سے رابطے میں تھیں، ان سب کے سیل نمبرز

میں نے تمہیں دیے تھے اور تم نے بتایا ہے کہ ان میں سے انتالیس نمبرز رسپانڈ نہیں کر رہے۔ صرف ایک نمبر ایسا ہے جو تمہارے کسی جاننے والے کا ہے۔ تم نے اس شخص کا نام نزاکت بتایا ہے......"

"ہاں، نزاکت شاہ کا نمبر میرے پاس فیڈ تھا۔" وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ "اس لیے میں نے جیسے ہی تمہارا دیا ہوا چالیس واں نمبر لگایا تو اس نمبر کے بجائے سیل فون کی اسکرین پر نزاکت شاہ کا نام ابھر آیا۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہاری بات میری سمجھ میں آرہی ہے۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "نزاکت شاہ سے تمہاری دوستی یا کوئی اور تعلق ہوسکتا ہے مگر تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ مجھے جس خاتون ہستی کی تلاش ہے، اس کا نام سلمٰی ہے؟"

"ارے یار! جب تم نے چالیس فون نمبرز والی لسٹ مجھے تھمائی تھی نا تو اس کے ساتھ ہی تم نے مجھے ان کے حوالے سے تھوڑی تفصیل بھی بتائی تھی کہ تمہیں ان چالیس سیل فون نمبرز کے ذریعے جس ہستی تک پہنچنا ہے وہ کسی نہ کسی طرح ان چالیس افراد کے ساتھ وابستہ رہی ہے۔ یہ معلومات میرے ذہن میں محفوظ تھیں چنانچہ......" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"جب میرے سیل فون کی اسکرین پر نزاکت شاہ کا نام ظاہر ہوا تو مجھے فوراً یاد آگیا کہ وہ کسی سلمٰی نامی عورت کے پاس ملازم تھا اس لیے میں نے تم سے کسوٹی کے انداز میں وہ دو سوال کیے تھے کہ...... کیا وہ کوئی خاتون ہے؟ کیا اس ہستی کا نام سلمٰی ہے......؟"

"اوہ اچھا......" میں نے جلدی سے کہا پھر پوچھا۔ "کیا نزاکت شاہ سے تمہاری بات ہوئی ہے؟"

"نہیں اسد۔" اس نے بتایا۔ "دوسری طرف سے وہی ریکارڈنگ سنائی دی جس کا ذکر تم نے کیا تھا، فون اٹینڈ نہیں ہوسکا۔"

"کیا نزاکت شاہ تمہارا کوئی قریبی ہے؟"

"کوئی خاص نہیں۔ بس مہینے میں ایک آدھ بار ہماری ملاقات ہوجاتی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "نزاکت شاہ دراصل میرے ایک دوست سہیل کا دوست ہے۔ میں نزاکت کو سہیل ہی کے توسط سے جانتا ہوں۔"

"اچھا اچھا......" میں نے کہا۔ "آخری مرتبہ نزاکت شاہ سے تمہاری ملاقات کب ہوئی تھی؟"

"کم و بیش دو ماہ پہلے۔" اس نے بتایا۔

"جب تمہیں یہ معلوم ہے کہ نزاکت شاہ کسی سلمٰی نامی عورت کے پاس کام کرتا ہے تو پھر تم یہ بھی جانتے ہوگے کہ سلمٰی صاحبہ کرتی کیا ہیں۔ مطلب، ان کا کیا کاروبار ہے، وہ کہاں رہتی ہیں، میں ان سے کہاں ملاقات کرسکتا.... ہوں؟"

"نن...... نہیں......" وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں یہ سب نہیں جانتا۔ مجھے سلمٰی کے بارے میں اتنی زیادہ جان کاری نہیں ہے......"

"اگر جان کاری نہیں ہے تو پیدا کرنے کی کوشش کرو نا یار۔" میں نے اضطراری انداز میں کہا۔ "میں صبح ان خاتون سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں بلکہ اگر ممکن ہو تو میں اس وقت بھی ان سے ملنے کے لیے جانے کو تیار ہوں۔"

"اوہ...... اتنی بے قراری۔" وہ چہک کر بولا۔ "لگتا ہے، سلمٰی صاحبہ کی تمہاری زندگی میں بہت زیادہ اہمیت ہے اسی لیے تم ان سے ملنے کے لیے امریکا سے یہاں چلے آئے ہو!"

"تمہاری سوچ سے بھی زیادہ اہمیت......!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "تم اندازہ نہیں کرسکتے کہ اس وقت میرے دل و دماغ کی کیا حالت ہے۔"

"تم مجھے اپنا دوست مانتے ہو نا......؟" اس نے سوال کیا۔

میں نے جواب دیا۔ "اس میں کیا شک ہے۔"

"تو پھر یقین کرلو کہ مجھے بہ خوبی اس بات کا اندازہ ہے کہ ان لمحات میں تمہاری دلی کیفیات کیا ہیں۔" اس نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ "جذبات میں ڈوبی ہوئی تمہاری آواز اور اس آواز کا اتار چڑھاؤ تمہارے معاملاتِ دل کی کہانی سنا رہا ہے۔ تم تیرہ، چودہ ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اگر کسی ہستی سے ملنے یہاں آئے ہو تو اس کا ایک ہی مطلب ہے اور وہ یہ کہ...... وہ ہستی تمہاری زندگی کا مرکز و محور ہے اور اس سے ملاقات کرنا تمہارا مقصدِ حیات!"

"تم نے ہو بہ ہو میرے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کی ہے۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا پھر پوچھا۔ "عظیم! اگر نزاکت شاہ کا فون اٹینڈ نہیں ہو رہا تو کیا کسی دوسرے ذریعے سے تم اس سے رابطہ کرکے سلمٰی صاحبہ کے بارے میں معلومات حاصل نہیں کرسکتے۔ تم میرا اشارہ سمجھ رہے ہونا......؟"

"بالکل سمجھ رہا ہوں یار۔" وہ دوستانہ انداز میں

بولا۔ ''تم سہیل کی طرف اشارہ کررہے ہو کیونکہ سہیل کے براہِ راست نزاکت شاہ سے دوستانہ تعلقات ہیں۔''

''ہاں، بالکل۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

اب میں مکمل طور پر خود کو سنبھال چکا تھا۔ چند لحات کے لیے میں جس جذباتی کیفیت کا شکار ہوگیا تھا، اب میں اس بھنور سے نکل آیا تھا اور بالکل نارمل انداز میں عظیم سے بات کررہا تھا۔ مجھے اس بات کا بھی اطمینان ہوگیا کہ میرے وہ الفاظ عظیم کی سماعت تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے جب بے اختیار میں نے اس سے پوچھا تھا...... تم میری ماں کو کیسے جانتے ہو؟

اگر عظیم نے میرے یہ الفاظ سن لیے ہوتے تو اس حوالے سے اب تک وہ مجھ سے درجنوں سوال کرچکا ہوتا۔ عظیم کا اس ایشو کو ٹچ نہ کرنا اس امر کی دلیل تھی کہ میرے وہ استفسار یہ الفاظ اس تک نہیں پہنچے تھے اور شاید اس کا سبب یہ تھا کہ ان نازک لحات میں میرا سیل فون مجھ سے کچھ دور، بیڈ پر پڑا تھا۔

''یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔'' عظیم کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ''میں سہیل سے بات کرکے یہ ساری معلومات حاصل کرسکتا ہوں لیکن اس کے لیے تمہیں کم از کم تین گھنٹے اور زیادہ سے زیادہ دس گھنٹے انتظار کرنا ہوگا۔''

''اس تاخیر کی کیا لوجک ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یار! اس وقت رات کا ایک بج رہا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''رمضان کا مہینا شروع ہوچکا ہے۔ کل پہلا روزہ ہے۔ تین بجے تک لوگ سحری کے لیے اٹھیں گے تو تبھی رابطہ ہوسکے گا۔ ابھی نیند سے کسی کو جگانا مناسب نہیں ہوگا اور وہ جو میں نے زیادہ سے زیادہ دس گھنٹے کی بات کی ہے نا تو اس کی منطق یہ ہے کہ میں اچھی طرح جانتا ہوں، سہیل روزے نہیں رکھتا لہٰذا اس کا سحری میں بیدار ہونا ممکن نہیں۔ وہ اپنے معمول کے مطابق، صبح آٹھ، نو بجے ہی سو کر اٹھے گا۔''

''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ''تو یہ بات ہے۔''

''برو! یہ تھکی ماندی آہیں نہ بھرو۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''رمضان کے مہینے میں، میں پوری رات جاگتا ہوں اور سحری کرنے کے بعد ہی میں سونے کے لیے لیٹتا ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں سحری کے وقت سہیل کو ٹرائی کروں گا۔ اگر میری اس سے بات ہوگئی تو میں فوراً تمہیں فون کروں گا۔ تم تو جیک لیگ میں ہو۔ تمہیں تو صبح ہی نیند آئے گی۔''

''جیک لیگ کی حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن میں سونے جاگنے کے لیے اس کیفیت کا محتاج نہیں ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے اپنی نیند پر پورا اختیار حاصل ہے۔''

''جیک لیگ'' ایک خاص قسم کی اصطلاح ہے جو ''سونے جاگنے'' کی عادت کے حوالے سے استعمال کی جاتی ہے۔ جب کوئی مسافر ہزاروں کلومیٹرز کا فاصلہ طے کرکے ایک ملک سے دوسرے ملک پہنچتا ہے اور ان دونوں ملکوں کے مقامی وقت میں چھ سات گھنٹے سے زیادہ کا فرق ہوتا ہے تو وہ نئی جگہ پہنچ کر پرانی جگہ کی روٹین کے مطابق ہی سوتا اور جاگتا ہے۔ کراچی اور بوسٹن کے مقامی وقت میں دس گھنٹے کا تفاوت تھا لہٰذا ''جیک لیگ'' کے اصول کے مطابق چند روز تک کراچی میں مجھے دن میں نیند آنا تھی اور رات میں مجھے جاگنا تھا۔ ہاں...... اگر کسی بھی طرح پہلے دن زبردستی مقامی وقت کے مطابق انسان سونے میں کامیاب ہوجائے تو پھر وہ ''جیک لیگ'' کی کیفیت سے آزاد ہوجاتا ہے اور مجھے وہی کرنا تھا۔

''گریٹ......'' وہ سراہنے والے انداز میں بولا۔ ''تم آرام کرو۔ جو بھی صورتِ حال ہوگی، میں تمہیں اپ ڈیٹ کردوں گا۔''

''تھینک یو عظیم۔'' میں نے تہِ دل سے کہا۔

''اور اگر میں تم سے رابطہ نہ کروں تو سمجھ لینا کہ سحری میں میری سہیل سے بات نہیں ہوسکی۔'' اس نے کہا۔ ''لہٰذا ہم دس گیارہ بجے اس موضوع پر گفتگو کریں گے۔ او کے!''

''او کے...... ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

عظیم سے سیلولر رابطہ موقوف ہوا تو میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اس نے مجھے بہت بڑی خوش خبری سنائی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی جلدی مجھے میری ماں کا سراغ مل جائے گا۔ اگر نزاکت شاہ بھی عظیم کا جاننے والا تھا اور وہ عظیم کے کسی دوست سہیل سے بہت قریب تھا تو پھر سہیل کے توسط سے لازمی مجھے میری ماں کا پتا ٹھکانا معلوم ہوجانا تھا۔ میں جب بوسٹن سے روانہ ہوا تھا تو اس وقت میرے ذہن میں یہی تھا کہ ان چالیس سیل نمبرز، منی ٹرانسفر کی رسیدوں، پرائیویٹ اسپتالوں کے برتھ ریکارڈ چیک کرنے اور دیگر وسیلوں حیلوں کی مدد سے اپنی ماں کو تلاش کرنے میں مجھے ہفتہ دس دن یا ایک مہینا لگ جائے گا لیکن چوبیس گھنٹے سے پہلے میں اپنی ماں کے بہت قریب پہنچ گیا

تھا اور یہ سب عظیم کے توسط سے ہوا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس سلسلے میں ابھی تک عظیم نے کوئی عملی کوشش نہیں کی تھی لیکن یہ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ مالک نے اسے میری ماں تک رسائی کا وسیلہ بنا دیا تھا۔ عظیم قدرت کی کسی مصلحت کے تحت مجھ سے ملا تھا لہٰذا مجھے عظیم کی اور اس کی دوستی کی قدر کرنا تھی۔

وفورِ مسرت سے میری عجیب حالت ہو رہی تھی۔ گزشتہ کئی سالوں سے میں اپنے والدین سے ملنے اور ان کی شکل دیکھنے کو ترس رہا تھا، ان کی آواز سننے کے لیے میری سماعت تڑپ رہی تھی۔ عظیم کی زبانی سنائی دینے والی خوش خبری کے بعد یہ تڑپ، یہ محرومی اور یہ کسک ہزاروں، لاکھوں گنا بڑھ گئی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ہوٹل کے کمرے سے نکل جاؤں، فضا میں رچی بسی اپنی ماں کی خوشبو کو سونگھتے ہوئے میں آگے ہی آگے بڑھتا جاؤں اور میرے قدم اس وقت تک محوِ حرکت رہیں جب تک میں اپنی ماں کے سامنے نہ پہنچ جاؤں اور...... اس کی ممتا بھری آغوش میں چھپ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر نہ ہو جاؤں......!

فوری طور پر ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ میرا اس انداز میں سوچنا جذباتی ردِعمل کا نتیجہ تھا۔ یہ احساسات کی شدت کا جوش تھا جو مجھے بھی پُرجوش بنا رہا تھا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اپنی ماں کے سامنے پہنچنے سے پہلے مجھے چند مراحل سے گزرنا تھا اور ان مراحل کا فیصلہ اس وقت ہونا تھا جب عظیم مجھے فون کرتا۔

میں اس وقت اپنی عمر کی بیسویں سیڑھی پر تھا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، اپنے والدین کے بارے میں سوچتا چلا آیا تھا۔ کم و بیش پندرہ سال سے میں اپنے والدین کی تلاش میں تھا۔ میرے انتظار کی محنت رنگ لانے والی تھی...... بڑا گہرا رنگ!

میں ''جیک لیگ'' جیسی کیفیات کے سامنے مجبور نہیں تھا۔ مجھے اپنی نیند پر مکمل اختیار حاصل تھا۔ میں اپنی مرضی سے جب چاہوں، سو سکتا تھا اور جس وقت چاہوں بیدار ہو سکتا تھا۔ اس وقت رات کا ایک بج چکا تھا۔ یہ وقت کراچی والوں کے سو جانے کا تھا۔ مجھے بھی سو جانا چاہیے تھا لیکن میں دانستہ ابھی سونا نہیں چاہتا تھا۔ عظیم نے اتنی بڑی خوش خبری سنائی تھی کہ اس بات کو انکل سلطان سے شیئر کرنا بہت ضروری تھا۔ وہ میرے مربی و مہربان تھے۔ انہوں نے انیس سال تک میری پرورش و نگہداشت کی تھی۔ اس خوشی کے موقع پر میں انہیں نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ انہیں یہ سن کر بے حد مسرت ہوتی کہ مجھے اپنی ماں کا سراغ مل گیا ہے۔

عظیم کا فون آنے سے پہلے میں نے انکل سے طویل گفتگو کی تھی اور انہیں یہاں کی صورتِ حال کے بارے میں بتایا تھا لیکن اس صورتِ حال میں اچانک ایک بہت بڑی تبدیلی آ گئی تھی لہٰذا انکل سے بات کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

میں نے سیل فون سے ان کا نمبر ملایا اور کال پک ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اس وقت بے سٹی (ٹیکساس) میں سہ پہر کے تین بجے تھے۔ دوسری گھنٹی پر انکل نے کال ریسیو کر لی۔ میرے ''ہیلو'' کے جواب میں وہ قدرے تشویش بھرے لہجے میں بولے۔

''میرے بچے! سب خیریت تو ہے نا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو ہماری بات ہوئی ہے......''

''انکل!'' میں نے ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''حالات میں ایسی تبدیلی آئی ہے کہ میں آپ کو فون کرنے پر مجبور ہو گیا۔''

''کیسی تبدیلی میرے بچے؟'' انہوں نے فکرمندی سے استفسار کیا۔

''آپ پریشان نہ ہوں انکل۔'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ تبدیلی مثبت ہے۔''

''کچھ مجھے بھی تو بتاؤ......'' وہ اضطراری لہجے میں بولے۔ ''آخر ہوا کیا ہے؟''

''آپ کو یہ خوش خبری سنانے کے لیے فون کیا ہے کہ میری ماں کا سراغ مل گیا ہے۔'' میں نے مسرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''عظیم کا ایک دوست میری ماں کا ملازم ہے۔ نزاکت شاہ اس کا نام ہے۔ کل کسی وقت بھی میری، اپنی ماں سے ملاقات ہو جائے گی...... ان شاءاللہ!''

''مبارک ہو میرے بچے۔'' وہ بے حد جذباتی لہجے میں بولے۔ ''یہ تو واقعی بہت بڑی خوش خبری ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا نا...... پیوستہ رہ شجر سے، امیدِ بہار رکھ...... سمجھ لو، تمہاری زندگی میں بہار کا موسم اتر آیا ہے۔''

''میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں انکل۔'' میں نے اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی کامیابی کے لیے بہت پُرامید ہوں۔''

''اللہ تمہیں فتح نصیب کرے میرے بچے۔'' وہ جذبات سے معمور لہجے میں بولے۔ ''مجھے کچھ تفصیل تو بتاؤ کہ یہ نزاکت شاہ کون ہے اور وہ تمہاری والدہ کے پاس کس قسم کی ملازمت کرتا ہے۔ تمہاری والدہ کراچی کے کس

علاقے میں رہتی ہیں اور ان کے مشاغل کیا ہیں؟''

جواب میں، میں نے انکل کو عظیم سے ہونے والی گفتگو کی تفصیل سے آگاہ کر دیا اور کہا۔ ''کل شام تک ساری صورتِ حال کھل کر سامنے آ جائے گی۔ جب میں اپنی ماں کے رو برو پہنچوں گا تو سارے سوالات کے جوابات مجھے مل جائیں گے پھر میں آپ کو مزید تفصیلات بتا سکوں گا۔''

''میں مطمئن ہو گیا میرے بچے!'' وہ گمبھیر آواز میں بولے۔ ''میرا مشن پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اب میرے دل میں کوئی بھی خلش باقی نہیں ہے۔ میں بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ رخصت ہو سکوں گا......!''

''آپ کو کہاں جانا ہے انکل؟'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''ارے...... کہیں نہیں...... میرے بچے......!'' وہ جلدی سے بولے۔ ''مم...... میرا مطلب یہ تھا کہ...... تمہاری ماں کا سراغ مل گیا۔ یہ تمہاری بہت بڑی کامیابی ہے۔ اس خوش خبری نے مجھے بہت سکون بخشا ہے۔ میرا اندرون شانت ہو گیا ہے۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ اس وقت میں کتنا خوش اور کتنا مطمئن ہوں۔ میرے اللہ نے کرم کیا اور تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔''

''جی انکل! یہ واقعی بہت بڑی کامیابی ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور یہ سب میرے مالک کے حکم سے ہوا ہے۔ آپ کو پتا ہے، ابھی ابھی میں نے کیا فیصلہ کیا ہے......!''

''کیا میرے بچے۔'' انہوں نے بڑے دُلار سے پوچھا۔

''مالک کی اس مہربانی کے شکر کے طور پر روزہ رکھوں گا۔ آج یہاں پہلا روزہ ہے۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اوہ...... ویری گڈ......'' وہ سراہنے والے انداز میں بولے۔ ''تمہارے اس فیصلے سے مجھے دلی خوشی ہوئی ہے۔ اللہ تمہیں ہر آزمائش اور ہر امتحان میں سرخرو کرے میرے بچے۔''

''آمین......!'' میں نے تہِ دل سے کہا۔

مزید تھوڑی دیر تک ہمارے بیچ گفتگو کا سلسلہ جاری رہا پھر ہم نے ایک دوسرے کو ''اللہ حافظ'' کہہ دیا۔

میں نے سیل فون کو سائڈ ٹیبل پر رکھا اور انٹر کام سے روم سروس کا نمبر ملایا۔ رابطہ ہونے پر میں نے کہا۔

''آپ کے ہوٹل میں سحری کا بندوبست بھی ہوتا ہے؟''

''کیسی باتیں کرتے ہیں سر۔'' دوسری جانب سے نہایت ہی مؤدبانہ انداز میں کہا گیا۔ ''ہمارے ہوٹل میں سحری اور افطاری کا خصوصی اہتمام ہوتا ہے۔ کیا آپ روزہ رکھیں گے؟''

''شیور......'' میں نے جواب دیا۔

''سحری ڈائننگ ہال میں کرنا پسند فرمائیں گے یا آپ کے روم میں سرو کر دی جائے؟''

''روم میں۔'' میں نے کہا۔

''اوکے سر!'' دوسری جانب سے کہا گیا۔ ''آج پہلا روزہ ہے۔ پہلی سحری کا وقت چار بج کر پندرہ منٹ پر ختم ہو گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ جتنے بجے حکم کریں گے، سحری آپ کے روم میں سرو کر دی جائے گی۔''

''ساڑھے تین بجے بھجوا دیں۔'' میں نے کہا۔

''اوکے سر! آپ سحری میں کیا لینا پسند فرمائیں گے؟''

میں نے عظیم کے گھر پر رات کو بہت ڈٹ کر ڈنر کیا تھا۔ اس وقت مجھے کوئی خاص بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی لیکن کھانا بھی ضروری تھا۔ میں نے روم سروس سے کہا۔

''مجھے سادہ مگر ٹھوس اور غذائیت سے بھرپور سحری چاہیے۔''

''اوکے سر!'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔''

میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ سحری کرنے کے بعد ہی سوؤں گا۔ سحری میں اب زیادہ وقت باقی نہیں تھا۔ اس وقت میرے دل و دماغ کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ میرے رگ و پے میں ایک بے نام سی سنسنی دوڑ رہی تھی۔ میں نے سن رکھا تھا کہ رمضان کا مہینا بڑا برکتوں والا ہوتا ہے۔ اس ماہِ مبارک میں مالک اپنے بندوں پر خصوصی رحمتیں نازل کرتا ہے۔ مجھے اپنے مالک پر پختہ یقین تھا اور اس یقین کا ایک ناقابلِ تردید ثبوت بھی میرے سامنے تھا۔ رحمت اور برکت بھرے اس ماہِ مبارک کے آغاز پر ہی مالک نے مجھے ایک عظیم تحفے سے نواز دیا تھا، مجھے میری ماں کا سراغ مل گیا تھا۔ کسی بچے کے لیے اس سے بڑا تحفہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ اسے اپنی کھوئی ہوئی ماں مل جائے۔ انیس سال پہلے میں مامتا کے جس بے بہا خزانے سے محروم ہو گیا تھا، چند گھنٹے بعد مجھے وہ حاصل ہونے والا تھا۔ اس کرم نوازی پر میں مالک کا جتنا بھی شکر ادا کرتا وہ کم تھا۔ ایک فوری خیال

کے تحت میں اٹھا اور واش روم میں داخل ہو گیا۔

میں نے نہایت ہی اہتمام کے ساتھ وضو کیا پھر جائے نماز پر کھڑے ہو کر شکرانے کے دو نفل ادا کیے۔ اس کے بعد سجدے میں گر کر زار و قطار رونے لگا۔ میری یہ کیفیت بے اختیاری تھی۔ اس میں میری کسی سوچ اور فیصلے کا عمل دخل نہیں تھا۔ میں جو کچھ بھی کر رہا تھا، کسی غیبی طاقت کے زیر اثر کر رہا تھا اور وہ غیبی طاقت میرے مالک کے سوا اور کسی کی نہیں تھی۔

پتا نہیں، میں کب تک اپنے مالک کے حضور سجدہ ریز رہا اور مالک کی اَن گنت عنایتوں و لاتعداد نوازشوں پر شکر کے آنسو بہاتا رہا۔ میرا یہ ایمان ہے کہ مالک اپنے بندوں پر بہت زیادہ مہربان ہے لیکن اکثر بندے اس کی مہربانیوں کی قدر نہیں کرتے اور جواب میں اپنی زندگی کو مشکل بنا لیتے ہیں۔ انسان اگر اس بات کو اپنی زندگی کا شعار بنا لے کہ مالک نے جو عطا کر دیا، اس پر شکر اور جو عطا نہیں کیا، اس پر صبر...... تو پھر زندگی میں کوئی مسئلہ باقی نہیں رہتا۔ میں پچھلے انیس سال سے اپنے والدین کی محبت کو ترسا ہوا تھا لیکن میں نے کبھی مالک سے اس محرومی کا شکوہ نہیں کیا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ میری اس محرومی کے پیچھے مالک کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہے اور مالک کی مصلحتوں کو کوئی جان نہیں سکتا۔ اس کی مرضی کے سامنے سرنگوں ہونے ہی میں عافیت ہے، اس کے سامنے سر بہ سجود ہو کر آنسو بہانے ہی میں نجات ہے اور...... میں یہی کر رہا تھا۔

دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے چونکا دیا۔ یقیناً روم سروس کے ذریعے میرے لیے سحری بھجوائی گئی تھی۔ میں نے جائے نماز پر سر رکھے رکھے بہ آواز بلند کہا۔

”دروازہ کھلا ہے۔ آپ سحری اندر ٹیبل پر رکھ دو۔“

اس وقت میری جو حالت تھی، میں وہ روم سروس پر آشکار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ میرا اور مالک کا معاملہ تھا۔ میں اس معاملے کو کسی تھرڈ پرسن کے ساتھ شیئر کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میرا چہرہ ان لمحات میں آنسوؤں سے تر بہ تر تھا۔ یہ میرے دل کا غبار تھا، میرے ضمیر کا بخار تھا جو آنکھوں کے راستے ڈھل گیا تھا اور مجھے کورے لٹھے کی طرح صاف شفاف اور اُجلا بنا گیا تھا۔

میں نے اٹھ کر منہ دھویا اور سحری کرنے بیٹھ گیا۔ اس دوران میں رہ رہ کر میری نگاہ اپنے سیل فون کی طرف بھی اٹھ جاتی تھی۔ مجھے عظیم کے فون کا انتظار تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر سحری میں سہیل سے اس کی بات ہو گئی تو وہ مجھے فون کرے گا۔ بہ صورتِ دیگر ہماری بات دن میں ہو گی۔

سحری ختم ہو گئی۔ سحری کا وقت بھی اختتام پذیر ہوا لیکن عظیم کا فون نہیں آیا۔ میں سمجھ گیا کہ سہیل سے اس کی بات نہیں ہو سکی ہو گی ورنہ وہ مجھے ضرور کال کرتا۔

میں نے دانت برش کیے اور کمر سیدھی کرنے کے لیے بستر پر لیٹ گیا پھر مجھے نہیں پتا، کب میری آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

سیل فون کی گھنٹی پر میری آنکھ کھل گئی۔

سحری میں سونے سے پہلے میں سیل فون کی گھنٹی بند کرنا بھول گیا تھا۔ بے ساختہ میری نگاہ دیوار گیر کلاک کی جانب اٹھ گئی۔ کلاک ساڑھے بارہ کا وقت بتا رہا تھا۔ میں بہت پُرسکون نیند سویا تھا۔ مجھے بالکل پتا نہیں چلا کہ یہ وقت کیسے گزر گیا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر سائڈ ٹیبل سے فون اٹھا لیا۔ وہ عظیم کی کال تھی۔

”ہیلو......!“ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

”برو! لگتا ہے، تم گہری نیند سو رہے تھے۔“ عظیم نے بے تکلفی سے کہا۔ ”میں نے تمہیں دو تین ٹیکسٹ کیے۔ جب تمہارا رپلائی نہیں آیا تو پھر میں نے کال کی ہے۔“

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے عظیم۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں واقعی گہری نیند سو رہا تھا۔ تمہاری کال پر میری آنکھ کھلی ہے۔“

”اوہ...... آئی ایم سوری برو۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ”لیکن یہ ضروری تھا۔ پاپا تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

”تمہارے پاپا میرا انتظار کر رہے ہیں!“ میں نے الجھن زدہ انداز میں عظیم کے الفاظ دہرائے۔ ”میں کچھ سمجھا نہیں؟“

”ارے یار! پاپا شوگر پیشنٹ ہیں اس لیے وہ روزہ نہیں رکھ پاتے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں تمہیں فوراً گھر پر بلا لوں۔ وہ ابھی سو کر اٹھے ہیں۔ وہ ہفتہ اور اتوار کو دیر تک سوتے ہیں۔ اتوار کو ہمارے آفس کی چھٹی ہوتی ہے اور ہفتے کو ہم ذرا تاخیر سے آفس جاتے ہیں۔ ویسے پاپا نے آج پہلا روزہ ہونے کی وجہ سے آفس جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم ان کے ساتھ بیٹھ کر برنچ کرو یعنی...... بریک فاسٹ + لنچ ایک ساتھ۔“

”سوری عظیم! میں آپ کے پاپا کی یہ خواہش پوری

نہیں کر سکتا۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔

''ارے یار! تم فکر نہیں کرو۔ میں تمہیں لینے آرہا ہوں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''بس تم فریش ہو جاؤ۔''

''میں تمہارے گھر آنے کے لیے فکر مند نہیں ہوں عظیم......''

''پھر کیا بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''یار! میرا روزہ ہے۔'' میں نے بتایا۔

''اوہ ......'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''ویری گڈ! یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ تم نے روزہ رکھا ہے۔ میں بھی روزے سے ہوں۔ ٹھیک ہے، میں پاپا کو تمہارے روزے کے بارے میں بتا دیتا ہوں لیکن تمہیں یہاں تو آنا ہی ہوگا۔''

عظیم کے آخری جملے میں بڑا شدید اصرار پایا جاتا تھا۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''خیریت...... کیا کوئی خاص بات ہے؟''

''بالکل خیریت ہے یار۔'' وہ بولا۔ ''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم سے پاپا کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، تم آجاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''میں پندرہ بیس منٹ میں تمہیں ریڈی ملوں گا۔''

''میں آدھے، پونے گھنٹے میں تمہارے پاس پہنچوں گا۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''جب تک تم اطمینان سے فریش بھی ہو جاؤ اور اس دوران میں تمہیں ہوٹل سے چیک آؤٹ بھی کرنا ہے۔''

''چیک آؤٹ...... وہ کیوں؟'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔ ''میری تو یہاں تین دن کی بکنگ ہے۔''

''تین دن کی بکنگ ہے تو کیا ہوا۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔ ''تم اس بات کے پابند تھوڑی ہو کہ پورے تین دن پی سی ہی میں گزارو گے۔ یہ تمہاری مرضی ہے کہ جب چاہو، چیک آؤٹ کر لو۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہارے پاپا ایسا کیوں چاہتے ہیں؟''

''انہوں نے تمہارے لیے کسی بہتر رہائش کا بندوبست کر دیا ہے۔''

میں نے بے ساختہ پوچھا۔ ''کہاں؟''

''یہاں پہنچو گے تو تمہیں سب پتا چل جائے گا۔'' وہ ذومعنی انداز میں بولا۔

''اوکے......'' میں نے اس کے پاپا کی خواہش کے سامنے ہتھیار پھینکتے ہوئے کہا۔ ''میں ریڈی ہوں۔ تم آجاؤ۔''

''دیٹس گڈ۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''عظیم! میرے کام کا کیا ہوا؟''

''کون سا کام؟'' الٹا اس نے مجھ سے سوال کیا۔

''ارے یار! میں نزاکت علی اور سہیل والے معاملے کی بات کر رہا ہوں۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔ ''کیا تمہاری ان دونوں میں سے کسی سے بات ہوئی؟''

''ہاں، بات ہوئی ہے۔'' وہ سرسری لہجے میں بولا۔

''پھر......'' میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا پتا چلا سلمٰی صاحبہ کے بارے میں؟''

''فون پر کیا بتاؤں یار۔'' وہ ٹالنے والے انداز میں بولا۔ ''تھوڑی دیر میں ہم مل رہے ہیں پھر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔''

میں نے ضد کرنا مناسب نہیں سمجھا اور کہا۔ ''اوکے!''

میں اگلے پندرہ بیس منٹ میں فریش ہو کر ہوٹل کے ریسیپشن پر پہنچ چکا تھا۔ چیک آؤٹ ہونے کے پروسس میں دس منٹ لگے ہوں گے۔ ایک خاص اماؤنٹ کاٹ کر باقی کی رقم مجھے واپس کر دی گئی۔ اس ہوٹل میں میری تین دن کی بکنگ تھی لیکن سوئے اتفاق کہ میں نے وہاں صرف ایک روز قیام کیا تھا۔ میں اس تمام تر کارروائی سے فارغ ہو کر لابی میں آبیٹھا اور عظیم کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد عظیم میرے پاس پہنچ گیا۔ آئندہ چند منٹ کے بعد میں گاڑی میں بیٹھا اس کے گھر کی جانب رواں دواں تھا۔ خلافِ معمول عظیم مجھے خاصا چپ چپ لگا۔ میں نے پوچھا۔

''عظیم! تمہارے ساتھ کوئی پرابلم ہے کیا؟''

''نہیں تو۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''تم ایسا کیوں سوچ رہے ہو؟''

''آج تم کافی خاموش دکھائی دیتے ہو......''

''شاید یہ روزے کے اثرات ہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''تمہیں تو پتا ہی ہے، میں اسموکنگ کرتا ہوں۔ تمباکو نوشی کرنے والوں کو روزہ ذرا سست کر دیتا ہے۔''

''ہاں...... ایسا ہوتا ہے۔'' میں نے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا تمہاری اپنے دوست سہیل سے بات ہو گئی ہے؟''

''ہاں، اس سے میرا رابطہ ہو گیا ہے۔'' اس نے

اثبات میں جواب دیا۔

"پھر...... اس نے نزاکت شاہ کے بارے میں کیا بتایا ہے؟" میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

"نزاکت شاہ اس وقت کراچی میں نہیں ہے۔" عظیم نے جواب دیا۔

"اوہ......!" میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ "وہ کہاں گیا ہے اور اس کی واپسی کب تک ہوگی؟"

"اس کی واپسی کی فی الحال کوئی امید نہیں ہے۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ "اس نے سلمٰی صاحبہ والی ملازمت چھوڑ دی ہے اور "یو اے ای" چلا گیا ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ وہ وہاں راس الخیمہ میں کوئی جاب کر رہا ہے اسی لیے اس کا یہ نمبر کوئی رسپانڈ نہیں کر رہا تھا۔"

"اسے بھی ابھی راس الخیمہ جانا تھا......!" میں نے تلملاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ٹینشن نہیں لو برو......" عظیم ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"ٹینشن کیسے نہیں لوں یار۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "سلمٰی صاحبہ تک پہنچنے کا ایک دروازہ کھلا ملا تھا اور وہ بھی بند ہوگیا۔"

"تمہیں کس نے کہہ دیا کہ منزل تک پہنچنے کا صرف ایک ہی راستہ، ایک ہی دروازہ ہوتا ہے۔" وہ عجیب سے لہجے میں مستفسر ہوا۔ "کیا تمہاری سائیکالوجی نے یہ اصول بیان کیا ہے؟"

"نہیں!" میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے قطعی لہجے میں کہا۔ "کسی بھی منزل تک پہنچنے کے لیے ایک سے زیادہ راستے، ایک سے زیادہ دروازے ہو سکتے ہیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"ویری سمپل۔" وہ چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔ "اگر سلمٰی صاحبہ تک رسائی کا ایک دروازہ بند ہوگیا ہے تو سمجھو، دوسرا دروازہ کھل گیا ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ کہ نزاکت شاہ سلمٰی صاحبہ کے ہاں ملازمت کرتا تھا۔ وہ تمہیں سلمٰی صاحبہ سے ملوا سکتا تھا لیکن وہ ملازمت چھوڑ کر راس الخیمہ چلا گیا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "لہٰذا نزاکت شاہ ہمارے کام کا نہیں رہا۔ اب یہی کام سہیل کرے گا اور......"

"کیا سہیل بھی سلمٰی صاحبہ کو جانتا ہے؟" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے سوال داغ دیا۔

"ہاں بالکل۔ سہیل، سلمٰی صاحبہ کو بہت اچھی طرح جانتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "وہ شام کو میرے گھر آئے گا۔ پھر ہم دونوں اس کے ساتھ سلمٰی صاحبہ کی طرف چلیں گے۔ یوں سمجھو کہ آج کی تاریخ میں سلمٰی صاحبہ سے تمہاری ملاقات لازمی ہوجائے گی۔"

"ویری گڈ۔" میں نے خوشی سے معمور لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ "سہیل شام میں کتنے بجے تمہارے گھر آئے گا؟"

"افطار کے بعد۔" عظیم نے بتایا۔

میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ "اوکے برو!"

مالک مجھ پر آج خاصا مہربان تھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ آج میں اپنی ماں سے ضرور ملاقات کروں گا۔ حالات وواقعات اس ملاقات کی نوید سنا رہے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے پَر نکل آئے ہوں۔ دل میں بڑی شدت سے یہ خواہش کروٹیں لے رہی تھی کہ میں چشم زدن میں اڑ کر اپنی ماں کے پاس پہنچ جاؤں اور اس کے ماتا بھرے سینے سے لگ کر برسوں کی جدائی کے داغ کو دھو ڈالوں۔

ہم باتیں کرتے ہوئے عظیم کے گھر پہنچ گئے۔

عظیم کے پاپا حفیظ کپور نے بڑے تپاک سے میرا استقبال کیا۔ مجھے دیکھتے ہی ان کے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ "آؤ میری جان" کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور بڑے پُرجوش انداز میں مجھ سے معانقہ کیا۔

میں نے بھی محبت کا جواب محبت سے دیا۔ اس وقت ڈرائنگ روم میں حفیظ کپور کے علاوہ چند اور افراد بھی موجود تھے۔ میں نے باری باری ان سب سے مصافحہ کیا اور ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

حفیظ کپور نے عظیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! تم نکل جاؤ اور چاہے جتنی بھی دیر لگے، کام کرکے ہی آنا ہے۔"

"جی پاپا۔" عظیم نے فرماں برداری سے کہا پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اسد! تم پاپا سے گپ شپ کرو۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔"

"اتنی فکر نہ کروا پنے دوست کی۔" حفیظ کپور نے عظیم

سے کہا۔ ''میں بوڑھا ہوگیا ہوں تو کیا ہوا۔ ابھی میرا دل جوان ہے۔ میں تمہارے دوست کو بور نہیں ہونے دوں گا۔''

عظیم کچھ بولے بغیر ڈرائنگ روم سے رخصت ہوگیا۔ میں نے یہ بات کل رات کو بھی محسوس کی تھی اور آج بھی مجھے یہ لگا تھا کہ بڑے کپور صاحب کا اپنے بڑے بیٹے یعنی عظیم کپور کے ساتھ رویّہ خاصا خشک تھا۔ کل دن بھر کے ساتھ میں عظیم بھی مجھے اپنے باپ سے خاصا شاکی اور خفا نظر آیا تھا۔ بہرحال، میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ باپ اور بیٹے کے مابین اس تناؤ کی تہ تک رسائی حاصل کروں گا اور اسے ختم کرنے کی اپنی سی کوشش ضرور کروں گا۔

حفیظ کپور نے وہاں موجود تمام افراد کو مجھ سے متعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''یہ اسد علی ہیں۔ امریکا سے آئے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اسد، عظیم کے دوست ہیں۔''

حفیظ کے آخری جملے پر ان سب لوگوں نے دلچسپ نگاہوں سے میری طرف دیکھا مگر کسی نے کوئی ایسا ویسا تبصرہ نہیں کیا۔ کنگ سائز مونچھوں والے ایک شخص نے صرف اتنا کہا۔

''عظیم صاحب بھی تو امریکا سے ہو کر آئے ہیں۔ ادھر ہی ان سے دوستی ہوئی ہوگی۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں انکل! ہماری دوستی ادھر کراچی میں ہوئی ہے اور وہ بھی ایک دن پہلے۔'' پھر میں نے حفیظ کپور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سر! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ آپ نے ادھورا تعارف کرایا ہے۔ اپنے دوستوں کے بارے میں مجھے بھی تو کچھ بتائیں......''

''بس، سمجھ لو کہ یہ سب میرے دوست ہیں۔ میرے خیرخواہ اور میرے جاں نثار۔'' حفیظ کپور نے فخریہ لہجے میں کہا پھر اپنے دوستوں کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''اب تم لوگ خود اپنے بارے میں اسد صاحب کو بتاؤ۔''

وہ سب حفیظ کپور کے حکم کی تعمیل میں لگ گئے۔ دراصل کپور نے کوئی حکم نہیں دیا تھا لیکن ان کی شخصیت بہت دبنگ تھی۔ ان کے منہ سے نکلا ہوا ایک عام سا جملہ بھی بڑے رعب داب والا محسوس ہوتا تھا اور پہلی ہی نظر میں، میں نے واضح اندازہ لگالیا تھا کہ وہ سب لوگ حفیظ کپور سے بہت متاثر تھے۔

اگلے دو منٹ میں ان سب کا تعارف مجھ تک پہنچ گیا۔ بھاری مونچھوں والے جس شخص نے عظیم کے امریکا جانے کی بات کی تھی اس کا نام شاکر علی تھا۔ شاکر علی محکمہ انکم ٹیکس کا ریٹائرڈ افسر تھا۔ باقی دو افراد... پرویز بیگ اور چودھری سہیل اشرف کا تعلق بھی انکم ٹیکس کے محکمے ہی سے تھا اور وہ حاضر ڈیوٹی تھے۔ واحد علی نامی ایک دراز قامت شخص ایف آئی اے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں مقناطیسی کشش پائی جاتی تھی۔ ندیم صاحب ایئرکنڈیشنرز کا کام کرتے تھے۔ ان کے چہرے کے تاثرات سے لگتا تھا جیسے وہ کسی غیر مرئی قوت کے زیرِ اثر ہوں۔ ایک عجیب سی اداسی تھی ان کی آنکھوں میں۔ باسط علی صاحب پرنٹنگ کا کام کرتے تھے اور ذوالفقار شیخ صاحب کا تعلق ہائی کورٹ سے تھا۔ شیخ صاحب سے میں غائبانہ طور پر متعارف تھا۔ گزشتہ روز عظیم کی ''زخمی'' وٹز کو شیخ صاحب کے بھیجے ہوئے بندوں ہی نے نثار شہید پارک سے موٹر مکینک تک پہنچایا تھا۔ عظیم نے فون پر شیخ صاحب کو بھی وہی ڈاکوؤں والی جھوٹی کہانی سنائی تھی۔ بعدازاں میں نے اس حرکت پر عظیم کو سرزنش بھی کی تھی۔

شیخ صاحب نے گہری نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''آپ اس وقت عظیم کے ساتھ ہی تھے جب ڈاکوؤں نے آپ کی گاڑی پر فائرنگ کی تھی؟''

''جی انکل!'' میں نے مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

''سائیں! اللہ پاک کا بڑا کرم ہے کہ بچوں کی جان سلامت رہی۔'' شیخ صاحب نے حفیظ کپور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''گاڑی کا کیا ہے، وہ تو اب تک مرمت بھی ہوچکی ہوگی۔''

''اللہ کا مجھ پر بڑا کرم ہے۔'' حفیظ کپور نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔

''بھائی! آپ بڑے فیاض انسان ہیں۔'' شاکر علی نے کہا۔ ''آپ کے ہاتھ سے صدقہ خیرات کا عمل ہر وقت جاری رہتا ہے۔ ہاتھ سے دیا ہوا کہیں نہ کہیں ضرور انسان کی ڈھال بنتا ہے۔''

''میں تو بہت گناہ گار انسان ہوں۔'' حفیظ کپور دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ''میری کیا مجال کہ میں نیکی کا دعویٰ کروں۔ یہ سب کام تو مجھ سے میرا رب کراتا ہے۔''

''بھائی! آپ مانیں یا نہ مانیں۔'' واحد علی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ نے لوگوں کو حرم دکھانے کا جو کام شروع کررکھا ہے نا، اس سے بڑی کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ آپ ہر سال درجنوں افراد کو اپنے خرچے پر حج اور عمرے پر روانہ کرتے ہیں۔''

''سب رب کے حکم سے ہوتا ہے۔'' حفیظ کپور نے کہا۔ ''اس کی مرضی، وہ جس کو نیکی کی توفیق دے اور جسے محروم رکھے۔'' پھر وہ پرویز بیگ اور سہیل اشرف کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''آپ دونوں سے بے حد معذرت کہ میں رمضان کے مہینے میں آپ لوگوں کو عمرے پر نہیں بھیج سکوں گا اور آپ اس کا سبب بھی سمجھتے ہیں لیکن عید کے بعد پکا ہے۔ آپ دونوں اپنے پاسپورٹ میرے پاس جمع کرادیں۔''

''جی بھائی۔ ہم آپ کے حالات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔'' سہیل اشرف نے کہا۔ ''آپ کو جیسے آسانی ہو، ہم خوش ہیں اور ہر وقت آپ کے مسائل کے خاتمے کے لیے دعا گو بھی ہیں۔''

''آپ دوستوں کی دعاؤں کے سہارے ہی تو میں چل رہا ہوں۔'' حفیظ کپور نے کہا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''عظیم بتا رہا تھا کہ آپ نے آج روزہ رکھا ہے؟''

''جی انکل! میں روزے سے ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''بیٹا جی! آپ نے میرا ایک کام کرنا ہے۔'' وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ''میں زندگی بھر آپ کا یہ احسان یاد رکھوں گا۔''

اس باہمی گفتگو سے مجھے یہ تو اندازہ ہوگیا تھا کہ کپور صاحب ان دنوں کسی مشکل میں پھنسے ہوئے تھے لیکن میں ان کی مشکل کی نوعیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''انکل! آپ حکم کریں۔ جو میرے بس میں ہوگا، میں آپ کے لیے ضرور کروں گا۔ آپ میرے دوست کے والد ہیں اور میرے لیے بہت محترم ہیں۔''

''اس وقت میں نہ تو آپ کے دوست کا والد ہوں اور نہ ہی آپ کے لیے کوئی محترم شخصیت۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''ہم دونوں بیوپاری ہیں۔ ہم ایک سودا کر لیتے ہیں۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں انکل......!'' میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں سمجھاتا ہوں۔'' وہ اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں جانتا ہوں، کوئی روزہ دار افطار کے وقت خلوصِ نیت سے جو بھی دعا کرے، رب اسے ضرور قبول کرتا ہے۔''

''ہاں، یہ تو میں نے بھی سنا ہے۔'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''بس تو آج افطار کے وقت تم خلوصِ دل سے صرف اور صرف میرے لیے دعا کرو گے کہ اللہ میری آزمائش کو ختم کر کے مجھے دوبارہ سرسبز و شاداب کر دے۔'' وہ ملتجیانہ انداز میں بولا۔

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے لیے ضرور یہ دعا کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''اس کے بدلے میں، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ آج کی تاریخ میں، میں آپ کو ایک ایسی ہستی سے ملواؤں گا جس کی تلاش میں تم امریکا سے یہاں تک آئے ہو۔'' حفیظ کپور نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو...... کیا...... عظیم نے آپ کو...... سب بتا دیا ہے......؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''سب کچھ نہیں۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بس اتنا ہی کہ تم کسی ہستی کی تلاش میں امریکا سے پاکستان آئے ہو اور وہ ہستی کراچی میں موجود ہے۔ میں نے ابھی عظیم کو اسی ہستی کا سراغ لگانے کے لیے بھیجا ہے اور مجھے امید ہے...... بلکہ یقین ہے کہ عظیم یہ کام ضرور کرلے گا۔ یہ پاگل شخص جس بھی کام میں ہاتھ ڈالتا ہے، سرخرو ہو کر ہی چین سے بیٹھتا ہے اور...... تم تو اس کے دوست ہو!''

حفیظ کپور کی باتوں نے میرا منوں خون بڑھا دیا۔ یہ مجھ پر مالک کی خاص مہربانی تھی کہ اس نے کراچی میں مجھے اس فیملی سے ملوا دیا تھا۔ اس کے بعد میرا ہر کام لائن اپ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے ذہن کی الجھن کو دور کرنے کی غرض سے پوچھ لیا۔

''انکل! میں نے آپ کے کہنے پر ہوٹل سے چیک آؤٹ کیا۔ عظیم بتا رہا تھا کہ آپ نے میرے لیے رہائش کا کوئی انتظام کر دیا ہے۔ یہ کیا اسٹوری ہے؟''

''اسٹوری کوئی نہیں ہے بیٹا جی۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''عظیم کی بیوی آج کل دو بیٹیوں کے ساتھ امریکا گئی ہوئی ہے، ہمارے گھر کا اوپر کا پورشن خالی پڑا ہے۔ تم ایک ماہ تک تو بہ آسانی یہاں قیام کر سکتے ہو۔ ویسے مجھے امید ہے، اس کی نوبت نہیں آئے گی......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے یقین ہے کہ اس ہستی سے ملاقات کے بعد تو تم اس کے پاس ہی رہنا پسند کرو گے......!''

''جی ضرور!'' میں نے پُراعتماد انداز میں کہا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ’’ان شاء اللہ!‘‘

’’بھائی ہمیں اجازت دیں۔‘‘ پرویز بیگ اور سہیل اشرف اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ’’آج پہلا روزہ ہے۔ افطاری کے بندوبست کے لیے جلدی گھر جانا ہوگا۔‘‘

’’یار چودھری!‘‘ اس نے سہیل اشرف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’پرویز بیگ تو جورو کا غلام ہے اور یہ بات سمجھ میں بھی آتی ہے کیونکہ اس کی بیوی عمر میں اس سے بیس سال چھوٹی ہے لیکن تمہاری پھرتیاں سمجھ سے بالاتر ہیں۔ تم لوگ تو اب بونس کی زندگی گزار رہے ہو پھر بھی گھر جانے کی اتنی جلدی؟‘‘

جواب میں چودھری سہیل اشرف معنی خیز انداز میں مسکرا کر رہ گیا۔

حفیظ کپور نے واحد علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’آپ بے چین کبوتر کی طرح بار بار پہلو کیوں بدل رہے ہیں۔ جانا ہے تو آپ بھی نکلیں۔ آپ تو بیگ سے بھی زیادہ ایفی شیٹ ہیں۔ آپ کو تو اپنے گھر کے علاوہ اپنی سالی کے گھر کے مسائل بھی حل کرنا ہوتے ہیں......!‘‘

’’بھائی! آپ بڑے ہیں۔ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔‘‘ واحد علی جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ’’رات بھر ائرپورٹ پر ڈیوٹی کی ہے اور آئندہ رات بھی ڈیوٹی ہے۔ گھر جا کر تھوڑی سی نیند لینا چاہتا ہوں...... اگر آپ کی اجازت ہو تو!‘‘

’’اجازت ہے۔‘‘ حفیظ کپور نے فراخ دلی سے کہا۔ ’’لیکن یہ بات ذہن میں رکھو کہ مجھے کبھی بڑا نہیں کہنا کیونکہ عمر میں آپ مجھ سے دو چار سال بڑے ہی ہوں گے۔‘‘

’’بھائی! آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔‘‘ واحد علی خفت آمیز لہجے میں بولا۔ ’’آپ ہی بڑے ہیں۔ عمر میں بھی، تجربے میں بھی اور مرتبے میں بھی۔‘‘

پرویز بیگ، چودھری سہیل اشرف اور واحد علی رخصت ہوئے تو حفیظ کپور نے باسط علی سے پوچھا۔ ’’کتابوں کا کام کہاں تک پہنچا؟‘‘

’’بھائی! حج اور زیارتوں والی دونوں کتابیں تو پرنٹنگ میں جانے کے لیے تیار ہیں۔‘‘ باسط علی نے جواب دیا۔ ’’عمرے والی کتاب کی فائنل پروف ریڈنگ ہو رہی ہے۔ آپ سمجھیں، ہفتہ دس دن میں تمام کام مکمل ہو جائے گا۔‘‘

’’میں تمہیں پورا رمضان کا مہینا دیتا ہوں۔‘‘ حفیظ کپور نے کہا۔ ’’عید سے پہلے مجھے تینوں کتابیں ریڈی چاہئیں لیکن ایک بات کا خاص طور پر خیال رکھنا کہ کوئی غلطی نہ چلی جائے۔ یہ دین کا معاملہ ہے۔ اس میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔‘‘

’’جی بھائی! آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔‘‘ باسط علی نے کہا۔ ’’میں احتیاطاً ایک ریڈنگ عالم دین سے بھی کروا رہا ہوں تاکہ قرآنی آیات میں زبر، زیر، پیش کی غلطی کا بھی احتمال نہ رہے۔‘‘

’’شاباش!‘‘ حفیظ کپور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’اس نیک کام کا اجر تمہیں اللہ دے گا۔‘‘

’’جی بھائی...... ان شاء اللہ۔‘‘ باسط علی نے کہا۔

’’کہیں یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہیں سوکھے اجر پر ٹرخا رہا ہوں۔‘‘ حفیظ کپور نے مذاق کے انداز میں کہا۔ ’’تمہارا پورا بل بھی کلیئر کروں گا۔ تم فوری طور پر پیسوں کی ضرورت تو محسوس نہیں کر رہے؟‘‘

’’نہیں بھائی! اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔‘‘ باسط نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ’’جب ضرورت ہوگی تو بتا دوں گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ بہت مہربانی۔‘‘ حفیظ کپور نے کہا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ’’حج اور عمرے پر جانے والوں کے لیے میں پاکٹ سائز کتابیں بھی چھپواتا ہوں جن کے اندر ہر بات آسان الفاظ میں پوری تفصیل کے ساتھ درج ہوتی ہے۔ اس کتاب کی مدد سے اللہ کے گھر اور اس کے رسول ﷺ کے روضے پر جانے والوں کو بہت آسانی ہو جاتی ہے۔‘‘

’’ویری گڈ!‘‘ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ’’انکل! آپ کے اس نیک کام نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔‘‘

’’جیتے رہو بیٹا جی۔‘‘ وہ دعائیہ انداز میں بولا۔ ’’یہ تو کچھ نہیں ہے۔ میں نے ماضی میں جس شان بان سے یہ کام کیا ہے اس کا ذکر سن کر تم حیران رہ جاؤ گے۔ ایک ایک بیج میں، میں نے سو سو، ڈیڑھ ڈیڑھ سو افراد کو عمرے پر بھیجا ہے۔ اب ٹوٹ کر رہ گیا ہوں......‘‘

آخری جملہ اس نے دل شکستگی کے انداز میں ادا کیا تھا۔ شاکر علی نے کہا۔

’’بھائی! وقت کبھی ایک جیسا نہیں رہتا۔ آج آپ کے حالات اچھے نہیں ہیں تو کیا ہوا۔ کل بہت اچھا وقت آئے گا۔ آپ دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑے ہو جائیں گے۔ آپ نے سیکڑوں، ہزاروں لوگوں پر احسانات کیے ہیں۔ کسی کی دعا تو لگے گی......!‘‘

’’بالکل صحیح بات ہے۔‘‘ ندیم اے سی والے نے شاکر علی کی تائید میں بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ’’ہم

تو دن رات آپ کے لیے دعا کرتے ہیں......'' اس کا لہجہ گلوگیر ہوگیا۔ ''مجھے یقین ہے، اللہ بہت جلد آپ کو بہت اوپر لے جائے گا۔''

''اوئے! یہ تم میرے لیے کس قسم کی دعا کرتے ہو۔'' حفیظ کپور نے تفریح لینے والے انداز میں کہا۔ ''میرا ابھی اوپر جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ قدرت نے ابھی مجھ سے بہت سارے کام لینا ہیں۔ میرا مشن ابھی پورا نہیں ہوا۔''

''اللہ آپ کی عمر دراز کرے بھائی۔'' ندیم نے ندامت آمیز لہجے میں کہا۔ ''میرا وہ مطلب نہیں تھا جو آپ نے سمجھا۔''

''ارے یار! میں تو مذاق کر رہا تھا۔'' حفیظ کپور نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ سب دوستوں کے خلوص اور دعاؤں کے سہارے تو میں چل رہا ہوں۔''

''اللہ آپ کی مشکل آسان کرے بھائی۔'' ندیم نے کہا۔

''آمین......!'' حفیظ کپور نے کہا۔ ''اور اللہ کرے کہ تم بھی میرے اے سی کی مشکل آسان کردو۔''

''آپ کے اے سی کو کیا ہوا بھائی؟''

''آواز دے رہا ہے۔'' حفیظ کپور نے بتایا۔ ''دن میں تو زیادہ محسوس نہیں ہوتا لیکن رات کے سناٹے میں اس کی 'گھوں گھوں' سے نیند ڈسٹرب ہوتی ہے۔''

حفیظ کپور کو میں نے ایک خوش مزاج اور بذلہ سنج انسان پایا تھا۔ وہ ہر بات میں تفریح کا پہلو نکال لیتا تھا۔ انسان کو ایسا ہی زندہ دل اور بے پروا ہونا چاہیے ورنہ زندگی کے مسائل کسی دیمک کی طرح انسان کو چاٹ جاتے ہیں۔ ایک بے پروا قہقہہ سو بیماریوں کو پرے بھگاتا ہے۔ انسان کی بے ساختہ مسکراہٹ اور قہقہہ اثر پذیری میں ہر اینٹی بائیوٹک کو مات دے دیتا ہے۔

''بھائی! میں نے بتایا تھا نا، آؤٹر کا مسئلہ ہے۔'' ندیم نے کہا۔

''مجھے بتانے کا کیا فائدہ ہے اللہ کے ولی۔'' حفیظ کپور نے کہا۔ ''اے سی کے ڈاکٹر تم ہو یا میں؟ آؤٹر، انر جس بھی یونٹ کا فالٹ ہے اسے ٹھیک کرو۔ اگر ٹھیک نہیں ہوسکتا تو آؤٹر کو تبدیل کردو مگر جو بھی کرنا، اپنی جیب سے کرنا۔ تمہارے بہت سے بلز میرے پاس پہلے ہی پڑے ہوئے ہیں۔''

''بھائی! آپ پیسوں کی فکر نہ کریں۔ میرے پاس جو کچھ ہے یہ سب آپ ہی کا دیا ہوا ہے۔'' ندیم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں کل دن میں آپ کا آؤٹر تبدیل کروا دیتا ہوں۔''

''بڑی مہربانی آپ کی۔'' حفیظ کپور نے ممنونیت بھرے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''وہ تمہاری بیٹی کا کیا حال ہے؟''

''گھر میں بیٹھی ہوئی ہے۔'' ندیم نے دکھی لہجے میں بتایا۔

''میاں لینے نہیں آیا؟''

''اس طرف تو مکمل خاموشی ہے بھائی۔''

''بیٹی کیا کہتی ہے؟''

''وہ تو کسی بھی قیمت پر سسرال جانے کو تیار نہیں۔'' ندیم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میری بیوی اور والدہ بھی اسی حق میں ہیں کہ ہم خلع کے لیے کورٹ چلے جائیں۔''

''خلع تو اس مسئلے کا آخری حل ہے ہی لیکن بیٹیوں کے معاملے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔'' حفیظ کپور نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہارے جیسی سچویشن میرے ساتھ بھی ہے۔ ہما کا معاملہ تمہارے سامنے ہے۔''

''جی بھائی! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' ندیم تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی بات میری سمجھ میں تو آرہی ہے لیکن میری بیٹی، بیوی اور والدہ سمجھنے کو تیار نہیں ہیں۔''

''اگر عورتوں کو اپنا راہ نما بنا کر چلو گے تو سراسر نقصان ہی اٹھاؤ گے۔ کیوں شیخ صاحب؟''

آخری جملہ اس نے ذوالفقار شیخ کی جانب دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ شیخ صاحب نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ان کا مخاطب ندیم تھا۔

''سائیں بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ لڑکے کو سمجھاؤ...... مصالحت کی کوئی راہ نکالو۔ کورٹ میں جانا بہت آسان کام ہے لیکن کوشش کرو، بیٹی کا گھر برباد نہ ہو۔''

''شیخ صاحب! میں نے تو ہر طرح سے کوشش کر کے دیکھ لی ہے۔'' ندیم روہانسا ہوگیا۔ ''لیکن ایک سال میں میری بیٹی کے ساتھ سسرال میں جتنے ظلم وستم ہو چکے ہیں، اس کے بعد وہ اس گھر میں قدم رکھنے کو تیار نہیں۔ میں نے اپنے داماد کو بھی بہت سمجھایا ہے کہ الگ گھر لے کر رہنا شروع کردے مگر سب میری بیٹی ہی کو قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ کوئی اپنی غلطی ماننے کو تیار نہیں۔''

''ندیم صاحب! آپ نے اپنے داماد کو پیار سے سمجھایا ہے اور آپ کا پیار اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔''

شاکر علی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''میری مجبوری یہ ہے کہ آج کل ہمارے لیے ہر معاملے میں خاموشی اور لاتعلقی اختیار کرنے کے احکامات ہیں ورنہ ہمارے پاس سمجھانے کے بہت سے طریقے ہیں۔ وہ آپ کا داماد سالا سر کے بل چل کر آتا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر منت خوشامد کر کے آپ کی بیٹی کو لے جاتا۔''

''بھائی! مجھے کسی جھگڑے پھڈے میں نہیں پڑنا۔'' ندیم نے حفیظ کپور کی طرف دیکھتے ہوئے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

''تم خاموش ہو کر اپنے گھر میں بیٹھ جاؤ اور گھر کی عورتوں کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دو۔'' حفیظ کپور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بیوی اور اماں زیادہ تنگ کریں تو ان کی تسلی کے لیے کہہ دو کہ مختلف وکیلوں سے تمہارا اصلاح مشورہ چل رہا ہے۔ ان شاء اللہ! بہت جلد عدالت میں خلع کے لیے کیس دائر کر دیا جائے گا۔''

ادھر حفیظ کپور کی بات ختم ہوئی ادھر اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں......!''

چند سیکنڈ اس نے دوسری طرف کی بات سنی پھر کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ جتنا بھی وقت لگے، پروا نہیں ہے۔ آج تم نے یہ کام نمٹا کر ہی آنا ہے بیٹا......''

اس نے فون کو ہاتھ سے چھوڑا تو میں نے کہا۔ ''کیا عظیم کا فون تھا انکل؟''

''ہاں بیٹا۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''میں نے اسے ایک پارٹی کے پاس پے منٹ کے لیے بھیجا تھا۔ اس نے خوش خبری سنائی ہے کہ کام ہو جائے گا مگر تھوڑی دیر لگے گی۔''

''سائیں! عظیم بہت قابل بچہ ہے۔'' شیخ صاحب نے کہا۔ ''میں آپ کو سچ بتا رہا ہوں۔ یہ بہت ترقی کرے گا۔''

''وہ عینک تھوڑی دیر کے لیے مجھے بھی عنایت کر دیں شیخ صاحب جس کو آنکھوں پر لگانے کے بعد آپ کو عظیم کے اندر مخفی جوہر نظر آنے لگتے ہیں۔'' حفیظ کپور نے کہا۔ ''وہ میری اولاد ہے۔ میری نگاہ کے سامنے وہ پل بڑھ کر چونتیس سال کا ہوا ہے۔ شادی شدہ ہے۔ دس گیارہ سال سے ازدواجی زندگی گزار رہا ہے۔ چار بچوں کا باپ ہے مگر آج تک مجھے تو اس میں کوئی گن نظر نہیں آیا۔ اب تک تو اسے اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر ایک کامیاب بزنس مین بن جانا چاہیے تھا مگر اسے تو شراب پی کر غل غپاڑا کرنے اور باپ کو اپنا دشمن سمجھنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔''

''ایسی بات نہیں ہے سائیں۔'' شیخ صاحب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں آپ کو بالکل سچ بتا رہا ہوں۔ عظیم آپ کی بہت عزت کرتا ہے۔''

''انکل! میں نے بھی یہی محسوس کیا ہے کہ عظیم دل کا بہت اچھا ہے۔'' میں نے حفیظ کپور کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی راست رائے دی۔

''واہ وا...... بڑے میاں تو بڑے میاں، چھوٹے میاں سبحان اللہ!'' حفیظ کپور نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا جی! آپ امریکا سے ایسی کون سی دوربین اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں جس کی مدد سے ایک ہی دن میں آپ نے عظیم کے خفیہ ٹیلنٹ کو دیکھ لیا...... خیر، آپ تو حقِ دوستی نبھا رہے ہیں۔''

''حقِ دوستی اپنی جگہ اور آوازِ حق اپنی جگہ۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔

حفیظ کپور نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔ ''آپ کا مطلب کیا ہے بیٹا؟''

''انکل! آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ عظیم اندر سے کھرا اور صاف انسان ہے۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹا جی! میں آپ کی بات مان لیتا ہوں۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''اور اپنے رب سے دعا کرتا ہوں کہ وہ عظیم کو بالکل ویسا ہی بنا دے جیسا آپ اور شیخ صاحب اسے سمجھتے ہیں۔''

''آمین......!'' میں نے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد شاکر علی اور ندیم صاحب بھی وہاں سے رخصت ہو گئے۔ صرف شیخ صاحب رہ گئے۔ حفیظ کپور نے دیوار گیر کلاک کی جانب دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''افطار میں ابھی تین، ساڑھے تین گھنٹے باقی ہیں۔ تم چاہو تو اوپر جا کر تھوڑا آرام کر لو۔''

''انکل! میں بالکل فریش ہوں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''عظیم کی واپسی کب تک متوقع ہے؟''

''ممکن ہے، وہ افطار سے پہلے آ جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے، وہ افطار کے بعد آئے۔'' حفیظ کپور نے کہا۔ ''میں اس من موجی کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں

کر سکتا۔"

"سائیں! آپ اپنے دوست کو فون کر کے معلوم کرلو نا۔" شیخ صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... یہ اچھی ترکیب ہے۔" حفیظ کپور نے کہا۔

"آپ عظیم کو فون کر کے اس کی واپسی کا پروگرام پوچھ لو۔ وہ تمہارا دوست ہے۔ تمہیں سب ٹھیک ٹھیک بتا دے گا۔"

میں نے اپنے سیل فون سے عظیم کا نمبر لگایا۔ دوسری گھنٹی پر اس نے کال ریسیو کرلی۔ میرے "ہیلو" کے جواب میں اس نے پوچھا۔

"اسد! تم بور تو نہیں ہو رہے ہو؟"

"نہیں یار! آپ کے پاپا بہت دلچسپ انسان ہیں۔" میں نے کہا۔ "ان کی محفل میں بوریت قدم نہیں رکھ سکتی۔"

"ہاں ہاں۔ وہ تو مجھے معلوم ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔ "میں تمہارے اور پاپا ہی کے کام سے نکلا ہوا ہوں۔ یہ کام کر کے ہی لوٹوں گا۔"

میں نے پوچھا۔ "افطار تو ایک ساتھ ہی کریں گے نا؟"

"ہاں برو! میں افطار سے پہلے ہی آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ پہلا روزہ ہم ایک ساتھ ہی افطار کریں گے۔"

"او کے۔" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ "کیا تمہارا سہیل سے رابطہ ہوا؟"

"ہاں یار! میں نے سہیل کو لائن اپ کیا ہوا ہے۔" اس نے بتایا۔ "آج شام میں اس سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔"

"گویا میرا کام ہونا صد فیصد ہے؟" میں نے دبے دبے جوش کے ساتھ استفسار کیا۔

وہ تیقن سے بولا۔ "ایک سو دس فیصد!"

"گڈ!" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

رسمی اختتامی کلمات کے بعد میں نے سیلولر رابطہ موقوف کر دیا۔ جب تک میں عظیم سے بات کر رہا تھا اس دوران میں حفیظ کپور یک ٹک میرے چہرے پر نگاہ جمائے بیٹھا تھا۔ عظیم کی زبانی "ایک سو دس فیصد" کے الفاظ سن کر میرا من خوشی سے گل و گلزار ہو گیا تھا۔ انگلش میں "فیس از این انڈیکس آف مائنڈ" کی اصطلاح بہت معروف ہے یعنی چہرہ دل کی کتاب ہوتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ حفیظ کپور نے میرے چہرے سے امڈتی خوشی کو دیکھ لیا تھا۔ میں فون سے فارغ ہوا تو اس نے بڑے کھوجتے ہوئے لہجے میں مجھ سے استفسار کیا۔

"عظیم نے ایک دن میں کیا گھول کر پلا دیا ہے آپ کو......؟" پھر وہ روئے سخن شیخ صاحب کی طرف موڑتے ہوئے بولا۔ "آپ دیکھ رہے ہیں، اسد کے چہرے کی رونق کو۔ یہ ایک ہی دن میں لیلیٰ مجنوں کی جوڑی کا رول پلے کرنے لگے ہیں۔"

"سائیں! میں آپ کو سچ بتا رہا ہوں۔" شیخ صاحب اپنے مخصوص لہجے میں بولے۔ "عظیم کی شخصیت میں ایک جادو ہے۔"

"تو کیا میرے علی کی شخصیت میں آپ کو کچھ دکھائی نہیں دیتا؟" حفیظ کپور نے شاکی انداز میں ذوالفقار کی طرف دیکھا۔

"نہیں سائیں! آپ میری بات کا غلط مطلب نہیں لیں۔" شیخ صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کو بالکل سچ بتا رہا ہوں۔ آپ کے دونوں بیٹے بہت اچھے، بہت فرماں بردار اور بہت لائق ہیں۔ میں علی اور عظیم میں کوئی فرق نہیں کر رہا۔ دونوں کا اپنا اپنا مقام ہے۔ جس طرح ایک ہاتھ کی تمام انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں، ایسے ہی ایک انسان کی تمام اولادیں بھی ایک جیسی نہیں ہوسکتیں۔"

"شیخ صاحب! آپ نے میرے علی کو اپنے ساتھ پراپرٹی کے کام میں لگاتا ہے۔" حفیظ کپور نے کہا۔ "میں نے محسوس کیا ہے کہ رئیل اسٹیٹ کے کام میں علی کا دماغ بہت چلتا ہے اور اسد صاحب......" میری جانب دیکھتے ہوئے اس نے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"آپ اپنے دوست عظیم کو اپنے ساتھ امریکا لے جائیں۔ یہ اللہ کا بندہ وہاں کے کلچر میں زیادہ ترقی کرے گا۔"

"جی انکل! میں آپ کی خواہش کی تکمیل کے لیے ضرور کوشش کروں گا۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "عظیم کے لیے امریکا میں سیٹل ہونا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔"

ذوالفقار شیخ صاحب ہائی کورٹ میں اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے علاوہ پارٹ ٹائم میں پراپرٹی کی خرید و فروخت کا کام بھی کرتے تھے۔

"ہو جائے گا سائیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" شیخ صاحب نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔

اسی وقت عظیم کپور کا چھوٹا بھائی محمد علی کپور ڈرائنگ روم کے دروازے میں دکھائی دیا پھر خراماں خراماں چلتے ہوئے وہ ہمارے پاس آ گیا۔ اس نے سب کو سلام کیا پھر

مجھ سے اور شیخ صاحب سے مصافحہ کرنے کے بعد وہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

محمد علی کے چہرے پر بڑی معصومیت پائی جاتی تھی۔ اسے دیکھ کر دل میں محبت کے جذبات امڈتے تھے۔ اگرچہ وہ بہت زیادہ اوور ویٹ تھا۔ اس کی عمر اور قامت کے لحاظ سے اس کا وزن دوگنا تھا لیکن عظیم الجثہ ہونے کے باوجود بھی وہ بے ڈھنگا اور برا نہیں لگتا تھا۔ اس کے چہرے کی معصومیت اور زبان کی شیریں بیانی اس کے مٹاپے کے سامنے ڈھال بن جاتے تھے۔ اس مختصر سی ملاقات میں، میں نے علی کو انتہائی تمیز دار اور ڈیسنٹ پایا تھا۔

''علی! افطار کے معاملات کو ذرا دیکھ لینا۔'' حفیظ کپور نے کہا۔ ''کوئی کمی نہیں رہنا چاہیے۔''

''جی پاپا! میں نے سب چیک کر لیا ہے۔'' علی نے شائستگی سے جواب دیا۔ ''اکبر سے ہر قسم کا سامان منگوا لیا گیا ہے اور ملازمائیں امی کے ساتھ کچن کے کاموں میں ہاتھ بٹا رہی ہیں۔ افطار سے پہلے سب کچھ تیار ہو جائے گا۔''

''شاباش بیٹا!'' حفیظ کپور نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ''آج پہلا روزہ ہے۔ غزالہ، عروج اور ہما سے بھی کہہ دو کہ آج افطار ادھر ہی کریں۔''

''کہہ دیا ہے پاپا۔'' علی فرماں برداری سے بولا۔ ''غزالہ باجی اور ہما تو آجائیں گی لیکن عروج باجی نے معذرت کر لی ہے۔''

''وہ کیوں؟'' حفیظ کپور نے کہا۔ ''میری بات کراؤ عروج سے!''

''نہیں پاپا! اس کی ضرورت نہیں۔'' علی نے بڑی رسان سے کہا۔ ''عروج باجی اپنی سسرال میں افطار پارٹی پر مدعو ہیں اس لیے یہاں نہیں آسکیں گی۔ ان کی مجبوری جینوئن ہے۔''

''عروج باجی کے چمچے ایک تم ہی تو لگے ہوئے ہو جو اس کی مجبوریوں کا سارا حساب رکھا ہوا ہے تم نے۔'' بڑے کپور نے دوستانہ انداز میں کہا۔

میں نے حفیظ کپور صاحب کے انداز میں ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ ان کے اندر کافی حد تک غرور و تکبر کے جراثیم پائے جاتے تھے۔ وہ خود کو سب سے زیادہ سپر سمجھتے تھے۔ ان کے اسٹائل میں شاہانہ پن تھا اور میں نے آج یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ ان کے ملاقاتی دل و جان سے انہیں ایک بادشاہ تسلیم بھی کرتے تھے۔

''میں نے تمہارے لیے شیخ صاحب سے بات کر لی ہے۔'' بڑے کپور صاحب نے چھوٹے کپور سے کہا۔ ''عید کے بعد یہ اپنا آفس بنا رہے ہیں اور تمہیں اس آفس میں بیٹھنا ہے اس لیے کمر کس لو...... صرف کس ہی نہ لو بلکہ اس کے سائز میں بھی کمی لانے کی کوشش کرو۔''

''جی پاپا! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔'' علی فرماں برداری سے بولا۔

''سائیں! آپ فکر ہی نہ کریں۔ پراپرٹی کے کام میں بڑی بھاگ دوڑ کرنا پڑتی ہے۔'' شیخ صاحب نے کہا۔ ''میں آپ کو سچ بتا رہا ہوں۔ چند ماہ میں آپ علی کو پہچان بھی نہیں پائیں گے۔ میں اسے اتنا بھگاؤں گا کہ چربی پگھلنے پر مجبور ہو جائے گی۔''

''پاپا! وہ بھٹی صاحب کا فون آیا تھا۔'' علی نے کہا۔

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ علی نے موضوعِ گفتگو کو بدلنے کی کوشش کی تھی۔ حفیظ کپور نے جلدی سے پوچھا۔

''کیا کہہ رہے تھے بھٹی صاحب؟''

''وہ آنے کو کہہ رہے تھے۔'' علی نے بتایا۔ ''بول رہے تھے، اگر کوئی سواری مل گئی تو افطار سے پہلے آؤں گا ورنہ تراویح کے بعد آنے کی کوشش کروں گا۔''

''سائیں! آپ کے یہ پیرومرشد مقبول بھٹی صاحب بڑے پیارے انسان ہیں۔'' بڑے کپور صاحب نے شیخ صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سائیں! آپ کے ساتھ ان کا دل لگ گیا ہے۔'' ذوالفقار شیخ نے کہا۔ ''ورنہ یہ تو آسانی سے کسی کے ہاتھ نہیں آتے۔''

''علی! بھٹی صاحب سے میری بات کراؤ۔'' حفیظ کپور نے اپنے بیٹے سے کہا۔

علی نے فوراً باپ کے حکم کی تعمیل کر دی۔

''سائیں! آپ ہمارے پاس آنے کے لیے سواری کے کب سے محتاج ہو گئے۔'' رابطہ ہونے پر بڑے کپور صاحب نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''اگر گھر میں کوئی گاڑی موجود ہوتی تو میں علی کو فوراً آپ کی طرف روانہ کر دیتا لیکن آپ فکر نہ کریں۔ میں کوئی بندوبست کرتا ہوں۔ ایک بات ذہن میں رکھیں کہ افطار آپ نے میرے ساتھ ہی کرنا ہے۔ اگر اپنی روحانی قوت کے بل پر اڑ کر آسکتے ہیں تو بسم اللہ کریں۔ شیخ صاحب بھی ادھر ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔''

شیخ صاحب نے سینے پر ہاتھ رکھ کر حفیظ کپور کی طرف اشارہ کیا۔ کپور صاحب نے دوسری طرف کی بات سنی اور کہا۔

''شیخ صاحب کہہ رہے ہیں کہ اگر آپ کا حکم ہو تو وہ آپ کو لینے آجائیں؟''

دوسری جانب مقبول بھٹی نے کچھ کہا۔ حفیظ کپور نے یہ کہتے ہوئے رابطہ ختم کردیا۔ ''ٹھیک ہے سائیں۔ جو آپ کی خوشی۔''

حفیظ کپور نے فون رکھا تو شیخ صاحب نے پوچھا۔ ''کیا کہہ رہے ہیں بھٹی صاحب؟''

''وہ رکشا پکڑ کر آرہے ہیں۔'' حفیظ کپور نے بتایا۔ ''کہہ رہے ہیں، شیخ صاحب کو زحمت دینا ٹھیک نہیں۔ وہ ادھر ہی بیٹھیں۔ میں تھوڑی دیر میں آرہا ہوں۔''

''اللہ والے ایسے ہی ہوتے ہیں سائیں۔'' ذوالفقار شیخ نے کہا۔ ''اگر یہ ایک اشارہ کریں تو ان کے لیے گاڑیوں کی لائن لگ سکتی ہے۔ بڑے بڑے منسٹرز اور اعلیٰ سرکاری افسران ان کے ارادت مندوں میں شامل ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں شیخ صاحب۔'' بڑے کپور صاحب بڑی سنجیدگی سے بولے۔

''سچا مرشد خدمتِ خلق کرتا ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اور جھوٹا پیر خدمتِ حلق کرتا ہے۔''

''واہ وا...... سبحان اللہ!'' شیخ صاحب توصیفی نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سائیں! آپ نے تو بڑی گہری بات کہہ دی ہے۔ صرف ایک نقطے کا فرق ہے۔ ''خلق اور حلق'' میں۔''

''صرف ایک نقطے ہی کا فرق نہیں بلکہ نقطے کی اونچ نیچ کا معاملہ بھی ہے۔'' حفیظ کپور نے کہا۔ ''وہ ایک شعر بھی ہے نا...... نقطے کی اونچ نیچ نے محرم سے مجرم بنادیا۔''

''سائیں! میں آپ کو سچ بتارہا ہوں۔'' شیخ صاحب نے حفیظ کپور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ اسد صاحب بھی اپنی ہی لائن کے آدمی ہیں۔ انہوں نے ابھی بڑی باریک نقطہ آفریں اور صوفیانہ بات کی ہے۔''

''سبحان اللہ!'' حفیظ کپور نے خلوصِ دل سے کہا۔

پھر ہمارے بیچ مقبول بھٹی سے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ شیخ صاحب اور کپور صاحب کی باہمی بات چیت سے میں جو سمجھ پایا اس کے مطابق، بھٹی صاحب ایک درویش صفت انسان تھے۔ نوجوانی کی عمر تک بھٹی صاحب سننے کی صلاحیت سے محروم تھے اور بولنے میں بھی انہیں خاصی دقت محسوس ہوتی تھی۔ وہ پیدائشی گونگے بہرے نہیں تھے۔ حادثاتی طور پر یہ بیماری ہوئی لیکن اب وہ اس بیماری سے کافی حد تک نکل آئے تھے۔ وہ آلۂ سماعت کی مدد سے سننے

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

جو شخص چھ باتیں اختیار کرلے، اس نے جنت کی طلب اور دوزخ سے بھاگنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔

1۔ جس نے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کی اور اس کی اطاعت اختیار کی۔
2۔ جس نے شیطان کو پہچانا اور اس کی نافرمانی اختیار کی۔
3۔ جس نے حق کو پہچانا اور اسے قبول کیا۔
4۔ جس نے باطل کو پہچانا اور اس سے بچاؤ اختیار کیا۔
5۔ جس نے دنیا کو پہچانا اور اس کو چھوڑ دیا۔
6۔ جس نے آخرت کو پہچانا اور اس کی طلب میں لگ گیا۔

حکمت

حضرت یحییٰ بن معاذ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حکمت آسمان سے قلوب میں اترتی ہے اور ایسے قلب میں نہیں ٹھہرتی جس میں درج ذیل 4 خصلتیں ہوں۔

1۔ دنیا کی محبت۔
2۔ کل کی فکر۔
3۔ مسلمان بھائی سے حسد۔
4۔ شرف وجاہ کی محبت۔

آپ نے فرمایا کہ عقلمند شخص وہ ہے جو تین کام کرے۔

1۔ اس سے پہلے کہ دنیا اسے چھوڑے، وہ دنیا کو چھوڑ دے۔
2۔ قبر میں جانے سے پہلے اس کی تیاری کرلے۔
3۔ اپنے خالق کو ملنے سے پہلے اسے راضی کرلے۔

(مرسلہ: جاوید اختر رانا۔ پاکپتن شریف)

سلام کے فوائد

1۔ رابطے کا ذریعہ۔
2۔ سلامتی اور برکت کی دعا۔
3۔ مسلمان کی شناخت۔
4۔ امن کا درس۔
5۔ غصے میں کمی۔
6۔ باہمی تعلقات میں اضافہ۔
7۔ عاجزی کا اظہار۔
8۔ اخلاق حسنہ کا تحفہ۔
9۔ نیکیاں کمانے کا ذریعہ۔

(مرسلہ: راحیلہ شفیق۔ سندھی ہوٹل، نیو کراچی)

کے قابل ہوگئے تھے اور بڑی حد تک صاف بولنے بھی لگے تھے۔ وہ کراچی کے ایک علاقے میں رہائش پذیر تھے۔ وہ کسی سرکاری محکمے میں اعلیٰ عہدے پر فائز بھی تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ بھٹی صاحب کے پاس موکلات ہیں جن کی مدد سے وہ کام لیتے ہیں۔ حقیقت کیا تھی یہ تو مالک ہی جانتا تھا۔

علی نے شیخ صاحب سے پوچھا۔ ''انکل! وٹز کا کیا ہوا؟''

''آج کسی وقت گیراج والا گاڑی آپ کے گھر بھجوادے گا۔'' شیخ صاحب نے جواب دیا پھر حفیظ کپور نے حسرت بھرے لہجے میں بتایا کبھی ان کے پاس تین تین گاڑیاں تھیں مگر اب نہیں ہیں۔

''انکل! آپ کے پاس ٹویوٹا کرولا بھی تو ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ سیاہ گاڑی جس میں عظیم گیا ہے۔''

''جان جی! سیاہ ٹویوٹا کرولا میرے پاس نہیں، عظیم کے پاس ہے۔'' حفیظ کپور کے لہجے میں تلخی گھلی ہوئی تھی۔

''آپ کے پاس ہو یا عظیم کے پاس، ایک ہی تو بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''ایک بات نہیں ہے بیٹا جی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ ''یہ گاڑی مہرالنسا کی ماں نے اسے دلائی ہے اس لیے زیادہ تر اسی کے استعمال میں رہتی ہے وہ بچوں کو اسکول میں پک اینڈ ڈراپ دیتی ہے اور سیر سپاٹے کرتی ہے۔ آج کل وہ امریکا فتح کرنے گئی ہے تو عظیم اس گاڑی کو استعمال کررہا ہے۔ میں اور علی بھی اس گاڑی میں نہیں بیٹھے۔''

میں نے محسوس کیا تھا کہ کپور صاحب کو عظیم سے کم اور اس کی بیوی سے زیادہ مسئلہ تھا۔ لہٰذا میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

شیخ صاحب نے کہا۔ ''ایک چھوٹی موٹی گاڑی ہوجائے۔''

''ایک گاڑی کی فوری ضرورت تو بہرحال ہے۔'' حفیظ کپور نے کہا۔ ''لیکن یہ کام پیسوں کے بغیر نہیں ہوسکتا اور پیسے فی الحال میرے پاس ہیں نہیں۔''

''پیسوں کو چھوڑیں سائیں۔ سب ہوجائے گا۔'' شیخ صاحب نے بڑی محبت سے کہا۔ ''کار ڈیلر اپنا یار ہے۔''

''شیخ صاحب! آپ کے کار ڈیلر دوست کے پاس کیا چوری کی گاڑیاں ہیں۔'' حفیظ کپور نے مذاق کے رنگ میں کہا۔ ''جو وہ ہمیں بغیر پیسوں کے گاڑی دے دے گا۔''

''آپ میری بات کو سمجھے نہیں سائیں۔'' شیخ صاحب وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ''آپ علی کو کسی وقت میرے ساتھ بھیجیں۔ دس بارہ لاکھ کی جو بھی گاڑی اسے پسند آئے گی وہ سمجھ لیں اس کی ہوگئی۔ دو لاکھ روپے اس کی مٹھی میں رکھیں گے۔ باقی تھوڑے تھوڑے کرکے دیتے رہیں گے۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے سائیں۔ میں آپ کو سچ بتا رہا ہوں۔''

''اگر دو لاکھ دینے سے نئی گاڑی گھر میں آرہی ہے تو اچھی بات ہے لیکن دس بارہ لاکھ والی گاڑی سے کام نہیں چلے گا۔'' حفیظ کپور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس سے بڑی گاڑی چاہیے ہوگی ہمیں۔''

''سائیں! میں نے تو ایک بات کی تھی۔ آپ چاہو تو سٹی یا کرولا بھی لے سکتے ہیں۔'' شیخ صاحب نے کہا۔ ''میں آپ کا کام کروادوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ اس پروجیکٹ پر غور کیا جاسکتا ہے۔'' حفیظ کپور نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس کے بعد علی کو موبائل کے سلسلے میں باہر جانا تھا، بڑے کپور نے مجھے بھی اس کے ساتھ کردیا تھا کہ میں بھی ذرا گھوم آؤں۔

☆☆☆

بہادرآباد کراچی کا پُررونق کمرشل ایریا تھا۔ سب سے پہلے علی نے اپنا سیل فون تبدیل کیا پھر ہم گاڑی میں بیٹھ کر سڑک نوردی کرنے لگے۔

میں نے پوچھا۔ ''علی! تمہارے سیل فون میں کوئی خرابی تھی؟''

''نہیں تو......'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''یہ شاپ والا میرا دوست ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جب بھی کوئی نیا سیل فون لانچ ہوتا ہے یہ مجھے فون کردیتا ہے۔ میں اپنا فون اسے دے کر نیا فون لے جاتا ہوں۔''

''گڈ...... تمہارے تو مزے لگے ہوئے ہیں۔'' میں نے مناسب الفاظ میں دل کی بات کہہ دی۔

''ایک بات بتاؤ اگر مائنڈ نہ کرو تو یہ انکل کا رویہ عظیم کے ساتھ اتنا ناگوار کیوں ہے۔''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ایسا صرف آپ ہی نے محسوس نہیں کیا بلکہ ہر وہ شخص جو ہمارے حالات سے بہ خوبی آگاہ نہیں، اس کا بھی یہی خیال ہے۔''

''پرابلم کہاں پر ہے؟'' میں نے علی کو کریدنے کی کوشش کی۔

علی کپور بڑا سافٹ اور شائستہ انسان تھا۔ اس کی گفتگو میں معقولیت پائی جاتی تھی۔ وہ منطقی اور ٹھوس بات کرتا تھا۔

میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔
''پرابلم دونوں طرف ہے۔''
''میں اس پرابلم کو سمجھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور میری خواہش ہے کہ باپ بیٹے کے بیچ موجود یہ تناؤ ختم ہوجائے۔''
''میں بھی یہی چاہتا ہوں بھائی۔'' وہ دکھی لہجے میں بولا۔ ''لیکن دونوں اپنی اپنی عادت بلکہ ضد پر جمے ہوئے ہیں۔''
''تم میرے بھائی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''تم مجھے ان دونوں کی عادت، ضد اور مجبوریوں کے بارے میں تھوڑا بریف کرو۔ ممکن ہے، میں اس مسئلے کا کوئی حل نکالنے میں کامیاب ہوجاؤں۔''
''اگر ایسا ہوجائے تو اس سے اچھی اور کوئی بات نہیں ہوگی۔'' علی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''اللہ آپ کو کامیاب کرے!''
اس کے بعد ہمارے بیچ آئندہ دس منٹ تک جو بات چیت ہوئی اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے کہ......
عظیم بے حد جذباتی، پُرجوش اور بڑبولا قسم کا انسان تھا جبکہ حفیظ کپور... ناپ تول کر سنجیدگی سے بات کرتے تھے۔ عظیم نے اپنی پسند کی شادی کی تھی اور یہ اس کی لو میرج تھی بلکہ کورٹ میرج تھی جبکہ حفیظ کپور مہر النسا سے عظیم کی شادی کے لیے رضامند نہیں تھے۔ وہ مہر النسا کو اپنے خاندان کے شایانِ شان نہیں سمجھتے تھے۔ باپ کی مخالفت کے نتیجے میں عظیم نے مہر النسا سے کورٹ میرج کرلی تھی لیکن دونوں اپنے اپنے گھر میں رہ رہے تھے۔ جلد ہی اس عدالتی نکاح کا راز کھل گیا جس کے نتیجے میں دونوں طرف دنگا فساد کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ بالآخر اس ہنگامے کو بریک لگانے کے لیے حفیظ کپور نے اپنے اصولوں میں نرمی دکھائی اور مہر النسا اپنے میکے سے رخصت ہوکر سسرال یعنی حفیظ کپور کے گھر آگئی۔ اس سلسلے میں حفیظ کپور نے شادی کی عالی شان تقریب کا انعقاد کیا اور بے تول کسے، پیسا پانی کی طرح بہایا گیا۔ بعدازاں یہ بات میرے علم میں آئی کہ حفیظ کپور نے اپنے تمام بیٹوں اور بیٹیوں کی شادیاں اسی طرح شاہانہ انداز ہی میں کی تھیں۔
مہر النسا، حفیظ کپور کے گھر کی بہو تو بن گئی تھی لیکن بڑے کپور صاحب کے دل میں اپنی بہو کے لیے ایک گرہ سی بندھ گئی تھی۔ وقت دھیرے دھیرے آگے بڑھتا رہا۔ محبوبہ جب بیوی بنی تو اس کے اندر سے محبوبیت رفتہ رفتہ کم ہونے لگی اور اس کی جگہ بیویانہ انداز و اطوار نے لے لی۔ شادی سے پہلے عظیم نے ایک پلے بوائے کی حیثیت سے زندگی گزاری تھی۔ اس کی درجنوں گرل فرینڈز تھیں جن کے ساتھ وہ ڈانس پارٹیاں اٹینڈ کرتا تھا اور پینے پلانے کا سلسلہ بھی روز کا معمول تھا اور یہ سارے معاملات مہر النسا کے علم میں تھے لیکن جب عظیم نے مہر النسا سے نکاح کیا تھا، اس کے بعد اس نے کسی بھی گرل فرینڈ کے ساتھ سنجیدہ تعلقات نہ رکھنے کا عہد کرلیا تھا البتہ جام نوشی کا سلسلہ جاری تھا۔ گھر کے اندر ہی ہفتے میں ایک آدھ بار پی لیتا تھا اور جب وہ زیادہ چڑھا لیتا تو غل غپاڑا بھی کرتا تھا یعنی ہفتے، دس دن میں رات کے وقت محلے والے حفیظ کپور کے گھر کی بالائی منزل سے چیخنے چلّانے اور چیزوں کے ٹوٹنے کی آوازیں ضرور سنا کرتے تھے۔ یہ سب حفیظ کپور کے لیے ناقابلِ برداشت اور اذیت ناک تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کے دل میں عظیم کے لیے پسندیدگی کم ہوتی اور ناپسندیدگی بڑھتی چلی جارہی تھی۔
عظیم اپنے باپ کی خفگی کو تو کسی نہ کسی طرح جھیل ہی رہا تھا۔ اس کے لیے کربناک بات یہ تھی کہ مہر النسا نے اس کے کردار پر شک کرنا شروع کردیا تھا۔ وہ اب بھی اسے ایک فلرٹ اور پلے بوائے ہی سمجھ رہی تھی اور وہ جب کبھی خاموش بیٹھا ہوتا یا جب بھی اچانک اس کے چہرے پر مسکراہٹ ابھر آتی تو مہر النسا طنزیہ لہجے میں اس سے یہ استفسار کرنا نہیں بھولتی تھی۔ ''کہاں کھوئے ہوئے ہو۔ کس محبوبہ کی یاد آرہی ہے۔ مجھ پر تو ہمیشہ گرجتے برستے رہتے ہو۔ یہ کس حرافہ کے تصور نے تمہارے چہرے پر مسکراہٹ سجادی؟''
مہر النسا کی ایسی جلی کٹی باتیں اس کا کلیجا چیر دیتی تھیں اور وہ غم غلط کرنے کے لیے اور زیادہ پینے لگتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ گھر کے بالائی حصے میں ہنگامہ آرائی کا تناسب بڑھ جاتا تھا اور اس بدامنی سے گھر کا زیریں حصہ بھی بعض اوقات محفوظ نہیں رہتا تھا۔ عظیم سچے دل سے یہ عہد کرچکا تھا کہ وہ شادی کے بعد مہر النسا سے بے وفائی نہیں کرے گا لیکن مہر النسا اس کی وفاداری کو شک کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ بیوی کا یہ رویّہ اس کے لیے سوہانِ روح تھا۔ باپ طعنہ دیتا تھا کہ وہ جورو کا غلام ہے۔ جورو شک کرتی تھی کہ اس کے دوسری عورتوں کے ساتھ بھی خفیہ تعلقات ہیں۔ وہ اکثر عظیم کے سیل فون کا اِن باکس اور کال ریکارڈ چیک کرتی رہتی تھی

اور ذرا سی بھی اونچ نیچ پر ان میاں بیوی میں خوب ہنگامہ آرائی ہوتی تھی۔ عظیم کو ایک شک یہ بھی تھا کہ حفیظ کپور صاحب درپردہ مہرالنسا کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور وہ اس کے خلاف مہرالنسا کے کان بھرتے رہتے ہیں۔

ٹریڈنگ کے بزنس میں تینوں باپ بیٹے ایک ساتھ تھے لہٰذا اس صورتِ حال نے وہاں بھی بدامنی اور بدمزگی کی فضا قائم کررکھی تھی۔ عظیم کا دعویٰ تھا کہ اس نے اپنی قابلیت کے بل بوتے پر کمپنی کو کروڑوں کما کر دیے ہیں لیکن پاپا کی پھنے خانی اور بدکلامی نے سارے کاروبار کا بیڑا غرق کردیا ہے۔ دوسری جانب حفیظ کپور سب کو پورے وثوق کے ساتھ یہ بتاتے پھرتے تھے کہ عظیم کی جذباتیت اور جھگڑالو مزاج نے بزنس کا دِوالیا نکال دیا ہے۔ شراب نوشی نے اس کی مت ماردی ہے۔ اس کے اسی رویّے کی وجہ سے بزنس تباہ ہوگیا ہے۔ دوسال پہلے کسٹم والوں نے ان کا دو کروڑ کا مال روک لیا تھا۔ عظیم کا کہنا یہ تھا کہ پاپا نے کسٹم کے افسران کے ساتھ بدکلامی کی تھی اور کلیئرنگ ایجنٹ کو بھی گالیاں دی تھیں جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ملائیشیا سے آنے والی آئل کی یہ امپورٹ کسٹم والوں نے اپنے قبضے میں کرلی۔ حفیظ کپور نے اس نقصان کا ذمے دار عظیم کو ٹھہرایا تھا۔ اس کے تئیں عظیم کی نالائقی کے سبب ان کا مال پھنس گیا تھا۔ قصور باپ کا تھا یا بیٹے کا، حقیقت یہ تھی کہ فوری طور پر دو کروڑ کا مال کھوہ کھاتے چلا گیا تھا۔ اس سلسلے میں حفیظ کپور نے عدالت میں کسٹم والوں پر کیس کررکھا تھا۔ اغلب امکان یہی تھی کہ اگست ستمبر میں وہ کیس جیت جائے گا جس کے بعد اس کے دن پھر جائیں گے۔

بارہ سال پہلے باپ بیٹے کے بیچ جو خلیج حائل ہوگئی تھی اسے پاٹنے کی ان دونوں میں سے کسی نے کوشش نہیں کی تھی بلکہ گزرتے ہوئے ہر لمحے کے ساتھ یہ خلیج اور وسیع ہوتی چلی گئی تھی اور اب یہ دونوں ایک طرح سے ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے علی سے استفسار کیا۔

''علی! تم دونوں میں سے کس کو غلط اور کس کو صحیح سمجھتے ہو؟''

''بھائی جان! یہ دونوں اپنی اپنی جگہ درست بھی ہیں اور اپنی اپنی جگہ غلط بھی ہیں۔'' اس نے دوٹوک الفاظ میں جواب دیا۔ ''لیکن میری حمایت اور ہمدردی پاپا کے ساتھ ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''اس امتیازی سوچ کا سبب کیا ہے؟''

''دیکھیں بھائی جان!'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''پاپا ہمارے باپ ہیں۔ انہیں یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنا بزنس چاہے جیسا چلائیں لیکن ہمیں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ہم اپنے باپ کے سامنے کھڑے ہوجائیں اور ان سے مقابلہ کریں۔ والد کا رتبہ اور مقام ہمیشہ بڑا ہوتا ہے۔ پاپا کو اس وقت ہماری توجہ کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ وہ کتنے گمبھیر مسائل میں گھرے ہوئے ہیں......''

''میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ آج کل مالی مسائل کا شکار ہیں۔'' میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ''یہ تو ایک مسئلہ ہے۔''

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''اس کے علاوہ اور کون کون سے مسائل ہیں؟''

''سب سے بڑا مسئلہ تو ان کی صحت کا ہے۔''

''کیا ہوا ان کی صحت کو؟'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں نے تو انہیں بالکل فٹ دیکھا ہے۔ عظیم بتا رہا تھا کہ وہ شوگر پیشنٹ ہیں مگر یہ تو اتنی فکر کی بات نہیں ہے۔''

''وہ شوگر پیشنٹ ہیں۔ ان کی آئی سائٹ بڑی تیزی سے متاثر ہورہی ہے اور شوگر کی وجہ سے بلڈ پریشر بھی شوٹ کرجاتا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کے علاوہ ان کا دل بھی متاثر ہے۔ ان کا بائی پاس ہوچکا ہے اور دل کے والوز بھی تبدیل کرائے گئے ہیں اور سب سے خطرناک بات یہ کہ وہ کینسر کے مریض ہیں۔ ان کے پیٹ میں جگر کے قریب پندرہ سینٹی میٹر سائز کا ٹیومر ہے۔ ان تمام امراض کے علاج کے سلسلے میں وہ صبح سے رات تک درجنوں گولیاں اور کیپسول پھانکتے ہیں اور تین چار مرتبہ انجکشن بھی لگواتے ہیں......'' وہ روہانسا ہوگیا۔ لمحاتی توقف کرکے اس نے دو تین گہری سانسیں لیں پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اس پر مالی مسائل کا عفریت منہ کھولے ہمارے سروں پر کھڑا ہے۔ جب سے کسٹم والوں نے ہماری دو کروڑ کی امپورٹ روکی ہے، بزنس بالکل اسٹاپ ہوگیا ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آتا، ہمارے کاروبار کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔ پاپا پیروں فقیروں کے پاس بھی جاتے ہیں۔ بھائی جان! آپ کو پتا ہے، اس وقت ہم مالی بحران کی کس منزل پر کھڑے ہیں؟''

مجھے نہیں معلوم تھا اس لیے میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''نہیں......!''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ ''آپ نے ہمارا جو عالی شان گھر دیکھا ہے نا اس کے ڈاکیومنٹس بینک کے پاس گروی رکھے ہوئے ہیں۔ ہم نے اپنے

بزنس کو سنبھالا دینے کے لیے گھر کو گروی رکھوا کر بینک سے پانچ کروڑ قرض لیا تھا۔ بزنس نہیں سنبھل سکا اور پیسے اڑن چھو ہوگئے۔ اس کے علاوہ دوستوں اور رشتے داروں سے کل ملا کر تین کروڑ ادھار لے چکے ہیں۔ کریڈٹ کارڈز کے ذیل میں بھی کم و بیش پچاس لاکھ روپے ہم پر واجب الادا ہیں۔ اس وقت ہم لگ بھگ ساڑھے آٹھ کروڑ کے مقروض ہیں اور اس قرض کا سارا دباؤ پاپا کے اعصاب پر ہے۔ وہ چڑچڑے نہیں ہوں گے، تو پھر کیا کریں گے۔ یہ ان کی ہمت اور اللہ کی مہربانی ہے کہ وہ اس سچویشن میں بھی زندہ ہیں۔ نہ صرف زندہ ہیں بلکہ بڑی زندہ دلی سے قہقہے بھی لگاتے ہیں اور اپنے دوستوں کو انٹرٹین بھی کرتے ہیں۔''

''واقعی! میں بڑے کپور صاحب کی برداشت کو سلام کرتا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''سچویشن بڑی گمبھیر اور تشویشناک ہے۔''

''ایسی ویسی تشویشناک۔'' وہ دکھی لہجے میں بولا۔ ''اب تو کوئی ہمیں دس بیس ہزار ادھار دینے کو بھی تیار نہیں ہوتا۔ پوری مارکیٹ میں ہماری زبوں حالی کا چرچا عام ہو چکا ہے اور قریبی رشتے دار و احباب بھی کنی کاٹنے لگے ہیں۔ ایک ماہ پہلے پاپا نے اس کرائسس سے نکلنے کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا۔''

''کیسا فیصلہ؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

علی نے گاڑی کو فیول کے لیے ایک فلنگ اسٹیشن پر روکا اور بولا۔ ''گھر اور آفس کو سیل کرنے کا فیصلہ۔''

''اوہ......'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

وہ گاڑی کو دوبارہ ایک صاف ستھری روڈ پر چڑھاتے ہوئے بولا۔ ''ہمارا گھر پانچ سو گز پر ون پلس ون بنا ہوا ہے اور اس گھر کی تعمیر میں پاپا نے کوئی کمپرومائز نہیں کیا تھا۔ ہر چیز دل کھول کر بہترین معیار کی لگائی تھی۔ اس وقت دس کروڑ میں گھر کا خریدار موجود ہے۔ ایک پارٹی ایک کروڑ میں آفس خریدنے کو تیار ہے۔ اگر ہم گھر اور آفس فروخت کر دیں تو ہمارے ہاتھ میں گیارہ کروڑ آجائیں گے۔ ہم پر ساڑھے آٹھ کروڑ کا قرضہ ہے۔ اگر تمام قرضہ جات ادا کر دیے جائیں تو ہمارے پاس ڈھائی کروڑ بچ جائیں گے۔ اس رقم میں ہم ایک لگژری اپارٹمنٹ خرید سکتے ہیں۔ پاپا نے اس ترکیب پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن ولیم آرتھر کی آفر نے وقتی طور پر پاپا کو اپنا ارادہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔''

''ولیم آرتھر......'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ کون صاحب ہیں؟''

''ولیم آرتھر کا تعلق امریکی ریاست کین ٹکی سے ہے۔'' علی نے بتایا۔ ''پاپا کے ایک دوست ہیں بٹ صاحب۔ ولیم آرتھر دراصل بٹ صاحب کا دوست ہے۔ بٹ صاحب ہی کے توسط سے ولیم آرتھر نے ہم سے رابطہ کیا ہے اور ہمیں ایک گولڈن آفر کی ہے جس کے بعد پاپا نے گھر اور آفس کو سیل آؤٹ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔''

''کیا یہ بٹ صاحب بھی امریکا میں رہتے ہیں؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''اور یہ بھی بتاؤ کہ ولیم آرتھر نے آپ لوگوں کو کیا آفر کی ہے؟''

''میں آپ کو بتاتا ہوں بھائی۔'' وہ بڑی رسان سے بولا۔ ''پاپا کے دوست بٹ صاحب ادھر کراچی ہی میں رہتے ہیں۔ ولیم آرتھر فیس بک پر ان کا فرینڈ ہے۔ ولیم آرتھر امریکا میں یو این (یونائیٹڈ نیشنز) کے پراجیکٹس میں کام کرتا ہے اور یورپ کی کئی کمپنیز کے ساتھ بھی اس کا بزنس جڑا ہوا ہے۔ ولیم آرتھر نے بٹ صاحب سے کہا کہ وہ پاکستان میں انویسٹ منٹ کرنا چاہتا ہے۔ اسے بتایا جائے کہ وہ کس سیکٹر میں سرمایہ کاری کرے۔ بٹ صاحب نے کہا کہ بھائی! مجھے تو بزنس کی سوجھ بوجھ نہیں ہے۔ میں تمہیں اپنے ایک دوست حفیظ کپور سے جوڑ دیتا ہوں۔ تم ان کے ساتھ معاملات طے کر لو۔ میرے دوست حفیظ کپور کراچی کے ایک معروف اور کامیاب بزنس مین ہیں۔ اس طرح ولیم آرتھر ہم سے ڈائریکٹ ہو گیا۔ ہمارے بیچ ای میلو کے ذریعے معاملات آگے بڑھنے لگے۔ اس نے ارادہ ظاہر کیا ہے کہ پہلے مرحلے پر وہ سترہ ملین ڈالرز کی سرمایہ کاری کرنا چاہتا ہے جس کا بیس فیصد وہ ایڈوانس دے گا، باقی پراجیکٹ شروع ہوتے ہی رفتہ رفتہ پے منٹ کا سلسلہ شروع ہو جائے گا اور منصوبہ مکمل ہونے سے پہلے وہ مکمل ادائیگی کر دے گا۔ ہمارے بیچ زمین کی خریداری کے بزنس پر اتفاق ہو گیا ہے۔ ہم ولیم آرتھر کی انویسٹ کی ہوئی رقم سے کسی اچھے علاقے میں یہاں زمین خرید کر اس کی پلاٹنگ کریں گے اور ایک عالی شان رہائشی منصوبے کا آغاز ہو جائے گا۔ ہم نے اسے چار لاکھ روپے فی مربع گز کا ریٹ دیا تھا۔ تھوڑی بحث و تکرار کے بعد تین لاکھ روپے فی مربع گز پر ہمارا اتفاق ہو گیا ہے۔ یہ قیمت تیار بنگلے کی ہے یعنی اگر ہم چار سو مربع گز پر ون پلس ون ایک بنگلا تعمیر کریں تو اس کی کل قیمت بارہ کروڑ ہو گی۔ یہ بنگلا تعمیر اور معیار کے

لحاظ سے عالی شان ہوگا۔ زمین اور تمام تر تعمیراتی مراحل سے گزرنے کے بعد یہ بنگلا ہمیں چھ کروڑ میں پڑے گا یعنی اس کام میں سو فیصد منافع ہے۔ اس منافع کا آدھا ہم رکھیں گے اور آدھا ولیم آرتھر کو دیں گے۔ اس حساب سے وہ مزید سرمایہ کاری کرتا چلا جائے گا۔''

''علی! سترہ ملین ڈالرز کو ذرا پاکستانی کرنسی میں تبدیل کرو تو تمہارے ہوش اڑ جائیں گے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''سترہ ملین ڈالرز کا مطلب ہے، پاکستانی کم و بیش پونے دو ارب روپے......''

''جی بھائی! اتنا ہی حساب بنتا ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔

''میں امریکیوں کی فطرت اور عادت سے اچھی طرح واقف ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اور اس وقت پاکستان کے جو اندرونی حالات ہیں وہ سب تمہارے سامنے ہیں۔ میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ کینن نگی میں بیٹھا ہوا ولیم آرتھر ابتدائی مرحلے میں پاکستان میں اتنی بھاری انویسٹ منٹ کے بارے میں سوچ بھی سکتا ہے۔ اگر وہ یو این کے پراجیکٹس میں کام کرتا ہے تو وہ عقل اور آنکھوں کا اندھا نہیں ہوسکتا۔''

''تو آپ کے خیال میں ولیم آرتھر ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے؟''

''بے حد معذرت کے ساتھ میرا یہی خیال ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''مگر وہ ہم سے کچھ لے تو نہیں رہا، کچھ دے ہی رہا ہے!'' علی میری بات کو ہضم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''کیا آپ لوگوں نے کبھی ولیم آرتھر سے فون پر بات کی؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تک ہمارے سارے معاملات ای میلو کے ذریعے ہو رہے ہیں۔''

''آپ کے پاس اس کا فون نمبر تو ہے نا؟''

''ہاں...... اس نے دو تین نمبر زدیے ہوئے ہیں۔''

''آپ ان نمبرز پر ولیم آرتھر کو کانٹیکٹ کرو۔'' میں نے کہا۔ ''اور اسے دعوت دو کہ وہ پاکستان آئے اور اس زمین کا وزٹ کرے جہاں اس کے کثیر سرمائے سے ایک لگژری ہاؤسنگ سوسائٹی بننے جا رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کبھی پاکستان آنے کو تیار نہیں ہوگا اور آئی ایم پریٹی شیور کہ آپ اس سے ٹیلی فونک رابطہ بھی نہیں کر پائیں گے۔''

''آپ یہ باتیں اتنے وثوق سے کر رہے ہیں!'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

''وہ اس لیے کہ آج کل اس نوعیت کے بہت فراڈ ہو رہے ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ اس سے پوچھیں کہ اس نے یو این کے ساتھ کون کون سے پراجیکٹ میں کام کیا ہے؟ وہ آپ کو تفصیل نہیں بتائے گا۔ آپ اس سے پوچھیں کہ وہ یورپ کی کن کمپنیز کے ساتھ منسلک ہے؟ وہ آئیں، بائیں، شائیں کر کے نکل جائے گا۔''

''بھائی! آپ تو اتنے اعتماد کے ساتھ یہ باتیں کر رہے ہیں جیسے آپ ولیم آرتھر کو ذاتی طور پر جانتے ہیں!'' ...... علی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''میں اس شخص کو ذاتی طور پر ہرگز نہیں جانتا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں ایسے لوگوں کی ذہنیت اور طریقۂ واردات سے بہ خوبی آگاہ ہوں۔ یہ لوگ معصوم افراد کو لاکھوں اور اربوں کے دل کش جھانسے دے کر اپنے شیشے میں اتارتے ہیں اور ان کی زندگی بھر کی جمع پونجی ہتھیا لیتے ہیں۔''

''مگر کیسے؟'' علی نے اصراری لہجے میں کہا۔ ''بھائی! میں ان نوسر بازوں کے طریقۂ کار کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ ابھی تک ولیم آرتھر نے ہم سے ایک ڈالر کا مطالبہ بھی نہیں کیا۔''

میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''ولیم آرتھر جیسے دھوکے باز بھی اپنے شکار کو اپنے جال میں جکڑنے کے لیے بڑے دل فریب گر آزماتے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق، اگر آپ لوگوں نے ولیم آرتھر کی نیت پر شک نہ کیا اور اس کے بچھائے ہوئے جال میں آ گئے تو وہ آپ لوگوں سے پانچ دس ہزار ڈالرز اینٹھنے کے لیے کوئی خوب صورت چال چلے گا اور آپ کروڑوں اربوں کے منافع کے لالچ میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچیں گے کہ وہ آپ کے ساتھ کون سا ہاتھ کر رہا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، ہمیں اس پراجیکٹ سے ہاتھ کھینچ لینا چاہیے؟'' علی نے مجھ سے پوچھا۔

''میرا مشورہ تو یہی ہے بھائی۔'' میں نے خلوصِ دل سے کہا۔ ''مجھے اس پراجیکٹ میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔ ویسے اگر آپ اپنی تسلی کرنا چاہتے ہیں تو دو کام کر کے دیکھ لیں۔'' میں سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''نمبر ایک، اس سے کہیں کہ ''ای میل، ای میل'' بہت کھیل لیا۔ اب تم ہمیں اپنا ڈائریکٹ کانٹیکٹ نمبر دو تاکہ

تم سے فون پر بات ہو سکے۔ نمبر دو، اس سے پوچھیں کہ وہ ان پراجیکٹس کے بارے میں بتائے جو اس نے یو این (یونائیٹڈ نیشنز) کے ساتھ کیے ہیں اور یورپ کی ان کمپنیز کے نام بتائے جن کے ساتھ وہ کام کر رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے بھائی۔ میں پاپا سے بات کرتا ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''ولیم آرتھر کی شکل بڑی حد تک ان بڑے میاں سے ملتی ہے جو ''کے ایف سی'' کے لوگو میں نظر آتے ہیں۔ میں سمجھا تھا ولیم آرتھر بھی ان بڑے میاں کی طرح کا کوئی کامیاب بزنس مین اور شریف آدمی ہوگا۔''

''تم نے جن بڑے میاں کا ذکر کیا ہے ان کا نام کرنل ہارلینڈ سینڈرز ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''جنہیں کرنل کک بھی کہا جاتا ہے۔ اس شخص نے ایک معمولی سے کچن سے اپنے کام کا آغاز کیا تھا۔ محنت ضرور ایک دن رنگ لاتی ہے۔ لوئیس ول کین ٹکی کے باسی اس شخص نے بھی ان تھک محنت کی اور اپنے ہنر کا لوہا پوری دنیا سے منوا لیا۔ اس وقت ''کے ایف سی'' یعنی کین ٹکی فرائیڈ چکن کے دنیا کے ایک سو پندرہ ممالک میں اٹھارہ ہزار سے زیادہ آؤٹ لیٹس دن رات کام کر رہے ہیں۔''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر علی کا نیا نکور سیل فون بیدار ہو گیا۔ دوسری گھنٹی پر علی نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

''جی پاپا......!''

گویا بڑے کپور صاحب کا فون تھا۔ علی نے چند سیکنڈ تک دوسری طرف کی بات سنی پھر بڑی فرماں برداری سے بولا۔

''پاپا! بس ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔''

ٹھیک پانچ منٹ کے بعد ہم گھر کے سامنے تھے۔

☆☆☆

دیوار گیر کلاک چھ بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ منظر ڈرائنگ روم کا تھا اور وہاں ذوالفقار شیخ کے علاوہ ایک اور شخص بھی موجود تھا۔ متناسب بدن اور دراز قامت اس شخص نے سفید سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ مناسب سائز کی سفید ڈاڑھی اس کے چہرے پر بہت جچ رہی تھی۔ اس کے سر کے بال بھی سفید ہی تھے مگر سر کے وسطی حصے پر بال ناپید تھے تاہم سر کے گرد سفید بالوں کی دبیز جھالر موجود تھی۔ اس اجنبی شخص کے چہرے پر معصومیت اور آنکھوں میں بلا کی ذہانت تھی۔ میرے ذہن میں فوری

سنہری باتیں

☆ایک ہاتھ اللہ کی طرف لینے کے لیے پھیلاؤ اور دوسرا مخلوق کو دینے کے لیے کھولو۔ عاجزی کے ذریعے اللہ سے لو اور سخاوت سے بندوں کو دو۔ عبادت کر کے اللہ کے محبوب بن جاؤ اور عمدہ اخلاق سے مخلوق کے محبوب بن جاؤ۔

☆☆☆

☆عقل کی کروڑوں دلیلیں اللہ سے ایک گناہ معاف نہیں کرا سکتیں لیکن ندامت کا ایک آنسو زندگی بھر کے گناہ معاف کرا سکتا ہے۔ لوٹ آؤ اللہ کی طرف اس سے پہلے کہ لوٹ جاؤ اللہ کی طرف۔

مرسلہ: ام حرم شفیق۔ نیو کراچی

☆مشکل وقت میں ہمیشہ رب کریم کے سامنے ہاتھ پھیلا کر دعا کیا کرو کیونکہ جہاں انسان کا حوصلہ جواب دے جاتا ہے، وہیں سے رحمت خداوندی شروع ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

☆خوب صورت عمل انسان کی شخصیت بدل دیتا ہے اور خوب صورت اخلاق انسان کی زندگی۔

☆☆☆

☆اپنے رب سے جو مانگو بھروسے کے ساتھ مانگو کیونکہ وہ تب بھی دیتا ہے جب تم نہیں مانگتے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ تم مانگو اور وہ عطا نہ کرے۔ (سبحان اللہ)۔

مرسلہ: راحیلہ شفیق۔ سندھی ہوٹل نیو کراچی

طور پر یہ خیال آیا کہ وہ مقبول ہستی ہوگا۔ اس نے اپنے دائیں کان میں آلۂ سماعت بھی لگا رکھا تھا۔ میں نے مذکورہ شخص سے مصافحہ کیا اور ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ علی نے بھی اس شخص کو سلام کیا تھا۔

علی نے گاڑی کی چابی شیخ صاحب کے حوالے کی تو انہوں نے پوچھا۔ ''بیٹا! گاڑی میں پیٹرول ڈلوا لیا تھا نا؟''

''جی انکل! میں نے ٹینکی فل کروا دی ہے۔'' علی نے جواب دیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اسد بھائی! آپ بیٹھو۔ میں پاپا کو بھیجتا ہوں۔''

حفیظ کپور اس وقت ڈرائنگ روم میں موجود نہیں تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ گھر کے اندرونی حصے میں ہوں گے۔ علی کے جانے کے بعد اس اجنبی نے گہری نظر سے میری طرف دیکھا اور بولا۔

''آپ ٹھیک ہیں نا؟''

''جی...... مالک کا کرم ہے۔'' میں نے مختصراً کہا۔

''آپ شیخ صاحب کے ساتھ آئے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں!'' میں نے نفی میں گردن ہلائی اور جواب دیا۔ ''میں شیخ صاحب کے ساتھ آیا تو نہیں مگر پچھلے چند گھنٹوں سے انہی کے ساتھ ہوں۔''

شیخ صاحب نے کہا۔ ''سائیں! یہ حفیظ بھائی کے مہمان ہیں۔ امریکا سے آئے ہیں۔ ان کا نام اسد علی ہے۔''

''ماشاء اللہ......!'' وہ شخص خوش دلی سے بولا پھر شیخ صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''یہ عظم کے دوست ہیں؟''

''جی سائیں۔'' شیخ صاحب نے اثبات میں گردن ہلائی پھر مجھے بتادیا۔ ''یہ مقبول بھٹی صاحب ہیں۔''

میں نے بھٹی صاحب کی طرف دیکھا پھر زیر لب مسکراتے ہوئے سر کو اثباتی جنبش دی اور کہا۔ ''بھٹی صاحب! آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ تھوڑی دیر پہلے شیخ صاحب اور کپور صاحب آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔''

کمزور سماعت رکھنے والے افراد کے ساتھ ایک نفسیاتی مسئلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں، دوسرے بھی اونچا ہی سنتے ہوں گے لہٰذا مقبول بھٹی بھی خاصے بلند آہنگ لہجے میں بات کرتے تھے۔ میری بات کے جواب میں انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''سائیں! میں اللہ کا بندہ ہوں۔ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ میں تو بہت گناہ گار انسان ہوں۔''

اسی لمحے حفیظ کپور ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے اور ''آؤ میری جان'' کہتے ہوئے مقبول بھٹی کی جانب بڑھے۔ بھٹی صاحب بھی اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ دونوں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ معانقہ کیا پھر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

''کہاں غائب ہو سرکار۔'' حفیظ کپور نے کہا۔ ''کافی دنوں سے ادھر کا چکر ہی نہیں لگایا، کوئی اتا پتا ہی نہیں۔ مجھے اس طرح نظر انداز نہ کیا کریں۔ مجھے آپ کی دعاؤں کی اشد ضرورت ہے۔''

''حفیظ بھائی! میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں۔'' بھٹی صاحب نے کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ اللہ کرم کرے گا۔''

''یہ تو مجھے بھی پتا ہے کہ اللہ کرم کرے گا۔'' حفیظ کپور نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''لیکن یہ کرم کب تک ہوگا، اس راز سے پردہ تو آپ ہی اٹھاؤ گے نا......''

''حفیظ بھائی! میں نے آپ کے لیے دعا کی ہے۔''

''پہلے تو آپ کی ہر دعا قبول ہوتی تھی......!'' حفیظ کپور نے شکایت بھری نظر سے بھٹی صاحب کی طرف دیکھا۔ ''اب کیا رکاوٹ ہے؟''

''رکاوٹ......'' بھٹی صاحب جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوگئے۔

میں نے دیکھا کہ خاموشی اختیار کرنے کے بعد وہ کچھ بے چین سے ہوگئے تھے۔ ان کے چہرے کے تاثرات سے اضطرار جھلک رہا تھا۔

''میں بڑے مضبوط اعصاب کا مالک ہوں میری جان۔'' حفیظ کپور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے بہت سے مالی اور معاشرتی بحران دیکھے ہیں۔ جیل بھی کاٹی ہے اور عدالتوں میں بڑے خطرناک مقدمات کا سامنا بھی کیا ہے اس لیے دعا کی قبولیت کے راستے میں جو بھی رکاوٹ آپ کو نظر آرہی ہے اس کا کھل کر اظہار کریں۔ میں بڑی ہمت اور حوصلے سے سن لوں گا۔''

''حفیظ بھائی! آپ بیاج سے جان چھڑالیں۔'' بھٹی صاحب نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''بیاج یعنی سود؟'' حفیظ کپور نے سوالیہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔

''جی جی...... میرا یہی مطلب ہے۔'' بھٹی صاحب نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''سودی معاملات اللہ کو سخت ناپسند ہیں۔ سود کی کوئی بھی قسم ہو، اللہ نے اس سے منع فرمایا ہے بلکہ یہاں تک کہا ہے کہ جو لوگ، سود کے معاملات یا سود کا کاروبار کرتے ہیں، میں ان کا کھلا دشمن ہوں۔ جس کا دشمن اللہ ہو وہ کیسے پنپ سکتا ہے، کیسے خوش رہ سکتا ہے؟'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

''میں آپ کا نقطہ اچھی طرح سمجھ رہا ہوں اور اس نقطے کے اندر چھپا ہوا نکتہ بھی مجھے صاف دکھائی دے رہا ہے۔'' حفیظ کپور نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں بری طرح سودی معاملات میں پھنسا ہوا ہوں۔ گھر کو بینک میں گروی رکھوا کر میں نے بینک سے جو رقم حاصل کی تھی وہ کب کی اڑن چھو ہو چکی۔ اب تو ہر ماہ مارک اپ کی لاکھوں کی قسط میرے سر پر کھڑی ہوتی ہے۔''

مقبول بھٹی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''جب تک آپ اس لعنت سے جان نہیں چھڑائیں گے، آپ کے معاملات سیدھے ہوتے مجھے نظر نہیں آتے۔''

میرے لیے یہ ٹاپک نیا اور دلچسپ تھا لہٰذا میں

پوری توجہ سے دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ حفیظ کپور نے استفسار کیا۔

''اس لعنت سے کیسے جان چھڑاؤں میں؟''

''جس گھر کو گروی رکھوا کر آپ نے سود پر قرض لیا تھا، اسے فروخت کردیں۔'' مقبول بھٹی نے واشگاف الفاظ میں کہا۔ ''گزارہ کرنے کے لیے کسی چھوٹے سے گھر میں چلے جائیں اور سارے قرضے اتار کر سکھ کی سانس لیں۔''

''سائیں! بھٹی صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' شیخ صاحب نے بڑے کپور سے کہا۔ ''اللہ آپ پر کرم کرے گا اور بہت جلد آپ اپنے قدموں پر کھڑے ہوجائیں گے۔ جب آپ کی روزی روٹی میں اللہ برکت ڈالے گا تو سارے مسئلے خود بہ خود حل ہوجائیں گے۔''

''چند روز پہلے میں یہ گھر فروخت کرنے کے لیے تیار ہوگیا تھا کیونکہ مالی مسائل کے عفریت سے بچنے کے لیے میرے پاس کوئی آپشن باقی نہیں تھا۔'' حفیظ کپور نے کہا۔ ''لیکن ولیم آرتھر والے منصوبے کے بعد میں نے یہ گھر بیچنے کا ارادہ ترک کردیا ہے۔''

ولیم آرتھر کی اسٹوری میں علی کی زبانی سن چکا تھا اس لیے میرے کان کھڑے ہوگئے۔ بھٹی صاحب نے پوچھا۔

''یہ وہی صاحب ہیں نا جن کا آپ نے پہلے بھی ذکر کیا تھا۔ جو امریکا میں ہوتے ہیں؟''

''جی بھائی وہی۔'' حفیظ کپور نے اثبات میں گردن ہلادی۔

''حفیظ بھائی! آپ خوش رہیں مگر کسی خوش فہمی میں نہ رہیں۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' حفیظ کپور نے پوچھا۔

''بھٹی صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ولیم آرتھر ایک فراڈ شخص ہے۔'' میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ''وہ آپ کو سہانے خواب دکھا کر آپ کے جذبات سے کھیل رہا ہے اور جب آپ اس پر اندھا بھروسا کرنے لگیں گے تو وہ آپ کو دس بیس ہزار ڈالرز کا چونا لگا کر رفوچکر ہوجائے گا۔''

مقبول بھٹی نے چونک کر معنی خیز نظر سے مجھے دیکھا پھر میرے تبصرے کی تائید میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اسد سائیں بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میرا بھی یہی مطلب تھا۔''

حفیظ کپور میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

''آپ کو کس نے بتایا ولیم آرتھر کے بارے میں؟''

''اس موضوع پر علی سے میری تفصیلی گفتگو ہوچکی ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اچھا ہوا، ولیم آرتھر کا ذکر نکل آیا ورنہ میں خود آپ سے بات کر کے اس سلسلے میں آپ کو خبردار کرنا چاہتا تھا۔''

''تھینک یو بیٹا! میں تمہاری رائے کو ضرور اہمیت دوں گا۔'' حفیظ کپور نے احسان بھرے انداز میں کہا۔ ''اور پھر بھٹی صاحب بھی منع کررہے ہیں تو میں اس کام میں ہاتھ نہیں ڈالوں گا۔ میں پُرخلوص دوستوں اور سچے خیرخواہوں کے مشوروں کی بہت قدر کرتا ہوں۔''

''میں نے علی کو بہت سی ٹپس دی ہیں۔'' میں نے حفیظ کپور سے کہا۔ ''علی آپ سے ڈسکس کرے گا۔ اگر آپ ولیم آرتھر کی اصلیت تک پہنچنا چاہتے ہیں تو ان ٹپس کو ٹرائی کیجیے گا۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجائے گا۔''

''ضرور بیٹا جی! میں علی سے بات کروں گا۔'' حفیظ کپور نے یقین دہانی کرانے والے انداز میں کہا۔

پھر ان لوگوں میں سیاست اور پاکستان کے موجودہ حالات پر گفتگو ہونے لگی۔

''ملک میں امن و امان کی صورتِ حال ہو تو کوئی کاروبار بھی چلے۔'' حفیظ کپور بوجھل لہجے میں بولے۔ ''ملکی حالات کو دیکھ کر بہت دل کڑھتا ہے۔''

اسی لمحے حفیظ کپور کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ انہوں نے کال ریسیو کی اور سیل فون کو کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... ہیلو!''

پھر انہوں نے بڑے اطمینان سے دوسری طرف کی بات سنی اور ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''سیدھے اوپر......!''

بس ایک جملہ ادا کرنے کے بعد حفیظ کپور نے فون ایک طرف رکھ دیا اور بہ آوازِ بلند نعرہ لگایا۔

''اکبر بادشاہ......!''

یہ نعرہ میں نے کل رات بھی ان کی زبان سے سنا تھا اور مجھے معلوم ہوچکا تھا کہ اکبر ان کے ایک وفادار گھریلو ملازم کا نام ہے۔ میں یہ پوچھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ انہوں نے ''سیدھے اوپر'' کس کو بھیجا ہے کہ اسی وقت اکبر نامی ملازم ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔

وہ حفیظ کپور کے سامنے باادب کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''جی صاحب!''

''پرندوں کے کھانے پینے کا بندوبست کردیا نا؟'' حفیظ کپور نے استفسار کیا۔

''جی صاحب! سارے برتن باجرے اور پانی سے

بھرے ہوئے ہیں۔'' اکبر نے جواب دیا۔

''شاباش!'' حفیظ صاحب نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''اب ذرا تم اوپر چلے جاؤ۔ چھوٹے عظیم نے چھت پر جو کبوتر، چڑیاں اور خرگوش پال رکھے ہیں، ذرا ان کو دیکھ لو۔''

''جی صاحب! میں جاتا ہوں۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

مقبول بھٹی نے کہا۔ ''حفیظ بھائی! عظیم نظر نہیں آ رہا۔ کیا وہ کہیں گیا ہوا ہے؟''

''عظیم کو میں نے ایک کام سے بھیجا ہے۔'' حفیظ صاحب نے جواب دیا۔ ''بس آنے ہی والا ہوگا۔''

''ماشاء اللہ!'' بھٹی صاحب نے کہا۔

حفیظ کپور نے ''چھوٹے عظیم'' کا ذکر کیا تو مجھے یہ سمجھنے میں ذرا سی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ اس تذکرے سے اس کی مراد عظیم کا بیٹا علیم تھی۔ عظیم کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ علیم کو پرندے اور جانور پالنے کا بہت شوق ہے لیکن حفیظ صاحب کو اپنے پوتے کا یہ شوق قطعی پسند نہیں تھا اور اس موضوع پر خاصی بدمزگی بھی ہو چکی تھی۔ شاید تھوڑی دیر پہلے کپور صاحب نے اپنے پوتے علیم ہی کو ''سیدھے اوپر'' جانے کی ہدایت کی تھی۔

''صرف ''ماشاء اللہ'' سے کام نہیں چلے گا سائیں۔'' حفیظ کپور نے مقبول بھٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ بتائیں کہ آخر کب تک ایسا چلتا رہے گا۔ عظیم کی طرف سے میرے نصیب میں کوئی سکھ بھی لکھا ہوا ہے یا نہیں؟''

میں محتاط نظر سے بڑے کپور صاحب کو تکنے لگا۔ پتا نہیں کیوں، اچانک انہوں نے عظیم کے خلاف لٹھ اٹھا لی تھی۔ میں نے اس حوالے سے کچھ کہنے سے گریز کیا۔

شیخ صاحب نے کہا۔ ''سائیں! میری بات کا یقین کریں۔ میں آپ کو سچ بتا رہا ہوں، عظیم کی بیوی ناکام ہو کر امریکا سے واپس آئے گی پھر ان دونوں میاں بیوی کا دماغ ٹھکانے پر آ جائے گا۔ عظیم اس سے پہلے امریکا کا ایک تجربہ کر کے واپس آ چکا ہے۔''

''آپ کیا کہتے ہیں بھٹی صاحب؟'' حفیظ کپور نے پوچھا۔

''وہ واپس آئے گی اور پھر دوبارہ جائے گی۔'' بھٹی صاحب نے جواب دیا۔

''آپ کا مطلب ہے کہ وہ دوبارہ امریکا جائے گی؟''

''جی حفیظ بھائی۔'' بھٹی صاحب نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اس کا بار بار امریکا آنا جانا لگا رہے گا۔

جب امریکا کے ویزا کی مدت پوری ہو جائے گی تو پھر وہ کسی اور ملک کا رخ کرے گی۔''

''اچھا......'' حفیظ کپور کے چہرے پر تفکر کی پرچھائیں نمودار ہوئیں۔ اس نے پوچھا۔ ''اور عظیم کا کیا بنے گا...... یہ مجنوں اپنی لیلیٰ کے بغیر کیسے زندہ رہے گا؟ آپ تو میری پریشانیوں میں اضافے کا اعلان فرما رہے ہیں۔''

''عظیم دوسری شادی کرے گا۔'' بھٹی صاحب نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

حفیظ کپور نے آنکھیں سکیڑ کر مقبول بھٹی کی طرف دیکھا اور استفسار کیا۔ ''کیا مہر النسا، عظیم کو دوسری شادی کرنے کی اجازت دے گی؟''

''سائیں! اجازت دینے کا کیا سوال......!'' بھٹی نے کہا۔

''میرا مطلب یہ کہ مہر النسا عظیم کو ایسا نہیں کرنے دے گی۔'' حفیظ کپور نے وضاحت کی۔

''وہ رہے گی تو روکے گی نا......!''

''وہ کیوں نہیں رہے گی؟'' حفیظ کپور نے الجھن زدہ نظر سے بھٹی کی طرف دیکھا۔ ''میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔ آپ ذرا وضاحت کر دیں۔''

''سائیں! مہر النسا، عظیم کو چھوڑ دے گی۔'' مقبول بھٹی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ خود کو بزنس میں اس طرح مصروف کر لے گی کہ اسے عظیم کی ضرورت نہیں رہے گی اور نہ ہی کبھی عظیم کا خیال آئے گا۔''

''اور چار بچوں کا کیا ہوگا؟''

''بچے دادا دادی اور پھوپیوں کے پاس پرورش پائیں گے۔'' مقبول بھٹی نے جواب دیا۔ ''مگر نانی کے پاس نہیں جائیں گے۔''

''آپ نے بڑی خطرناک خبر سنا دی ہے سائیں۔'' حفیظ کپور نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں اندر سے ہل کر رہ گیا ہوں۔ بچے پھوپیوں کے پاس کیوں پلیں گے، کیا عظیم ان کا خیال نہیں رکھے گا؟''

''عظیم بھی دور چلا جائے گا۔'' بھٹی صاحب نے بتایا۔

''دور کہاں؟'' حفیظ کپور نے سوال کیا۔

''جنوبی ایشیا کے کسی ملک میں۔'' بھٹی صاحب نے جواب دیا۔ ''جیسے تھائی لینڈ یا ملائیشیا یا انڈونیشیا وغیرہ......''

''آپ نے تو عظیم کی دوسری شادی کی بات کی ہے اور اب آپ اسے جنوبی ایشیا بھیج رہے ہیں۔ یہ کیا ماجرا ہے سائیں؟''

''حفیظ بھائی! میں اللہ کا بندہ ہوں۔'' وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولے۔ ''میری اپنی کوئی طاقت نہیں ہے۔ میں کسی کو کہیں نہیں بھیج سکتا۔ عظیم اپنی مرضی سے جنوبی ایشیا کا رخ کرے گا اور وہاں جا کر وہ دوسری شادی کرے گا۔''

''کیا عظیم کی دوسری بیوی مسلم ہوگی؟''

''الحمدللہ! وہ ایک پردہ دار اور باحیا مسلم عورت سے شادی کرے گا۔'' مقبول بھٹی نے بتایا۔ ''اسی عورت کی وجہ سے عظیم کو وہاں کی شہریت بھی مل جائے گی۔ بعد میں وہ اپنے چاروں بچوں کو بھی اپنے پاس بلالے گا۔''

ادھر بھٹی صاحب کی بات ختم ہوئی، ادھر عظیم ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اس نے سب سے ہاتھ ملایا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ حفیظ کپور نے مقبول بھٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عظیم سے کہا۔

''بھائی نے تمہارے لیے ایک سنسنی خیز پیش گوئی کردی ہے!''

''کیا؟'' عظیم نے سپاٹ آواز میں کہا۔

''بیٹا جی! سہرا باندھنے کی تیاری شروع کردو۔'' حفیظ کپور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''بھٹی صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ تم عنقریب فار ایسٹ جانے والے ہو اور وہاں جا کر تم ایک باحیا، پردہ دار عورت سے شادی کرو گے۔''

''پاپا! آپ کے خیال میں کیا مہرالنسا کوئی بے حیا اور بے پردہ عورت ہے؟'' عظیم کے استفسار سے اذیت جھلکتی تھی۔

''میں نے یہ تو نہیں کہا۔'' حفیظ کپور سنبھلے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''میں نے تمہیں وہ بتایا ہے جو بھٹی صاحب نے کہا ہے۔''

''بھٹی صاحب پہلے بھی دو تین مرتبہ مجھ سے یہ بات کہہ چکے ہیں۔'' عظیم نے اکھڑے ہوئے انداز میں کہا۔ لیکن پاپا! میں آپ سب کو بتادوں کہ مہرالنسا مجھ سے محبت کرتی ہے۔ وہ مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتی اور جہاں تک میری دوسری شادی کا تعلق ہے تو یہ کبھی نہیں ہوگا، چاہے میں پاکستان میں رہوں یا فار ایسٹ جاؤں یا امریکا شفٹ ہوجاؤں...... ڈیٹس فل اینڈ فائنل۔''

''نہ...... تم اتنی گرمی کیوں کھا رہے ہو۔'' حفیظ کپور نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''ہم کوئی زبردستی تمہاری دوسری شادی تھوڑی کروا رہے ہیں۔''

عظیم نے اپنے باپ کے ریمارکس پر ایک لفظ نہیں کہا اور خاموشی سے اٹھا اور ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔ میں عظیم سے بہت کچھ پوچھنے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن یہاں اچانک ایسی صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی کہ اس کا موقع نہیں مل سکا۔

حفیظ کپور نے برا سامنہ بناتے ہوئے کہا۔ ''آپ لوگوں نے اس کا رویہ دیکھ لیا۔ اس کے اسی مزاج نے ساری گڑبڑ پھیلا رکھی ہے۔ یہ نہ خود سکون میں رہتا ہے اور نہ ہمیں چین سے رہنے دیتا ہے۔''

میں اس امر کا چشم دید گواہ تھا کہ کم از کم اس سچویشن میں عظیم کی کوئی غلطی نہیں تھی۔ بڑے کپور صاحب خوامخواہ اسے مطعون کررہے تھے۔

''چھوڑیں حفیظ بھائی! آپ ٹینشن نہ لیں۔'' مقبول بھٹی نے کہا۔ ''ابھی اس کی سوچ بچوں والی ہے۔ جب میچور ہوگا تو خود ہی سمجھ جائے گا۔''

''کیا اس کی میچورٹی ساٹھ سال کی عمر میں اس کے بھیجے پر دستک دے گی؟'' حفیظ کپور خفگی آمیز لہجے میں بولا۔ ''اس اکتوبر میں یہ چونتیس سال کا ہوجائے گا۔ ماشاء اللہ! چار بچوں کا باپ ہے۔ میں کب تک اس چونتیس سالہ بچے کو فیڈر پلانے میں لگا رہوں گا۔ غیر ذمے داری اور لاابالی پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔''

میں نے ماحول کے تناؤ کو کم کرنے کے لیے مقبول بھٹی سے کہا۔ ''سر! آپ کچھ میرے بارے میں بھی تو بتائیں!''

''آپ کا دوست ناراض ہوکر چلا گیا ہے۔'' بھٹی صاحب گہری سنجیدگی سے بولے۔ ''اگر میری کوئی بات آپ کو بری لگ گئی تو یہ اچھا نہیں ہوگا۔''

''آپ فکر نہ کریں سر!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے آپ کی کوئی بات بری نہیں لگے گی اور نہ ہی میں ناراض ہوکر یہاں سے اٹھ کر جاؤں گا۔ آپ میرے بارے میں جو بھی بتانا چاہتے ہیں، بلاخوف وخطر کہہ سکتے ہیں۔''

''ماشاء اللہ!'' وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''سائیں! آپ اپنے دوست سے بہت مختلف ہیں۔ اللہ آپ پر بڑا کرم کرے گا۔ آپ بہت ترقی کریں گے۔ کیا ابھی حال ہی میں، آپ کے بیڈ روم میں آتشزدگی کا کوئی واقعہ پیش آیا ہے؟''

میں نے چونک کر مقبول بھٹی کی طرف دیکھا۔ اس کے سوال نے مجھے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ وہ بہت اندر کی بات پوچھ رہے تھے۔ میرے ذہن میں وہ واقعہ گھوم گیا جب چند روز پہلے میں ڈیلس میں تھا۔ ڈیلفینا نے مجھے پریسٹن ہالو

کے ایک بنگلے میں ٹھہرایا تھا اور میں نے مذکورہ بنگلے میں ڈیلفینا کے ساتھ بہتر گھنٹے قیام کیا تھا۔ یہ بہتر گھنٹے ایک سے بڑھ کر ایک حیرت انگیز واقعات سے بھرے ہوئے تھے۔
وہیں پر ربی آئزک باروخ لاؤ سے بھی میری تفصیلی ملاقات ہوئی تھی۔ ربی آئزک نے ڈیلفینا کو کسی پراسرار چکر سے نجات دلائی تھی۔ بعدازاں جب مجھے معلوم ہوا کہ ڈیلفینا کس مقصد سے مجھ پر کام کر رہی تھی تو میں نے اس کی پیشکش کو بڑی بے دردی سے ٹھکرادیا تھا۔ اسی بنگلے پر قیام کے دوران میں ایک رات میرے بیڈروم کے برابر والے کمرے میں آتشزدگی کا واقعہ پیش آیا تھا۔
مقبول بھٹی یک ٹک سوالیہ نظر سے مجھے دیکھے جارہا تھا۔ اس کے انکشاف نے مجھے حیرت زدہ کردیا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔
''میرے بیڈروم میں تو نہیں البتہ میرے بیڈروم کے برابر والے بیڈروم میں ایسا واقعہ پیش آیا تھا۔''
''اور یہ واقعہ جہاں پیش آیا تھا، وہ آپ کا اپنا گھر نہیں تھا۔'' وہ بہ دستور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔ ''آپ کسی کے گھر میں مہمان بن کر ٹھہرے ہوئے تھے؟''
''جی۔ یہ درست ہے۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔
''آتشزدگی سے ایک دو روز پہلے آپ کی کسی شخص کے ساتھ خوں ریز مارا ماری بھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے آپ کے لیے کافی مشکلات کھڑی ہوگئی تھیں؟'' بھٹی صاحب نے پوچھا۔
''جی...... ایسا ایک واقعہ پیش آیا تھا'' میں نے کہا۔
مقبول بھٹی جس انداز میں میرے بارے میں بتا رہا تھا، وہ حیران کن ہونے کے ساتھ تشویشناک بھی تھا۔ اس سے اس کی باطنی قوت کا ثبوت ملتا تھا۔ وہ یقیناً پراسرار صلاحیتوں کا مالک ایک روحانی شخص تھا۔
''آپ بہت خوش قسمت ہیں سائیں۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''اللہ آپ سے خوش ہے اور اس ذاتِ پاک کا بڑا کرم ہے آپ پر۔''
''میں اس کرم پر مالک کا شکر گزار ہوں۔'' میں نے کہا۔
''بھٹی صاحب! آپ اسد کے ماضی کو چھوڑ دیں۔ ان کے حال اور مستقبل کے بارے میں کچھ بتائیں......!'' حفیظ کپور نے کہا۔
''ان کا حال اور مستقبل شاندار ہے۔'' مقبول بھٹی نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن زندگی بھر انہیں سخت محنت کرنا پڑے گی۔ ان کے پاؤں میں چکر ہے۔ یہ کسی ایک مقام پر زیادہ عرصہ قیام نہیں کرسکیں گے۔ ملکوں ملکوں گھومنا اور سنسنی خیز واقعات میں ملوث ہونا ان کے نصیب میں لکھا ہے۔''
''مستقبل میں کیا پیش آئے گا اس کا فیصلہ تو آ[نے] والا وقت ہی کرے گا۔'' بڑے کپور صاحب نے فلسفیا[نہ] انداز میں کہا۔ ''آپ ان کے حال کا احوال بتائیں۔ ا[سد] کسی خاتون کی تلاش میں امریکا سے پاکستان آئے ہیں یہ فرمائیں ان خاتون سے اسد کی ملاقات کب اور ک[ن] حالات میں ہوگی؟''
حفیظ کپور نے مقبول بھٹی سے ایسا سوال کیا تھا کہ م[یں] سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ یہ میری زندگی کا سب سے حساس ا[ور] سب سے زیادہ نازک پہلو تھا۔ میں اپنی ماں کی تلاش میں ہزاروں کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے یہاں پہنچا تھا اور حالا[ت] و واقعات کے مطابق، بہت جلد میں اپنی ماں سے ملنے وا[لا] تھا۔ حفیظ کپور صاحب نے تو یہاں تک پیش گوئی کردی تھ[ی] کہ آج کی تاریخ میں ماں سے میری ملاقات ہو جائے گی۔ یہ ان کا بہت بڑا دعویٰ تھا۔ اسی سبب مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا ک[ہ] کہیں بھٹی صاحب کے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نہ نکل جائے جس سے، ماں سے ہونے والی ملاقات پر کوئی برا ا[ثر] پڑتا ہو۔ میں نے ابھی بھٹی صاحب کی روحانی قوت کا ثبوت دیکھا تھا۔ یہ شخص کوئی بہت ہی پہنچا ہوا بندہ تھا۔ اگر دل میں خدشات اور ذہن میں اندیشے بھرے ہوں تو ایسے لوگوں کی صحبت سے دور ہی رہنا چاہیے ورنہ ننگی تلوار کسی بھی وقت آپ کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک سکتی ہے۔ ایسے لوگوں کی سنگت صرف ان افراد کو راس آتی ہے جو اندر باہر سے ٹرانسپیرنٹ ہوتے ہیں!
حفیظ کپور کے سوال پر مقبول بھٹی ایک دم سنجیدہ ہوگئے تھے۔ میں یہی سمجھا کہ وہ میرے بارے میں کوئی گمبھیر انکشاف کرنے والے ہیں۔ اس خیال نے میرے دل کی دھڑکن کو خطرناک حد تک بڑھادیا۔ ہم سب کی نظریں مقبول بھٹی کے ہونٹوں پر لگی ہوئی تھیں۔ بالآخر ان کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔ وہ کپور صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔
''حفیظ بھائی! آپ ہمارا امتحان لے رہے ہیں......؟''
''نہیں بھائی۔ ایسی کوئی بات نہیں۔'' کپور صاحب نے جلدی سے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''میں ایسی گستاخی کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ بس، ایسے ہی میں نے آپ

سے پوچھ لیا۔ اگر آپ نہیں بتانا چاہتے تو آپ کی مرضی ہے۔ میں اصرار نہیں کروں گا۔‘‘

’’میں اللہ کا بندہ ہوں سائیں۔‘‘ مقبول بھٹی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ’’میں کچھ نہیں جانتا۔ میرا اللہ سب جانتا ہے اور اس کی مرضی کے بغیر کچھ ہو نہیں سکتا۔‘‘

’’سائیں! اگر کوئی خطرناک بات ہے تو رہنے دیں۔‘‘ شیخ صاحب نے کہا۔ ’’میں آپ کو سچ بتا رہا ہوں۔ حفیظ بھائی کی نیت صاف ہے۔‘‘

’’اگر حفیظ بھائی کی نیت صاف نہ ہوتی تو میں ایک ملاقات کے بعد کبھی ان سے ملنے کی کوشش نہ کرتا۔‘‘ مقبول بھٹی نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ’’یہ میرے بھائی ہیں۔ میں ان سے محبت کرتا ہوں لہٰذا ان کے سوال کا جواب ضرور دوں گا۔‘‘ پھر وہ کپور صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئے۔ ’’آپ نے کیا پوچھا تھا حفیظ بھائی؟‘‘

’’میں نے آپ سے اسد کے بارے میں سوال کیا تھا۔‘‘ حفیظ کپور نے اپنے الفاظ دہراتے ہوئے کہا۔ ’’یہ کسی خاتون کی تلاش میں امریکا سے پاکستان آئے ہیں۔ ان خاتون سے اسد کی ملاقات کب اور کن حالات میں ہوگی؟‘‘

’’حفیظ بھائی! آپ کے سوال کا سیدھا سادہ جواب تو یہ ہے کہ اسد صاحب کی ان خاتون سے ملاقات بہت جلد ہوگی اور انہی حالات میں ہوگی جو اس وقت موجود ہیں۔‘‘

’’بہت جلد سے آپ کی کیا مراد ہے؟‘‘ حفیظ کپور نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ’’کوئی ٹائم فریم دیں......!‘‘

’’ٹائم فریم......‘‘ بھٹی صاحب نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’مثلاً...... افطار کے بعد کسی بھی وقت......‘‘

’’اللہ آپ کی زبان مبارک کرے سائیں۔‘‘ شیخ صاحب نے کہا۔

’’لیکن اسد صاحب کا مسئلہ صرف ایک خاتون سے ملاقات تک محدود نہیں ہے۔‘‘ بھٹی صاحب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

حفیظ کپور نے پوچھا۔ ’’آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟‘‘

’’میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ اسد صاحب اس وقت تین خواتین کی پہیلی ’’سی ایس ڈی‘‘ میں پھنسے ہوئے ہیں۔‘‘ بھٹی صاحب نے کہا۔ ’’سی ان کے ہاتھ سے نکل گئی ہے، ڈی انہیں اپنے ہاتھ میں کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور یہ خود ایس کی تلاش میں امریکا سے پاکستان آ گئے ہیں۔‘‘

افسانچہ

’’اوہ میرے جیون ساتھی! تم کہاں چلے گئے؟ تم تو جانتے ہی ہو کہ اگر ایک پل بھی تم میری نظروں سے اوجھل ہو جاؤ تو میں کتنا بے چین ہو جاتا ہوں۔ اس ڈر سے کہ کہیں کوئی تمہیں چرا نہ لے، میں سوتے وقت تمہیں اپنے سرہانے رکھ کر سوتا ہوں۔ تم نے دیکھا تھا نا کہ میں تمہاری خاطر مبین سے لڑ پڑا تھا کیونکہ اس نے مجھ سے تمہیں آدھے گھنٹے کے لیے ادھار مانگا تھا! تم تو ہر وقت میرے ساتھ ہوتے ہو نا! جو میں دیکھتا ہوں، وہ پہلے تم دیکھتے ہو۔ مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا۔ آج بھی مجھے وہ دن یاد ہے جب تم میرے ہاتھوں گر کر زخمی ہوئے تھے اور میں نے اپنے جیب خرچ سے پچاس روپے بچا کر تمہاری لوہار سے ویلڈنگ کرائی تھی۔ بس...... بس، ایک مرتبہ تم مجھے مل جاؤ، پھر دیکھنا...... میں تمہیں اپنی سر آنکھوں پر بٹھائے رکھوں گا۔ اوہ...... اب مجھے یاد آیا! تمہیں مبین نے اٹھا لے جانے کی دھمکی دی تھی نا! اس لیے میں نے رات کو تمہیں ایک ڈبیا میں بند کر دیا تھا تاکہ مبین تمہیں اٹھا لے جا کر تمہاری توڑ پھوڑ نا کر سکے! اوہ میرے نظر کے چشمے!

پرنس تنویر احمد۔ دادو

سنہری موقع

ایک آدمی کو پاگل کتے نے کاٹ لیا۔ وہ ڈاکٹر کے پاس گیا تو اس نے کہا۔ ’’آپ فوراً ٹیکے لگوا لیں ورنہ آپ پاگل ہو جائیں گے، لوگوں کو کاٹیں گے اور وہ مر جائیں گے۔‘‘

آدمی نے کہا۔ ’’مجھے کاغذ اور قلم دیجیے۔‘‘

ڈاکٹر نے پوچھا۔ ’’کیا آپ وصیت لکھنا چاہتے ہیں؟‘‘

آدمی نے جواب دیا۔ ’’جی نہیں! میں ان لوگوں کی فہرست بنانا چاہتا ہوں، جنہیں میں کاٹوں گا۔‘‘

مرسلہ: اسماعیل نوید...... کراچی

''آپ نے تو واقعی ایک پہیلی بیان کردی ہے بھائی۔'' حفیظ کپور نے کہا۔

''میں نے ''سی ایس ڈی'' کی جو پہیلی بیان کی ہے اسے اسد صاحب بہ خوبی سمجھ گئے ہیں۔'' بھٹی صاحب نے حفیظ کپور کی بات کے جواب میں کہا پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے استفسار کیا۔ ''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نن......نہیں......'' میں نے گڑبڑائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں آپ کا اشارہ سمجھ گیا ہوں۔''

''اسد صاحب! آپ اس وقت ایک محفل میں بیٹھے ہوئے ہیں۔'' حفیظ کپور نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا جی! محفل کے آداب کا تقاضا ہے کہ اشاروں کنایوں میں گفتگو سے اجتناب برتا جائے۔ آپ سی ایس ڈی کے اشارے سے جو سمجھ پائے ہیں وہ ہمیں بھی سمجھائیں۔ یہ ''سی ایس ڈی'' یقیناً گروسری والا اسٹور تو ہو نہیں سکتا......!''

''جی واقعی۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''سی ایس ڈی دراصل تین ناموں کا مخفف ہے۔''

''کون سے تین نام!'' حفیظ کپور نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''ایس کا مطلب تو مجھے معلوم ہے یعنی سلمیٰ نامی وہ خاتون جس کی تلاش میں آپ امریکا سے یہاں آئے ہیں۔ کیا باقی سی اور ڈی بھی خواتین ہی ہیں؟''

''جی انکل! یہ دونوں بھی خواتین ہی ہیں۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

حفیظ کپور نے پوچھا۔ ''یہ کن خواتین کے ناموں کے اشارے ہیں؟''

اس سے پہلے کہ میں حفیظ کپور کے سوال کا جواب دیتا، علی کپور ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور حفیظ کپور کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''پاپا! افطار میں دس پندرہ منٹ کا وقت رہ گیا ہے۔ آپ سب لوگ ڈائننگ میں آجائیں۔ ڈائننگ ٹیبل پر افطاری لگادی گئی ہے۔''

علی کے اس اعلان پر ڈرائنگ روم کی محفل برخاست ہوگئی۔

☆☆☆

مقبول بھٹی میری توقع سے زیادہ گہرا آدمی ثابت ہوا تھا۔ اس نے ''سی ایس ڈی'' کا ذکر کر کے مجھے تشویش میں مبتلا کردیا تھا۔ نہ صرف اس نے ''سی ایس ڈی'' کا کوڈ استعمال کیا تھا بلکہ مبہم انداز میں اس کی وضاحت بھی کردی تھی کہ ''سی'' یعنی شارو میرے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ ''ڈی'' یعنی ڈیلفینا مجھے اپنے ہاتھ میں کرنے کی کوشش کررہی ہے اور ''ایس'' یعنی سلمیٰ صاحبہ کی تلاش میں، میں امریکا سے پاکستان آیا ہوں۔

یہ کوئی معمولی اشارے نہیں تھے۔ یہ میری زندگی کے ماضیِ قریب کا ایک کھلا باب تھا جو مستقبل قریب کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ میں آج سے پہلے کبھی مقبول بھٹی سے نہیں ملا تھا اور نہ ہی یہ باتیں میں نے یہاں کسی سے شیئر کی تھیں پھر بھٹی صاحب میری زندگی کے اس راز سے کس طرح آگاہ ہوگئے تھے؟ عظیم کے ذریعے حفیظ کپور تک صرف اتنی بات پہنچی تھی کہ میں جس خاتون کی تلاش میں امریکا سے کراچی آیا ہوں، ان کا نام سلمیٰ ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ شارو اور ڈیلفینا کا معاملہ مقبول بھٹی تک کیسے پہنچا؟

اس سوال نے میرے ذہن میں کھلبلی مچا رکھی تھی۔ یہ ایسا سوال نہیں تھا جسے نظرانداز کیا جاسکتا۔ بھٹی صاحب نے جس اعتماد کے ساتھ مجھ سے آتشزدگی والے واقعے کے بارے میں پوچھا تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ یہ شخص پریسٹن ہالو والے اس بنگلے میں موجود تھا۔ بہ عین، بھٹی نے کسی شخص سے میرے سنگین جھگڑے کا ذکر بھی کیا تھا اور اس کے لیے ''خون ریز مارا ماری'' کے الفاظ استعمال کیے تھے اور کہا تھا کہ اس واقعے کے بعد میرے لیے کافی مشکلات کھڑی ہوگئی تھیں۔

بھٹی صاحب کا انکشاف مبنی برحقیقت تھا۔ میرے ماضیِ قریب میں یہ واقعی ظہور پذیر ہوچکا تھا۔ شارو کی گمشدگی کے بعد میں بہت پریشان ہوگیا تھا۔ شارو میری عزیز از جان دوست تھی۔ اس سے میری دوستی بھی ایک ہنگامی سچویشن میں ہوئی تھی۔ لیونارڈو نامی ایک غنڈا ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا اور میں نے لیک جیکسن کے ونی لاؤنج ریسٹورنٹ میں لیونارڈو اور اس کے ساتھی غنڈوں کی خوب درگت بنائی تھی۔ اس واقعے نے مجھے شارو کا دوست اور لیونارڈو کا دشمن بنادیا تھا۔ شارو ونی لاؤنج ریسٹورنٹ میں گٹار بجاتی تھی اور گلوکاری کرتی تھی لیکن لیونارڈو سے میری مڈبھیڑ کے بعد شارو نے اس ریسٹورنٹ کی ملازمت چھوڑدی تھی اور میرے ساتھ بے سٹی آگئی تھی۔ لیونارڈو میرے ہاتھوں ہونے والی اپنی ہزیمت کو بھولا نہیں تھا اور مجھ سے انتقام لینے کے لیے اس شیطان نے شارو کو بے سٹی سے اغوا کر کے کیوبا کے شہر ہوانا پہنچادیا تھا۔ ڈیلفینا کے مطابق، لیونارڈو کے ارادے نیک نہیں تھے۔ وہ شارو کو ہوانا سے بہاماز کے شہر ناسو شفٹ کرنا چاہتا تھا اور اسے ''اسکن بزنس'' کے مذموم کام پر لگانا چاہتا تھا۔ میرے لیے یہ تصور کرنا سوہانِ روح تھا کہ میری دوست شارو کو آبروریزی

اور عصمت فروشی کے دھندے میں دھکیل دیا جاتا۔

بھٹی صاحب نے جس بندے کے ساتھ میری خون ریز مارا ماری کا ذکر کیا تھا اس کا نام پیبلو تھا۔ پیبلو، لیونارڈو کا ساتھی تھا۔ میں جب شارو کی تلاش میں بے سٹی سے لیک جیکسن آیا تو پیبلو پر میری نگاہ پڑ گئی تھی اور میں اس کا تعاقب کرتے ہوئے چرچ چکن نامی ایک ریسٹورنٹ کے کچن تک پہنچ گیا تھا۔ زبردست لڑائی کے بعد میں پیبلو کو زیر کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں اس سے شارو کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا لیکن میری مار نے اس کی حالت غیر کر دی تھی۔ اس نے زبان نہیں کھولی اور زندگی کی بازی ہار گیا۔ اس واقعے کے بعد میں واقعی کافی مشکلات کا شکار ہو گیا تھا اور اس جھمیلے سے ڈیلفینا نے مجھے ایسے نکال لیا تھا جیسے کوئی مکھن میں سے بال کو کھینچ کر نکالتا ہے۔

ڈیلفینا نے یہ سب مہربانی مجھ پر کس مقصد کی خاطر کی تھی، یہ ایک طویل قصہ ہے۔ ڈیلفینا کا تعلق ''اسکل اینڈ بونز'' نامی ایک سیکرٹ سوسائٹی سے تھا اور وہ مجھے بھی اپنی سوسائٹی کا ممبر بنانا چاہتی تھی لیکن میں اس کا فرادا ہسپانوی دوشیزہ کے ارمانوں پر اوس ڈال کر پریسٹن ہالو والے بنگلے سے نکل آیا تھا۔ پریسٹن ہالو والے اس بنگلے پر گزرے ہوئے بہتر گھنٹے میری زندگی میں بہت اہمیت کے حامل تھے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کراچی میں رہنے والا مقبول بھٹی میری زندگی کے ان رنگین اور سنگین معاملات سے کس طرح واقف تھا۔ اگرچہ بھٹی صاحب نے کھل کر کوئی بھی بات نہیں کی تھی۔ بس اشارے دیے تھے اور یہ اشارے اپنے اپنے نشانے پر بڑے فٹ بیٹھے تھے!

ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں اس سوال نے بھی سر اٹھایا کہ کہیں مقبول بھٹی کا تعلق بھی ''اسکل اینڈ بونز'' سوسائٹی سے تو نہیں؟

یہ سوال بڑا خطرناک تھا کیونکہ میری معلومات کے مطابق، مذکورہ سیکرٹ سوسائٹی صرف انہی افراد کو اپنا ممبر بناتی تھی جو بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہوں اور ان کا تعلق دنیا کے کسی نہ کسی مذہب سے لازمی ہو۔ لادین افراد کی اس سوسائٹی میں کوئی گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ اس لحاظ سے مقبول بھٹی اس سوسائٹی کے مطلوبہ معیار پر پورے اترتے تھے۔ وہ بے پناہ وجدانی صلاحیتوں کے مالک تھے اور انتہائی مذہبی بھی۔ مجھے پتا چلا تھا کہ وہ پنج وقتہ نماز کے پابند ہیں۔ اس وقت بھی وہ مجھے ڈائننگ ٹیبل پر نظر نہیں آرہے تھے۔ ہم سب تو ڈرائنگ روم سے اٹھ کر ڈائننگ ہال میں آگئے تھے اور مقبول بھٹی وضو کرنے کے لیے واش روم کی طرف چلے گئے تھے۔



''ملک کے ہر شکاری نے اس مچھلی کو پکڑنے کی کئی ہفتے تک مسلسل کوشش کی۔'' ایک شکاری نے گھر آکر اپنی بیوی کو بتایا۔ ''درجنوں شکاریوں کے کانٹوں میں وہ پھنسی مگر ہمیشہ ڈور تڑا کر بھاگ نکلی۔ میں واحد خوش قسمت ہوں جو آج سہ پہر اسے پھانسنے اور کنارے تک لانے میں کامیاب ہو گیا۔''

بیوی نے تعریفی نظروں سے شوہرِ نامدار کی طرف دیکھا۔ ''کہاں ہے وہ مچھلی؟''

''افسوس تو یہی ہے کہ میں اسے کھانے کے لیے گھر نہیں لاسکتا تھا۔''

''کیوں؟''

''کیوں کہ اس کے جسم میں لوہے کے اتنے کانٹے پیوست تھے کہ مجبوراً میں نے اسے کباڑی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔''

میرے ذہن نے مقبول بھٹی کے بارے میں جس انداز میں سوچا، یہ موجودہ سچویشن کے زیر اثر تھا اور نہ میرے پاس اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ سیدھے سادے اللہ والے ہوں اور ایک مخصوص وجدانی کیفیت کے تحت ایسی باتیں کرتے ہوں جن کا تعلق انسان کے ماضی، حال اور مستقبل سے جڑا ہوتا ہے۔ ایسا ہونا ناممکن نہیں۔ اگر کسی انسان کا وجدان اور چھٹی حس تیز ہو تو وہ ان معاملات پر قادر ہو جاتا ہے۔

میں مقبول بھٹی کے خیال کو ذہن سے جھٹک کر ڈائننگ

ہال کا جائزہ لینے لگا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک وسیع وعریض اور عالی شان ہال تھا جس کے ایک حصے میں ٹی وی لاؤنج کی سیٹنگ بنائی گئی تھی۔ ایک دیوار پر کنگ سائز ایل ای ڈی آویزاں تھا اور اس کے سامنے دوسری دیوار کے ساتھ آرام دہ دبیز صوفے لگے ہوئے تھے۔ ان صوفوں پر بہ یک وقت پندرہ سے بیس افراد نشست جما کر ٹی وی پروگرامز سے لطف اندوز ہوسکتے تھے۔

کچھ ایسی ہی صورتِ حال ڈائننگ ٹیبل کی بھی تھی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق، لگ بھگ پچیس افراد وہاں بہ آسانی بیٹھ سکتے تھے۔ مذکورہ ٹیبل اس وقت خورونوش کی مختلف چیزوں سے بھری ہوئی تھی۔ کھجور، پکوڑے، سموسے، رولز، دہی بڑے، فروٹ چاٹ، تازہ پھل الغرض انواع واقسام کی نعمتیں ڈائننگ ٹیبل پر سجی ہوئی تھیں۔ تین چار قسم کے تو ٹھنڈے مشروب ہی تھے۔ آج کا دن خاصا گرم تھا۔ مجھے بھوک کا تو زیادہ احساس نہیں ہوا تھا لیکن پیاس نے اچھا خاصا تنگ کیا تھا۔ اینی ہاؤ، وہ روزہ کیا جو محسوس نہ ہو!

مقبول بھٹی ڈائننگ ٹیبل پر پہنچے تو ہمارے بیچ دوبارہ باتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑانے کے بعد حفیظ کپور سے استفسار کیا۔

''انکل! عظیم کہیں نظر نہیں آرہا۔ کیا وہ ہمارے ساتھ روزہ افطار نہیں کرے گا؟''

حفیظ کپور نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے علی سے پوچھا۔ ''عظیم کہاں گیا ہے؟''

''پتا نہیں پاپا۔'' علی نے اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تو انہیں کافی دیر سے نہیں دیکھا۔''

اکبر اور اس کا بیٹا اصغر ادھر نزدیک ہی موجود تھے تاکہ کسی چیز کی کمی محسوس ہو تو وہ فوراً سرو کردیں۔ زیریں منزل کا کچن ڈائننگ ہال سے ملحقہ تھا جہاں پر گھریلو ملازمائیں مصروفِ کار تھیں۔

''اصغر!'' حفیظ کپور نے اپنے ملازم سے پوچھا۔ ''عظیم کو تم نے دیکھا ہے؟''

''صاحب جی! عظیم صاحب باہر بیٹھے ہیں۔''

''باہر کہاں؟'' حفیظ کپور نے بگڑے ہوئے انداز میں دریافت کیا۔

''گیٹ کے باہر۔'' اصغر نے بتایا۔ ''لان کے ساتھ کرسی پر بیٹھے ہیں۔''

''وہ وہاں بیٹھ کر انڈے دے رہا ہے۔'' حفیظ کپور نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ ''جاؤ...... اس سے کہو، پاپا بلا رہے ہیں۔''

''شاید عظیم کو میری بات بری لگ گئی ہے!'' بھٹی صاحب نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''وہ آئے تو میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے بھائی۔'' حفیظ کپور نے... دوٹوک الفاظ میں کہا۔ ''آپ ایسی کوئی حرکت نہیں کریں گے۔ آپ میرے دوست ہیں۔ عظیم کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے باپ کے دوستوں کا احترام کرے اور ان کی باتوں کو توجہ سے سنے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ آپ اس سے معذرت کریں گے۔'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ نے تو اسد کے بارے میں بھی کتنی باتیں کی ہیں۔ انہوں نے کوئی بُرا منایا؟ آپ کی ہر بات کا جواب اسد نے معقول انداز میں دیا ہے لیکن عظیم کا رویہ انسانوں والا نہیں۔ بھائی! ہم کب کہتے ہیں کہ تم دوسری شادی کرو۔ تمہاری قسمت میں مہرالنسا کے تلوے چاٹنا ہی لکھا ہوا ہے تو ہم کیا کرسکتے ہیں......؟''

میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ جہاں بھی عظیم کا ذکر آتا، وہاں بڑے کپور صاحب اس کی بیوی کا تذکرہ بھی لے آتے تھے۔ اس سے ایک بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی تھی کہ انہیں عظیم سے کم اور مہرالنسا سے زیادہ مسئلہ تھا۔ یہ میرا خیال تھا۔ ممکن ہے، صورتِ حال اس کے برعکس ہو۔ ان لوگوں کے حوالے سے میرا تجربہ محض دو روزہ تھا۔ میں اس فیملی کے پس منظر اور مخصوص خاندانی نفسیات سے کماحقہٗ آگاہ نہیں تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا اور محسوس کیا تھا کہ حفیظ کپور جب بھی عظیم یا اس کی بیوی کے بارے میں کوئی بات کرتے علی بالکل خاموش رہتا تھا۔ وہ ان متنازع معاملات سے اپنی کلی لاتعلقی کا اظہار کرتا تھا۔ علی کا یہ رویہ فطری اور نارمل نہیں تھا۔ اچھا یا برا کوئی نہ کوئی ردعمل ضرور ظاہر کرنا چاہیے تھا۔ باپ کا حد سے بڑھا ہوا احترام اپنی جگہ لیکن حق کا ساتھ دینے کے لیے علی کو اپنی زبان کا استعمال کرنا چاہیے تھا ورنہ اس امر کے امکانات روشن تھے کہ وہ ایک دن بھائی کو کھو بیٹھے گا اور...... اکیلا رہ جائے گا......!

''سائیں! آپ نے اسد صاحب کے بارے میں بالکل ٹھیک کہا کہ انہوں نے بھٹی صاحب کی کسی بات کا برا نہیں منایا۔'' شیخ صاحب نے حفیظ کپور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن میں آپ کو بالکل سچ بتا رہا ہوں کہ یہ بہت گہرے انسان ہیں۔ ابھی تک انہوں نے سی ایس ڈی کا راز نہیں اگلا......''

میں شیخ صاحب کی شرارت کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

حفیظ کپور نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''جی بھائی! آپ کا کیا ارادہ ہے۔ ایس کا راز تو میں

نے کھول دیا کہ آپ سلمٰی صاحبہ کی تلاش میں امریکا سے پاکستان آئے ہیں۔ شیخ صاحب سی اور ڈی کا راز جاننے کے لیے بہت بے تاب ہو رہے ہیں۔ آپ ان کی بے چینی دور کر دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔''

حفیظ کپور کے سیدھے ہاتھ پر میں اور الٹے ہاتھ پر علی بیٹھا تھا۔ جبکہ مقبول بھٹی اور شیخ صاحب سامنے والی نشستوں پر براجمان تھے۔ بات ختم کرتے ہی کپور صاحب نے علی کے کان میں کوئی سرگوشی کی اور گھر کی بالائی منزل کی طرف دیکھا۔ میں سن نہیں سکا کہ انہوں نے اپنے بیٹے سے کیا کہا تھا۔ جواب میں علی نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔

''جی پاپا......!''

اسی لمحے اصغر نے آکر بتایا۔ ''عظیم بھائی آرہے ہیں۔''

''بڑی مہربانی تمہارے عظیم بھائی کی۔'' حفیظ کپور نے اصغر کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا پھر شیخ صاحب اور بھٹی صاحب کی جانب روئے سخن موڑتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''ظلِ سبحانی تشریف لا رہے ہیں۔ باادب، باملاحظہ، ہوشیار......!''

شیخ صاحب اور مقبول بھٹی نے حفیظ کپور کے زہر میں بجھے ہوئے الفاظ پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ شیخ صاحب نے اکبر سے کہا۔

''سائیں بابا! ٹی وی کی آواز ذرا بڑھا دو۔ افطار کا ٹائم ہونے ہی والا ہے۔''

دیوار پر آویزاں ایل ای ڈی آن تھا۔ اکبر حکم کی تعمیل میں ٹی وی لاؤنج کی طرف بڑھ گیا۔ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ہم سب ایل ای ڈی کو بہ آسانی دیکھ رہے تھے۔

اسی لمحے عظیم وہاں پہنچ گیا اور بہ آوازِ بلند کہا۔ ''السلام علیکم!''

سب نے اپنے اپنے انداز میں اس کے سلام کا جواب دیا۔ وہ شیخ صاحب کے پہلو میں بیٹھ چکا تو حفیظ کپور نے کہا۔ ان کا مخاطب عظیم ہی تھا۔

''تم عجیب پاگل انسان ہو۔ سب اندر بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے ہیں اور تمہارا کچھ پتا ہی نہیں۔ کیا مہر النسا کے ساتھ افطار کرنے کا ارادہ ہے؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے پاپا۔'' عظیم نے اپنے موبائل کے کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مہر النسا اس وقت ٹیکساس کے علاقے شوگر لینڈ میں بیٹھی ہے اور وہاں اس وقت صبح کے نو بج کر بیس منٹ ہوئے ہیں۔ میں تو باہر اس لیے بیٹھ گیا

سنہری باتیں

☆ بھوک ہر ایک کے لیے بنیادی محرک ہے، اس کے بغیر زندگی کا تصور مشکل ہے۔

☆ کھانا صرف جینے کے لیے کھایا جائے نہ کہ کھانے کے لیے جینا چاہیے۔

☆ کھانا کھانے میں احتیاط لازم ہے۔

☆ دیر سے کھانا عقل مندی، آدھا پیٹ کھانا عبادت ہے۔

(حکایات سعدیؒ سے انتخاب)

(مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال)

تھا کہ روزہ لگ رہا تھا۔''

''جی سائیں!'' شیخ صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''راز پر سے پردہ اٹھاؤ نا......!''

میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور کہا۔ ''شیخ صاحب! بھٹی صاحب نے بالکل ٹھیک کہا کہ میری زندگی میں تین عورتوں کا بڑا عمل دخل ہے۔ ایس یعنی سلمٰی صاحبہ کے بارے میں تو آپ جان چکے ہیں کہ میں ان کی تلاش میں امریکا سے یہاں آیا ہوں۔ باقی دو عورتوں کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ ڈی یعنی ڈیلفینا ایک ہسپانوی دوشیزہ ہے جو مجھ سے دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی خواہشمند ہے لیکن میرے کچھ تحفظات ہیں اس لیے میں اس سے دور رہنے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہوں۔ جہاں تک ''سی'' کا تعلق ہے تو یہ دراصل 'سی ایچ' یعنی شارو ہے۔ شارو میری ایک بہت اچھی دوست ہے جو چند روز پہلے اچانک غائب ہوگئی تھی۔ اغلب امکان یہی ہے کہ شارو کو میرے کسی دشمن نے اغوا کر لیا ہے۔''

''اوہ......!'' شیخ صاحب نے ہمدردی بھرے لہجے میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو بہت بُرا ہوا۔'' پھر پوچھا۔ ''کیا ڈیلفینا سے آپ کے تحفظات کا سبب یہی شارو ہے؟''

''ایسا کہہ بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی کہہ سکتے۔'' میں نے ذومعنی انداز میں جواب دیا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' شیخ صاحب نے الجھن زدہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

اسی لمحے ٹی وی پر افطار کے ٹائم کا اعلان ہونے لگا۔ حفیظ کپور نے کہا۔ ''سب لوگ دعا کریں۔ روزہ افطار ہونے والا ہے۔ باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔''

ہم سب نے کپور صاحب کی ہدایت پر عمل کرتے

ہوئے دعا کے لیے ہاتھ اٹھادیے۔ مجھے حفیظ کپور سے کیا ہوا وعدہ یاد تھا۔ ان لمحات میں، میں نے خالصتاً حفیظ صاحب کے لیے دعا کی۔

''مالک! تو قادرِ مطلق ہے۔ تو اپنے خاص کرم سے حفیظ کپور کی مشکلات کو ختم کردے۔ انہیں مالی استحکام کے ساتھ صحت اور تندرستی عطا فرما۔ یہ اس وقت محتاجی کی زندگی بسر کررہے ہیں۔ انہیں قرض اور سود کی لعنت سے نجات دلا اور اس خاندان کے تمام افراد میں باہمی محبت کو مسلمہ کردے، خاص طور پر حفیظ کپور اور عظیم کے بیچ جو بے اعتمادی اور تناؤ کی کیفیت ہے اسے زائل کرکے باپ بیٹے کے دلوں کو آپس میں جوڑ دے۔ بے شک! تو ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔''

روزہ افطار ہوگیا۔ میں نے خوردونوش کے معاملات میں بہت احتیاط برتی تھی۔ میں نے کھجور سے روزہ افطار کیا پھر ایک دو پکوڑے کھائے۔ اس کے بعد ٹھنڈے شربت کا ایک گلاس پیا اور تازہ پھلوں سے انصاف کرنے لگا۔ حفیظ کپور نے میری چوری پکڑلی اور بہ صد اصرار مجھے کھلانے لگا۔

میں نے کہا۔ ''سر! میرے پیٹ میں جتنی گنجائش ہے اتنا ہی کھاؤں گا نا!''

''کیا تم یہ مانتے ہو کہ اس وقت ڈائننگ ٹیبل پر کھانے پینے کی جو بھی چیزیں سجی ہیں، یہ سب اللہ کی نعمتیں ہیں؟''

اس نے بے تکلفی سے پوچھا۔

''بے شک! یہ سب نعمتیں مالک ہی نے پیدا کی ہیں۔''

''اور تمہیں یہ بھی پتا ہے نا، یہ ساری نعمتیں اللہ نے انسانوں کے لیے پیدا کی ہیں؟''

''جی جی...... بے شک!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''بس تو پھر آپ یقین کرلیں کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی نعمتیں پیدا کی ہیں، انسان کے معدے میں ان نعمتوں کے لیے اتنے ہی خانے بھی بنائے ہیں۔ ہر نعمت کے لیے ایک الگ خانہ اس لیے......'' لمحاتی توقف کرکے انہوں نے آنکھ ماری اور ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''لہٰذا کھانے پینے کا ایکسلریٹر دبا کر رکھیں اور جب تک معدے کا ہر خانہ لبالب بھر نہ جائے، ہاتھ کو روکنے کی کوشش ہرگز ہرگز نہ کریں۔ آئی بات سمجھ میں؟''

ان کا فلسفۂ خوردونوش میری سمجھ میں تو آ گیا تھا مگر ظاہر ہے، میں اس پر صد فیصد عمل نہیں کرسکتا تھا کیونکہ ایسا کرنا میرے بس کا کام نہیں تھا تاہم ان کی دلجوئی اور اطمینان کے لیے میں نے حصہ بہ قدرِ جثہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہاتھوں کو بھی حرکت کردیا۔

افطار کے بعد ڈنر کا بندوبست بھی کیا گیا تھا لیکن بھٹی صاحب نمازِ مغرب کی ادائیگی کے لیے مسجد کی طرف چلے گئے تو حفیظ کپور نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جب تک بھٹی صاحب نماز پڑھ کر واپس آتے ہیں، ہم ایک ضروری کام کرلیتے ہیں۔''

اپنی بات کے اختتام پر وہ اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور مجھے بھی اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے ان کی تقلید میں کرسی چھوڑ دی اور سوالیہ نظر سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کون سا ضروری کام انکل؟''

''ہمارے درمیان ڈرائنگ روم میں ایک کاروباری معاہدہ ہوا تھا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ ''آپ کو میرے لیے افطار سے پہلے ایک خصوصی دعا کرنا تھی!''

''جی بالکل۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میں نے بڑے بھرپور انداز میں دعا کردی ہے۔''

''آپ نے اپنا کام کردیا ہے تو ڈیل کے مطابق، اب مجھے اپنا کام کرنے کا موقع بھی تو دیں۔'' وہ بہ دستور سنجیدہ لہجے میں بولے۔ ''آئیں میرے ساتھ۔''

بات کے اختتام پر انہوں نے اس زینے کی جانب قدم بڑھادیے جو زیریں منزل کو بالائی منزل سے ملاتا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان کے تیور بدلے بدلے سے نظر آتے تھے۔

''آپ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔ ''آپ کو میں آپ کی والدہ صاحبہ سے ملوانے لے جارہا ہوں۔''

''کک......کیا......'' میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ''یہ......کیسا مذاق ہے......؟'' میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

''بیٹا جی! یہ مذاق نہیں، حقیقت ہے۔'' وہ شفقت بھرے لہجے میں بولے۔ ''اوپر عظیم کے کمرے میں سلمیٰ صاحبہ آپ کا انتظار کررہی ہیں......!''

میں بے یقینی سے یک ٹک حفیظ کپور کو دیکھتا چلا گیا۔

امنگوں، حوصلوں اور آہوں کے بیچ رلاتی۔ کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مدھر گیت سناتی اس ناقابلِ فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

وہ کچھ کر دکھانے کا عزم لے کر فوج میں بھرتی ہوا تھا لیکن تقدیر کا لکھا، بدلنا انسان کے بس میں نہیں۔ بندہ جو سوچتا ہے وہ ہوتا نہیں اور جو ہو رہا ہوتا ہے وہ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا۔ سائمن کے ساتھ بھی وقت نے عجیب کھیل کھیلا تھا۔ اس کے سہانے سپنے سچ ہونے [illegible] زنگ آلود ہو کر رہ گئے۔ ساری نوکری اردلی کے طور پر گزار کر ریٹائر ہو گیا۔ اسے عضوِ معطل کی طرح فوج سے علیحدہ کر دیا گیا۔ نو سال قبل جب اس کی رجمنٹ ترک فوج کے

فرض شناس

وسیم بن اشرف

وہ جو آپس میں یک جان دو قالب تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں بہت بڑا سہارا تھے جانے کیسے ایک ہی منزل کی مسافت کے لیے الگ الگ سمتوں کا تعین کر بیٹھے لیکن... ان میں سے ایک نے ثابت کر دیا کہ رشتہ بنانے سے رشتہ نبھانا کس قدر اہم اور کٹھن ہوتا ہے اور وہ اپنی اس آزمائش میں پورا اتر کر ہمیشہ کے لیے اس کے دل میں پچھتاوا چھوڑ گیا۔

معاشرتی رویوں کے خلاف ایک کم ہمت انسان کا جارحانہ انداز



ساتھ برسرِپیکار تھی تو وہ ایک افسر کا اردلی تھا۔ بارش کی طرح برستی گولیوں میں وہ روزانہ تین بار کھانا لے کر اپنے افسر کے پاس جاتا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس نے ناغہ کیا ہو، فرض شناسی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جب تک جنگ رہی وہ اپنے افسر کے ساتھ رہا۔ برستی آگ اور بہتے خون میں بھی اس کے استقلال و استقامت میں کبھی لغزش نہ آئی۔ جنگ و جدل کے میدان کی تمام سختیاں برداشت کرتا رہا۔ تیر کی طرح چبھتی دھوپ نے اس کا چہرہ جھلسا کر رکھ دیا تھا اور یخ بستہ شب و روز نے اس کے خون کی حرارت چھین لی تھی۔ جب وہ فوج سے ریٹائر ہو کر اپنے گاؤں آیا تو وہ ہڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گیا تھا۔ اسے گٹھیا کا مرض بھی لاحق ہو چکا تھا۔ وہ اس قابل بھی نہیں رہا تھا کہ آبائی کھیتوں پر محنت و مشقت سے پیٹ کا جہنم سرد کر سکے۔

نہ چاہتے ہوئے بھی میاں بیوی نے اپنے گاؤں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیرباد کہنے کا فیصلہ کر لیا۔ تلاشِ معاش میں دونوں شہر چلے آئے۔ روزی روٹی کا بندوبست نہ ہوا تو پریشانیوں نے بوڑھے وجود پر پنجے گاڑ لیے، ناچار سائمن نے بیوی کو ایک تاجر کے ہاں گھریلو کام کاج کے لیے چھوڑ دیا اور خود کسی موزوں کام کے لیے رختِ سفر باندھا۔ دورانِ سفر ایک ریلوے اسٹیشن پر سائمن کو جانا پہچانا چہرہ نظر آیا۔ آنکھیں چار ہوئیں تو دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ یہ اسٹیشن ماسٹر تھا جو سائمن کی رجمنٹ میں افسر رہ چکا تھا۔

''کیا تم سائمن ہی ہو؟''

''جی جناب!''

''یہاں کیسے آنا ہوا؟''

سائمن نے تمام حالات بتا دیے۔

''تو اب کہاں کا قصد کیے ہوئے ہو؟''

''میں تو خود بھی نہیں جانتا جناب کہ میری منزلِ مقصود کہاں ہے؟''

''بیوقوف......''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں جناب...... زندہ رہنے کے لیے کام کی ضرورت ہے، جیسا بھی ہو جہاں بھی مل جائے۔''

''اچھا تو تم یوں کرو اپنی بیوی کو بھی بلا لو، یہاں ایک گینگ مین کی جگہ خالی ہے۔'' پھر اسٹیشن ماسٹر نے اس کی امید بندھائی۔ ''میں متعلقہ افسر سے بات کر کے یہ نوکری تمہیں دلوانے کی کوشش کرتا ہوں، کام بن جائے گا۔''

پندرہ روز بعد اس کی بیوی بھی آ گئی اور وہ دونوں ایک ٹرالی میں بیٹھ کر (جو پٹڑی پر دھکا لگانے سے چلتی ہے) اپنے سرکاری کوارٹر میں پہنچ گئے۔

☆☆☆

اس کا کوارٹر ایک ریلوے اسٹیشن سے دس میل دور اور دوسرے اسٹیشن سے بارہ میل کی مسافت پر دونوں اسٹیشنوں کے درمیان ریلوے لائن کے ساتھ ہی تھا۔ دو میل کے فاصلے پر گھنا جنگل تھا جس کے پار ایک فیکٹری کی بلند و بالا چمنی اس کے کوارٹر میں جھانکتی محسوس ہوتی تھی۔ بطور گینگ مین اس کو جس سامان کی ضرورت تھی وہ اسے فراہم کر دیا گیا۔ مثلاً جھنڈیاں، ہتھوڑا، بگل، ریلوے ٹائم ٹیبل اور وہ تمام اشیا جو دورانِ ڈیوٹی اس کے کام آ سکتی تھیں، اس کو اپنے منحنی وجود میں طاقت کی رمق سی محسوس ہوئی۔ اتنی دلجمعی اور جوش و خروش سے اس نے اپنا کام شروع کر دیا کہ ٹرین کی آمد سے دو گھنٹے قبل ہی کوارٹر سے نکل پڑتا۔ اپنے علاقے میں ریلوے لائن کا بغور معائنہ کرتا اور جب سب ٹھیک محسوس ہوتا تب مطمئن ہوتا۔ وہ ریل کی پٹڑی سے کان لگا کر آنے والی ٹرین کی گونج سنتا، یہ گونج نغمہ بن کر اس کی سماعت کو لطف پہنچاتی۔

کچھ روز گزرنے کے بعد سائمن نے سوچا پڑوس میں بھی تعلقات بنانے چاہئیں۔ اس کے ہمسائے بھی دو گینگ مین ہی تھے جن کے علاقے اس کا سیکشن ختم ہونے کے بعد دونوں طرف شروع ہوتے تھے۔ ایک جانب تو ایک ضعیف شخص تھا جو شاذ و نادر ہی اپنے کوارٹر سے نکلتا تھا۔ اس کی بیوی کام میں اس کا ہاتھ بٹاتی تھی، افسرانِ بالا سوچ رہے تھے کہ چونکہ اب وہ ضعیف ہو چکا ہے اسے ملازمت سے سبکدوش کر دیا جائے۔ دوسری جانب گینگ مین نوجوان ویزلی کا کوارٹر تھا۔ کم گو اتنا جیسے منہ میں زبان ہی نہ ہو اور ہمیشہ اپنے خیالات میں یوں کھویا رہتا جیسے سارا مال و متاع کھو کر اسے پانے کی سوچ میں ہوش کھو بیٹھا ہو۔ سائمن اکثر اس سے ملتا، اس کو اپنے گاؤں کی تاروں بھرے آسمان کے نیچے گزری راتوں کی باتیں اور جنگ و جدل کے قصے سناتا۔ ویزلی سنتا رہتا مگر بولتا بہت کم اور جب لب کھولتا تو سائمن اس کی گنجلک باتیں سمجھنے سے قاصر رہتا۔ ایک دن دونوں پٹڑی پر بیٹھے محوِ گفتگو تھے۔

''مجھے میری زندگی میں کبھی کوئی سکھ نہیں ملا......شاید خدا کی یہی مرضی ہے۔ تقدیر سے کون لڑ سکتا ہے۔'' سائمن نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ تقدیر کیا بلا ہے۔'' ویزلی جھٹ سے بولا۔

''سائمن! تقدیر کوئی چیز نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ ہم ہی ہیں جو غیر محسوس طریقے سے ایک دوسرے کے تعاقب میں لگے ہوئے ہیں۔ برا نہ ماننا، اس روئے زمین پر انسان سے زیادہ خونخوار اور ظالم جانور کوئی نہیں۔ بھیڑیا کبھی بھیڑیے کو نہیں کھاتا لیکن میں ثابت کرسکتا ہوں کہ انسان انسان کو کھا جاتا ہے۔''

''ایسے لفظ تو نہ زبان سے نکالو دوست!'' سائمن نے کہا۔

ویزلی دل آزردہ تھا، بجھے دل سے بولا۔ ''میرے دماغ میں ایک خیال آیا جو میں نے تم پر ظاہر کردیا۔ اس دنیا میں زندہ رہنا کتنا سہل ہوجاتا اگر انسان میں مکاری، لالچ کے بجائے انسانیت اور خلوص ہوتا۔ حالات و واقعات دیکھ کر دل الٹ پلٹ ہوتا ہے۔ ہر شخص تم کو زک پہنچانے، دل دکھانے کی کوشش کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ تمہارے وجود کو اپنی خواہشات کی بھٹی میں بھسم کرکے اپنی ہستی کو نکھارلے۔''

سائمن چند لمحے کے لیے جیسے کہیں کھو سا گیا پھر کہنے لگا۔ ''میرے بھائی تمہاری باتیں کسی جیٹ طیارے کی طرح 'زوں' کرکے میرے سر سے گزر جاتی ہیں۔ ممکن ہے جو تم کہتے ہو وہ ٹھیک ہو، شاید خدا کی یہی مرضی ہو۔''

ویزلی نے برا سا منہ بنایا اور بولا۔ ''تمہارے ساتھ بات کرنا گویا بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔ تم ہر ناخوشگوار واقعے کو خدا سے منسوب کرکے بری الذمہ ہوجاتے ہو۔ دکھ جھیلتے ہو...... مصیبتیں اٹھاتے ہو اور مقدر راستے پر آنے کا انتظار کرتے ہو۔ تم آدمی نہیں جانور ہو جس کو کسی چیز کا احساس نہیں ہے۔''

سائمن نرم دلی سے بولا۔ ''مقدر زور سے نہیں چلتا، تقدیر کے سامنے تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ جو قسمت میں ہے ہوکر رہے گا۔''

''تم بھی مفت کا دردِ سر ہو۔'' ویزلی یہ کہتے ہوئے کھڑا ہوگیا۔ وہ بغیر کچھ کہے چلا گیا، سائمن چلاتا رہ گیا۔ ''دوست! تم ناراض ہوگئے ہو...... غصہ تھوک دو۔'' ویزلی نے اس کی آواز پر کان نہ دھرے اور ریلوے لائن کے موڑ کے ساتھ آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔

دوسرے روز موسم بڑا سہانا تھا۔ گہرے نیلے آسمان نے سورج کو جیسے اپنی کوکھ میں چھپالیا تھا۔ بادل گھر کر آرہے تھے جب جھوم کر برسے تو ہر طرف جل تھل کردیا۔ بارش رکی تو ہر چیز نہا دھو کر یوں چمک رہی تھی...... جیسے سنار کی دکان پر زیورات دمک رہے ہوتے ہیں۔ کوارٹروں میں جمع ہونے والا

پانی نکالنے کے بعد سائمن اور ویزلی ریلوے لائن کے ساتھ خراماں خراماں چلتے، موسم سے لطف اندوز ہوتے دور نکل آئے۔ ویزلی پھر نیا دکھڑا لے کر بیٹھ گیا۔ ''سائمن! یہ مکان جن میں ہم رہتے ہیں، انسانوں کی رہائش کے قابل نہیں۔''

سائمن ویزلی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اتنے شکستہ بھی نہیں ہیں، بہرحال ان میں گزارہ تو ہو ہی رہا ہے۔''

وہ چڑ کر بولا۔ ''بڑی تنگی ترشی سے گزارہ ہورہا ہے، یہ صرف تمہارے ہی گزارے کے قابل ہیں کسی دوسرے کے لیے نہیں، سائمن تمہاری عمر تو زیادہ ہے لیکن تمہارا علم بہت کم ہے۔ تم نے سیر تو بہت کی لیکن دیکھا کچھ نہیں۔ تم نہیں جانتے کہ مردم خور مختلف طریقوں سے تم کو دیمک کی طرح کھا رہے ہیں۔ تمہاری رگوں سے خون چوس رہے ہیں۔ جب تم ناکارہ ہوجاؤ گے تو یہ لوگ تم کو پھینک دیں گے۔ کیا فوج میں تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہوا؟ اچھا تم یہ سوچو کہ تمہیں تنخواہ کتنی ملتی ہے صرف تیرہ روبل...... کیا تم نے کبھی سوچا اتنی قلیل تنخواہ میں تم کتنے عرصے تک روح اور جسم کا رشتہ قائم رکھ پاؤ گے؟ میں تو اس زندگی سے تنگ آگیا ہوں ...... کسی روز یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

سائمن اس کی باتوں کی گہرائی میں گرنے کے بجائے بولا۔ ''تم جاؤ گے کہاں؟ یہاں تمہارے پاس مکان ہے، قریب ہی زمین ہے، جہاں تم اپنی ضرورت کے لیے سبزیاں کاشت کرسکتے ہو۔ تمہاری بیوی ایک محنتی عورت ہے، ہر کام میں تمہارا ہاتھ بٹاتی ہے۔''

''جس زمین کی تم بات کرتے ہو اس میں پچھلے موسم بہار میں' میں نے گوبھی کاشت کی تھی کہ انسپکٹر آگیا۔ میرے کھیت کو دیکھ کر جل بھن گیا۔ جو منہ میں آیا بکتا چلا گیا۔'' ویزلی نے سانس لیا پھر کڑوے کسیلے لہجے میں بتانے لگا۔ ''انسپکٹر نے پوچھا یہ گوبھی تم نے کس کی اجازت سے کاشت کی ہے' اس کو اسی وقت اکھاڑ پھینکو۔ وہ دوبارہ آیا اور مجھے دو روبل جرمانہ کرگیا۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی، بنجر زمین کا ہرا بھرا ہونا اس کی طبع نازک پر شاید بہت گراں گزرا تھا۔ اس مرتبہ اس نے زبان درازی نہیں کی ورنہ وہ میرے ہاتھوں شدید نقصان اٹھاتا۔''

''تم بہت چڑچڑے اور بدمزاج ہو۔'' سائمن نے کہا۔

ویزلی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''میں بدتہذیب ہوں نہ ہی بدخو، میں صرف سچ بولتا ہوں اور اگر اب انسپکٹر آیا اور مجھے پریشان کیا تو میں اس کا منہ نوچ لوں گا۔ میں چیف سے اس کی شکایت کروں گا۔''

پندرہ روز ہی گزرے ہوں گے کہ چیف دورے پر آیا۔ انسپکٹر بھی ساتھ تھا۔ ریلوے کے بڑے افسروں کی ایک ٹیم پیٹرزبرگ سے ریلوے لائن کے معائنے کے لیے آنے والی تھی۔ وہ دونوں اس معائنے کی تیاریوں کا جائزہ لینے آئے تھے۔ ریلوے لائن کے نٹ بولٹ کسے جا رہے تھے۔ پھاٹکوں، کھمبوں اور عمارتوں پر ایسے رنگ و روغن کیا جا رہا تھا جیسے کسی بڑھیا کو میک اپ میں ڈبو کر نئی نویلی دلہن بنایا جا رہا ہو۔ سائمن اور ویزلی بھی اپنے اپنے علاقے میں انہی تیاریوں میں مصروف تھے۔ چیف ٹرالی مین سائمن کی پوسٹ پر آیا۔ سائمن نے فوجی انداز میں ٹھک سے سیلوٹ کیا، سب کچھ ٹھیک تھا۔

چیف نے پوچھا۔ ''کب سے یہاں کام کررہے ہو؟''

''دو مئی سے جناب!'' سائمن نے جواب دیا۔

''کوارٹر نمبر 164 پر کس کی ڈیوٹی ہے؟'' چیف نے پوچھا۔

''ویزلی کی جناب!'' انسپکٹر نے جواب دیا۔

چیف نے پوچھا۔ ''کیا یہ وہی ہے جس کی تم نے گزشتہ برس شکایت کی تھی؟''

''جی جناب! وہی بدماغ ہے؟'' انسپکٹر نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے۔

''چلو آج پھر اس کی خبر لیتے ہیں۔'' چیف نے حکم دیا۔

ملازمین نے پٹڑیوں پر چلنے والی ٹرالی دھکیلنا شروع کی، سائمن کو فکر و اندیشوں نے گھیر لیا۔ وہ دور تک انہیں جاتا دیکھتا رہا۔ اسے خدشہ لاحق ہوگیا تھا کہ آج ضرور یہ افسر ویزلی کی ہڈیاں توڑیں گے۔

دو گھنٹے بعد سائمن حسب معمول اپنے حلقے کی پٹڑیاں چیک کر رہا تھا کہ اس نے دور سے ویزلی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کے سر پر سفید کپڑا بندھا ہوا تھا، ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ کندھے پر ایک چھوٹی سی گٹھڑی لٹکائی ہوئی تھی۔ بائیں رخسار پر رومال بھی بندھا ہوا تھا۔ سائمن کو اپنے اندیشے حقیقت میں ڈھلتے نظر آئے۔ قریب پہنچنے پر سائمن نے دیکھا اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

سائمن نے غمزدہ لہجے میں پوچھا۔ ''یہ سب کیا ہے، کیسے ہوا؟''

''میں ہیڈ آفس ماسکو جارہا ہوں۔'' ویزلی نے کہا۔

''تم ہیڈ آفس شکایت کرنے جارہے ہو۔ کس کس کا دامن پکڑ کر اپنا رونا روتے پھرو گے۔ سب ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہیں۔ اس ارادے سے باز آجاؤ۔ جو کچھ ہوا اسے ایک بھیانک خواب سمجھ کر بھولنے کی کوشش کرو، اسی میں بھلائی ہے۔''

ویزلی تیوریاں چڑھاتے ہوئے دہاڑا۔ ''کیسے بھول جاؤں، ہر چیز کی کوئی حد ہوتی ہے۔ میرے زخمی سر اور چہرے کو دیکھو، کیا میں اس کو بھول سکتا ہوں۔ انسپکٹر نے چیف کے کان بھرے، اس کو اشتعال دلایا۔ کپڑا منہ پر رکھ کر رونے سے بہتر ہے کہ کوئی نہ کوئی فیصلہ ہو ہی جائے۔''

''تم کیا سمجھتے ہو ماسکو میں تمہیں انصاف ملے گا، حق رسی ہوگی، تمہاری شکایت سے جو نتیجہ نکلے گا وہ تمہارے بچے کھچے سکون کو بھی غارت کردے گا۔ تم غریب ہو، اچھائی کی توقع نہ رکھو۔'' سائمن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

ویزلی نے کہا۔ ''میں جھکنے والا ہوں نہ ہی ڈرپوک۔ جانتا ہوں انصاف کی بھیک نہیں ملے گی لیکن اپنے حق کے لیے لڑنے میں جو راحت ملے گی اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔''

''اچھا یہ تو بتاؤ کہ آخر ہوا کیا ہے؟'' سائمن نے پوچھا۔

''چیف اپنی ٹرالی سے اترا۔'' ویزلی نے بتانا شروع کیا۔ ''میرے کوارٹر کا معائنہ شروع کردیا، مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ یہ بڑا کڑا معائنہ ہوگا، اسی لیے میں نے دن رات ایک کرکے ہر شے کو درست کردیا تھا۔ اس کو موقع ہی نہ ملا کہ مجھ سے کسی بات پر باز پرس کرے۔ جب واپسی کے لیے اپنی ٹرالی کی طرف گیا تو میں نے انسپکٹر کی شکایت کردی۔ میری بات سنتے ہی وہ آگ بگولا ہوگیا اور تشدد پر اتر آیا، مجھے تختۂ مشق بنا کر دل کی بھڑاس اچھی طرح نکال لی، میں گم صم کھڑا مار کھاتا رہا۔ مزاحمت بالکل نہ کی، یہی سوچتا رہا کہ اونٹ کبھی تو پہاڑ تلے آئے گا، بس یہی کچھ ہوا۔''

سائمن رقت سے بولا۔ ''تم نے اپنی ایک شکایت کا نتیجہ تو یہیں دیکھ لیا، تمہاری دوسری شکایت کا نتیجہ کیا نکلے گا، خدا بہتر جانتا ہے۔''

ویزلی بھی ضدی واقع ہوا تھا۔ ''اچھا سائمن میں جارہا ہوں، مجھے معلوم ہے ماسکو میں شاید ہی کوئی میری شکایت سنے مگر میں جارہا ہوں۔ میری بیوی کا خیال رکھنا، میری غیر موجودگی میں وہ میرا کام نمٹائے گی۔''

''ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی، خدا کرے تمہاری مراد پوری ہو اور تمہیں انصاف ملے۔'' سائمن نے بے بسی سے کہا، پھر دونوں گلے ملے۔ ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور جدائی کے جنگل میں اپنی اپنی راہ پر چل پڑے۔

کافی عرصہ گزر گیا، ریلوے افسر بھی معائنہ کرکے جا چکے تھے لیکن ویزلی واپس نہ آیا۔ ایک روز لائن پر سائمن کا آمنا سامنا ویزلی کی بیوی سے ہوگیا۔ چہرے پر سوجن،

آنکھیں سرخ، کام کے بوجھ کے باعث وہ نیم جان نظر آ رہی تھی اور خاوند کی جدائی نے جیسے اس کا حسن گہنا دیا تھا۔ وہ افسردہ دکھائی دے رہی تھی۔

"ویزلی کا کچھ اتا پتا چلا؟" سائمن نے پوچھا۔

شدت غم سے اس کی آواز نہ نکلی، اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ کوئی خبر نہیں۔ سائمن نے اس کی ڈھارس بندھائی اور دونوں چل پڑے۔

سائمن نے بچپن میں ایک خاص قسم کی لکڑی سے بچوں کے لیے باجے بنانا سیکھے تھے۔ وہ فرصت کے لمحات میں باجے بناتا اور دوستوں کے ذریعے شہر میں فروخت کر دیا کرتا تھا۔ سائمن نے سوچا پھر سے یہ کام کیوں نہ شروع کر دوں۔ تھوڑی بہت آمدنی ہو جایا کرے گی۔ ایک روز کام ختم کرنے کے بعد سائمن اس خاص لکڑی کی تلاش میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ کچھ زیادہ ہی دور نکل گیا اور اس مقام پر پہنچ گیا جہاں پٹڑی ایک پل سے گزرتی تھی۔ اس پل کے ساتھ ہی جنگل تھا جہاں سے باجوں کے لیے لکڑی مل سکتی تھی۔ سائمن پل سے اترا اور جنگل میں گھس گیا۔ کچھ ہی دیر میں اس کی تلاش رنگ لائی اور اسے مطلوبہ لکڑی مل گئی۔ اس نے درختوں سے لکڑی کاٹنا شروع کر دی۔ ضرورت کے مطابق لکڑیاں کاٹنے کے بعد ان کی ایک گٹھڑی بنائی اور ریلوے لائن کی طرف قدم بڑھا دیے، سورج غروب ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ فضا بالکل ساکن تھی۔ گھونسلوں کی جانب گامزن پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سائمن ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اس کی سماعت سے عجیب سی آواز ٹکرائی۔ پہلے اس نے وہم سمجھا لیکن دوبارہ ویسی ہی آواز نے اسے مخمصے میں ڈال دیا۔ یہ آواز کیسی؟ اس نے سوچا، دھیان دیا اسے لگا جیسے لوہے سے لوہے کو ٹکرایا جا رہا ہے۔ اس کی چال میں تیزی آ گئی۔ وہ جانتا تھا کہ ریلوے لائن پر مرمت کا کام نہیں ہو رہا پھر ان آوازوں کے کیا معنی؟ وہ پل پر آ گیا، اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ کوئی شخص ریل کی پٹڑی کے ساتھ ٹھوک پیٹ کر رہا تھا۔ وہ تیز قدموں سے اس شخص کی جانب بڑھا، وہ بھونچکارہ گیا جب اس نے ویزلی کو دیکھا۔ وہ پٹڑی اکھاڑنے میں کامیاب ہو چکا تھا اور ایک ٹکڑے کو پل سے نیچے پھینک دیا تھا۔ سائمن کی حالت ایسی تھی جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ ویزلی نے سائمن کو دیکھا، اندھیرا بہت گہرا نہیں ہوا تھا۔ ملگجی فضا تھی، ویزلی کچھ دیر سائمن کو گھورتا رہا اور پھر بات کیے بغیر پل سے اترائی کی جانب چل دیا۔

سائمن نے پکارا۔ "دوست واپس آ جاؤ" ویزلی

یہ تم نے کیا کیا؟

☆ اے انسان تُو نے رب کو پہچانا مگر معرفت کا حق ادا نہ کیا۔

☆ قرآن پڑھا مگر اس پر عمل نہ کیا۔

☆ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں کھائیں مگر شکر ادا نہ کیا۔

☆ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تو کی مگر ان کی سنت پر عمل نہ کیا۔

☆ شیطان سے دشمنی کا دعویٰ تو کیا مگر اس کی بھرپور مخالفت نہ کی۔

☆ جنت کی آرزو تو کی مگر اسے حاصل کرنے کا سامان نہ کیا۔

☆ جہنم سے پناہ تو مانگی مگر گناہ نہ چھوڑے۔

☆ موت کو برحق جانا مگر اس کی تیاری نہ کی۔

☆ عزیز واقارب، دوستوں کو دفن کرتا رہا مگر عبرت حاصل نہ کی۔

☆ اپنے عیب نظر نہ آئے اور ساری عمر دوسروں کے عیب تلاش کرتا رہا۔

(مرسلہ: جاوید اختر رانا۔ پاکپتن شریف)

پیٹ کا غلام

اگر پیٹ نہ ستاتا تو کوئی پرندہ شکاری کے جال میں نہ آتا بلکہ شکاری جال ہی نہ بچھاتا۔ پیٹ ہاتھ کی ہتھکڑی اور پیر کی بیڑی ہے۔ پیٹ کا غلام اللہ تعالیٰ کی عبادت بہت کم کرتا ہے۔ عقل مند لوگ بہت دیر میں کھاتے ہیں اور عبادت گزار آدھا پیٹ کھاتے ہیں اور متقی صرف جینے کے لیے کھاتے ہیں اور جوان اس وقت تک کھاتے ہیں جب تک طباق نہ اٹھالیں۔ بوڑھے اس وقت تک کھاتے ہیں جب تک پسینا نہ آ جائے۔ کیا خوب بات ہے کہ پیٹ کے قیدی کو دو راتیں نیند نہیں آتی۔ ایک رات تو معدہ بھاری ہونے کی وجہ سے اور دوسری رات بے چینی کی وجہ سے۔

(مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال)

نے سنی ان سنی کر دی، سائمن پھر رنج و غم سے چیخا۔ ’’ویزلی! مت کرو ایسا، ملک الموت کو دعوت نہ دو، خدا کے لیے لوٹ آؤ۔ لاؤ ہتھوڑا مجھے دو، ہم دونوں مل کر اس پٹڑی کو صحیح جگہ پر لگا دیں گے۔ ابھی تک سوائے میرے تمہیں کسی نے نہیں دیکھا۔ ابھی تو کچھ نہیں بگڑا، تم نہ آئے تو جانتے ہو کیا قیامت آجائے گی، سیکڑوں گھروں میں جلتے چراغ گل ہو جائیں گے۔ مائیں پاگل ہو جائیں گی۔ ہنستے بستے گھر اجڑ جائیں گے۔ نہ جانے کتنے بچے یتیم ہو جائیں گے اور یہ سب تمہاری گردن پر ہوگا، واپس آجاؤ میرے دوست! تمہاری بیوی تمہاری راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھی ہے۔‘‘ ویزلی نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا اور تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا جنگل میں گم ہو گیا۔

سائمن کے اوسان خطا ہو گئے۔ سمجھ نہ آیا کہ کیا کرے؟ اکیلا اس قابل نہ تھا کہ پٹڑی کے بھاری بھرکم ٹکڑے کو نیچے سے اٹھا کر پل پر لاتا اور لائن کو ٹھیک کر دیتا۔ وہ مدد کے لیے سینے کا پورا زور لگا کر چلایا، کوئی ہے؟ کوئی ہے؟ وہ پھر زور سے مدد کے لیے پکارا مگر اس کی چیخ و پکار پر کس نے کان دھرنے تھے۔ آس پاس کیا دور دور تک کوئی ذی نفس موجود نہ تھا۔ اس کا کلیجا سلگنے لگا، اس کڑی مشکل میں کچھ سجھائی نہ دیا تو مدد کے لیے اپنے کوارٹر کی جانب بھاگ پڑا۔ تھوڑی دور بھی نہ گیا ہوگا کہ کارخانے کے ساڑھے سات بجانے والے گھنٹے کی ٹن ٹن سنائی دی۔ اس کا مطلب تھا کہ مسافر ٹرین کے آنے میں صرف پانچ منٹ رہ گئے ہیں۔ پانچ منٹ میں تو وہ بمشکل کوارٹر تک ہی پہنچ پاتا، وہ واپس بھاگا۔ بدحواسی کے عالم میں گرتے پڑتے، اس مقام پر پہنچا جہاں سے لائن ٹوٹی ہوئی تھی۔

’’اب کیا کروں؟‘‘ اس نے خود کو کبھی اتنا بے بس نہ پایا تھا، اس کے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ حل سجھائی دے گیا تھا۔ تیز رفتار گاڑی کے ڈرائیور کو صرف سرخ جھنڈی ہی ٹرین روکنے پر مجبور کر سکتی تھی مگر سرخ جھنڈی کہاں سے لائی جائے؟ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ چہرہ پسینے سے بھیگ گیا۔ آنے والے قیامت خیز مناظر اک پل کے لیے اس کی آنکھوں میں گھوم گئے۔ ہر طرف خون، چیخ و پکار، زخمی، لاشیں، بے بسی سے مرتے بے گناہ لوگ، گاڑی پوری رفتار سے آئے گی اور چشم زدن میں پٹڑی سے اتر کر پچاس فٹ اونچے پل سے نیچے کی طرف ایسے جائے گی جیسے آسمان سے ٹوٹا ہوا تارا زمین کی طرف آتا ہے۔ ریل کی بوگیاں نہ جانے کتنے انسانوں کو پیستی ہوئی ایک دوسرے میں پیوست ہو جائیں گی اور پھر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اِدھر اُدھر بکھر جائیں گی۔

ریلوے لائن پر بہت دور ایک چھوٹا سا سیاہ دھبا نمودار ہونا شروع ہوا جو لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ قیامت خیز گھڑیاں ایک بڑے سانحے کو جنم دینے والی تھیں۔ سائمن پتھر کا بت بنا ٹکٹکی باندھے دھبے کو بڑا ہوتے دیکھتا رہا۔

اچانک اسے ایک خیال سوجھا۔ اس نے اطمینان کی ایک لہر سی دوڑتی محسوس کی۔ فیروزمندی کا تمغا اس کے سینے پر سجنے والا تھا۔ وہ بجلی کی سی سرعت سے دوڑتا ہوا لکڑی کے گٹھے تک گیا۔ سب سے لمبی لکڑی نکالی، لکڑی کاٹنے والا تیز دھار چاقو اٹھایا اور تیزی سے بھاگتا ہوا ریلوے لائن پر آیا۔ کمر پر بندھی پیٹی سے سفید رومال نکالا۔ رومال کو لکڑی پر باندھ کر جھنڈی بنالی۔ نظریں آسمان کی طرف اٹھائیں، چند لمحے کے لیے ان بے کراں وسعتوں کے مالک کو یاد کیا، چاقو والا ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور پلک جھپکتے ہی اس کے پیٹ میں پیوست ہو گیا۔ سائمن نے دیدہ دلیری سے چاقو نکالا اور گھاؤ والی جگہ پر سفید جھنڈی رکھ دی۔ زخم سے جاری خون کی دھار نے پل بھر میں سفید جھنڈی کو سرخ کر دیا۔ اب وہ عام سرخ جھنڈیوں کی نسبت زیادہ سرخ ہو کر ہوا میں لہرا رہی تھی۔ سائمن ایک ہاتھ سے سرخ جھنڈی لہرا رہا تھا۔ دوسرا ہاتھ گہرے گھاؤ پر رکھا ہوا تھا۔ خون بہت تیزی سے بہہ رہا تھا، اس پر نقاہت طاری ہونے لگی۔ سر چکرانے لگا۔ وہ ہر ممکن کوشش کر رہا تھا کہ ڈرائیور ٹرین کی تیز روشنی میں خطرے کی جھنڈی دیکھ لے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے گول گول سیاہ دائرے بننا شروع ہو گئے تھے۔ وہ کوشش کرنے لگا کہ کچھ دیر اور کھڑا رہے، اس نے تب تک ہمت نہ ہاری جب تک اس کی ٹانگوں نے ساتھ نہ چھوڑ دیا۔ بالآخر وہ گر گیا۔ اس سے پہلے کہ جھنڈی بھی گرتی ایک ہاتھ آگے بڑھا اور جھنڈی کو تھام لیا۔ سرخ جھنڈی ہوا میں لہرا رہی تھی۔ ریلوے لائن پر سیاہ دھبا ریلوے انجن کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ ڈرائیور نے دور سے سرخ جھنڈی دیکھتے ہی ٹرین کی رفتار کم کرنا شروع کر دی۔ ٹرین رینگتے رینگتے عین اس جگہ پر آرکی جہاں سے پٹڑی کا ٹکڑا اکھاڑا گیا تھا۔ اِدھر ٹرین رکی اُدھر سائمن کی سانسیں رُک گئیں۔ مسافر نیچے اتر آئے۔ ٹرین کا عملہ بھی آگیا۔ سبھی نے دیکھا ایک لاش خون میں لت پت پڑی تھی اور دوسرا شخص خون آلود جھنڈی ہاتھ میں لیے لاش کی پیشانی کو بوسہ دے رہا تھا، یہ دوسرا شخص ویزلی تھا۔



جواری

شاہ زین رضوان

کھیل چاہے جو بھی ہو آخری بات اس کی جیت اور ہار پر ختم ہو جاتی ہے مگر بہ ظاہر ختم ہونے والی یہ بات کچھ لوگوں کے لیے انا کا ایسا مسئلہ بن جاتی ہے جو شاید زندگی کے نشیب و فراز سے الجھتے ہوئے آخری سانس پر آکر تھمتی ہے وہ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا جسے بساط چاہے کوئی بھی ہو شکست کسی حال میں منظور نہ تھی۔

زندگی کی بساط پر جال بچھانے والے جواری کا ماجرا

کورے کالان نے نظر گھما کر اپنے برابر میں بیٹھی نوجوان لڑکی... کی طرف دیکھا۔ اس کی عمر بہ مشکل اٹھارہ سال ہو گی۔ اس نے بہترین لباس زیب تن کر رکھا تھا لیکن وہ سب سے زیادہ بے چین اور گھبرائی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ”کیا ٹرین کے آنے کی کوئی اطلاع ہے؟“

ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر بیٹھے ہوئے کلرک نے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی نئی اطلاع نہیں، سوائے اس کے کہ ٹرین پینتالیس منٹ دیر سے آئے گی۔"

یہ سن کر ایک شخص نے جھلاہٹ میں اپنا کاؤبوائے ہیٹ زمین پر پھینک دیا۔ اس کی پیٹی کے ساتھ ہولسٹر بندھا ہوا تھا اور کورے نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا کہ وہ آرمی کولٹ ہے۔ اس شخص کے چہرے پر غصہ نظر آرہا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ بہ مشکل تمام ٹرین کی روانگی کے مقررہ وقت سے دس منٹ پہلے ریلوے اسٹیشن پہنچنے میں کامیاب ہوسکا تھا اور اب اسے یہ اطلاع مل رہی تھی کہ ٹرین پینتالیس منٹ لیٹ ہے۔ اس نے زمین پر پیر پٹختے ہوئے کہا۔ "ہمیں مزید کتنی دیر انتظار کرنا ہوگا؟"

کھڑکی کے ساتھ کھڑی ہوئی نوجوان عورت نے اسے غور سے دیکھا اور اس کے برابر میں کھڑے شخص کے تاثرات کچھ یوں تھے جیسے وہ ریلوے والوں کو اس تاخیر کا مزہ چکھادے گا لیکن وہ خود ایک طویل قامت اور دبلا پتلا شخص تھا اور اس نے ایک بوسیدہ سا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "کتنی عجیب بات ہے کہ ریل گاڑی ہمیں ایک بندرگاہ سے دوسری بندرگاہ تک تو پہنچادیتی ہے لیکن کنڈیکٹر چاہے کتنی کوشش کرے، وہ مقررہ وقت پر اس کی آمد اور روانگی کو یقینی نہیں بناسکتا۔"

پہلے شخص نے اسے گھور کر دیکھا اور کوئی جواب دیے بغیر فرش سے اپنا ہیٹ اٹھا کر سر پر رکھ لیا۔ کورے بڑے غور سے یہ سب باتیں دیکھ اور سن رہا تھا۔ اسے باکسنگ کیریئر شروع کرنے کے بعد ٹرین سے سفر کرنے کا اکثر موقع ملتا رہتا تھا اور وہ جانتا تھا کہ دبلا پتلا شخص ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ٹرینیں اور کوچز کبھی بھی وقت پر نہیں آتیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اس نے گزشتہ برسوں میں کافی وقت سفر میں گزارا ہے اور وہ جانتا ہے کہ ٹرین لیٹ ہونے کی وجہ سے جو مایوسی اور بوریت ہوتی ہے، اس سے کیسے نمٹا جائے۔ وقت گزارنے کے کئی طریقے تھے جن میں مسافروں کو دیکھنا، ان سے باتیں کرنا، دیوار سے لگ کر اونگھنا، کتاب پڑھنا یا پھر کسی بھی کھیل میں شامل ہوجانا تھا۔

"تم جانتے ہو کہ تیزی سے وقت گزارنے کا بہترین طریقہ کون سا ہے؟" منحنی شخص نے کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ہم تاش کھیل سکتے ہیں۔"

کورے نے اپنی بائیں جانب دیکھا۔ مس پنڈورا ہارسن اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے اپنی بھویں اوپر اٹھائیں۔ کورے نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر ایک جھٹکے سے سر گھما کر اپنے باکسنگ منیجر پیٹرک سولیون کی طرف دیکھا جو اس کی دائیں جانب نیند کے مزے لے رہا تھا۔

مس ہارسن مسکرائی اور دوسری جانب دیکھنے لگی۔

دبلے آدمی نے اپنا بیگ کھولا اور ہیئر برش کے ڈھیر میں تاش کی گڈی تلاش کرنے لگا۔ "مجھے معلوم ہے کہ میرے پاس ایک گڈی ہے۔" اس نے انہیں یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ کیا کہتے ہو؟ کیا کوئی ایک بازی لگانے کے لیے تیار ہے؟"

جس شخص نے کچھ دیر پہلے اپنا ہیٹ پھینکا تھا، وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ میں ایک دو بازیاں کھیل سکتا ہوں...... اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہارے پاس اتنی رقم ہے۔" پھر اس نے اپنے بھاری بیگ اٹھائے اور اپنے بھائی کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ "جارج! تم ان کا خیال رکھنا، جب تک میں کچھ اور پیسے بنالوں۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ کوئی اچھی بات ہے برٹ؟" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمارے پاس کافی رقم ہے۔"

"احمق۔" برٹ نے تلخی سے کہا۔ "کبھی کسی کے پاس کافی رقم نہیں ہوتی۔"

"اوہ...... مل گئے۔" برش والے شخص نے ایک پرانی گڈی دکھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم تھا کہ میں نے اسی بیگ میں رکھی تھی۔"

کورے نے مس ہارسن کے تھوڑا قریب ہوتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ "تم کھیل رہی ہو؟"

اس نے اپنے سرخ بال پیچھے کی طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔ "ہم دیکھیں گے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس کا انحصار اس پر ہے کہ کون اس کھیل میں شریک ہورہا ہے۔ مجھے تو برش والا کوئی پیشہ ور جواری لگتا ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟" کورے نے سرگوشی میں کہا۔ اسی دوران وہ شخص اپنے برش واپس بیگ میں رکھنے لگا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ایک برش اس طرح ہاتھ میں پکڑا کہ وہ سب لوگوں کو نظر آجائے۔ اس وقت وہاں تقریباً بیس افراد تھے، وہ سب برٹ اور اس شخص کی حرکتیں دیکھ رہے تھے۔

"چونکہ میں یہ برش باہر نکال چکا ہوں۔" دبلے شخص

نے اعلان کیا۔ "اس لیے میرا خیال ہے کہ مجھے یہ پوچھ لینا چاہیے، کیا تم میں سے کوئی یہ برش خریدنا چاہتا ہے؟ یہ بہت اچھی کوالٹی کے ہیں اور کسی بھی مشہور برانڈ کے مقابلے میں بہت عمدہ ہیں۔ خاص طور پر الجھے ہوئے بالوں کو سیدھا کرنے کے لیے بہترین ہیں۔"

برٹ نے بے صبری سے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ہمیں کھیل شروع کرنا چاہیے۔ کیا تمہیں ایسا لگتا ہے کہ میرے بالوں کو کسی برش کی ضرورت ہے؟"

کورے طنزیہ انداز میں مسکرا دیا۔ اسے یاد آ گیا کہ وہ اور جارج کس طرح بھاگم بھاگ ٹرین پکڑنے کے لیے اسٹیشن پہنچے تھے اور اب وہ وقت سے فائدہ اٹھانا چاہ رہا تھا۔

دبلے شخص نے برٹ کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میں یہ نہیں سوچ رہا تھا کہ تم اپنے لیے یہ برش خریدو گے لیکن یقیناً تمہاری زندگی میں کوئی خاص عورت ہو گی جسے یہ تحفہ پسند آئے گا۔"

"یہ صحیح کہہ رہا ہے برٹ۔" جارج بولا۔ "میں شرطیہ کہتا ہوں کہ جب ہم مس این سے ملنے پورٹ لینڈ جائیں گے تو وہ تمہارا خریدا ہوا برش دیکھ کر خوش ہو جائے گی۔"

برٹ کو اپنے بھائی کا تبصرہ پسند نہیں آیا اور وہ ناگواری سے بولا۔ "کیا تم اپنی زبان بند نہیں رکھ سکتے؟"

"میرا مقصد تو صرف اچھا مشورہ دینا تھا۔" جارج ڈھٹائی سے بولا۔

"پھر تم کیا کہتے ہو؟" سیلزمین اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "کیا تم اپنی مس این کے لیے ایک برش خریدنا چاہو گے؟"

"غالباً نہیں۔" برٹ جھلاتے ہوئے بولا۔ "لیکن میں تم سے اس کھیل میں رقم جیتنا چاہتا ہوں۔"

جارج کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ "تم واقعی سمجھتے ہو کہ یہ کوئی اچھا خیال ہے۔ تمہیں......"

برٹ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اپنی زبان بند رکھو اور مجھے تنگ مت کرو۔"

جارج نے اسے غصے سے دیکھا لیکن کچھ نہیں بولا۔

برٹ نے ایک چھوٹی میز اپنی طرف کھینچی تو اس پر رکھے ہوئے بہت سے پمفلٹ زمین پر گر گئے۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" کلرک اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اس پر چلّایا۔

برٹ اسے گھورتے ہوئے بولا۔ "اب اگر تم کچھ بولے تو اچھا نہیں ہو گا۔ بہتر ہو گا کہ تم ہمیں ٹرین کے آنے کے بارے میں بتاؤ۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں ٹرین کے آنے کا پتا چل جائے گا۔" جارج نے کہا۔ "اسٹیشن کے قریب آ کر وہ وسل دیتی ہے۔"

برٹ اسے گھور کر رہ گیا۔ سیلزمین نے ابھی تک برش بیچنے کا ارادہ ترک نہیں کیا تھا۔ وہ کورے کی جانب مڑا اور برش اس کے قریب لاتے ہوئے بولا۔ "تم کیا کہتے ہو۔ شاید یہ خاتون تمہاری جانب سے اس طرح کا تحفہ لینا پسند کریں۔ ان کے سرخ بال بہت ہی خوب صورت ہیں۔ جب یہ روزانہ رات کو ان میں برش کریں گی تو یہ دوپہر کی دھوپ میں پیتل کی طرح چمکیں گے۔"

مس ہارسن نے کورے کی طرف ترچھی نگاہوں سے دیکھا۔ سیلزمین کے طرزِ تخاطب پر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ کورے سے اس کی شادی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی ان کے درمیان اس طرح کی کوئی بات تھی۔ گو کہ انہیں ایک ساتھ سفر کرتے ہوئے چھ ماہ ہو چکے تھے۔ ایک خاتون پیشہ ور جواری ہونے کی وجہ سے وہ ایک باکسر اور اس کے منیجر کے ساتھ سفر کرنا سود مند سمجھتی تھی اور کورے بھی ایک دوست کی حیثیت سے اس کا ساتھ پسند کرتا تھا۔

"تم کیا کہتی ہو مس ہارسن؟" اس نے پوچھا۔ "کیا تم ایک برش لینا پسند کرو گی؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "تمہاری پیشکش کا شکریہ مسٹر کالان لیکن میرے پاس پہلے سے ایک برش موجود ہے۔"

"لیکن اس جیسا نہیں ہو گا۔" سیلزمین نے اصرار کرتے ہوئے کہا پھر وہ ایک چھوٹا برش اس کے قریب لاتے ہوئے بولا۔ "تم ذرا اس پر ہاتھ پھیر کر دیکھو۔"

جب مس ہارسن نے اپنا ذہن تبدیل نہیں کیا تو سیلزمین نے کورے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تم کیا کہتے ہو...... اگر اس وقت پیسے کم ہیں تو تم ہمارے ساتھ تاش کیوں نہیں کھیلتے۔ شاید تم اتنی رقم جیت جاؤ جو اس خوب صورت خاتون کے برش خریدنے کے لیے کافی ہو۔"

کورے نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں تاش نہیں کھیلتا۔"

برٹ اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "کیوں نہیں؟"

کورے نے اپنی جگہ سے اٹھے بغیر اسے دیکھا۔ سب سے پہلے اس کی نظر اس کے ہولسٹر پر گئی جس میں سے اس کی گن جھانک رہی تھی۔

"پو کر دیکھنے میں آسان لگتا ہے لیکن یہ ایک کافی پیچیدہ کھیل ہے۔ میرا حساب ہمیشہ سے کمزور ہے اس لیے میں اسے نہیں سیکھ سکا۔"

برٹ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں یہی سیکھنے کا وقت ہے۔"

اب کورے کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ قد میں وہ اس سے دو انچ زیادہ تھا اور اس کے مقابلے میں مضبوط جسامت رکھتا تھا۔ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے تاش کھیلنا سکھاؤ گے؟"

برٹ کو یہ امید نہیں تھی کہ کورے اس سے قد اور جسامت میں بڑا ہو گا۔ اس نے ڈھیٹ بنتے ہوئے کہا۔ "مجھے ایسا لگا کہ تمہیں ایک سبق کی ضرورت ہے۔"

"ہمیں کسی مشکل میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے برٹ۔" اس کے بھائی نے کہا۔ "یاد کرو تم نے مجھ سے کیا کہا تھا کہ جب تک ٹرین نہیں آجاتی، ہمیں خود کو لڑائی جھگڑے سے دور رکھنا ہے۔"

"کیا تم اپنی زبان بند نہیں رکھ سکتے؟" برٹ نے کورے پر سے نظریں ہٹائے بغیر اس سے کہا۔

"جنٹلمین۔" سیلزمین مداخلت کرتے ہوئے بولا۔ "لڑنے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ صاحب کھیلنا نہیں چاہتے تو مجھے یقین ہے کہ کوئی اور ہمارے ساتھ کھیل میں شامل ہو جائے گا۔"

اسی اثنا میں پیٹرک کی آنکھ بھی کھل گئی اور وہ چونکتے ہوئے بولا۔ "کیا ہو رہا ہے کورے؟"

"کوئی خاص بات نہیں ہے۔" سیلزمین بولا۔ "ہم صرف تاش کھیلنا چاہ رہے ہیں۔"

"ایک دو گیم تو میں بھی کھیل سکتا ہوں۔" پیٹرک بولا۔

"بہت عمدہ۔" سیلزمین نے کہا۔ "اب ہم صرف ایک یا دو مزید......"

ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا لیکن اس کے برابر بیٹھی ہوئی لڑکی نے اسے دوبارہ بینچ پر بٹھا دیا اور اس کے کان میں سرگوشی کرنے لگی۔

"تمہارا کیا خیال ہے مس ہارسن؟" پیٹرک نے پوچھا۔ "تم ہمیشہ اچھا کھیلتی ہو۔"

پیٹرک کے سوال پر برٹ تالی بجاتے ہوئے بولا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ ہم پوکر کھیلنے کی بات کر رہے ہیں؟"

پیٹرک نے مس ہارسن کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ یہ بہت اچھا کھیلتی ہے......"

"تمہارا شکریہ مسٹر سولیون۔" مس ہارسن نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اس وقت میں بہت تھکن محسوس کر رہی ہوں۔ میں نہیں سمجھتی کہ آج تمہارے ساتھ اس کھیل میں شامل ہو سکوں گی۔"

"لیکن تم......"

کورے خاتون کی مدد کے لیے آگے بڑھا اور بولا۔ "تمہیں اس کے بغیر ہی کھیلنا ہو گا۔ اس کے علاوہ ٹرین عین اس وقت آسکتی ہے جب تمہاری پہلی بازی چل رہی ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ اگر یہ نہیں کھیلنا چاہتی تو کوئی بات نہیں۔" پیٹرک نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہمیں اب بھی ایک کھلاڑی کی اور ضرورت ہے۔" سیلزمین نے اونچی آواز میں کہا لیکن وہ براہِ راست کھڑکی کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "کیا کوئی اور ہمارے ساتھ کھیل میں شامل ہونا چاہتا ہے؟"

یہ دعوت بظاہر اسی شخص کے لیے تھی۔ اس نے لڑکی کا بازو جھٹکا اور کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "میں کچھ بازیاں کھیلنا چاہوں گا۔"

لڑکی نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اوہ ڈیوی! تم جانتے ہو کہ ہمارے پاس اس کھیل کے لیے کافی رقم نہیں ہے۔ اگر ہار گئے تو کیا ہو گا؟"

"ہم جیت بھی تو سکتے ہیں ایما۔" مرد نے بحث کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہماری نئی زندگی شروع کرنے میں مددگار ہو گا۔"

"یہی جذبہ ہونا چاہیے دوست۔" سیلزمین نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔

کورے نے اسے گھورا اور مس ہارسن کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔ "تمہارے خیال میں اس کے جیتنے کا کوئی امکان ہے؟"

وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ "میں نہیں سمجھتی کہ وہ مسٹر سولیون سے زیادہ برا کھلاڑی ہو گا۔"

"اور اس کاؤبوائے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"اسی کی وجہ سے میں نہیں کھیل رہی۔" مس ہارسن نے کہا۔ "میں نہیں سمجھتی کہ وہ آسانی سے ہار مان لے گا۔"

برٹ کو کرسیاں تلاش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ وہ سیدھا ان کرسیوں کی طرف گیا جہاں دو لڑکے اپنے والدین کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے ان دونوں کو دھکا دے کر فرش پر گرا دیا۔ ان کے باپ نے احتجاج کرنا چاہا لیکن برٹ کی آنکھوں سے جھانکتی خونخواری دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ وہ کورے کی طرح طاقتور نہیں تھا۔ اس نے بیٹوں سے کہا کہ وہ فرش پر ہی بیٹھ جائیں۔ چند لمحوں بعد برٹ اس کی کرسی بھی لینے آ گیا تو اس نے کسی احتجاج کے بغیر پسپائی اختیار کر لی۔

جب چاروں کھلاڑی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو سیلزمین نے کارڈ کی گڈی ہاتھ میں پکڑی اور انہیں اوپر نیچے کرنے لگا۔ کورے نے مس ہارسن کی طرف دیکھا اور بولا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ شاطر ہے؟"

"ہاں...... مجھے ایسا ہی لگا۔" اس نے جواب دیا۔

کورے کو اس پر کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ کارڈز کے ساتھ دلچسپ کمالات کر سکتی تھی اور تاش کی میز پر بیٹھ کر اس سے بہتر زندگی گزار رہی تھی۔

مس ہارسن نے ہلکے سے کندھوں کو جھٹکا دیا اور بولی۔ "اس کی بہت سی نشانیاں ہیں اور ان میں سب سے بڑی یہ ہے کہ وہ کس طرح گڈی اٹھاتا اور پتے تقسیم کرتا ہے۔"

کورے نے اس شخص کو غور سے تاش پھینٹتے ہوئے دیکھا لیکن اسے کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی، سوائے اس کے کہ وہ گڈی کے نصف حصوں کو آپس میں ملانے سے پہلے اپنی انگلیوں کی پوزیشن تبدیل کرتا تھا۔

مس ہارسن اس کی الجھن بھانپ گئی اور بولی۔ "وہ گڈی کو اس طرح اوپر اٹھاتا ہے جیسے پتوں کو اوپر نیچے کرنے والا ہو لیکن پھر اپنی انگلیاں ان کے گرد رکھ کر انہیں پھینٹنے لگتا ہے۔ یہ ایک سوچا سمجھا طریقہ ہے تاکہ وہ ناتجربہ کار اور شوقین نظر آئے۔"

کورے نے اپنا سر ہلایا اور بولا۔ "اب تک میں نے تمہیں اور پیٹرک کو جتنی بار پوکر کھیلتے دیکھا، اس میں کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ پتوں کو پھینٹنے کے ایک سے زیادہ طریقے بھی ہیں۔"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ کارڈز تمہارے لیے اہمیت نہیں رکھتے مسٹر کالان۔" مس ہارسن بولی۔ "درحقیقت مسٹر سولیون کو ہارتا دیکھ کر تمہیں یہ کھیل غیر دلچسپ لگتا ہے۔"

ڈیوی کی محبوبہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ جوا کھیلے لیکن وہ پہلی بازی جیت گیا۔ اس نے ایما کی جانب ایک مسکراہٹ پھینکی اور بولا۔ "تم نے دیکھا ایما...... میں جانتا ہوں کہ کیا کر رہا ہوں۔"

ایما کی آنکھوں میں امید کی چمک ابھری لیکن وہ اب بھی خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔ مس ہارسن مسکراتے ہوئے بولی۔ "مجھے حیرت ہے۔"

"کس بات پر؟" کورے نے پوچھا۔

"اگر وہ واقعی جانتا ہے کہ کیا کر رہا ہے۔ سیلزمین نے بڑی ہوشیاری سے دونوں بادشاہ اسے پکڑا دیے تھے۔"

کورے نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی ہیں جس پر مس ہارسن بھی مسکرا دی۔

سیلزمین نے دوبارہ تاش کے پتے اکٹھے کیے اور انہیں پھینٹنے لگا۔ برٹ نے دوسری اور تیسری بازی جیت لی اور بولا۔ "تم نے دیکھا جارج کہ کس طرح اپنے پتے استعمال کیے جاتے ہیں۔"

"تم بہت اچھا کھیل رہے ہو برٹ۔" جارج نے اس سے اتفاق کیا۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور ان کی طرف آتے ہوئے بولا۔ "اگر اعتراض نہ ہو تو میں تم لوگوں کے ساتھ ایک دو بازیاں کھیل لوں؟"

برٹ کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ بولا۔ "تم واپس بینچ پر جاؤ اور ہمارے سامان کی نگرانی کرو۔"

"یہ ٹھیک نہیں ہے برٹ۔" جارج نے شکایتاً کہا۔ "میں بھی کھیلنا چاہتا ہوں۔"

"بے وقوف۔ ہم یہاں جیتنے کے لیے بیٹھے ہیں۔" برٹ نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ "اس لیے نہیں کہ ساری رقم ہار کر ان احمقوں کے حوالے کر دیں۔"

جارج بحث کرنے سے باز نہیں آیا۔ اس نے کہا۔ "لیکن ہمارے پاس کافی......"

"میں نے کہا نا خاموش ہو جاؤ۔" برٹ چلایا۔

جارج ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ اس صورتِ حال سے ناخوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں صرف یہ چاہ رہا تھا......"

"مجھے سبق سکھانے پر مجبور نہ کرو۔" برٹ نے

اسے دھمکی دی۔
جارج نے تلخ گھونٹ نگلا اور واپس بینچ پر جا کر بیٹھ گیا۔
"کیا ٹرین کے آنے کی کوئی اطلاع ہے؟" ایما نے کلرک سے کوئی دسویں یا بارھویں بار پوچھا تھا۔
کھڑکی کے پیچھے بیٹھے ہوئے کلرک نے سرد آہ بھری اور نفی میں سر ہلا دیا۔
کورے یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ ٹرین کے آنے میں کتنی دیر ہے لیکن جواریوں کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ کم از کم ایک درجن بازیاں مزید کھیل سکیں۔ پیٹرک کے علاوہ سب ہی کچھ نہ کچھ جیت چکے تھے۔
مس ہارسن نے سرگوشی میں کہا۔ "مسٹر سولیون نے دوسری بار یہ حرکت کی ہے۔"
"کیسی حرکت؟" کورے نے پوچھا۔
"یہ دوسرا موقع تھا کہ وہ جیت جاتا لیکن اس نے اپنے پتے پھینک دیے۔"
"کوئی پیٹرک کو جیتنے کا موقع کیوں دے گا۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ سیلزمین کو اس سے ہمدردی ہے؟"
"ہاں مجھے شک ہے۔" مس ہارسن بولی۔ "میں یہی کہوں گی کہ وہ مسٹر پیٹرک کو کھیل میں رکھنا چاہ رہا ہے اور مسٹر برٹ کے لیے اس نے کھیل کے آخر میں ایک بڑے نقصان کا بندوبست کر لیا ہے۔"
کورے نے اس طرح سر ہلایا جیسے وہ مس ہارسن کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ "وہ کیا کر رہا ہے؟"
"اب تک اس نے ہر بازی کو کنٹرول کیا ہے۔ وہ مسٹر سولیون اور اس نوجوان شخص کو کھیل میں رکھنے کے لیے جیت کا موقع فراہم کر رہا ہے لیکن اس کا اصل ہدف مسٹر برٹ اور وہ کھلیے ہیں جن کی نگرانی جارج کر رہا ہے۔"
کورے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ اس دوران پیٹرک ایک بازی ہار چکا تھا۔ مس ہارسن نے کہا۔ "کیا تمہیں میرے نہ کھیلنے پر حیرت نہیں ہوئی؟"
کورے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "شاید اس لیے کہ ایک پیشہ ور جواری پتے پھینٹ رہا ہے۔" اس نے جان بوجھ کر بے ایمانی کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔
"اوہ نہیں۔" مس ہارسن بولی۔ "میں اس سے بھی آگے جا سکتی ہوں۔ اس کی حکمت عملی اسی وقت کام آ سکتی ہے جب لوگ آخری بازی تک کھیلیں۔"

کورے فوراً سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ کن لوگوں کی جانب ہے۔ پیٹرک اور شاید برٹ یا ڈیوی بھی جو نہیں جانتے تھے کہ جیتنے کے بعد انہیں کھیل سے الگ ہو جانا چاہیے۔ مس ہارسن میں یہ کمزوری نہیں تھی۔
"پھر تم آج تاش کیوں نہیں کھیل رہی ہو؟"
"کیونکہ بُرا وقت کبھی کہہ کر نہیں آتا۔"
کورے بالکل نہ سمجھ سکا کہ مس کورے کس بارے میں بات کر رہی ہے۔
"اگر ٹرین کے آنے سے پہلے پولیس یہاں پہنچ گئی تو وہ جیتی ہوئی تمام رقم ضبط کر لے گی۔"
کورے کی سمجھ میں اب بھی پوری بات نہیں آئی تھی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن دور سے وسل کی آواز سنائی دی۔ یہ گویا ٹرین کی آمد کا اعلان تھا جو کچھ ہی دیر بعد اسٹیشن میں داخل ہونے والی تھی۔
"ٹرین آ رہی ہے۔" کلرک نے ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے پیچھے سے اعلان کیا۔ وہ ٹرین کا استقبال کرنے کے لیے اپنے چھوٹے سے بوتھ سے باہر آ گیا۔ ویٹنگ روم میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی اپنی نشستوں سے اٹھنے لگے۔
سیلزمین نے تاش کی گڈی اٹھائی اور اسے اسی انداز میں پھینٹنے لگا جیسا کہ مس ہارسن نے بیان کیا تھا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمارے پاس ایک بازی کھیلنے کا وقت ہے۔" اس نے دوسرے کھلاڑیوں سے کہا۔ "اور ہم ایک بڑی رقم کی بازی لگا سکتے ہیں۔"
"میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ ہمارے پاس اتنا وقت ہے۔" برٹ متفق ہوتے ہوئے بولا۔ "مجھے مزید ایک بازی جیتنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"
پیٹرک طنزیہ انداز میں مسکرایا اور اس نے بھی ایک سکہ نکال لیا۔ کورے جانتا تھا کہ انہوں نے اس چھوٹے سے شہر میں جو کمائی کی تھی، اس کا بیشتر حصہ پیٹرک اڑا چکا ہے لیکن اسے مزید خطرہ مول لینے کا شوق تھا۔ ڈیوی نے بھی سکہ نکال لیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے برتن میں ڈالتا، ایما نے اس کا کندھا پکڑتے ہوئے کہا۔ "تم پہلے ہی ان سب سے آگے ہو اور میں ٹرین میں بیٹھنے کے بعد اپنے آپ کو زیادہ محفوظ اور آرام دہ محسوس کروں گی تاکہ ہم ایک نئی زندگی کی ابتدا کر سکیں۔"
ڈیوی نے فوراً ہی وہ سکہ اپنی جیتی ہوئی رقم میں ڈال دیا اور اپنی محبوبہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ "بالکل۔ میں کھیل روک سکتا ہوں۔ تم جانتی ہو کہ اب تک سب کچھ ٹھیک

ہے۔ اگر تمہارے بھائی ہمیں روکنا چاہتے تو وہ پہلے سے یہاں موجود ہوتے۔"

"بہرحال میں ٹرین میں بیٹھنے کے بعد اپنے آپ کو زیادہ پُرسکون محسوس کروں گی۔" ایما نے اپنا جملہ دہرایا۔

ڈیوی نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور اپنی جیتی ہوئی رقم سمیٹتے ہوئے بولا۔ "مجھے افسوس ہے دوستو...... میں مزید نہیں کھیل سکوں گا۔ ٹرین آرہی ہے اور ایما کو میری ضرورت ہے۔"

"تم اب نہیں جاسکتے۔" برٹ اور سیلز مین نے یک زبان ہو کر کہا۔

"ہم نے ایک اور بازی کھیلنے پر اتفاق کیا تھا۔" برٹ نے اصرار کیا۔

"تمہیں ایک آخری موقع دینا ہوگا تاکہ میں اپنی ہاری ہوئی رقم کا کچھ حصہ واپس لے سکوں۔"

"اوہ۔ اسے جانے دو۔" پیٹرک نے کہا۔ "کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ اس کی ساتھی لڑکی سفر کی وجہ سے کتنی گھبرائی ہوئی ہے۔ ہم اس کے بغیر بھی ٹھیک ہیں۔"

ایما اور ڈیوی دونوں نے تشکر آمیز نظروں سے پیٹرک کو دیکھا پھر اس میز سے دور چلے گئے۔ ڈیوی کی جیبیں سکوں سے بھر گئی تھیں۔

"میرا اندازہ ہے کہ ہم تین بھی کھیل سکتے ہیں۔" سیلز مین نے کہا۔

کورے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "پیٹرک! ہمیں بھی اب چلنا چاہیے۔ ٹرین زیادہ دیر اسٹیشن پر نہیں رکے گی۔"

"لیکن میں تو پہلے ہی اپنا حصہ ڈال چکا ہوں۔" پیٹرک نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"اب وہ نہیں جاسکتا۔ اس کے پتے میز پر پڑے ہوئے ہیں۔" برٹ نے کہا۔

"اس میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔" سیلز مین نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

کورے کو انجن کی آواز قریب آتی محسوس ہوئی لیکن ان تین کھلاڑیوں کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ بازی ختم کرسکتے تھے۔ ان تینوں نے اپنے پتے اٹھائے تو برٹ کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پیٹرک نے اپنے پتے دیکھ کر اوپری ہونٹ کاٹنا شروع کردیا۔ کورے عرصہ دراز سے اپنے ساتھی کو تاش کھیلتے ہوئے دیکھ رہا تھا اس لیے وہ پیٹرک کی اس حرکت کا مطلب سمجھ گیا۔

"ٹرین قریب آچکی ہے۔ اس لیے میں تم دونوں کو جیتنے کا ایک اور موقع دیتا ہوں۔" برٹ نے کہا۔ "اس لیے میں تین ڈالر کی بازی لگا رہا ہوں۔"

کورے نے اپنے پیٹ میں عجیب سی گڑبڑ محسوس کی۔ تین ڈالر کی رقم ان تمام بازیوں سے بہت زیادہ تھی جو وہ اب تک کھیل چکے تھے۔ پیٹرک نے اپنی تمام رقم برتن میں ڈال دی پھر جیب میں کچھ تلاش کرتے ہوئے بولا۔

"کورے! مجھے کچھ رقم ادھار چاہیے۔"

"تین ڈالر ایک بڑی رقم ہے۔" سیلز مین نے کہا۔ "لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ یہ اس سہ پہر کی آخری بازی ہے، میں تمہارا ساتھ دے سکتا ہوں۔"

اس نے اپنے حصے کی رقم میز پر رکھی اور گڈی دوبارہ اٹھائی۔ برٹ نے دو کارڈ مانگے اور انہیں دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ پیٹرک نے بھی ایسا ہی کیا اور اپنے پتوں کو دیکھتے ہی خوشی سے جھوم اٹھا جبکہ سیلز مین اپنے پتے دیکھ کر سنجیدہ ہوگیا۔

برٹ نے اپنے سامنے رکھی ہوئی رقم کو دیکھا۔ اس میں اس کے جیتے ہوئے پیسوں کے علاوہ داؤ پر لگائی ہوئی رقم بھی تھی۔ "اسے ہم اور زیادہ دلچسپ بنادیتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "یہ دس ڈالر کے لگ بھگ ہیں۔ اس میں کچھ کمی بیشی ہوسکتی ہے لیکن یہ بات اتنی اہم نہیں ہے۔"

پیٹرک نے کورے کی طرف مڑ کر دیکھا اور التجا آمیز لہجے میں بولا۔ "کورے! میرے دوست......"

"نہیں۔" کورے نے صاف جواب دے دیا۔

پیٹرک کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ "لیکن کورے......"

"نہیں۔" کورے نے اپنی بات دہرائی۔ "ایک منٹ بھی نہیں۔ اپنا بیگ اٹھاؤ پیٹرک۔ ٹرین اسٹیشن میں داخل ہورہی ہے۔"

"لیکن رقم تو پہلے ہی برتن میں ڈالی جاچکی ہے۔" پیٹرک نے کہا۔

"میں نے کہہ دیا نا کہ ایک منٹ بھی نہیں دوں گا۔" کورے اپنی بات پر قائم رہا۔

سیلز مین نے پیٹرک کی جانب سے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن جیسے ہی اس کی نظر کورے کے چہرے پر گئی، اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور جھینپتے ہوئے بولا۔ "مجھے افسوس ہے بڑے میاں لیکن تمہارا دوست بہتر سمجھ سکتا ہے۔"

پیٹرک اس قدر دہشت زدہ نظر آرہا تھا جیسے اس کا اکلوتا بیٹا کھو گیا ہو۔ سیلز مین نے برٹ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”تم نے واقعی بہت اچھی بازی لگائی ہے لیکن میرے پاس بھی بہت اچھے پتے ہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر مزید سکے نکالے اور انہیں گنتے ہوئے بولا۔

”میں نے تمہارے دس ڈالر دیکھ لیے ہیں۔ ان میں سات ڈالر کا اضافہ میری طرف سے۔“

برٹ نے اسے سختی سے گھورا اور اپنے بھائی کو آواز دیتے ہوئے کہا۔ ”جارج! اپنا ایک تھیلا لے کر یہاں آؤ۔“

”تمہارے خیال میں یہ کوئی اچھا آئیڈیا ہے برٹ؟“ جارج نے پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے کہ ٹرین آچکی ہے اور ہمیں اس پر سوار ہو جانا چاہیے۔“

”تم صرف پیسے لے کر آؤ۔“ برٹ جھلاتے ہوئے بولا۔

جارج دونوں تھیلے لے کر اپنے بھائی کے پاس آ گیا۔ برٹ نے ان میں سے ایک کھولا۔ اس میں سے مٹھی بھر سکے نکالے اور انہیں گن کر برتن میں ڈال دیا۔ جب سات ڈالر پورے ہو گئے تو سیلز مین نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ یہ بازی کافی بڑی ہو گئی ہے۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ کون جیتا۔“

”وہ میں ہی ہوں۔“ برٹ نے اعلان کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے پتے شو کر دیے جن میں دو بادشاہ اور تین دہلے موجود تھے۔ برٹ نے ہاتھ آگے بڑھا کر جیتی ہوئی رقم سمیٹنا چاہی۔

”اتنی تیزی دکھانے کی ضرورت نہیں۔“ سیلز مین نے اس سے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ جب تم میرے پتے دیکھو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں نے یہ بازی جیت لی ہے۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے چار تگیاں لکڑی کی میز پر ڈال دیں۔ برٹ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ بولا۔ ”یہ بالکل بھی ممکن نہیں۔“

سیلز مین نے کندھے اچکادیے۔ کورے کو بھی اس کی جیت پر حیرت ہو رہی تھی۔ سیلز مین نے فخریہ انداز میں کہا۔ ”کبھی کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے۔“

برٹ اپنے قدموں پر اچھلتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کہا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔“

سیلز مین بھی اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا لیکن اس نے برٹ کے چہرے پر سے نظریں نہیں ہٹائیں اور بولا۔

”کیا میں نے یہ شکایت کی کہ ایسا نہیں ہو سکتا جب تم اور وہ لڑکا کھیل کے دوران بازی پر بازی جیتتے رہے؟ نہ ہی ان بڑے میاں نے یہ شکایت کی کہ وہ پورے دن میں ایک بھی بازی نہ جیت سکے۔“

باہر سے کنڈیکٹر نے آواز لگائی۔ ”تمام مسافر ٹرین پر سوار ہو جائیں۔“ اس کے ساتھ ہی گھوڑوں کے ہنہنانے اور زمین پر سم مارنے کی آوازیں آئیں جیسے کچھ لوگ ٹرین تک پہنچنے کی جلدی کر رہے ہوں۔

برٹ نے ان آوازوں پر توجہ نہیں دی۔ وہ پاگلوں کی طرح پیٹرک کو گھور رہا تھا۔ ”تم بھی اس کے ساتھ ملے ہوئے ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”کس معاملے میں؟“ پیٹرک نے پوچھا۔ ”خوش قسمتی سے اس کے پاس اچھے پتے آ گئے۔“ پھر وہ مس ہارسن سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”کیا ایسا نہیں ہے؟“

برٹ نے مس ہارسن کے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ اس کے بجائے اس کا ہاتھ اپنی گن کی طرف بڑھا۔ خوش قسمتی سے کورے اس کے لیے تیار تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ برٹ کا ہاتھ اس کی گن سے قریب ہوتا جا رہا ہے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ برٹ ان لوگوں میں سے ہے جو بے ایمانی کرنے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتے۔ اگر وہ پیٹرک کو اس معاملے میں نہ گھسیٹتا تو کورے بھی تماشا دیکھنے والوں میں شامل ہو جاتا۔ یہ اس کا مسئلہ نہیں تھا لیکن اس نے پیٹرک کو اپنا نشانہ بنایا تھا۔ اس کے علاوہ اسٹیشن پر اور لوگ بھی تھے۔ اگر برٹ کا نشانہ خطا ہو جاتا تو وہ اس کی لپیٹ میں آ سکتے تھے۔ چنانچہ اس نے اپنی دائیں مٹھی مضبوطی سے بھینچ لی اور برٹ کی ٹھوڑی پر وار کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ کورے کے عقب میں سڑک سے آنے والا دروازہ کھلا اور بھورے رنگ کے بالوں والے تین آدمی اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوئے۔ ”ایما!“ ان میں سے ایک چلایا۔ ”کیا تم یہاں ہو؟“

”وہ رہی۔“ دوسرے نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہم تمہیں گھر لے جانے کے لیے آئے ہیں۔“

”یہاں کوئی ایسا مائی کا لعل نہیں جو اسے بھگا کر لے جا سکے۔“ تیسرا چلایا۔ ان تینوں نے ہال کا جائزہ لیا پھر ان کی نظریں ایما اور ڈیوی پر ٹھہر گئیں جو انہیں دیکھتے ہی خوفزدہ ہو گئے تھے۔

برٹ نے پستول نکال کر کورے کا نشانہ لینا چاہا لیکن اس نے ہاتھ مار کر نال کا رخ نیچے کر دیا تاکہ اس سے نکلنے

والی گولی اس کے سینے میں لگنے کے بجائے لکڑی کے فرش میں پیوست ہوجائے۔

"ہے۔اب سنبھلو۔" سیلز مین نے کہا۔اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا پستول نظر آرہا تھا لیکن تب تک پیٹرک بھی سمجھ چکا تھا کہ اس کے ساتھ بے ایمانی کی گئی ہے۔ اپنے وقت میں وہ بھی باکسر رہ چکا تھا چنانچہ اس نے وقت ضائع کیے بغیر سیلز مین کی ناک پر یکے بعد دیگرے تین ضربیں لگائیں اور یہ دیکھ کر مطمئن ہو گیا کہ اس کا حریف فرش پر گرا ہوا ہے۔

کمرے کی دوسری جانب ایما کے بھائیوں نے ڈیوی کو دیوار سے لگادیا اور اس کے پیٹ پر مکے برسانا شروع کردیے جبکہ ایما چلّا چلّا کر انہیں روکنے کی کوشش کرتی رہی۔

"سب لوگ آجائیں۔" کنڈیکٹر نے ایک بار پھر آواز لگائی۔ "ٹرین پہلے ہی لیٹ ہے۔اب ہمیں روانہ ہونا ہے۔"

چند لوگ جو اس جھگڑے میں شامل نہیں تھے، وہ دروازوں کی طرف لپکے۔باہر سڑک پر گاڑیاں رکنے کی آواز آئی لیکن کورے کے پاس اس پر توجہ دینے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے ایک بار پھر برٹ پر ضرب لگائی اور بائیں ہاتھ سے اس کی گن چھیننے کی ناکام کوشش کی۔جارج بھی بھائی کی مدد کے لیے آگے بڑھا اور اپنے قیمتی تھیلے بینچ کے پاس فرش پر چھوڑ کر کورے کی طرف لپکا جس نے جھک کر جارج کے پیٹ پر زوردار ضرب لگائی اور وہ تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا پھر وہ دوبارہ برٹ کی طرف متوجہ ہوا۔

عمارت کا بیرونی دروازہ ایک بار پھر کھلا اور بہت سے باوردی سپاہی اندر داخل ہوئے۔ "کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔" ان میں سے ایک تحکمانہ آواز میں چلّایا لیکن کسی نے بھی اس کی آواز نہیں سنی۔ کورے اور برٹ کے درمیان گن چھیننے کے لیے کشمکش جاری تھی۔ جارج اپنی تکلیف سے نجات پاچکا تھا اور ان دونوں کو الگ کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ پیٹرک نے جھک کر سیلز مین کی چھاتی پر ایک اور ضرب لگائی اور غصے میں اسے بُرا بھلا کہنے لگا۔

ادھر ایما پوری قوت سے چلّا رہی تھی کیونکہ اس کے ایک بھائی نے اپنا بازو اس کی کمر کے گرد ڈال رکھا تھا اور اسے زمین پر گھسیٹ رہا تھا۔ "میری مدد کرو آفیسر۔ یہ لوگ مجھے اغوا کررہے ہیں۔"

سپاہیوں نے ان پر بندوقیں تان لیں اور انہیں الگ کرنے لگے..... انہیں زیادہ دیر نہیں لگی لیکن انہیں خاموش کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ سب اپنی بولی بول رہے تھے۔

"یہ لوگ میری مرضی کے خلاف مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہ رہے ہیں۔"

"اپنی زبان بند رکھو بے وقوف لڑکی۔ ہم تمہیں واپس گھر لے جارہے ہیں۔ ماما کے پاس۔"

"میں اس شاطر سے اپنی رقم واپس لینا چاہتا ہوں۔"

"آخری بار کہا جارہا ہے۔ سب مسافر ٹرین میں سوار ہوجائیں۔"

"اب ہم کیا کریں گے برٹ؟"

اچانک ہی فائر کی آواز گونجی۔ کسی سپاہی نے ان لوگوں کو خاموش کرنے کے لیے رائفل کی نال کا رخ چھت کی طرف کرکے گولی چلائی تھی جس سے یقیناً چھت کو نقصان پہنچا ہوگا لیکن اس طرح وہ لوگوں کو خاموش کرانے میں کامیاب ہو گیا۔

"اب ٹھیک ہے۔" ان کے افسر نے کہا۔ "تم میں سے کس نے سویٹ واٹر کے بینک میں ڈاکا ڈالا تھا اور باقی لوگ کس بات پر جھگڑا کررہے تھے۔"

اس کا یہ پوچھنا غضب ہو گیا۔ سب لوگوں نے ایک ساتھ بولنا شروع کردیا۔ کورے زمین پر لیٹا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ لڑکی کے تینوں بھائی آگے بڑھے۔ وہ چلّا چلّا کر آفیسر کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانا چاہ رہے تھے پھر اس نے دیکھا کہ ایک ڈپٹی نے برٹ اور جارج کو پکڑ رکھا ہے اور وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کررہے ہیں۔ مس ہارسن نے ایما کی طرف دیکھا اور تیزی سے برٹ کے تھیلوں کی جانب لپکی۔

"میرا خیال ہے کہ لوٹی ہوئی رقم ان تھیلوں میں ہے آفیسر۔" یہ کہہ کر اس نے ایک تھیلا کھول دیا۔ بہت سے سکے اور نوٹ زمین پر بکھر گئے۔ سب لوگ خاموش ہوگئے اور حیرت سے اس ڈھیر کو دیکھنے لگے جو بڑھتا جارہا تھا۔

"برٹ۔ اس نے ہماری رقم تلاش کرلی۔" جارج منمنایا۔

ایک ڈپٹی نے اس کے بازو پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ اس وقت کسی کی توجہ ایما پر نہیں تھی۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈیوی کا بازو پکڑا۔ اسے لے کر اپنے سامان تک گئی اور خاموشی سے اسٹیشن سے باہر نکل گئی۔

لے مس ہارسن سے کہا۔ "تمہارا بہت بہت
کیا تم بتا سکتی ہو کہ اس کے علاوہ یہاں کس
...ر رہا تھا؟"
"...ں بتا سکتی ہوں۔" مس ہارسن نے جواب دیا۔
"...اع کروں؟" اسٹیشن سے باہر ٹرین نے وسل
...شروع کردیا۔

☆☆☆

"تمہیں پہلے سے معلوم تھا کہ ان دونوں نے
...کا مارا ہے۔" پیٹرک نے تین دن بعد ملنے والی
...لی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
"...یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی۔" مس ہارسن
...نے برابر والی نشست سنبھالتے ہوئے کہا۔ "لیکن
...ات وسکنات سے ایسا ہی لگ رہا تھا۔"
...رے اس کے سامنے والی نشست پر بیٹھتے ہوئے
...تھی کہ تم نے کھیل میں حصہ نہیں لیا۔"
"...کسی جواری کے پاس چرائی ہوئی رقم ہو۔" مس
...ضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "تو مقدمے کے
...ل میں لگائی گئی تمام رقم ثبوت کے طور پر پیش کی
...وقت بھی کہہ کر نہیں آتا۔ بینک والے موقع
...کر اپنے نقصان کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں
...یں لگی ہوئی ساری رقم اس میں شامل کرلی جاتی
...طرح سبھی لوگ نقصان میں رہتے ہیں۔"
"...م تم نے مجھے خبردار کیوں نہیں کیا؟" پیٹرک
...کہا۔
"...میں نے کہا تھا۔" مس ہارسن اسے یاد دلاتے ہوئے
...ب میں نے تمہیں کہا تھا کہ میں اس کھیل میں
...ہیں چاہتی۔"
"...لیکن تم نے تو صرف یہ کہا تھا کہ تھک گئی ہو۔"
...نے اعتراض کیا۔
"ہاں۔ میں کھل کر نہیں کہہ سکی کہ ان لوگوں
...مت کھیلو۔ ان میں سے ایک لٹیرا اور دوسرا بے
...کیا میں ایسا کہہ سکتی تھی؟"
"...نہیں۔" پیٹرک ہار مانتے ہوئے بولا۔ "میں نہیں
...تم اس طرح کہہ سکتی تھیں۔ یہ بھی غنیمت ہے
...مجھے میرے پیسے واپس مل گئے۔"
"ہمیشہ اچھے پہلوؤں کو دیکھا کرو مسٹر پیٹرک۔"
...ن بولی۔ "سیلز مین کو تو اس کے پیسے بھی واپس نہیں
...اس کا مطلب ہے کہ دنیا میں انصاف ہو رہا ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ اس پوری کہانی میں دلچسپ بات کیا ہے؟" کورے نے کہا۔ "صرف ایک شخص جیت کر گیا جس کی بیوی نہیں چاہتی تھی کہ وہ کھیل میں حصہ لے۔"

"محبوبہ۔" مس ہارسن نے اس کی تصحیح کی۔

"کیا؟" پیٹرک اور کورے ایک ساتھ بولے۔

"وہ اس کی بیوی نہیں محبوبہ تھی۔"

کورے کی نگاہوں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا جب اس لڑکی کے بھائی اسے ڈھونڈتے ہوئے آئے اور اسے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ "میں سمجھتا ہوں کہ تمہارا اندازہ درست ہے لیکن اس وقت میں اس پر غور نہ کرسکا۔"

"صاف لگ رہا تھا کہ وہ دونوں میاں بیوی نہیں تھے۔" مس ہارسن چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔ "لیکن میں یہ ظاہر کرکے ان کی بے عزتی نہیں کرنا چاہتی تھی۔"

کورے اور پیٹرک اب بھی حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ تب اس نے اپنی انگلیوں پر گننا شروع کیا اور اپنا مشاہدہ بیان کرنے لگی۔ "وہ دونوں ایک ساتھ سفر کررہے تھے اور لڑکا اسے متاثر کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا جبکہ وہ پیسوں کے بارے میں فکرمند تھی۔ ٹرین لیٹ ہونے سے وہ دونوں غیر معمولی طور پر پریشان نظر آرہے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں ٹرین آنے سے پہلے لڑکی کے بھائی ان کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں پہنچ جائیں اور اسے اپنے ساتھ واپس لے جائیں اور تم نے دیکھا کہ ایسا ہی ہوا۔ لڑکی کے بھائی پہنچ گئے تھے اور اگر پولیس نہ آتی تو شاید وہ لڑکی کو لے جاتے۔ اس افراتفری میں انہیں نکلنے کا موقع مل گیا اور وہ ٹرین میں سوار ہوگئے۔"

پیٹرک نے اپنا سر نشست سے لگایا اور آنکھیں بند کرتے ہوئے بولا۔ "بینک لوٹنے والے، بے ایمان کھلاڑی اور بھاگنے والے بچے۔ میں حیران ہوں کہ اگلے شہر میں ہمیں کیا دیکھنے کو ملے گا۔"

"تاش کے کھیل میں بے ایمانی کرنے والے ہر جگہ ہوتے ہیں۔" کورے نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں وہاں بھی ایسے لوگ مل جائیں گے۔ اس لیے تم محتاط رہنا۔ ضروری نہیں کہ ہر مرتبہ پولیس تمہاری مدد کے لیے آئے۔"

مس ہارسن نے سر ہلایا اور پیٹرک شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ اسے اس سفر میں اچھا سبق مل گیا تھا۔



قدردان

محمد الیاس

دُہری شخصیت، دُہرا معیار رکھنے والے کبھی کبھی اصول پسند لوگوں کو تگنی کا ناچ نچادیتے ہیں۔ یہاں بھی ایک چور کو یہی مسئلہ درپیش تھا گویا الٹا چور کوتوال کو ہری جھنڈی دکھا گیا اور ساتھ ہی شکوہ کناں بھی رہا۔

بہت طریقے سے لوٹنے والے ایک تہذیب یافتہ چور کا قصہ

قیمتی پلاٹ کی صورت میں آخری جائداد بھی فروخت ہوگئی، تاہم میجر بابر اور اس کی بیوی کو اطمینان رہا کہ رہائش کے لیے ذاتی گھر ہے، گاڑی ہے اور گزر بسر کرنے کو معقول پنشن مل جاتی ہے۔ عمر کے آخری حصے میں ضرورتیں ہی کتنی رہ جاتی ہیں۔ میاں بیوی نے طے شدہ پروگرام کے مطابق پینتیس

لاکھ روپے کی رقم الگ کر کے بیڈروم کے وارڈروب میں دھلے ہوئے کپڑوں کے اندر رکھ دی تاکہ اگلے روز بیوہ بیٹی کے نام قومی بچت کی اسکیم میں جمع کرائی جاسکے۔ تنخواہ کے علاوہ ماہانہ منافع سے وہ اپنے دونوں بچوں کی تعلیم کا سلسلہ بہ آسانی جاری رکھ سکے گی۔ باقی کے بیس لاکھ روپے پنشن کی رقم کے ساتھ لاؤنج کی ہی سامنے والی الماری میں رکھ دیے، جن سے گھر کی مرمت کروانا اور ایک دو الیکٹرانکس کی اشیا خریدنا طے ہو گیا۔

خریدار اور پراپرٹی ڈیلر ادائیگی کرنے کی غرض سے ایسے وقت پر آگئے کہ بینک میں رقم جمع کرانا ممکن نہ رہا۔ ہاؤسنگ اسکیم میں کیے گئے سخت سکیورٹی اقدامات کی بدولت ماحول ہمیشہ پُرامن ہی رہا اور کبھی کوئی ایسا برا واقعہ بھی نہ ہوا کہ دونوں میاں بیوی بلاوجہ ہی تشویش میں مبتلا ہو جاتے۔ لیکن سچ کہا گیا ہے کہ بُرا وقت کبھی پوچھ کر نہیں آتا۔ سردیوں کے موسم میں رات کے دس بجے گلیاں ویسے بھی سونی ہو جاتی ہیں۔ وہ ہیٹر کے سامنے ٹی وی لاؤنج میں خاموشی سے کوئی ڈاکیومنٹری فلم دیکھ رہے تھے کہ ہاتھوں میں پسٹل لیے چار نقاب پوش ڈاکوؤں نے انہیں گھیر لیا۔ انہوں نے جینز پہن رکھی تھیں اور جسمانی ساخت سے صاف پتا چل گیا کہ چاروں نوجوان ہیں۔

میجر نے بیوی کو بازو کے حصار میں لے کر پہلو سے لگالیا اور ذرا سی بھی ایسی حرکت نہ کی جس سے ڈاکو مشتعل ہو جائیں۔ بڑے تحمل سے بولا۔ ''جس مقصد کے لیے آئے ہو، وہ کرو اور جاؤ۔ کسی بھی قسم کی بدتمیزی کرنے سے تم لوگوں کو کوئی اضافی فائدہ ہونے والا نہیں۔''

سامنے کھڑے ڈاکو نے کہا۔ ''میجر صاحب! ہم خاندانی لوگ ہیں۔ فوج کی دل میں بڑی قدر ہے۔ آپ صاف صاف بتا دیں، رقم کہاں پڑی ہے۔ بدتمیزی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا......''

میجر نے الماری کی طرف اشارہ کیا اور کہنے لگا۔ ''اس میں پنشن کی ساری رقم پڑی ہے، آج ہی لایا تھا اور بیس لاکھ روپے الگ سے۔ زیور وغیرہ گھر میں ہے ہی نہیں۔ پرانی گاڑی تمہارے کام کی نہ ہوگی......'' میجر نے ذرا توقف کیا، تاہم کچھ سوچ کر دوبارہ بول پڑا۔ ''باقی یہ کہ میں نے 65ء اور 71ء کی دونوں جنگیں اگلے محاذ پر لڑی ہوئی ہیں...... خیر، کوئی بات نہیں۔ اب مہربانی کر کے تم رقم اٹھا کر جلدی نکلو، میری بیوی دل کی مریضہ ہے......''

اسی ڈاکو نے جو پہلے مخاطب ہوا تھا، جواب دیا۔ ''سوری سر! بہت مجبوری ہے...... ورنہ......''

میجر نے سر پر آئی آفت کو جلد ٹالنے کی غرض سے اسی طرح متوازن لب و لہجے میں کہا۔ ''کوئی بات نہیں، میں سمجھتا ہوں۔ تم اچھے گھرانے کے بچے دکھائی دیتے ہو، بس ذرا جلدی کرو۔ میری بیگم کی حالت بگڑ رہی ہے......''

اچھے گھرانے کے سپوت نے ایک ساتھی کو مخاطب کر کے حکم دیا۔ ''ہری اَپ...... آنٹی پریشان ہو رہی ہیں۔''

میجر بیوی کو ہلکے ہلکے...... مسلسل تھپکتے ہوئے دلاسا بھی دیے جا رہا تھا۔ اتنے میں الماری کی صفائی کرنے والے نے رقم سمیٹ لی اور اپنے لیڈر سے کہا۔ ''میجر صاحب نے ٹھیک ہی کہا ہوگا لیکن جاتے جاتے سرسری نظر سے بیڈروم کو دیکھ لینے میں حرج نہیں۔'' لیڈر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ایک آدھ منٹ بعد ہی بیڈروم سے پینتیس لاکھ روپے اٹھائے دو ڈاکو نکل آئے اور اپنے لیڈر کے سامنے نمائش کرتے ہوئے دبی دبی ہنسی ہنسنے لگے۔ لیڈر بدستور یرغمال بنے بوڑھے جوڑے کے سامنے تن کے کھڑا تھا۔ پسٹل والے ہاتھ کو یکبارگی حرکت دی لیکن نہ جانے کیا خیال آیا اور کسی انتہائی اقدام سے باز آگیا۔ بڑے زخم خوردہ لہجے میں بولا۔ ''انکل! آپ نے سخت مایوس کیا۔ بندہ آخر کس پر اعتبار کرے......''

میجر نے اپنا لب و لہجہ مزید...... پُرسکون کرتے ہوئے کہا۔ ''آئی ایم سوری۔ یہ رقم دراصل کسی کی امانت رکھی تھی۔''

حضرت یوسف علیہ السلام

رضوانہ ساجد

اللہ رب العالمین نے تمام انسانوں کی اصلاح کے لیے نہ صرف مختلف پیغمبر دنیا میں بھیجے کہ وہ اپنے رب کا پیغام حق لوگوں تک پہنچائیں بلکہ... ان پیغمبروں کی تمام زندگی بھی عملی طور پر اسی حق گوئی کی تفسیر بنادی گئی... جیسے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کا ہر لمحہ کٹھن آزمائشوں اور صبر و استقامت کی اعلیٰ مثال بن کے بنی نوع انسان کے لیے سبق آموز ٹھہرا... کیونکہ آپ کے لیے کڑی آزمائشوں کا سلسلہ تو بچپن سے ہی شروع ہو چکا تھا کہ جب آپ کے بھائیوں نے آپ کو مصر کے بازار میں پہنچایا اور بچپن کا وہ خواب کہ جس میں آپ کی عظمت کی بشارت دی گئی اور گیارہ ستاروں نے آپ کو سجدہ کیا... پھر دھیرے دھیرے وقت نے ثابت کیا کہ خوابوں کی تعبیر کا ایسا سچا علم آپ کو عطا کیا گیا جس کے ذریعے نہ صرف زلیخا کے دیے گئے جھانسے سے نکلنے میں کامیاب ہوئے بلکہ قیدو بند کی صعوبتوں سے بھی نکلنے کا راستہ نکلا اور آپ کی تمام دعاؤں کو قبولیت بخشی گئی... سبحان اللہ۔

اللہ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کی سوانح حیات کے سبق آموز پہلو

تیسرا حصہ



قرآن کا خود دعویٰ ہے کہ ہم نے اسے علم عطا کیا۔ ان علوم میں سب سے مشہور علم جو آپ کو عطا ہوا وہ خوابوں کی تعبیر کا علم تھا۔ خواب سب ہی دیکھتے ہیں۔ قیدی کچھ زیادہ ہی دیکھتے ہیں۔ قیدیوں میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی عقل مندی کے پیشِ نظر ان کے سامنے بیان کیا۔ آپ نے اس کی تعبیر بتادی۔ وہ تعبیر اسی طرح عمل میں آئی جس طرح بتائی تھی۔ اس قیدی نے دوسروں کو بتایا۔ اس کے بعد جو بھی خواب دیکھتا تھا اس کی تعبیر آپ سے پوچھتا تھا۔

لوگ آپ کے گرویدہ تو تھے ہی' اس کے بعد مزید گرویدہ ہو گئے۔

اس قید خانے میں دو نوجوان قیدی بن کر آئے۔ ان میں سے ایک ساقی سلطان تھا یعنی بادشاہ کو جام اور مشروبات پلانے والا تھا' دوسرا شاہی باورچی خانے کا سردار یا داروغہ تھا۔ وہ دونوں جیسے ہی جیل میں آئے حضرت یوسف علیہ السلام کی شہرت دامن گیر ہوئی اور داروغہ کی مہربانی تھی کہ ہر قیدی حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات کر سکتا تھا۔ یہ دونوں بھی ان کے پاس پہنچے اور پھر اکثر آپ کی مجلس میں بیٹھنے لگے۔

ان دونوں نے ایک ہی رات میں ایک ایک خواب دیکھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی شہرت سے آشنا ہو ہی چکے تھے۔ اپنے اپنے خواب لے کر یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے۔

''ہم دونوں ایک ساتھ زنداں میں آئے تھے۔ ایک ساتھ فرعون کے معتوب ہوئے تھے اور ایک ہی رات میں ایک ساتھ خواب بھی دیکھے ہیں۔ خواب بھی اتنے عجیب ہیں کہ تعبیر ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔'' ان دونوں نے کہا۔

''تم خواب سناؤ۔ اللہ تعالیٰ نے خوابوں کی تعبیر کا علم مجھے خوب دیا ہے۔ جب تک تمہارا مقرر کھانا تم تک پہنچے، میں تمہارے خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔''

ساقی نے اپنا خواب سنایا۔ ''میں نے خواب میں دیکھا کہ انگور کی بیل میرے سامنے ہے اور اس بیل میں تین شاخیں ہیں اور ایسا دکھائی دیا کہ اس میں کلیاں لگیں اور پھول آئے اور اس کے سب گچھوں میں پکے پکے انگور لگے اور فرعون کا پیالہ میرے ہاتھ میں ہے اور میں نے فرعون کا پیالہ لے کر اس .... میں نچوڑا اور وہ پیالہ میں نے فرعون کے ہاتھ میں دیا۔''

یوسف علیہ السلام نے خواب سن کر اسے مبارک باد دی۔

''اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ تین شاخیں تین دن ہیں۔ خواب میں ظاہر ہوتا ہے کہ اب سے تین دن کے اندر فرعون تجھے سرفراز فرمائے گا اور تجھے پھر تیرے منصب پر بحال کر دے گا اور پہلے کی طرح جب تو اس کا ساقی تھا' پیالہ اس کے ہاتھ میں دیا کرے گا۔''

جب ساقی اپنا خواب سن چکا تو اس کے ساتھی کی باری آئی جو شاہی باورچی خانے کا سردار تھا۔

''میں نے دیکھا ہے کہ میرے سر پر سفید روٹی کی تین ٹوکریاں ہیں۔ اوپر کی ٹوکری میں ہر قسم کا پکا ہوا کھانا فرعون کے لیے ہے اور پرندے اس ٹوکری میں سے کھا رہے ہیں۔''

حضرت یوسف علیہ السلام اس کا خواب سن کر اداس ہو گئے لیکن وعدہ کر چکے تھے، تعبیر تو دینی تھی۔

''تیرے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ وہ تین ٹوکریاں تین دن ہیں۔ سو اب سے تین دن کے اندر فرعون تیرا سر تیرے تن سے جدا کرا کے تجھے ایک درخت پر ٹنگوا دے گا اور پرندے تیرا گوشت نوچ نوچ کر کھائیں گے۔''

یہ تعبیر ہی ایسی تھی کہ اسے سننے والا سنتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

''افسوس کہ اس کی تقدیر میں جو کچھ لکھ دیا گیا، وہ تو ہو کر رہے گا۔'' یوسف علیہ السلام نے کہا اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے۔

ساقی کو انتظار تھا کہ کب تین دن گزریں اور اسے رہائی ملے۔

دوسرا کہتا تھا کہ تیسرا دن کبھی نہ آئے۔

وقت کسی کے روکے رکتا ہے؟ تیسرے دن فرعون کی سالگرہ تھی۔ فرعون نے ان دونوں کو طلب کیا کہ ان کے بارے میں فیصلہ کیا جائے۔

دربار کے سپاہی ان دونوں کو لینے کے لیے آن پہنچے۔ داروغہ نان تو حضرت یوسف علیہ السلام سے خفا تھا کہ انہوں نے اس کے بارے میں ایسی تعبیر کی لیکن ساقی خوش تھا لہٰذا حضرت یوسف علیہ السلام سے ملنے آیا۔ وہ خوش تھا کہ تعبیر کے مطابق اسے رہائی ملنے والی تھی۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے ساقی سے کہا۔ ''جب تو باہر جائے تو اپنے آقا (فرعون) سے میرا ذکر کرنا۔ اسے بتانا کہ ایک بے گناہ اور بے قصور شخص کو مجرم بنا کر زنداں میں ڈال دیا گیا ہے۔ یہ بھی بتانا کہ وہ شخص دینِ حق کی تلقین کرتا ہے اور خوابوں کی تعبیر دیتا ہے۔''

توریت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

''جب تو خوش حال ہو تو مجھے یاد کیجیو اور مجھے اس سے مخلصی دلوائیو کہ وہ عبرانیوں کی ولایت سے مجھے چرا لائے اور یہاں بھی میں نے ایسا کام نہیں کیا کہ وہ مجھے اس قید میں رکھیں۔''

کہا جاتا ہے کہ ساقی اور داروغہ باورچی خانہ پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے بادشاہ کے کھانے پینے کی چیزوں میں زہر ملایا ہے۔

جب تحقیقات ختم ہوگئی تو داروغہ پر جرم ثابت ہوگیا اور ساقی کو بری کر دیا گیا جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر کے طور پر بیان فرمایا تھا۔

ساقی پھر سے ساقی گری پر بحال ہوگیا لیکن وہ اپنی خوشی میں ایسا مست ہوا کہ فرعون سے حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر کرنا بھول گیا۔

''مگر شیطان نے اسے (ساقی کو) ایسا غفلت میں ڈالا کہ وہ اپنے رب (شاہِ مصر) سے اس کا (یوسفؑ) ذکر کرنا بھول گیا اور یوسف کئی سال قید خانے میں پڑا رہا۔''

''کئی سال'' کی تفسیر میں تین قول بیان کیے جاتے ہیں۔ تین سے نو تک اور ایک قول ہے تین سے سات اور ایک قول یہ ہے کہ دس سے کم کم پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ بہرحال اس کی صراحت نہیں کی جاسکتی کہ ساقی کی رہائی کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کتنے سال جیل میں رہے اور کتنے سال بعد ''ساقی'' نے حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر فرعون سے کیا۔

توریت کے مطابق دو سال بعد فرعون نے خواب دیکھا تھا اور ساقی کو حضرت یوسف علیہ السلام کی یاد آئی تھی۔ باورچی خانے کے داروغہ کو پھانسی دے دی گئی اور اس کی لاش کو ایک درخت پر لٹکا دیا گیا۔ ساقی کے منصب و اعزاز میں مزید اضافہ ہوگیا اور وہ فرعون کی خدمات میں شب و روز گزارتا رہا۔

توریت کے مطابق دو سال گزرے تھے کہ فرعون نے ایک پریشان کن خواب دیکھا۔

اس خواب کا ذکر قرآن میں بھی ہے۔

''ایک روز بادشاہ نے کہا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور اناج کی سات بالیاں ہری ہیں اور دوسری سات سوکھی۔''

فرعون یہ خواب دیکھ کر جاگا تو سخت پریشان ہوا۔ وہ اس خواب پر غور کرتا رہا لیکن کوئی معنی سمجھ میں نہ آئے۔ اس نے پورے مصر کے جادوگروں، کاہنوں اور منجموں کو طلب کیا اور اپنا خواب ان کے سامنے دہرایا۔ سب نے اس خواب پر غور کیا مگر تعبیر بتانے سے قاصر رہے۔ کسی نے تعبیر بتائی بھی تو دوسرے لوگوں نے اس کی مخالفت کی۔ کئی دنوں تک یہ اجلاس چلتے رہے۔ کئی تعبیریں سامنے آئیں لیکن کوئی ایسی نہیں تھی جس پر سب متفق ہوجاتے۔ ان محفلوں میں ''ساقی'' بھی مستقل شریک ہو رہا تھا۔ ایک دن اچانک اسے حضرت یوسف علیہ السلام کا خیال آ گیا۔

''اگر آپ مجھے کچھ مہلت دیں تو میں اس خواب کی تعبیر لا سکتا ہوں۔'' ساقی نے فرعون سے عرض کیا۔

''میں تو مایوس ہو چکا ہوں۔ درباری منجم کہتے ہیں یہ خواب نہیں بلکہ پریشان کن خیالات ہیں۔ تُو بھلا اس کی تعبیر کہاں سے لا دے گا؟''

''آپ نے جب مجھے قید کیا تھا تو قید خانے میں میری ملاقات یوسف نام کے آدمی سے ہوئی تھی جو خوابوں کی تعبیر بتانے میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔ سب لوگ اسی سے تعبیر پوچھا کرتے تھے۔ میں نے بھی ایک خواب دیکھا تھا اور اس سے تعبیر پوچھی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ میں رہا ہو جاؤں گا۔ تعبیر بالکل سچ نکلی۔ آپ کی مہربانی سے میں رہا ہوگیا۔ ممکن ہے آپ کے خواب کی تعبیر اس کے پاس ہو۔ آپ اگر مجھے قید خانے جانے کی اجازت دیں تو میں اس سے پوچھ لوں۔''

''اتنے بڑے بڑے منجم عاجز آ گئے تو وہ معمولی سا قیدی بھلا کیا تعبیر بتائے گا۔ پھر بھی تو پوچھ کر دیکھ لے۔''

''اس نے یہ بھی کہا تھا کہ رہائی کے بعد میں اس کے بے قصور ہونے کا حال آپ تک پہنچاؤں لیکن افسوس! اتنے سال گزر گئے۔ میں اس کو بھول ہی گیا تھا۔''

''تو اس کے پاس جا اور تعبیر لے کر آ۔ میں تجھ سے عہد کرتا ہوں کہ اگر اس نے تعبیر بتا دی اور وہ ویسا ہی ہے جیسا کہ تو بیان کر رہا ہے تو میں اسے اپنے پاس بلاؤں گا اور اس سے اس کا حال پوچھوں گا۔''

فرعون کی اجازت ملتے... وہ شخص قید خانے میں پہنچ گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے شرمندگی کا اظہار کیا۔

''میں نے آپ جیسے نیک آدمی سے اپنا عہد توڑا۔ اس کے لیے میں شرمندہ ہوں۔ میں یہاں سے نکلتے ہی اپنے حال میں ایسا مست ہوا کہ فرعون کو آپ کے بارے میں بتانا بھول گیا۔ آج جب اس نے خواب دیکھا اور تعبیر کی ضرورت پیش آئی تو مجھے آپ کا خیال آیا۔''

''بھلے آدمی۔ اس میں تیرا قصور نہیں۔ تیرا بھولنا من جانب اللہ ہی ہوگا۔ اللہ خود چاہتا ہوگا کہ میں اتنے عرصے قید میں رہوں تو مجھے وہ خواب سنا جس کی تعبیر کے لیے تو یہاں آیا ہے۔''

حضرت یوسف علیہ السلام نے صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا۔ ساقی کو نہ ملامت کی اور نہ برسوں تک بھولے رہنے پر جھڑکا اور نہ یہ سوچا کہ جن ظالموں نے مجھ کو بے قصور زندان میں ڈالا ہے، وہ اگر تباہ ہوجائیں اور اس خواب کا حل نہ پاکر برباد ہوجائیں تو اچھا ہے بلکہ اسی وقت نہ صرف خواب کی تعبیر دی بلکہ خواب کے نقصانات سے بچنے کی تدبیر بھی بتلادی۔

''خواب کی تعبیر یہ بتاتی ہے کہ تم لوگ سات سال متواتر کھیتی کرتے رہو گے۔ یہ تمہاری خوش حالی کے دن ہوں گے۔ جب کھیتی کے کٹنے کا وقت آئے تو جس قدر تمہارے سال بھر کھانے کے لیے ضروری ہو اس کو الگ کرلینا اور باقی غلے کو ان کی بالیوں میں ہی رہنے دینا تاکہ گلنے سڑنے سے محفوظ رہے۔ اس کے بعد سات برس خوب مصیبت کے آئیں گے۔ قحط سالی ہوگی۔ وہ تمہارا جمع کیا ہوا تمام ذخیرہ ختم کردیں گے۔ پھر ایک برس ایسا آئے گا جب خوب پانی برسے گا۔ کھیتیاں ہری بھری ہوں گی اور لوگ پھلوں اور دانوں سے عرق اور تیل بہتات کے ساتھ نکالیں گے یعنی موٹی گائیں (جو خواب میں دیکھیں) اور بالیں خوش حالی کے سال ہیں اور دبلی گائیں خشک سالی کے برس ہیں جو خوشحالی کی پیداوار کو کھا جائیں گے۔

''تم کھیتی کرو گے سات برس جم کر۔ سو جو کاٹو اس کو چھوڑ دو اس کی بال میں مگر تھوڑا سا جو تم کھاؤ۔ پھر آئیں گے اس کے بعد سات برس سختی کے۔ کھا جائیں گے جو رکھا تم نے ان کے واسطے مگر تھوڑا سا جو روک رکھو گے بیج کے واسطے پھر آئے گا ایک برس اس کے پیچھے۔ اس میں مینہ (بارش) برسے گا لوگوں پر اور اس میں رس نچوڑیں گے۔''

ساقی نے یہ تعبیر اور تدبیر سنی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی جلالت قدر کا قائل ہوا اور یہ سب معاملہ بادشاہ کی خدمت میں جا کر سنا دیا۔

فرعون نے ساقی کی زبانی حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں چند کلمات سنے تھے، اب جو اپنے خواب کی ایسی جامع تعریف سنی اور قحط سالی سے بچنے کی تدبیر یوسف علیہ السلام نے بتائی تو وہ ان کا قائل ہوگیا اور انہیں دیکھنے کا مشتاق ہوا۔ ساقی کو حکم دیا۔ ''تم اسی وقت جاؤ اور اس نادر روزگار شخص کو میرے پاس لے کر آؤ۔ یہ شخص تو دانائی اور اعلیٰ انتظامی لیاقت کے سبب اس لائق ہے کہ میں اسے سرکاری مناصب میں سے کوئی عہدہ عطا کروں۔''

ساقی ایک مرتبہ پھر حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو قید میں رہتے ہوئے آٹھ سال ہوچکے تھے۔ جب ساقی نے بادشاہ کا پیغام آپ تک پہنچایا اور قید سے نجات کی خوش خبری دی تو آپ خوشی سے بے قابو نہیں ہوگئے بلکہ استقامت سے ٹھہرے رہے۔

''میں چند شرائط کے ساتھ ہی باہر جاؤں گا۔ اس طرح تو باہر جانے کو تیار نہیں۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' ساقی نے کہا۔ ''آپ ان بادشاہوں کو نہیں جانتے۔ فرعون آپ کی شرطیں ماننے میں برسوں لگا سکتا ہے۔ ویسے ہی آپ میری بھول کی وجہ سے اتنا عرصہ قید میں رہ چکے ہیں۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ اس وقت رہائی قبول کیجیے اور شرائط کا معاملہ کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیے۔''

''اگر میں اس وقت رہا ہوگیا تو اسے بادشاہ کی مہربانی سمجھا جائے گا۔ میں چاہتا ہوں حقائق سامنے آئیں۔ جن لوگوں نے مجھ پر بہتان باندھے اور مجھے یہاں تک پہنچایا گناہ گار وہ ٹھہریں۔ میری بے گناہی ثابت ہو۔ اگر میں اس وقت باہر نکل گیا تو میرا بے قصور اور صاحب عصمت ہونا پردہ خفا میں رہ جائے گا۔ اس طرح صرف عزتِ نفس ہی کو ٹھیس نہیں لگے گی بلکہ دعوت و تبلیغ کے اس اہم مقصد کو بھی نقصان پہنچے گا جو میری زندگی کا نصب العین ہے۔''

''آپ کی شرائط کیا ہیں۔ آپ مجھے بتائیں تاکہ میں وہ شرائط بادشاہ تک پہنچا دوں۔''

''بادشاہ سے کہنا کہ وہ تحقیق کرے کہ ان عورتوں کا معاملہ کیا ہے جنہوں نے مجھے دیکھ کر اپنی انگلیاں کاٹ لی تھیں۔ اس تحقیق کے لیے ان سب عورتوں کو بلایا جائے اور ان سے پوچھا جائے کہ بھلا اس وقت کیا ہوا تھا۔ اس وقت انہوں نے میرا کردار کیسا دیکھا تھا، جب انہوں نے مجھے اپنی طرف مائل کرنا چاہا تھا اور اپنے ہاتھ کاٹ کر یہ باور کرانا چاہا تھا کہ وہ میرے

حسن پر عاشق ہوگئی ہیں، یہ ان کا مکر تھا۔ وہ میری تعریف کر کے میرے نفس کو ابھارنا چاہتی تھیں۔ ان کی گواہی سے میں قصوروار اور بے قصور ٹھہروں گا۔“

ساقی آپ کا یہ پیغام لے کر بادشاہ کے پاس چلا گیا۔

بخاری اور مسلم کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس واقعے کا ذکر فرماتے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام کے ضبط وصبر کو بہت سراہا اور تواضع وکسر نفسی کی حد تک اس کو بڑھا کر پیش کیا اور یہ ارشاد فرمایا۔

”اگر میں اس قدر دراز مدت تک قید میں رہتا جس قدر کہ یوسف رہے تو بلانے والے کی دعوت فوراً قبول کر لیتا۔“

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی براہ راست گناہ گار زلیخا تھی لیکن آپ نے اس کا ذکر تک نہیں کیا کہ اسے بلا کر پوچھو بلکہ ان مصری عورتوں سے تحقیق کا مطالبہ کیا جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ یہ اس لیے کہ عزیز نے ان کے ساتھ ممکنہ حسنِ سلوک کیا تھا۔ آپ کو حیا آئی کہ اپنے اس محسن کی بیوی کا نام لیں اور اس کی رسوائی کا باعث بنیں۔

بادشاہ کے پاس جب حضرت یوسف علیہ السلام کا پیغام پہنچا تو اس نے مصری عورتوں کو بلانے سے قبل یہ موزوں سمجھا عزیز مصر سے اس معاملے کی تفصیل پوچھی جائے کہ ان مصری عورتوں نے ہاتھ کیوں کاٹے تھے اور وہ عورتیں کون کون سی ہیں۔

بادشاہ نے عزیز مصر کو طلب کر لیا اور اس سے اس معاملے کی وضاحت چاہی۔ عزیز مصر پوری تفصیل بتانے سے قاصر تھا کیونکہ اس طرح اس کی بیوی پر الزام آتا۔ اس نے اپنی گفتگو کو مصری عورتوں تک محدود رکھا۔

”ان عورتوں نے یوسف کے حسن کی بے پناہ تعریف کر کے اس کو پھسلانے کی کوشش کی تھی اور اس پر اپنی عاشقی ظاہر کرنے کے لیے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے (اس واقعے کی پوری تفصیل سنا دی)“

”یہ جرم تو ایسا نہیں تھا کہ یوسف کو قید کیا جاتا۔“ بادشاہ نے کہا۔

”مجھے یہ گمان ہوا تھا یوسف ان کے بہکاوے میں آجائے گا اور میری رسوائی ہوگی۔ اس لیے میں نے یوسف کو ان عورتوں سے الگ کرنے کے لیے زندان میں ڈال دیا۔“

”اتنے عرصے تک تمہیں اس کا خیال ہی نہ آیا؟“

”میں ملک کے کاموں میں مصروف ہو گیا تھا۔“

”مجھے تو یہ معاملہ کچھ اور لگتا ہے۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ وہ مصری عورتیں کون کون تھیں۔ اصل حقیقت شاید ان سے معلوم ہو جائے۔“

عزیز مصر نے ان عورتوں کے نام بتانے سے بھی پس و پیش کیا اور پھر یہ بہانہ کر کے بادشاہ کے پاس سے اٹھ گیا کہ وہ اپنی بیوی سے پوچھ کر ان عورتوں کے نام بتائے گا۔

وہ گھر پہنچا تو سخت گھبرایا ہوا تھا۔ جس معاملے کو وہ سمجھ رہا تھا کہ دب گیا تھا، وہ پوری شدت سے ابھرا تھا۔ بات بادشاہ تک پہنچ گئی تھی۔ زلیخا کا نام نہیں لیا گیا تھا لیکن مصری عورتوں کا کیا بھروسا۔ وہ زلیخا کا نام بھی لے سکتی ہیں۔

زلیخا کی نظروں سے اس کی پریشانی چھپی نہ رہ سکی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بتاتا، زلیخا نے خود ہی پوچھ لیا۔

”آپ کو میں نے اس قدر پریشان کبھی نہیں دیکھا۔“

”ابھی تک ملکی معاملات درپیش ہوا کرتے تھے، اس مرتبہ مسئلہ میری اور تمہاری ذات کا ہے اور بات ہے رسوائی کی۔“

”ایسی کیا بات ہے؟“

”تمہیں یوسف یاد ہے۔ ہمارا غلام یوسف؟“

”اسے میں کیسے بھول سکتی ہوں۔ وہ تو قید میں اپنی سزا بھگت رہا ہوگا۔“

”بادشاہ نے اس کی رہائی کا فیصلہ کیا ہے۔“

”تو ہمیں کیا۔ اب تک تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہوگا۔“

”صرف اس کی رہائی عمل میں نہیں آرہی ہے بلکہ بادشاہ نے اس معاملے کی چھان بین کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم نے جس رسوائی سے بچنے کے لیے یوسف کو قید کیا تھا وہ پھر ہمارے سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔“

”آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ یوسف ہمارا غلام ہے۔ وہ ہمارے خلاف زبان نہیں کھولے گا۔“

”اس نے تو اب بھی ہمارے خلاف زبان نہیں کھولی ہے مگر اس کا مطالبہ یہ ہے کہ ان مصری عورتوں سے بلا کر پوچھا

جائے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ مجھے ڈر ہے وہ اپنی جان بچانے کے لیے تمہارا نام نہ لے دیں۔''

''آپ اس کی بھی فکر نہ کریں۔ وہ سب میرے کہنے سے باہر نہیں ہیں۔ میں انہیں سمجھا دوں گی۔ وہ ہرگز میرا نام درمیان میں نہ آنے دیں گی۔''

''تمہیں جو کچھ کرنا ہے، آج ہی آج کرلو۔''

زلیخا نے اسی وقت سواری منگوائی اور ان عورتوں میں سے ایک ایک کے پاس جا کر سمجھا دیا کہ انہیں کیا کہنا ہے۔

''تم کہہ دینا کہ یوسف نے تمہیں ورغلانے کی کوشش کی تھی اور خبردار یہ ذکر نہ آئے کہ میں اس کے لیے بے قابو تھی۔''

وہ عزیز مصر کی بیوی تھی۔ بادشاہ کے بعد اس کے شوہر ہی کا نام آتا تھا۔ یہ عورتیں اس سے دشمنی مول نہیں لے سکتی تھیں۔ انہوں نے وعدہ کرلیا کہ جو اس نے کہا ہے وہی کہیں گی۔

زلیخا نے گھر آکر ان عورتوں کے نام اپنے شوہر کو بتا دیے جو اس نے بادشاہ تک پہنچا دیے۔ بادشاہ نے ان عورتوں کو پیغام بھجوا دیا کہ وہ کل اس قید خانے میں پہنچ جائیں جہاں یوسف قید ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے چونکہ اس وقت تک زنداں سے باہر آنے سے انکار کردیا تھا جب تک کہ تحقیق نہیں ہوجاتی اور بادشاہ چاہتا تھا معاملے کی تحقیق یوسفؑ کے سامنے ہو۔

زلیخا اس رات بہت بے چین رہی۔ اس کا ضمیر بار بار اسے ملامت کررہا تھا کہ ایک بے قصور کو میں نے پہلے زنداں میں ڈلوایا اور اب اس کے خلاف گواہی دینے کے لیے عورتوں کو تیار کرلیا ہے۔ تقریباً آٹھ یا نو سال بعد جب اچانک حضرت یوسف علیہ السلام کا نام اس کے سامنے آیا تو عشق کی دبی ہوئی چنگاریاں شعلہ بن گئیں۔ بے اختیار جی چاہا کہ یوسف میرے سامنے ہو اور میں اسے دیکھوں اور اگر دنیا کا خیال نہ ہو تو اقرارِ جرم بھی کروں۔ قصور میرا تھا سزا اسے ملی ہے۔ اس نے اپنی جوانی کے کتنے سال زنداں میں گزار دیے۔

زلیخا کو بادشاہ نے نہیں بلوایا تھا لیکن صبح ہونے تک وہ یہ فیصلہ کرچکی تھی کہ صرف مصری عورتیں ہی زنداں نہیں جائیں گی بلکہ وہ بھی وہاں پہنچے گی۔

یہ عجیب لطیفہ غیبی تھا کہ یوسفؑ کو زنداں کی طرف روانہ کرنے والی آج خود زنداں کی طرف جارہی تھی جہاں اسے یوسفؑ کے سامنے جوابدہ ہونا تھا۔

بادشاہ بذاتِ خود زنداں میں پہنچا اور ان عورتوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کے روبرو کرکے ان سے پوچھا۔

''صاف صاف اور صحیح صحیح بتاؤ کہ اس معاملے کی حقیقت کیا ہے جبکہ تم نے یوسف پر ڈورے ڈالے تھے تاکہ تم اس کو اپنی طرف مائل کرلو۔''

ان عورتوں کو معلوم ہوچکا تھا کہ زلیخا بھی یہاں موجود ہے اور وہی کچھ سننے کی مشتاق ہوگی جو وہ ہمیں سکھا چکی ہے لیکن انہوں نے آپس میں فیصلہ کرلیا کہ وہی کہیں گی جو حقیقت ہے۔ انہوں نے یوسفؑ اور زلیخا کے عشق کی پوری داستان سنانے کے بعد کہا۔

''جب ہمیں معلوم ہوا کہ زلیخا اپنے غلام کو دل دے بیٹھی ہے تو ہمیں یہ بات صریح گمراہی لگی کہ ایک خاندانی عورت اپنے غلام پر فدا ہوگئی ہے۔ ہم نے اسے لعن طعن کی کہ یوسف کے حسن کے قصے سنا کر ہمیں اس کا تمنائی کردیا اور وہ اسے ہمارے سامنے لائی۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمارا بھی وہی حال ہوا جو زلیخا کا ہوا تھا۔ ہم نے یوسف کو متاثر کرنے کے لیے اپنے ہاتھ کاٹ لیے لیکن وہ پاکباز تھا۔ اس نے ہماری حوصلہ افزائی نہیں کی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے یوسف میں کوئی برائی نہیں دیکھی۔''

یہ گواہی دوسروں کی زبانی تھی۔ زلیخا قریب ہی کھڑی تھی۔ اس نے سوچا اگر میں یوسف سے عشق کی دعویدار ہوں تو حقیقت آشکار کردوں تاکہ یوسف بے قصور ثابت ہو۔ میری رسوائی ہوتی ہے تو ہوا کرے۔

وہ بے اختیار بول اٹھی۔ ''اب حق کھل چکا ہے۔ وہ میں ہی تھی جس نے اس کو پھسلانے کی کوشش کی تھی۔ بے شک وہ بالکل سچا ہے۔''

زلیخا کے اس بیان پر زندان میں سناٹا چھا گیا۔ بادشاہ بھی اس طرح خاموش تھا جیسے وہ بولنا بھول گیا ہو۔ عزیز مصر کے ہونٹوں پر بھی خشکی جم گئی تھی۔

حضرت یوسف علیہ السلام

قدرت نے یہ اہتمام کر دیا تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام .... کی عصمت و پاکبازی اور صداقت وطہارت کا معاملہ تہمت لگانے والوں کی زبان ہی سے واضح ہوجائے۔خود مجرم (زلیخا) اقرار کر چکی تھی البتہ ایک اندیشہ پھر بھی رہ گیا تھا کہ اس قدر آسامیوں کا فائدہ کہیں حضرت یوسف علیہ السلام نے تو نہیں اٹھالیا۔اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے اس سناٹے میں حضرت یوسف علیہ السلام کی آواز گونجی۔

''میں نے حقیقت حال جاننے کی خواہش اس لیے نہیں کی تھی کہ میں پاکیزہ سمجھا جاؤں بلکہ اس سے میری غرض یہ تھی کہ عزیز یہ جان لے کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے اس کی خیانت نہیں کی تھی اور یہ کہ جو خیانت کرتے ہیں ان کی چالوں کو اللہ کامیابی سے ہم کنار نہیں کرتا۔میں کچھ اپنے نفس کی برات نہیں کررہا ہوں۔نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے مگر یہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو۔بے شک میرا رب بڑا غفورالرحیم ہے۔''

عزیز مصر نے جس بات کو چھپانے کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید کرایا تھا، وہ حقیقت علی الاعلان ظاہر ہوگئی اور وہ بھی خود اس کی بیوی کی زبانی۔

''میں نے ہی اس کو اپنے نفس کے لیے پھسلایا تھا اور بلاشبہ وہ سچا ہے۔''عزیز مصر وہاں زیادہ دیر کھڑا نہ رہ سکا۔

فرعون پر جب حقیقتِ حال منکشف ہوگئی تو اس کے قلب میں حضرت یوسف علیہ السلام کی عظمت جاگزیں ہوگئی۔اپنے خواب کی بہترین تعبیر سن کر وہ حضرت یوسف علیہ السلام کی عقل و دانش کا معترف پہلے ہی ہو چکا تھا، اب ان کی دیانت و پاکیزگی دیکھ کر ان پر فریفتہ ہوگیا۔

بادشاہ نے اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ یوسف کو خوب بنا سنوار کر اور دربار کے لائق بنا کر میرے دربار میں پیش کرو۔

آپ نے غسل فرمایا۔زنداں کی میل کچیل صاف ہوئی۔شاہی پوشاک زیب تن کرائی گئی اور بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

بادشاہ سے بات چیت کا آغاز ہوا تو بادشاہ حیران رہ گیا کہ اب تک جس کے حسن کے چرچے سنے تھے، جس کی امانت داری ملاحظہ کی تھی، وہ عقل ودانش میں بھی اپنی نظیر آپ ہے۔وہ بے اختیار کہہ اٹھا۔

''بلاشبہ آج کے دن تو ہماری نگاہوں میں بڑا صاحب اقتدار اور امانت دار ہے۔''

بادشاہ نے دریافت کیا۔''میرے خواب میں جس قحط سالی کا ذکر ہے اس کے متعلق مجھ کو کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔تُو کوئی مشورہ دے کہ میں اس پر عمل کروں۔''

''پہلے تو آپ یہ کریں کہ کسی دانشور اور عقلمند آدمی کو تلاش کر کے اسے ملک مصر پر مختار بنائیے۔اس آدمی کو اختیار ہو کہ وہ ملک میں ناظروں کو مقرر کر دے اور ارزانی کے سات برسوں میں سارے ملک مصر کی پیداوار کا پانچواں حصہ لے اور وہ ان اچھے برسوں میں جو آتے ہیں، سب کھانے کی اچھی چیزیں جمع کرے اور شہر شہر میں غلہ جو آپ کے اختیار میں ہو فراہم کر کے اس کی حفاظت کرے۔یہی غلہ ملک کے لیے ذخیرہ ہوگا اور ساتوں برس کے لیے جب تک ملک میں کال رہے گا، کافی ہوگا تاکہ کال کی وجہ سے ملک برباد نہ ہوجائے۔''

آپ کی ان تجاویز سے فرعون اور اس کے خادموں نے اتفاق کیا۔

''کیا ہم کو ایسا آدمی جیسا یہ ہے جس میں خدا کی روح ہے، مل سکتا ہے؟''فرعون نے خادموں سے پوچھا پھر وہ حضرت یوسف علیہ السلام سے مخاطب ہوا۔''چونکہ خدا نے تجھے یہ سب کچھ سمجھا دیا ہے اس لیے تیرے مانند دانشور اور عقل مند کوئی نہیں لہٰذا آج سے تُو میرے گھر کا مختار ہوگا اور میری ساری رعایا تیرے حکم پر چلے گی۔فقط تخت کا مالک ہونے کے سبب سے میں بزرگ تر ہوں گا۔''

عزیز مصر نے اپنی انگشتری اپنے ہاتھ سے نکال کر حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھ میں پہنا دی اور انہیں باریک کتان کے لباس میں آراستہ کروا کر سونے کا طوق ان کے گلے میں پہنایا اور رتھ میں سوار کرایا۔دوسرے رتھ میں وہ خود سوار تھا۔منادی آگے آگے آواز لگاتا جارہا تھا۔

''گھٹنے ٹیکو۔ملک مصر کا حامی آتا ہے۔''

اہلِ کتاب کہتے ہیں اس وقت آپ کی عمر تیس سال تھی اور بادشاہ نے آپ کی شادی ایک بہت عظمت والی عورت سے کرادی تھی۔

توریت میں ہے۔

''لون کے پجاری فوطیفرع کی آسناتھ سے یوسفؑ کے دو بیٹے پیدا ہوئے اور یوسف نے پہلوٹھے کا نام ''منسی'' یہ کہہ کر رکھا کہ خدا نے میری اور میرے باپ کی سب مشقت مجھ سے بھلا دی اور دوسرے کا ''افرائیم'' یہ کہہ کر رکھا کہ خدا نے مجھے میری مصیبت کے ملک میں پھلدار کیا۔''

ایک قول یہ بھی آتا ہے کہ بادشاہ نے زلیخا کے میاں کے مرنے کے بعد زلیخا کی شادی حضرت یوسف علیہ السلام سے کرادی تھی۔

محمد بن اسحٰق فرماتے ہیں کہ اس وقت کا بادشاہ ''ریان'' حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہو گیا تھا۔

قدرت کا کیسا عطا و کرم ہے کہ کل جس ہستی کو مصر کی متمدن قوم، بدوی و صحرائی سمجھتی تھی اور غلام بھی وہ پہلے ایک سردار کے گھر میں شان و شوکت سے پہنچا دیا گیا۔ پھر قید خانے کی زندگی سے نکلا تو مملکتِ مصر اور قوم مصر کا مالک و مختار بنا دیا اور اس مرتبے پر پہنچا دیا اسباب دنیوی کے لحاظ سے جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اسی لیے حق باری تعالیٰ نے فرمایا۔

''اور اس طرح ہم نے سرزمین مصر میں یوسف علیہ السلام کے قدم جما دیے کہ جس جگہ سے چاہے حسب مرضی رہنے سہنے کا کام لے۔ ہم جسے چاہتے ہیں اپنی رحمت سے فیض یاب کرتے ہیں اور نیک عملوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتے اور جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور بدعملیوں سے بچتے رہے ان کے لیے آخرت کا اجر تو اس سے کہیں بہتر ہے۔''

حضرت یوسف علیہ السلام نے سلطنتِ مصر کے مختار کل ہونے کے بعد خواب سے متعلق وہ تمام تدابیر شروع کردیں جو چودہ سال کے اندر مفید کار ہو سکیں اور قحط سالی کے ایام آرام سے گزر جائیں۔

کام سنبھالتے ہی انہوں نے حالات کا جائزہ لینے کے لیے سارے ملک مصر کا دورہ کیا۔ یہ ارزانی کا دور تھا۔ خواب کی تعبیر کے مطابق سات برس تک اس خوش حالی کو رہنا تھا۔ افراط سے فصل ہو رہی تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے سات برس تک وہ تمام کھانے کی چیزیں جو سرزمینِ مصر میں تھیں، جمع کر کے شہروں میں ذخیرہ کرتے رہے۔ ہر شہر کی غذائی اجناس اسی شہر میں ذخیرہ کیں۔ غلہ سمندر کی ریت کی طرح ذخیرہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ حساب رکھنا بھی چھوڑ دیا کیونکہ وہ بے حساب تھا۔

سات سال ان انتظامات میں گزر گئے تو خوش حالی کا دور رخصت ہوا، قحط سالی کا آغاز ہوا۔ جب اجناس کی قلت ہوئی اور لوگ بھوکوں مرنے لگے تو روٹی کے لیے فرعون کے آگے چلائے۔ فرعون نے مصریوں سے کہا کہ یوسف کے پاس جاؤ۔ جو کچھ وہ تم سے کہے وہ کرو۔ یہ لوگ روتے بلکتے حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ذخیروں کے منہ کھول دیے اور مصریوں کے ہاتھ بیچنے لگے۔ تمام ملکوں میں قحط پڑا ہوا تھا۔ کھیتیاں سوکھ گئی تھیں۔ خلقِ خدا دانے دانے کو محتاج ہو رہی تھی۔

جب دوسرے ملکوں کے لوگوں نے سنا کہ مصر میں اناج کی بہتات ہے۔ جو بھی قیمت ادا کرے خرید سکتا ہے تو دوسرے ملکوں سے لوگ اناج خریدنے آنے لگے اور اونٹوں پر لاد کر لے جانے لگے۔

☆☆☆

کنعان کے آسمان پر آج چاند نہیں چمکا تھا۔ تیل کی کمی نے چراغ خانہ کو بھی سرِ شام ہی بجھا دیا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ اس سوال نے سب کو پریشان کر دیا تھا۔ حضرت یعقوبؑ نبی تھے اور تمام بستی والوں کے محافظ و نگراں بھی۔ انہیں صرف اپنی نہیں بستی کے لوگوں کی بھی فکر تھی۔ اس وقت بھی وہ اب کیا ہوگا؟ کے سوال کے جواب تلاش کرنے میں غلطاں تھے۔ بستی کے کچھ لوگ ابھی ابھی ان کے پاس سے اٹھ کر گئے تھے اور اب ان کے سامنے ان کے گیارہ بیٹے بیٹھے تھے اور کسی حکم کے سننے کے منتظر تھے۔

''ابھی تمہارے آنے سے قبل بستی کے کچھ لوگ میرے پاس سے اٹھ کر گئے ہیں۔'' حضرت یعقوبؑ نے بیٹوں کو مخاطب کیا۔ ''ان سب کا برا حال ہے۔ گھروں میں کھانے کے لیے بہت کم رہ گیا ہے۔ وہ مجھ سے مدد کے طالب تھے۔ میں نے ان سے وعدہ کر لیا ہے۔''

''آپ نے کیوں وعدہ کر لیا۔ ہمارے کھیت تو خود ہمارے سامنے مٹھیاں باندھے کھڑے ہیں۔ ہم کسی کو کیا دیں گے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ سخت کال نے روئے زمین کا منہ ڈھانپ لیا ہے۔ ہر ملک میں قحط پاؤں جمائے کھڑا ہے۔''

''میں نے جوان سے وعدہ کیا ہے کسی وجہ سے کیا ہے۔ایک تدبیر ہے میرے سامنے۔''

''آپ کی تدبیریں ہماری سمجھ میں تو آتی نہیں ہیں۔پھر بھی ہمیں معلوم تو ہو آپ نے کیا سوچا ہے۔اب یہ مت کہہ دیجیے گا کہ ہم آسمان پر جائیں اور بارش برسانے کا کوئی انتظام کریں۔''

''تمہاری انہی گستاخیوں نے مجھے بوڑھا کردیا ہے۔میری ہڈیاں اکڑ گئی ہیں ورنہ میں خود کچھ نہ کچھ کرلیتا۔یا آج میرا یوسف ہوتا اور یقیناً جوان ہو چکا ہوتا تو وہ مجھے ہرگز ایسا جواب نہ دیتا۔''

''یوسف کا تو اب نام ونشان بھی باقی نہیں رہا اور آپ ہیں کہ اسی کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ہماری کوئی اہمیت ہی نہیں۔''

''کیوں نہ یاد کروں۔وہ میری آنکھوں کی روشنی تھا۔دیکھتے نہیں کہ وہ گیا تو اس کے ساتھ میری آنکھیں بھی چلی گئیں۔جب دیکھنے کو وہ نہیں تو میں کیوں کسی کو دیکھوں۔''

حضرت یوسف علیہ السلام کے چلے جانے کے بعد روتے رہنا ہی حضرت یعقوبؑ کا شعار بن گیا تھا۔روتے روتے بینائی چلی گئی تھی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا نام آتا تھا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوجاتے تھے۔اس وقت بھی حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر آگیا تو آپ کا دل بھر آیا۔جو گفتگو کررہے تھے درمیان میں رہ گئی۔

تمام بھائی ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔

پھر ایک نے دوسرے سے کہا۔''ابا جان کیا کہنے والے تھے معلوم تو ہو۔''

''اب وہ کچھ نہیں کہیں گے۔انہیں یوسف یاد آ گیا ہے۔''

''معلوم تو کرو شاید ہمارے فائدے کی بات ہو۔''

ان میں سے ایک نے ہمت کی۔

''ابا جان! آپ وہ بات بتا رہے تھے جو ہمیں نہیں معلوم۔''

''کیا تم نہیں جانتے کہ ہمیں قحط کا سامنا ہے؟''

''ہمیں معلوم ہے لیکن ہم کیا کرسکتے ہیں؟''

''میں نے سنا ہے کہ مصر میں غلہ افراط سے مل رہا ہے۔تم سب مل کر وہاں جاؤ اور ہمارے لیے غلہ لے کر آؤ تاکہ ہم زندہ رہیں ہلاک نہ ہوجائیں۔''

''یہ کیا ضمانت ہے کہ جب تک ہم مصر پہنچیں گے غلہ موجود ہوگا؟''

''تم جاؤ تو سہی۔اللہ نے مدد کی تو غلہ وہاں بہت ہے۔''

باپ کے حکم کے مطابق یہ کنعانی قافلہ عزیز مصر سے غلہ لینے کے لیے مصر روانہ ہوا۔سب سے چھوٹا بھائی بن یامین اس قافلے میں شامل نہیں تھا۔حضرت یعقوبؑ نے اسے اپنے پاس روک لیا تھا کہ سب کے چلے جانے کے بعد کوئی تو ان کی دیکھ بھال کے لیے ان کے پاس ہو۔

اس چھوٹے سے کنعانی قافلے نے مصر کی حدود میں قدم رکھا تو انہوں نے اپنی طرح کے کئی اور قافلے بھی دیکھے جو اناج خریدنے آئے تھے۔انہیں امید ہو چلی کہ اناج وافر مقدار میں ہے۔انہیں مایوسی نہیں ہوگی۔

وہ ایک بڑے میدان میں پہنچ گئے جہاں غلہ تقسیم کیا جارہا تھا۔حضرت یوسف علیہ السلام ایک جگہ مرصع کرسی پر بیٹھے پورے کام کی نگرانی فرمارہے تھے۔

مصر کے دستور کے مطابق جو قافلہ وہاں پہنچتا تھا،اس میں شامل لوگ سرزمین پر ٹیک کر حضرت یوسفؑ کے حضور آداب بجالاتے تھے اور جب وہ اجازت دیتے تھے تو کارندے ان کے ہاتھ اناج فروخت کرتے تھے۔

خدا کی قدرت دیکھیے کہ برادران یوسفؑ اسی بھائی کے آگے سجدہ کرنے کے لیے اپنی باری کا انتظار کررہے تھے جسے وہ اپنی دانست میں کسی مصری گھرانے کا معمولی غلام بنا چکے تھے۔وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کل کا غلام آج مصر کے تاج وتخت کا مالک ومختار کل ہے اور اسی کے سامنے عرض حال کرنا ہے۔

وہ سب حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے پہنچے اور سرزمین پر ٹیک کر آداب بجالائے۔حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا لیکن وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو نہ پہچان سکے۔پہچانتے بھی کیسے۔وہ جب کنعان میں تھے تو کم عمر

لڑکے تھے اور اب چالیس سالہ تجربہ کار انسان۔ ناک نقشہ بدل چکا تھا۔ بول چال کا انداز جدا ہو گیا تھا اور پھر یہ شائبہ بھی نہ ہو سکتا تھا کہ تختِ شاہی پر بیٹھنے والا یوسف ہو سکتا ہے۔

''وہ جب یوسف کے پاس پہنچے تو اس نے فوراً اُن کو پہچان لیا اور وہ یوسف کو نہ پہچان سکے۔'' (سورۃ یوسف)

حضرت یوسف علیہ السلام ابھی اپنی شناخت کرانا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے ڈانٹ کر ان سے پوچھا۔

''تم لوگ کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟''

''ہم لوگ کنعان سے آئے ہیں۔ ہمارے ملک میں قحط ہے۔ ہمیں اناج کی کشش یہاں کھینچ لائی ہے۔''

''تم لوگ جھوٹ بولتے ہو۔ دراصل تم جاسوس ہو اور اس ملک کی بری حالت دریافت کرنے آئے ہو۔''

''نہیں خداوند! تیرے غلام اناج مول لینے آئے ہیں۔ ہم سب ایک ہی شخص کے بیٹے ہیں اور جاسوس نہیں۔''

''تم کتنے بھائی ہو۔ جس شخص کے تم بیٹے ہو اس کے کتنے بیٹے ہیں؟''

''تیرے غلام بارہ بھائی تھے۔''

''مگر تم تو دس ہو۔''

''ایک بھائی گھر پر رہ گیا ہے۔''

''پھر بھی گیارہ ہوئے۔''

''ایک بھائی بچپن ہی میں غائب ہو گیا جو آج تک نہیں ملا۔''

''مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ تم نے اسے قتل کر کے کہیں پھینک دیا تھا۔''

''بھلا ہم کیوں ایسا کریں گے جبکہ وہ ہمارا بھائی تھا۔ ہمارے باپ کی آنکھوں کا تارا تھا۔''

''شاید تم ہی سچے ہو مگر میں کہہ چکا کہ تم جاسوس ہو۔''

''اب ہم آپ کو کیسے یقین دلائیں۔''

''تمہاری آزمائش اس طرح کی جائے گی کہ فرعون کی قسم تم اس وقت تک یہاں سے جا نہیں پاؤ گے جب تک تمہارا سب سے چھوٹا بھائی یہاں نہ آ جائے اور میں اسے دیکھ نہ لوں۔''

''یہ کس طرح ممکن ہے جبکہ وہ بھائی ہمارے ساتھ آیا ہی نہیں۔''

''تمہارے اس بھائی کا نام کیا ہے؟''

''اس کا نام بن یامین ہے۔''

اب حضرت یوسف علیہ السلام کو پوری طرح یقین ہو گیا کہ انہوں نے اپنے بھائیوں کو صحیح پہچانا ہے۔ یہ وہی ہیں۔ ایک ایک بھائی کو غور سے دیکھتے تھے اور دل ہی دل میں ایک ایک کا نام دہراتے تھے۔ پھر آپ نے انہیں اپنے پاس روک لیا۔

''تم اپنے میں سے ایک کو بھیجو اور اپنے چھوٹے بھائی کو بلا لو تاکہ تصدیق ہو کہ تم سچے ہو ورنہ فرعون کی قسم تم جاسوس ہو۔''

حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں قید میں رکھا اور کرید کرید کے گھر کی باتیں پوچھتے رہے۔

''اچھا یہ بتاؤ تمہارے والد کی حالت کیسی ہے؟''

''وہ غائب ہو جانے والے بیٹے سے بہت محبت کرتے تھے۔ جب وہ غائب ہو گیا اور گھر نہیں پہنچا تو اس وقت سے اب تک اسے یاد کر کے برابر روتے رہتے ہیں۔ ہر وقت کے رونے سے ان کی بینائی زائل ہو گئی ہے۔''

''تمہارا بھائی غائب کیسے ہو گیا تھا؟''

''وہ اکیلا جنگل میں نکل گیا تھا۔ کوئی کہتا ہے اسے بھیڑیا اٹھا کر لے گیا۔ کوئی کہتا ہے مصر آنے والے قافلے کے ہاتھ لگ گیا اور انہوں نے یہاں لا کر غلام بنایا اور بیچ دیا۔ خدا کرے اسے بھیڑیا نہ لے گیا ہو۔ زندہ ہو چاہے غلام ہی کیوں نہ ہو۔''

''اگر وہ تمہیں مل جائے تو تمہاری کیا حالت ہو گی؟''

''ہم اپنی آنکھیں اس کے قدموں میں رکھ دیں گے۔ اس سے معافی مانگیں کہ ہم اس کی حفاظت نہ کر سکے۔''

حضرت یوسفؑ جانتے تھے کہ ان کے بھائی ان کے بارے میں جھوٹ بول رہے ہیں۔ وہ بااختیار بھی تھے لیکن کوئی سزا نہیں دی، ان کے جھوٹ پر گرفت نہیں کی۔

حضرت یوسفؑ کے خواب کا ایک جز پورا ہو چکا تھا۔ ان کے بھائی انہیں تعظیمی سجدہ کر چکے تھے۔ تعبیر کے مطابق عظمت

وبزرگی ان کے نصیب میں آ چکی تھی۔ اب شمس وقمر باقی تھے جو دراصل ان کے ماں باپ تھے۔ ان سے ملاقات باقی تھی۔ ان کی سگی ماں تو دنیا میں نہیں تھیں لیکن سوتیلی ماں تو تھیں جنہیں ابھی مصر آنا تھا۔

جب تین دن گزر گئے تو حضرت یوسفؑ کو اپنے بھائیوں پر رحم آیا۔ یہ خیال بھی آیا کہ یہ لوگ اناج لینے آئے تھے۔ نہ جانے گھر میں کچھ کھانے کو ہے یا نہیں۔ انہیں جلد سے جلد اناج دے کر رخصت کیا جائے تاکہ گھر کا چولہا جلے۔ میرے والد کس شدت سے ان کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ بھائی ان کے اختیار میں تھے ان سے بدلہ لیتے یا کم از کم احسان تو جتا ہی دیتے لیکن وہ تو کریم ابنِ کریم تھے۔

حضرت یوسفؑ نے حکم کیا کہ ان کے بوروں میں ان کے حسبِ مرضی غلہ بھر دیں۔ حضرت یوسفؑ کے ملازموں نے ان کے بوروں میں غلہ بھر دیا۔

جب ملازم غلہ بھر رہے تھے تو حضرت یوسفؑ نے ان سے کہا کہ ان کے بوروں میں وہ پونجی (رقم) بھی رکھ دو جو انہوں نے قیمت کے طور پر ادا کی ہے۔ کیا عجب کہ یہ رقم دیکھ کر وہ دوبارہ چلے آئیں۔ ہوسکتا ہے دوبارہ ضرورت پڑے اور رقم نہ ہونے کے سبب نہ آسکیں۔

جب بھائی رخصت ہونے لگے تو حضرت یوسفؑ نے انہیں روک لیا۔

''قحط اس قدر سخت ہے کہ تمہیں دوبارہ آنا پڑے گا۔ اس لیے یاد رکھو کہ اب کی مرتبہ اگر تم اپنے چھوٹے بھائی بن یامین کو ساتھ نہ لائے جس کے متعلق تم نے مجھ سے کہا ہے کہ اس کا بھائی گم ہوگیا ہے اور اس لیے تمہارا باپ اس کو کسی طرح جدا نہیں کرتا تو تم کو ہرگز غلہ نہیں ملے گا نہ میں تمہیں اپنے پاس جگہ دوں گا۔''

''اور جب یوسف (علیہ السلام) نے ان کا سامان مہیا کر دیا تو کہا اب کے آنا تو اپنے سوتیلے بھائی بن یامین کو بھی ساتھ لانا۔ تم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ میں تمہیں پوری تول دیتا ہوں اور باہر سے آنے والوں کے لیے بہتر مہمان نواز ہوں لیکن اگر تم اسے میرے پاس نہ لائے تو پھر یاد رکھو نہ تو تمہارے لیے میرے پاس خرید و فروخت ہوگی، نہ تم میرے پاس جگہ پاؤ گے۔'' (سورۃ یوسف)

بھائیوں کو کچھ خبر نہیں تھی کہ ان کے بوروں میں ان کی رقم جو انہوں نے قیمت کے طور پر ادا کی تھی، رکھ دی گئی ہے۔

انہوں نے خوشی خوشی بوروں کو اونٹوں پر لادا اور اپنے ملک کنعان کی طرف چل دیے۔ وہ راستے بھر حاکم مصر کی باتیں کرتے رہے جسے وہ پہچان نہ سکے تھے، جسے انہوں نے سخت بھی پایا تھا اور نرم بھی۔

واپسی میں جب وہ اس کنویں کے پاس سے گزرے جہاں انہوں نے حضرت یوسفؑ کو ڈال دیا تھا تو کچھ دیر کے لیے رک گئے۔ وہ کئی مرتبہ یہاں سے گزرے تھے۔ انہیں خیال بھی نہیں آیا تھا لیکن اس وقت آ گیا۔

''اچھا ہوا ہم نے حاکمِ مصر کو یہ نہیں بتا دیا کہ بن یامین کے بھائی کو فلاں کنویں میں پھینک دیا گیا تھا ورنہ وہ تو عجیب آدمی ہے۔ یہاں تک تحقیق کرنے آ جاتا۔'' راوبین نے کہا۔

''ہم نے تو سنی سنائی بات کہہ دی کہ لوگ یہ کہتے ہیں۔'' شمعون بولا۔

''ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اسے ہماری ذات میں اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہوگئی تھی؟'' زبولون نے پوچھا۔

''اس لیے کہ وہ ہمیں جاسوس سمجھ رہا تھا۔'' لاوی نے کہا۔

''یہ مصر والے ہم کنعانیوں کو ایسا ہی سمجھتے ہیں۔'' ولسیا کر نے منہ بنا کر کہا۔

''اس سے تو اچھا ہے ہم دوبارہ نہ جائیں۔ وہ اب کے کچھ اور نہ سمجھ لے۔'' شمعون پھر بولا۔

''اگر قحط ختم نہ ہوا تو جانا تو پڑے گا۔''

''اس نے یہ بھی تو کہہ دیا ہے کہ اب کے آؤ تو بن یامین کو ساتھ لانا۔''

''یہ تو اور بھی مصیبت ہوگئی۔ ابا جان اسے ہمارے ساتھ جانے دیں گے؟ نہ جانے دیا تو ہم تو غلہ لا چکے۔''

''ابھی تو گھر چلو۔ دیکھا جائے گا جو ہونا ہوگا ہو جائے گا۔''

گھر بھی قریب آ گیا تھا لہٰذا انہیں خاموش ہونا پڑا۔

گھر جاتے ہی وہ حضرت یعقوبؑ کی خدمت میں پہنچ گئے اور جو کچھ مصر میں ان پر گزری تھی، ایک ہی سانس میں سنا دی۔

''مصر کے والی نے اس مرتبہ تو ہمیں اناج دے دیا ہے لیکن دوبارہ نہیں مل سکے گا۔''

''کیوں، کیا وہاں بھی اناج ختم ہوگیا؟''

''ختم نہیں ہوگیا بلکہ اس نے ایک عجیب شرط عائد کردی ہے۔ اس نے کہا ہے اس وقت تک یہاں نہ آنا جب تک اپنے بھائی بن یامین کو اپنے ساتھ نہ لاؤ۔ ہمیں معلوم ہے آپ اسے ہمارے ساتھ نہیں آنے دیں گے اس لیے غلہ بھی دوبارہ نہیں آ سکتا۔''

''تمہیں خدا سمجھے۔ تم نے یہ کیوں بتادیا کہ تم ایک بھائی کو گھر پر چھوڑ کر آئے ہو۔ نہ تم بتاتے اور نہ وہ یہ شرط عائد کرتا۔''

''ہم نے کب بتایا۔ اس نے جب ہمیں ایک ساتھ دیکھ کر جاسوس سمجھا تو اپنی جان چھڑانے کے لیے ہم نے اس سے کہا کہ ہم بارہ بھائی ہیں۔ ایک گم ہوگیا ایک گھر پر ہے۔ ہم کیا جانتے تھے کہ وہ کہے گا کہ اپنے بھائی کو لے آؤ۔''

''پھر بھی میں بن یامین کو تمہارے ساتھ نہیں جانے دوں گا۔''

''آپ اس کو ہمارے ساتھ کردیں۔ ہم اس کے ہر طرح نگہبان اور محافظ ہیں۔''

''اسی طرح نگہبان ہوگے جیسے یوسف کے وقت میں ہوئے تھے؟ اس وقت بھی تم یہی کہہ کر گئے تھے اور اس کی حفاظت نہیں کرسکے تھے۔ تمہاری حفاظت ہی کیا۔''

اس وقت ان بھائیوں نے بحث کو طول دینا مناسب نہ سمجھا اور اپنے اپنے بوروں سے اناج نکالنے لگے کہ اسے محفوظ کرلیا جائے۔ ایک بھائی نے بورا کھولا۔ دیکھا کہ اس میں وہ نقدی رکھی ہوئی ہے جو اس نے ادا کی تھی۔ وہ چیخا اور دوسرے بھائیوں کو بلایا۔ پھر دوسرے نے بورا کھولا تو اس کی نقدی بھی رکھی ہوئی تھی۔ اسی طرح تمام بھائیوں کے بوروں سے نقدی نکلی۔

''ہمیں اور کیا چاہیے۔ غلہ بھی مل گیا، نقدی بھی واپس آ گئی۔''

''عجیب حاکم تھا۔ شاید ہمیں مسکین سمجھا ہو۔''

''یہ بھی ہوسکتا ہے، اس کے ملازموں نے غلطی سے یہ رقم واپس کردی ہو۔''

''یوسفؑ نے اپنے غلاموں کو اشارہ کیا کہ ان لوگوں نے غلے کے عوض جو مال دیا ہے، وہ چپکے سے ان کے سامان میں رکھ دو۔'' (سورۃ یوسف)

بعض حضرات فرماتے ہیں، اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ اس قیمت کو واپس جاکر اپنے ہی غلوں میں دیکھیں گے تو واپس دینے کے لیے مصر آئیں گے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ خیال فرمایا تھا کہ شاید ان کے پاس دوبارہ واپس آنے کے لیے پیسے نہ ہوں تو یہ پیسے انہیں دے دو تاکہ دوبارہ آنے میں انہیں مدد ملے۔

اور ایک قول یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو بُرا لگا ہوگا کہ بھائیوں سے غلے کے پیسے لیں۔ غرض یہ کہ جب غلے سے رقم نکلی تو وہ بھاگے ہوئے باپ کے پاس گئے اور شدومد سے اصرار کرنے لگے۔

''ہمیں اور کیا چاہیے۔ ہمیں اناج بھی مل گیا اور پیسے بھی۔ ہم واپس جائیں گے اور مزید اناج لے کر آئیں گے کیونکہ یہ اناج کم ہے لیکن اس مرتبہ بن یامین کو لے جانا ضروری ہے۔ اس کے حصے کا غلہ بھی خریدنا ہوگا۔''

''تم نے مجھے بے اولاد کردیا۔ میرا یوسف نہیں رہا اور اب تم بن یامین کو لے جانے کی ضد کررہے ہو۔ یہ سب باتیں میرے خلاف ہیں۔ میں ہرگز اسے تمہارے ساتھ نہیں جانے دوں گا۔''

رادبین سامنے آیا اور اس نے عہد کیا۔

''اگر میں اسے آپ کے پاس نہ لے آؤں تو میرے دونوں بیٹوں کو قتل کردینا۔ اسے میرے حوالے کردیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اسے واپس لاکر آپ کے حوالے کردوں گا۔''

''نہیں، ہرگز نہیں۔ میرا بیٹا تمہارے ساتھ نہیں جائے گا۔ اس کا بھائی مرگیا، اب وہ اکیلا رہ گیا ہے۔ اگر راستے میں جاتے جاتے اس پر کوئی آفت آ پڑے تو تم میرے سفید بالوں کو غم کے ساتھ گور میں اتاروگے۔''

(جاری ہے)

ماخذات

قصص القرآن۔ قصص الانبیا۔ توریت۔ پہلے نبی سے آخری نبی تک

باتوں باتوں میں بات بنانے والے ایک سراغ رساں کا کارنامہ

بہ ظاہر دوست کے روپ میں دشمنی نبھانے والے اکثر اپنوں سے بڑھ کر اپنایت جتاتے ہیں اور ایسی چالوں کی مار مارتے ہیں کہ خون کے رشتوں میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں بالخصوص دولت کی چمک آنکھوں کو نہ صرف خواب دکھاتی ہے بلکہ منظر میں بھی اپنی منشا کے مطابق رنگ بھرے نظر آتے ہیں وہ بھی اسی خوش فہمی کا شکار تھا مگر قانون کی مار نے سارے خواب چکنا چور کر دیے۔

زہر

محمد یاسر اعوان

ٹیلی فون کی پہلی گھنٹی پر ذوحان نے ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف کوئی دوشیزہ تھی۔ ’’میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں......‘‘

’’کس سلسلے میں؟‘‘ ذوحان خوشگوار موڈ میں تھا۔ ’’اب کوئی فائدہ نہیں۔ پچھلے دنوں میری ماں نے ایک خوب صورت چڑیل کے ساتھ میری منگنی کر دی ہے......‘‘

’’میرا نام شکیلہ ہے۔‘‘ نسوانی آواز نے ذوحان کی گفتگو کا اثر لیے بغیر اپنا تعارف کرایا۔ ’’میں ڈیفنس کے علاقے میں ایک پٹ شاپ چلاتی ہوں......اور میں اس وقت ایک کیس کے سلسلے میں فون کر رہی ہوں۔‘‘

’’کیس کے سلسلے میں؟‘‘ ذوحان نے حیرت سے پوچھا۔

’’میری ایک گاہک لاپتا ہے۔ وہ مجھ سے مسلسل آٹھ ہفتوں تک سیاہ بلی خریدتی رہی ہے۔‘‘

’’سیاہ بلی!‘‘ ذوحان نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ’’کیا تمہاری گاہک نے بلیوں کی قیمت کی ادائیگی نہیں کی؟‘‘

’’ادائیگی تو اس خاتون نے ایڈوانس کر دی تھی۔‘‘ شکیلہ نے پریشان لہجے میں جواب دیا۔ ’’میری پریشانی کی



وجہ یہ ہے کہ اس خاتون کو اتنی بلیاں خریدنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی جبکہ میری معلومات کے مطابق وہ بلیوں سے شدید نفرت کرتی ہے۔"

"یہ بات تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟" ذوحان قدرے سنجیدہ ہو گیا۔

"یہ بات ریحانہ خاتون کی سگی بہن فرزانہ نے مجھے بتائی تھی۔ فرزانہ کافی عرصہ پہلے مجھ سے ایک سیاہ بلی خرید کر لے گئی تھی، اس شرط پر کہ اگر ان کی بہن نے اس بلی کو گھر میں رکھنے کی اجازت دے دی تو وہ رکھ لے گی ورنہ مجھے بلی واپس کر کے اپنی رقم واپس لے جائے گی۔"

"اوہ!" ذوحان دلچسپی محسوس کرنے لگا۔ "مزید کوئی معلومات......؟"

"ریحانہ خاتون ایک مالدار بیوہ ہیں۔" دوسری طرف سے شکیلہ نے جواب دیا۔ "پچھلے کئی سالوں سے وہ شدید بیمار ہیں۔ ان کا اپنی ایک بہن کے سوا دنیا میں کوئی نہیں۔"

"کیا فرزانہ بھی لاپتا ہے؟" ذوحان نے سوال کیا۔

"اگر وہ دونوں بہنیں لاپتا ہیں تو میرا خیال ہے کہ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ علاج کی غرض سے کسی اسپتال میں شفٹ ہوئی ہوں۔"

"ریحانہ خاتون ایک مالدار بیوہ ہیں۔" شکیلہ نے اپنی پریشانی کی اصل وجہ بتائی۔ "وہ اپنی سگی بہن فرزانہ پر بھی شک کرتی تھیں۔ یہ بات انہوں نے ٹیلی فون پر مجھے بتائی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ فرزانہ انہیں قتل کر کے ان کی دولت پر قبضہ کرنا چاہتی ہے جو شاید وہ اپنے بستر کے نیچے رکھتی تھیں۔ اس سلسلے میں انہیں بینک پر بھی بھروسا نہیں تھا۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو؟" انویسٹی گیٹر پولیس ذوحان کے کان کھڑے ہو گئے۔ "کیا تمہارے خیال میں فرزانہ اپنی بہن کو قتل کر کے اس کی ساری دولت لے کر فرار ہو گئی ہے؟"

"کیا یہ آپ کے خیال میں ناممکن ہے؟" شکیلہ نے الٹا سوال کر دیا۔

"ٹھیک ہے۔" ذوحان لاجواب ہو گیا۔ "میں تمہاری شاپ پر پہنچ رہا ہوں۔" پھر مزید کہا۔

"تمہارے نام سے میرا خیال تھا کہ تم ایک عام سی کوئی خاتون ہو گی لیکن تم تو نہ صرف جوان بلکہ خوب صورت...... اور حسین بھی ہو۔"

"شکریہ۔" شکیلہ جھینپ سی گئی۔

"ریحانہ خاتون نے تم سے آٹھ بلیاں خریدیں۔"

ذوحان فوراً ہی مطلب کی بات کی طرف آ گیا۔ "وہ کس قسم کی بلیاں تھیں؟"

"عام سی سیاہ رنگ کی بلیاں۔" شکیلہ نے جواب دیا۔ "یہ بات جاننے کے لیے کہ وہ ایک مالدار خاتون ہیں، میں نے ان سے مہنگی بلی خریدنے پر اصرار کیا لیکن انہوں نے بتایا کہ انہیں سیاہ رنگ کی عام سی بلی چاہیے، بالکل ویسی ہی، جیسی فرزانہ نے خریدی تھی۔"

"ریحانہ خاتون نے آخری بلی تم سے کب خریدی تھی؟" ذوحان نے سوال کیا۔

"اب سے ایک مہینا پہلے۔" شکیلہ نے جواب دیا۔ "اس کے بعد سے ان کا کوئی فون نہیں آیا۔ میں نے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش بھی کی لیکن دوسری طرف سے کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا۔ دونوں بہنیں پراسرار طور پر غائب ہیں۔"

"اس کے علاوہ تم نے کیا عجیب بات محسوس کی؟" ذوحان کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

"بڑی عجیب سی بات ہے!" شکیلہ سوچتی ہوئی گویا ہوئی۔ "نہ صرف ریحانہ خاتون نے اپنی بہن کو بلیوں کے متعلق کچھ بتانے سے منع کیا بلکہ مجھے تاکید کی کہ میں اس بات کا کسی سے بھی ذکر نہ کروں......"

"اب میں یہ کیس لینے کے لیے تیار ہوں، مس شکیلہ!"...... ذوحان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ "تمہاری آخری بات نے کیس میں جان ڈال دی ہے......" ذوحان سگریٹ کا کش لے کر بڑبڑایا۔

"ریحانہ خاتون نے آٹھ بلیاں خریدیں اور تمہیں یہ تاکید کی کہ اس بات کا اس کی بہن سے ذکر نہ کیا جائے حالانکہ آٹھ بلیوں کو کسی صورت میں بھی چھپا کر نہیں رکھا جا سکتا۔ تم اگر مناسب سمجھو تو ہم دونوں اسی وقت ریحانہ خاتون کے بنگلے پر چلتے ہیں......" ذوحان نے گفتگو آگے بڑھائی۔ "تم میرا تعارف ایک گاہک کے طور پر کرانا جو ایک سیاہ بلی خریدنا چاہتا ہے اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قیمت دینے کے لیے تیار ہے۔"

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔" شکیلہ مطمئن نظر آنے لگی۔

"میں ریحانہ خاتون سے کہہ دوں گی، اگر آپ بلی فروخت کرنا چاہتی ہیں تو ایک بلی ان صاحب کو دے دیں، میں جلد ہی آپ کے لیے دوسری بلی کا انتظام کر دوں گی۔ ویسے بھی ریحانہ خاتون سے ملنے کے لیے یہ نہایت مناسب وقت ہے۔ فرزانہ اس وقت چہل قدمی کے لیے باہر جاتی

ہے......'' شکیلہ نے جلدی جلدی اپنی شاپ بند کی اور ذوحان کی اسپورٹ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ صرف پانچ منٹ بعد وہ دونوں ریحانہ خاتون کے بنگلے پر تھے۔

''دودھ کی یہ بوتلیں!'' ذوحان کی نگاہ دروازے پر رکھی ہوئی دودھ کی بوتلوں پر پڑی اور اس کے چہرے پر سوچ کی گہری لکیریں نمودار ہوگئیں۔ ''یہ ایک خطرناک بات ہے......''

''کیا مطلب؟'' شکیلہ پریشان ہوکر ذوحان کی طرف دیکھنے لگی۔

''مطلب یہ کہ اگر کوئی شخص اپنا گھر چھوڑ کر کہیں جاتا ہے تو دودھ سپلائی کرنے والے کو منع کردیتا ہے کہ اس کے جانے کے بعد دودھ فراہم نہ کیا جائے۔'' ذوحان نے وضاحت کی۔ ''دودھ کی بوتلوں کی یہاں موجودگی کا مطلب یہ ہے کہ دودھ فراہم کرنے والے شخص کو اس گھر کے مکینوں کے کہیں جانے کی پیشگی اطلاع نہیں ہے۔''

''دروازہ بھی بند ہے۔'' شکیلہ مزید پریشان نظر آنے لگی۔

''تم نے بتایا تھا کہ جب فرزانہ باہر جاتی ہے تو دروازہ بند نہیں کرتی یعنی لاک نہیں لگاتی۔'' ذوحان نے گفتگو آگے بڑھائی۔ ''اس کا مطلب ہے کہ فرزانہ گھر کے اندر ہے۔''

''ہوسکتا ہے۔'' شکیلہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ڈوربیل کا بٹن دبایا لیکن اندر گھنٹی بجتی رہی اور اس کا کوئی ردِعمل نہیں ہوا۔

''شاید ریحانہ خاتون کے پڑوس سے کچھ پتا چل سکے۔'' شکیلہ نے مشورہ دیا۔ ذوحان نے پڑوسی کے دروازے پر دستک دی جس کے جواب میں فوراً ہی ایک صحت مند عورت دروازے پر نمودار ہوئی۔

''فرمایئے؟'' عورت بولی۔

''آپ کے شوہر گھر پر ہیں؟'' ذوحان نے سوال کیا۔

''لیاقت اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔'' عورت نے ذوحان کے سوال کے جواب میں کہا۔ ''وہ رات کو دیر سے گھر آتے ہیں، مگر آپ کو ان سے کیا کام ہے؟'' عورت پریشان نظر آنے لگی۔

''دراصل میں آپ کے پڑوس کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' ذوحان نے وضاحت کی۔ ''فرزانہ شاید گھر پر نہیں ہے اور دروازہ لاک ہے۔ اندر سے کوئی جواب نہیں آرہا......''

''اوہ۔'' عورت خود بھی پریشان نظر آنے لگی۔ ''مگر ریحانہ خاتون کو جواب دینا چاہیے۔ وہ تو ہر وقت گھر پر رہتی ہیں۔ چل پھر نہیں سکتیں......''

''تم نے فرزانہ کو آخری مرتبہ کب دیکھا تھا؟'' ذوحان نے سوال کیا۔ وہ آپ سے تم پر آگیا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ دو دن گزر گئے ہیں۔'' عورت نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ''دو دن سے میں نے دونوں بہنوں کو نہیں دیکھا......''

''تو اس کا مطلب ہے کہ دونوں بہنوں سے تمہاری دوستی ہے۔'' ذوحان نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ ''تم ریحانہ خاتون سے بھی ملنے جاتی ہو؟''

''ہاں۔'' عورت نے اثبات میں جواب دیا۔ ''میں اکثر ریحانہ کے پاس جاتی رہتی ہوں۔ آخر وہ میری پڑوسن ہے۔ اکثر جب ریحانہ کو کوئی کام ہوتا ہے تو وہ مجھے ہی فون کرتی ہے۔ فرزانہ کی غیر حاضری میں دو چار دن پہلے ریحانہ خاتون نے ایک خط پوسٹ کرنے کے لیے مجھے دیا تھا۔ وہ کچھ پریشان بھی تھیں۔''

''وہ خط اب کہاں ہے؟'' ذوحان نے پوچھا۔ ''وہ خط کس کے نام تھا؟''

''وہ خط میں نے پوسٹ کردیا تھا۔'' عورت..... پریشان نظر آنے لگی پھر مزید کہا۔

''وہ خط ریحانہ کے نواسے فرقان کے نام تھا جو لاہور میں رہتا ہے مگر یہ سب تم کس لیے پوچھ رہے ہو؟ تمہارے سوال وجواب کا انداز تو پولیس والوں جیسا ہے؟''

''میں واقعی پولیس والا ہوں۔'' ذوحان نے اپنا کارڈ نکالا اور عورت کی آنکھوں کے سامنے لہرا کر جیب میں رکھ لیا۔

''پولیس۔'' عورت خوفزدہ ہوکر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ''معاملہ کچھ گڑبڑ لگتا ہے۔ ٹھہرو، میں ریحانہ کے بنگلے کی چابی لے کر آتی ہوں...... ریحانہ نے مجھے یہ چابی خود ہی دی تھی۔ خدا کرے ریحانہ خیریت سے ہو۔'' عورت بڑبڑاتی ہوئی اندر گئی اور ایک چابی لاکر ذوحان کے ہاتھ پر رکھ دی......

ذوحان نے ریحانہ خاتون کے بنگلے کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ اندر شور کی آواز سن کر ٹھٹک گیا۔ ''شاید اندر کوئی ہے۔''

ذوحان آگے بڑھا ہی تھا کہ ریحانہ خاتون کے بیڈروم سے ایک سایہ نمودار ہوا اور ذوحان سے ٹکراتا ہوا دوسرے کمرے میں غائب ہوگیا۔

ذوحان نے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ جو کوئی بھی تھا، بنگلے کے نقشے سے زیادہ واقف تھا۔ ذوحان کی گرفت میں آنے سے پیشتر ہی وہ سایہ چھت کے راستے فرار ہوگیا۔

"ریحانہ اپنے بستر پر نہیں ہیں۔" شکیلہ نے ریحانہ خاتون کے بیڈروم سے باہر نکلتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں ذوحان کو اطلاع دی۔ "وہ تو بستر سے اٹھ بھی نہیں سکتیں، بھلا وہ کہاں جاسکتی ہیں؟"

"اور یہ دوسرا بستر!" ذوحان نے ایک دوسرے بستر کی طرف اشارہ کیا۔

"اس بستر پر یقیناً دو دن سے کوئی نہیں لیٹا اور یہ بستر یقیناً فرزانہ کا ہے...... اور اس بستر کی طرف دیکھو۔" ذوحان نے شکیلہ کی توجہ دوبارہ ریحانہ کے بستر کی طرف دلائی۔ "اس بستر کا گدا تیز دھار چاقو سے کاٹا گیا ہے نیچے سے......" اپنی بات کہہ کر ذوحان نے مسہری کا گدا پلٹ دیا۔

"بستر کے نیچے فوم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ اس گدے کو کاٹا گیا ہے اور اس تکیے میں بھی سوراخ ہے۔" ذوحان نے تکیہ اٹھا کر چیک کیا۔

"لگتا ہے کہ کسی نے ریحانہ خاتون کی دولت کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے مگر ریحانہ کہاں ہیں؟" ریحانہ کی موٹی پڑوسن نے تبصرہ کیا۔

ذوحان دونوں عورتوں کو اسی کمرے میں ٹھہرنے کی ہدایت کر کے خود گھر کی تلاشی لینے لگا مگر ناکام رہا۔

"ریحانہ کہاں جاسکتی ہے؟" شکیلہ نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

"زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ریحانہ خاتون کی آٹھ عدد سیاہ بلیاں کہاں غائب ہیں!" ذوحان عجیب سے لہجے میں بڑبڑایا۔ "ان بلیوں کو اس وقت گھر کے اندر ہونا چاہیے تھا کیونکہ اس کمرے میں جو شخص موجود تھا، وہ کھڑکی کا شیشہ توڑ کر اندر داخل ہوا......"

"ہوسکتا ہے کہ اس شخص کے اندر داخل ہونے کے بعد بلیاں گھر سے باہر چلی گئی ہوں۔" شکیلہ نے تبصرہ کیا۔

"مگر وہ سب پالتو بلیاں تھیں، رات گہری ہونے پر سب لوٹ آئیں گی۔"

"تم نے دو دن سے دونوں بہنوں میں سے کسی کو نہیں دیکھا لیکن تم نے یہ تو دیکھا ہوگا کہ اس دوران ریحانہ خاتون کے گھر کون آیا تھا...... کسی گاڑی یا رکشے وغیرہ میں؟" ذوحان نے پولیس والوں کے مخصوص لہجے میں پڑوسی عورت کو مخاطب کیا۔

"پچھلے دو دن کے اندر ریحانہ کے گھر کے باہر کوئی گاڑی آکر نہیں رکی۔ یہ بات میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں......" پڑوسن گہری سوچ میں پڑ گئی۔

"ہوسکتا ہے کہ تمہارے شوہر لیاقت نے کسی کو آتے جاتے دیکھا ہو!" ذوحان نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"یقیناً لیاقت کے بھی ریحانہ سے اچھے تعلقات ہوں گے۔ مجھ سے بھی زیادہ۔" عورت نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے جواب دیا۔ "لیاقت اکثر ریحانہ کی خدمت کرتا رہتا تھا۔ باہر کے اکثر کام ریحانہ خاتون لیاقت کے ذریعے ہی کراتی تھیں، کبھی کبھار ریحانہ کی جائداد کا کرایہ بھی لیاقت ہی وصول کر کے لاتا ہے۔ ریحانہ لیاقت پر بہت اعتماد کرتی ہیں۔ کچھ دن پہلے اس کے بنگلے کے باتھ روم کے نل ٹپکنے لگے تھے، ریحانہ پلمبر کے بجائے لیاقت سے ہی اصرار کرتی رہتیں کہ وہ نئے نل خرید کر خود ہی تبدیل کردے...... بے چارہ لیاقت...... کیمیکل فیکٹری سے آنے کے بعد کئی کئی گھنٹوں تک یہاں مصروف رہا تھا۔"

"اس بنگلے میں یقیناً چوہے بہت زیادہ ہیں؟" ذوحان نے اچانک ہی عورت سے ایک عجیب وغریب سوال کیا۔ "تم اس بارے میں کیا کہتی ہو...؟"

"مجھ سے کبھی ریحانہ خاتون نے چوہوں کا تذکرہ نہیں کیا۔" پڑوسن پریشان ہوگئی۔ "میں نے تو یہاں کبھی چوہا نہیں دیکھا۔"

"پھر...... آٹھ بلیاں...... ریحانہ خاتون نے کہاں......؟" ذوحان کچھ کہتے کہتے اچانک خاموش ہو کر کچھ سننے لگا۔ "دروازے پر کوئی ہے۔"

شکیلہ کے بھی کان کھڑے ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ کھلا اور ایک نوجوان کندھے پر سفری بیگ لٹکائے ہوئے اندر داخل ہوا مگر ذوحان اور دونوں عورتوں پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک گیا۔

"معاف کیجیے گا۔" نوجوان کے چہرے پر شرمندگی تھی۔ "شاید میں غلط بنگلے میں داخل ہوگیا ہوں۔ دراصل میں اپنی نانی کا بنگلا تلاش کر رہا ہوں۔ میں تقریباً پانچ سال بعد لاہور سے ان سے ملاقات کے لیے آیا ہوں۔"

"تم ٹھیک جگہ پہنچے ہو نوجوان!" ذوحان نے مسکراتے ہوئے نوجوان کا استقبال کیا۔ "تمہاری نانی کا نام اگر ریحانہ ہے تو یہ ان ہی کا بنگلا ہے۔"

"مگر نانی کہاں ہیں؟" نوجوان پریشان ہو کر ان

تینوں کی شکلیں دیکھنے لگا۔

"فی الوقت کچھ نہیں کہا جاسکتا۔" ذوحان نے جواب دیا۔

"تم یہ بتاؤ کہ تم ان کے لیے اتنے پریشاں کیوں ہو، کیا ریحانہ خاتون نے تم سے اپنی کسی پریشانی کا ذکر کیا تھا؟"

"میرا خیال ہے کہ آپ یہ خط پڑھ لیں۔" نوجوان نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور ذوحان کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ خط مجھے آج ہی ملا تھا۔ خط پڑھتے ہی میں شام کی فلائٹ سے روانہ ہوگیا۔" اپنی بات مکمل کر کے نوجوان نے ایک بار پھر اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ "سب خیریت تو ہے نا؟"

ذوحان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ لفافہ کھول کر خط کا مضمون پڑھنے میں مصروف تھا، لکھا تھا۔ "ڈیئر فرقان...... جیتے رہو!

میں بہت عرصے بعد تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔ مجھے اس وقت تمہاری شدید ضرورت ہے۔ تم میرے واحد رشتے دار ہو، جس سے میں اپنی پریشانی کا ذکر کر کے مدد کی درخواست کرتی ہوں۔ میں سنگین خطرے میں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنی بوڑھی، بیمار نانی کی فوراً مدد کو آؤ گے۔ میرا یہ خط ملتے ہی کراچی آجاؤ۔ پلیز فرقان دیر مت کرنا۔ میں تمہارا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی ہوں۔ فقط تمہاری نانی، ریحانہ۔"

خط کے آخر میں ریحانہ خاتون کے دستخط موجود تھے۔ خط پر تین دن پہلے کی تاریخ تھی۔ ذوحان نے خط واپس لفافے میں بند کیا اور نوجوان کی طرف بڑھا دیا۔

"مجھے افسوس ہے!" ذوحان نے دکھی لہجے میں نوجوان سے کہا۔ "تمہیں یہاں پہنچنے میں دیر ہوگئی ہے۔"

"کیا مطلب؟" فرقان کا منہ حیرت سے کھل گیا...

"یہ خط مجھے آج دوپہر ہی ملا ہے......اور میں......"

"کیا یہ واقعی تمہاری نانی کی تحریر ہے؟" ذوحان نے قطع کلامی کرتے ہوئے سوال کیا۔

"جی ہاں۔" فرقان نے جواب دیا۔ "مگر نانی ریحانہ اور نانی فرزانہ کہاں ہیں؟"

"وہ دونوں یہاں سے پراسرار طور پر غائب ہیں۔" ذوحان نے بھاری لہجے میں جواب دیا۔ "اور میں ان دونوں بہنوں کی پراسرار گمشدگی کے معمے کو حل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر مناسب سمجھو تو، ریحانہ خاتون کے بارے میں مجھے تفصیل سے بتاؤ۔ تم ان کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

حکمت لقمان

حکیم لقمان کسی جنگ کے دوران گرفتار ہوگئے۔ ایک امیر تاجر نے انہیں خرید لیا۔ وہ شکل وصورت سے سادہ نظر آتے تھے اور سیاہ فام تھے جبکہ دوسرے غلام خوبصورت اور اچھی شکل وصورت کے مالک تھے۔ وہ ہمیشہ لقمان کا مذاق اڑایا کرتے اور مالک سے ان کی جھوٹی شکایتیں کرتے۔ لقمان خاموشی سے اپنا اور دوسرے غلاموں کا کام بھی کرتے رہتے اور زبان پر شکایت کا ایک لفظ تک بھی نہ لاتے تھے۔ ان کا ظاہری رنگ بیشک سیاہ تھا مگر باطن انتہائی روشن اور چمکتا ہوا۔ وہ دانائی کی ایسی باتیں کرتے کہ سننے والے دنگ رہ جاتے۔ لقمان کے آقا کے پھلوں کے باغات تھے۔ وہ غلاموں کو پھل توڑنے کے لیے بھیجتا تو وہ زیادہ پھل خود ہی کھا جاتے تھے۔ ان غلاموں کے آقا کو اس کی خبر ہوگئی مگر ان سب نے مل کر سارا الزام لقمان کے سر تھوپ دیا۔ آقا لقمان سے بلاوجہ ناراض رہنے لگا تھا۔ اسے وقت بے وقت ڈانٹتا رہتا تھا۔ آخر مجبور ہو کر لقمان نے مالک سے کہا۔

"اے آقا! میں نے آج تک امانت میں خیانت نہیں کی۔ ہمیشہ سچ بولا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اللہ بے ایمان شخص کو کبھی نہیں بخشتا۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ ہم سب غلاموں کا امتحان لیں۔ وہ اس طرح کہ سب غلاموں کو پیٹ بھر کر گرم پانی پلائیں۔ آپ خود گھوڑے پر سوار ہو کر جنگل کی طرف روانہ ہوں اور غلاموں کو حکم دیں کہ وہ گھوڑے کے ساتھ ساتھ دوڑیں۔ اس طرح سچ اور جھوٹ سامنے آجائے گا۔"

مالک کو اس غلام کی بات پسند آئی۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ جب تمام غلام آقا کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ دوڑے تو سب نے قے کرنا شروع کردی تھی۔ اس سے جو کچھ جس جس نے کھایا تھا، پیٹ سے باہر آگیا۔ آقا نے سب غلاموں کو سزا دی اور لقمان سے معافی مانگی۔ صرف لقمان کی قے بالکل صاف تھی اس میں کچھ نہ تھا کیونکہ اس نے تو آقا کے باغات کے پھل کھائے ہی نہ تھے۔

اب آقا نے لقمان پر پورا اعتماد کرنا شروع کردیا تھا۔ گھر کا سارا انتظام اس کے سپرد کر کے اسے سیاہ وسفید کا مالک بنا دیا تھا۔ لقمان اب تمام غلاموں کا سردار تھا۔

سبق: جس طرح ان غلاموں کے آقا نے حکمت ودانائی سے جھوٹ اور سچ کو الگ کر کے دیکھ لیا تھا، وہ مالک حقیقی جب چاہے جس کا چاہے جھوٹ اور سچ ظاہر کردے۔

اقتباس حکایات رومی اور سعدی

از ڈاکٹر تصدق حسین

''کچھ زیادہ نہیں۔'' فرقان نے پریشان لہجے میں کہا۔ ''پندرہ سال پہلے، میں میٹرک کی چھٹیاں گزارنے کراچی آیا تھا۔ اس وقت ریحانہ نانی بالکل ٹھیک تھیں۔ چار، پانچ سال پہلے بھی میں چند دنوں کے لیے ان سے ملنے آیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے محض دو خط لکھے۔ پھر نانی فرزانہ نے بھی ایک آدھ خط لکھا جس میں ریحانہ نانی کی بیماری کا بھی ذکر کیا لیکن مجھے نہیں معلوم کہ انہیں بیماری کیا تھی۔ فرزانہ نانی نے ہی مجھے اپنے خط میں لکھا تھا کہ ان کے پاس کچھ رقم ہے، کتنی رقم؟ اس کا فرزانہ نانی کو اندازہ نہیں تھا۔ فرزانہ نانی کو شکوہ تھا کہ ان کی بہن پیسوں کے معاملے میں بے حد کنجوس ہوگئی ہیں اور ان پر شک کرنے لگی ہیں کہ وہ ریحانہ نانی کی دولت حاصل کرنے کے لیے ان کے گھر آ کر رہ رہی ہیں...... بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔'' فرقان اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہوگیا۔

''اچھا یہ بتاؤ۔'' ذوحان نے کہا۔ ''کیا ریحانہ خاتون کو بلیوں سے شدید نفرت تھی؟''

''ہاں۔'' فرقان پر حیرت کا شدید حملہ ہوا۔ ''لیکن یہ بات تمہیں کیسے معلوم ہوئی؟ نانی ریحانہ واقعی بلیوں سے بہت نفرت کرتی تھیں جبکہ ان کے مقابلے میں فرزانہ نانی کو بلیاں پالنے کا بہت شوق تھا۔ وہ اپنے خط میں اس بات کا ذکر کرتی تھیں کہ ریحانہ نانی ان کی بلی پالنے والی عادت سے شدید نفرت کرتی ہیں۔''

''شکریہ مسٹر فرقان۔'' ذوحان نے نوجوان کا شکریہ ادا کیا۔ ''اگر تمہارے کوئی اور رشتے دار ہیں تو ان کے گھر ٹھہر جاؤ، ورنہ مناسب ہوگا کہ ہوٹل میں قیام کرو، جیسے ہی ریحانہ خاتون کے بارے میں پتا چلا میں تم سے فوراً رابطہ کروں گا......'' جواب میں فرقان پریشان سا ہو کر بنگلے سے باہر چلا گیا۔

''میرا خیال ہے کہ میں ایک بار پھر اس بنگلے کو ایک نظر دیکھ لوں۔'' ذوحان نے شکیلہ کو مخاطب کیا۔ ''تم بھی میری مدد کرو...... اور کوئی بھی چیز جو تمہیں عجیب و غریب لگے، اسے فوراً میرے علم میں لاؤ۔ اسے ہاتھ مت لگانا۔''

''آل رائٹ سر۔'' شکیلہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''تم بھی ہماری مدد کرو میڈم!'' ذوحان نے پڑوسی عورت سے درخواست کی۔ ''تم تو یہاں آتی جاتی رہتی ہو، تم ہماری خاصی مدد کرسکتی ہو۔''

''مجھے پولیس کی مدد کر کے خوشی ہوگی۔'' پڑوسی عورت، شکیلہ کے ساتھ بنگلے کا معائنہ کرنے میں مصروف ہوگئی۔

ذوحان ابھی بیڈ روم میں ہی تھا، جب اس نے دونوں عورتوں کی چیخوں کی آوازیں سنیں۔ ذوحان دوڑتا ہوا باتھ روم کی طرف گیا جہاں شکیلہ منہ پر ہاتھ رکھے اپنی الٹی روکنے کی کوشش کررہی تھی۔

''یہ ......وہ ......یہ......وہ......'' پڑوسی عورت کی حالت بھی کافی خراب تھی۔ باوجود کوشش کے وہ کوئی بات نہیں کہہ سکی...... ذوحان نے آگے بڑھ کر باتھ روم کے اندر جھانکا تو وہاں ایک سیاہ بلی کی لاش پڑی تھی۔ اس طرح کہ اس کا سر کسی بھاری چیز سے بری طرح کچلا گیا تھا۔ اطراف میں خون کے چھینٹے بھی واضح طور پر موجود تھے۔ بلی کی لاش بھی ضرورت سے کچھ زیادہ پھول گئی تھی۔

''ایک معصوم بلی کے ساتھ اس قدر ظالمانہ سلوک کون کرسکتا ہے؟''

''ریحانہ کو بلیوں سے نفرت تھی۔'' پڑوسی عورت نے تبصرہ کیا۔

''مگر وہ اس قدر خوفناک کام ہرگز نہیں کرسکتیں...... وہ معذور ہیں۔''

''ریحانہ خاتون کے بستر کے نیچے ان کے کھانے کے برتن رکھے ہوئے ہیں۔ پلیٹ میں کچھ کھانا بھی موجود ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ریحانہ خاتون نے کھانا کھایا تھا۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ یہ کام کس نے کیا ہے اور کیوں؟'' ذوحان نے پُرسوچ لہجے میں اپنا خیال ظاہر کیا۔

''میں نے پلیٹ میں موجود رہ جانے والے کھانے کو ایک پلاسٹک بیگ میں پیک کردیا ہے۔'' ذوحان نے مزید کہا۔ ''تم اس کھانے کو لیبارٹری تک لے جاؤ۔ وہاں سردار خان صاحب میرے دوست ہیں۔ ان سے میرا نام لے کر کھانا ٹیسٹ کروالو۔''

''کیا تمہارے خیال میں یہ کھانا زہر آلود ہوسکتا ہے؟'' شکیلہ نے سوال کیا۔

''ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔'' ذوحان نے سگریٹ کا کش لیا اور ایک بار پھر بیڈ روم میں نظریں دوڑانے لگا پھر اس کی نگاہ پڑوسن عورت پر جا کر ٹھہر گئی۔

''میرا خیال ہے کہ تمہارا شوہر لیاقت اب تک گھر آ گیا ہوگا۔ اسے یہیں بلالو؟''

ذوحان کی بات سن کر عورت باہر نکل گئی۔

''ہیلو۔'' چند لمحوں بعد ایک طویل قامت شخص پڑوسی

عورت کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ''مجھے لیاقت علی کہتے ہیں۔'' اس نے اپنا تعارف کرایا۔

''میرا تعلق پولیس کے محکمے سے ہے۔'' ذوحان نے اسے اپنا کارڈ دکھاتے ہوئے بتایا۔

''میری بیوی انعم کہہ رہی تھی کہ ریحانہ خاتون کے بنگلے میں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے، کیا واقعی کوئی مسئلہ ہوا ہے؟''

''فی الوقت میں معاملے کی تحقیق کر رہا ہوں اور تمہارا تعاون درکار ہے۔'' ذوحان بھاری لہجے میں بولا۔

''ضرور۔'' لیاقت کچھ پریشان نظر آنے لگا۔

''کیا گزشتہ دنوں تم نے اس بنگلے کے اندر یا باہر کوئی سیاہ بلی مردہ حالت میں دیکھی ہے؟'' ذوحان نے فوراً ہی سوال کیا۔ ''اس حالت میں کہ اس کا سر کچل کر ہلاک کیا گیا ہو؟''

لیاقت جواب میں چند لمحوں تک کچھ نہیں کہہ سکا۔ اس کی کیفیت ایسی تھی، گویا ذوحان کا سوال اس کی سمجھ میں نہ آیا ہو۔

انعم نے شوہر کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ذوحان صاحب کو باتھ روم میں ایک مردہ بلی کی لاش ملی ہے۔ اسے دیکھ کر تو میں بھی ڈر گئی تھی، مجھے یقین ہے کہ یہ کام کسی عورت کا نہیں ہوسکتا۔''

''تمہاری خاموشی کا مطلب ہے کہ تمہارا جواب اثبات میں ہے۔'' ذوحان نے بات آگے بڑھائی۔ ''اب سوال یہ ہے کہ تم نے ایسی کتنی بلیاں دیکھیں؟ یقیناً تمہیں تعداد یاد ہوگی......'' ذوحان توقف کرتے ہوئے بولا۔

''یقیناً تم نے سات مردہ بلیاں دیکھی تھیں؟''

''آپ کو یہ تعداد کس نے بتائی؟'' لیاقت کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

''یہ بلیاں تم نے کہاں دیکھیں؟'' ذوحان نے اس کی ان سنی کرتے ہوئے دوسرا سوال کیا۔ ''کیا ان سب بلیوں کے سر بھی کچلے ہوئے تھے؟''

''ان کی...... تو گردنیں تک جسم سے الگ تھیں۔'' لیاقت گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

''میں نے اپنے طور پر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کچھ پتا نہیں چلا۔ کسی نے اس بات کا اقرار نہیں کیا کہ اس کی بلی غائب ہے لیکن بلیوں کے قتل کے یہ واقعات مسلسل نہیں ہوئے۔ ان کے درمیان آٹھ، آٹھ، دس، دس دن کا وقفہ تھا۔''

''کیا تمہیں تعداد کے بارے میں یقین ہے؟''

ذوحان نے سوال کر کے بغور لیاقت کا چہرہ دیکھا۔

''جی ہاں۔'' لیاقت نے پریشان ہوتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا۔''

شکریہ کہہ کر ذوحان نے لیاقت کو جانے کا اشارہ کیا اور خود سگریٹ سلگاتا ہوا شکیلہ کا انتظار کرنے لگا جو لیبارٹری گئی ہوئی تھی...... اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔

''اس کھانے میں کوئی زہر وغیرہ شامل نہیں۔'' شکیلہ نے اندر داخل ہوتے ہی رپورٹ پیش کی۔

''مس شکیلہ! تمہارے یہاں سے جانے کے بعد میں یہی سوچتا رہا ہوں کہ ایک مالدار بوڑھی بیوہ، جو بستر علالت پر تھی، آخر وہ بلیوں کو کس مقصد کے لیے ہلاک کر رہی تھی اور کیوں کر رہی تھی؟''

''کیا تمہارے دماغ نے اس سوال کا کوئی جواب تلاش کرلیا ہے؟'' شکیلہ نے الٹا سوال کر دیا۔

''میں یقین سے ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' ذوحان نے جواب دیا۔ ''ممکن ہے کہ دونوں بہنیں، بلیوں پر کوئی سائنسی تجربہ کر رہی ہوں......'' ذوحان نے مسخرہ پن اختیار کیا۔

''مجھے یقین نہیں آتا کہ تم بکواس بھی کر لیتے ہو۔'' شکیلہ نے چڑ کر کہا۔

''یہ میرے سوچنے کا انداز ہے۔'' ذوحان کسی خیال پر اچانک سنجیدہ ہوگیا۔

''ریحانہ خاتون بلیوں سے نفرت کرتی تھیں۔ یہ بات طے ہے کہ انہوں نے بلیاں صرف دودھ پلانے کے لیے نہیں خریدی تھیں...... اب اگر فرض کرلیا جائے کہ انہوں نے چوہے ہلاک کرنے کے لیے خریدی تھیں تو مسز لیاقت کے کہنے کے مطابق اس گھر میں چوہے نہیں ہیں۔ یہ بلیاں انہوں نے کسی کو تحفے میں دینے کے لیے بھی نہیں خریدیں......'' ذوحان بڑبڑاتا رہا۔ شکیلہ حیرت زدہ ہوکر خاموش کھڑی رہی۔ ذوحان کا ذہن بہت تیزی سے چل رہا تھا۔

''اس بات کو بھی دل تسلیم نہیں کرتا کہ ریحانہ نے اپنی بہن فرزانہ کو خوفزدہ کرنے کے لیے بلیاں خریدیں...... تمہارے بیان کے مطابق فرزانہ کو بلیوں سے محبت تھی......''

''ہوسکتا ہے کہ ریحانہ خاتون نے محض اس لیے بلیاں خریدی ہوں کہ وہ انہیں ہلاک کر کے اپنی نفرت کو تسکین پہنچاسکیں۔'' شکیلہ نے تبصرہ کیا۔

''مگر سیاہ رنگ کی بلیاں خریدنے کا کیا جواز ہے؟ وہ کسی بھی رنگ و نسل کی بلی خرید کر یہ شوق پورا کرلیتیں......''

''تم واقعی حیرت انگیز آدمی ہو۔'' شکیلہ نے تعریف کی۔

''ابھی میری صرف منگنی ہوئی ہے۔'' ذوحان چڑانے والے انداز میں مسکرایا۔ ''سوچ رہا ہوں مس شکیلہ...... کہ میں تم سے اپنے دل کی بات کہہ ہی دوں۔''

...... کچھ دیر چپ رہنے کے بعد ذوحان گویا ہوا۔ ''میرا دل کہتا ہے کہ ریحانہ خاتون نے آٹھ بلیاں اپنے تحفظ کے لیے خریدی تھیں۔''

''تحفظ کے لیے۔'' شکیلہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''تمہارا یہ خیال نہایت احمقانہ ہے، اپنی حفاظت کے لیے لوگ کتے پالتے ہیں، بلیاں نہیں۔''

''ریحانہ خاتون بلیوں سے نفرت کرتی تھیں......'' ذوحان اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ زندہ رہنا چاہتی تھیں اور انہیں بلیوں سے شدید نفرت تھی...... ریحانہ خاتون کا منصوبہ تو بے حد سیدھا سادہ ہے، ہم خوامخواہ ہی پریشان ہو رہے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' شکیلہ ذوحان کی طرف دیکھنے لگی۔

''مطلب یہ کہ ریحانہ خاتون نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔'' ذوحان جیسے خود کلامی کرتا ہوا بڑبڑایا۔ ''اپنے خط کے مطابق، جو انہوں نے فرقان کو تحریر کیا، وہ کسی سے خوفزدہ تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ کوئی ان کی دولت کے لیے انہیں قتل کردے گا۔ خوفزدہ ہونے کا میرے نزدیک ایک ہی مطلب ہے......'' وہ کچھ توقف کرتے ہوئے بولا۔ ''قتل...... کوئی شخص ریحانہ خاتون کو قتل کرنا چاہتا تھا اس دولت کے لیے جو ریحانہ خاتون نے اپنے.... بیڈروم میں کسی جگہ چھپا رکھی تھی۔''

''لیکن...... بلیاں کیسے حفاظت کرسکتی ہیں؟'' شکیلہ نے قطع کلامی کی۔

''زہر......'' ذوحان نے سگریٹ سلگاتے ہوئے جواب دیا۔ ''بلیاں زہر سے حفاظت کرسکتی ہیں۔''

''زہر......!'' شکیلہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''بلیوں سے زمانۂ قدیم میں بھی زہر آلود کھانے چیک کروائے جاتے تھے۔ ریحانہ خاتون نے بھی یہ کام ان سے لیا۔ انہیں شک تھا کہ کوئی انہیں زہر دے رہا ہے یا دے گا۔ اس لیے خود کھانے سے پہلے وہ اپنے کھانے کو بلی سے ٹیسٹ کرالیا کرتی تھیں۔ ہوسکتا ہے کہ فرزانہ اس گھر میں جو بلی تم سے خرید کر لائی تھی، اس نے اتفاقاً زہر آلود کھانا کھالیا ہو...... اس کے علاوہ سیاہ بلی خریدنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔ ریحانہ خاتون اس بات کو اپنی بہن سے بھی چھپانا چاہتی تھیں۔ اسی مقصد کے لیے انہوں نے تم سے سیاہ

شعبدہ گر

ایک شعبدہ گر اپنے ہنر کے کمالات دکھا رہا تھا۔ اس نے ایک لیمو...کو کاٹ کر آدھا کیا اور اس کو اتنا نچوڑا کہ ذرہ بھر بھی اس میں رس نہیں رہا پھر اس نے مجمعے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''اگر کوئی صاحب اس میں سے ذرا سا بھی رس نکالیں تو میں ان کو پانچ سو روپے انعام دوں گا۔'' ایک صاحب آگے بڑھے اور لیمو... کے چھلکے کو اتنا نچوڑا کہ اس میں سے ایک قطرہ رس نکل آیا۔ شعبدہ گر بہت حیران ہوا۔ اس نے پوچھا ''آپ کام کیا کرتے ہیں؟'' وہ صاحب بولے...... ''میں انکم ٹیکس آفیسر ہوں۔''

مرسلہ: رعنا رضوی۔ یو کے

بلی خریدنے پر اصرار کیا۔ اس کے بعد دوسری بلی کی موت بھی زہر کی وجہ سے ہوئی اور مزید بلیوں کی ضرورت ریحانہ خاتون کو اسی مقصد کے لیے پڑی......''

''لیکن ریحانہ خاتون تو بیمار تھیں۔'' شکیلہ نے اعتراض کیا۔ ''کم از کم ان جیسی خاتون بلی کا سر اس قدر خوفناک انداز میں نہیں کچل سکتیں۔''

''ریحانہ خاتون، جب فرقان کو خط لکھ سکتی ہیں تو یہ کام بھی کرسکتی ہیں۔'' ذوحان نے جواب دیا۔ ''ریحانہ خاتون نہیں چاہتی تھیں کہ جو شخص انہیں زہر دے رہا ہے وہ ان پر شک کرے کہ وہ اپنا کھانا بلیوں سے ٹیسٹ کراتی ہیں۔ اس لیے مجبوراً وہ سر پھاڑنے کا مکروہ فعل انجام دے رہی تھیں۔''

''ریحانہ خاتون کو زہر کون دے سکتا ہے؟'' شکیلہ نے سوال کیا۔

''ریحانہ خاتون کو اپنی بہن پر بھی شک تھا۔'' ذوحان جواباً گویا ہوا۔ ''مگر فرزانہ یہ کام نہیں کرسکتی۔ اگر یہ کام اس کا ہوتا تو اپنی بہن کے ساتھ وہ غائب نہ ہوتی۔ اس کی پراسرار گمشدگی کا میرے نزدیک اس کے علاوہ کوئی مطلب نہیں کہ ریحانہ خاتون کے ساتھ فرزانہ بھی قتل کردی گئی ہے۔''

''قتل...... قتل کردی گئی ہے!'' شکیلہ کے حلق سے پھٹی پھٹی آواز برآمد ہوئی۔ ''یہ تم سے کس نے کہا؟''

''ان دونوں بہنوں کی گمشدگی نے۔ کسی زندہ انسان

کو ہلاک کرنے کے لیے ہی دیا جاتا ہے۔ قاتل اس سلسلے میں سات بار ناکام ہو چکا تھا مگر آٹھویں مرتبہ وہ کامیاب ہو گیا۔'' ذوحان کسی خیال کے تحت چند لمحوں کے لیے خاموش رہ کر دوبارہ بولا۔'' آٹھویں مرتبہ قاتل نے زہر استعمال نہیں کیا...... بلکہ ریحانہ خاتون کو قتل کرنے کے لیے کوئی دوسرا طریقہ استعمال کیا اور بالآخر کامیاب ہو گیا۔''

'' لیکن......'' شکیلہ پریشان نظر آنے لگی۔'' اگر تمہارے کہنے کے مطابق ریحانہ خاتون قتل ہو چکی ہیں تو ان کی لاش کہاں ہے، فرزانہ کہاں ہے؟''

'' ریحانہ خاتون اپنی بہن پر بھی شک کرتی تھیں۔''

ذوحان پُرسوچ انداز میں بڑبڑایا۔ اس کا ذہن بہت تیزی کے ساتھ اس کیس کو حل کرنے میں مصروف تھا۔'' ریحانہ خاتون کو شک تھا کہ فرزانہ ان کی دولت حاصل کرنے کے لیے انہیں زہر دے رہی ہے لیکن پھر کسی وقت انہیں یقین آ گیا تھا کہ فرزانہ یہ حرکت نہیں کر سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ ریحانہ خاتون نے قاتل کو دیکھ لیا ہو۔ اس کے بعد ان کے پاس، اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ فرزانہ کو اپنی پریشانی میں شریک نہ کرتیں......'' ذوحان نے گفتگو ادھوری چھوڑ کر سگریٹ سلگایا اور غور کرتے ہوئے بولا۔

'' تین چار دن پہلے ریحانہ خاتون نے فرقان کو جو خط تحریر کیا، اس میں انہوں نے لکھا کہ تم میرے واحد رشتے دار ہو جس پر وہ بھروسا کر سکتی ہیں لیکن خط پوسٹ ہو جانے کے بعد انہوں نے قاتل کو پہچان لیا۔ اس کے فوراً بعد انہوں نے اپنی بہن فرزانہ کو اپنے راز میں شریک کر کے اس بنگلے سے نکلنے کی کوشش کی...... اور فرزانہ فوراً ہی اپنی بہن کی مدد کے لیے تیار ہو گئی۔ فرزانہ صحت مند تھی۔ وہ اس بنگلے سے باہر بھی جاتی تھی۔ قاتل کو فرزانہ سے زیادہ خطرہ تھا، اس لیے قاتل نے پہلے فرزانہ کو راستے سے ہٹایا اس کے بعد ریحانہ کو۔ قاتل جو کوئی بھی ہے، بہت چالاک اور ہوشیار ہے۔'' ذوحان نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

'' قاتل جانتا تھا کہ ریحانہ خاتون اپنا کھانا بلی سے ٹیسٹ کراتی ہیں۔ وہ سات مرتبہ ناکام ہو چکا تھا۔ آٹھویں مرتبہ اس نے ریحانہ خاتون کے کھانے میں زہر شامل کرنے کے بجائے، ان کے چمچے، چھری اور کانٹے کو کسی خطرناک زہر سے آلودہ کر دیا......''

'' چمچے، چھری اور کانٹے کو زہر آلود کیا؟'' شکیلہ نے پریشان ہو کر استفسار کیا۔'' اس کا کیا مطلب؟''

'' اگر ریحانہ خاتون کو چھری کانٹے کے ذریعے زہر نہیں دیا گیا تو پھر ان پر سے فنگر پرنٹ صاف کرنے کی کیا ضرورت تھی...... جی جناب! ان پر کوئی نشان نہیں ہے۔'' ذوحان نے گویا انکشاف کیا۔

'' شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' شکیلہ بڑبڑا کر رہ گئی۔

ذوحان نے اپنی بات آگے بڑھائی۔

'' قاتل اس بات سے واقف تھا کہ ریحانہ خاتون کھانے کے آغاز سے پیشتر کچھ کھانا بلی کے آگے ڈال دیتی ہیں...... اور وہ اس بات سے بھی آگاہ تھا کہ کتے بلیوں کو کھانے کی چیز دیتے ہوئے انسان چھری کانٹے کا استعمال نہیں کرتا...... پھر ریحانہ خاتون نے بھی ایسا ہی کیا۔ کانٹے سے انہوں نے کھانا کھایا تو زہر ان کے جسم میں چلا گیا اور اسی زہر سے ان کی موت واقع ہوئی۔''

'' اگر یہ سب درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر ان کی لاش کہاں ہے؟'' شکیلہ کے لبوں سے بمشکل سرگوشی خارج ہوئی۔'' اور فرزانہ کی لاش کہاں ہوگی؟''

'' اہم سوال یہ ہے کہ قاتل کون ہے اور کہاں ہے؟'' ذوحان شکیلہ کو بنگلے سے باہر چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔'' قاتل سے ہم آج ملاقات کریں گے۔''

'' آج!'' شکیلہ نے حیرت زدہ ہو کر ذوحان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔'' کیا آج ہی رات تم قاتل کو گرفتار کر لو گے؟''

'' قاتل کی آج رات گرفتاری بے حد ضروری ہے ورنہ...... پھر وہ ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا۔ ویسے بھی میرا طریقہ کار عام پولیس والوں سے مختلف ہے۔ میں اس قسم کے خطرناک مجرموں کو ڈھیل نہیں دیتا۔''

'' کیا میں رات ہی کو قاتل سے نہیں مل سکتی؟'' شکیلہ نے پوچھا۔

'' اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ رات کالی کرنی ہوگی۔'' ذوحان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

'' میرا خیال ہے کہ تم ایک شریف آدمی ہو۔'' شکیلہ نے ذوحان کی بکواس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

چند لمحوں بعد دونوں اسپورٹ کار میں سوار تھے۔

'' ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' شکیلہ نے کار کا رخ اولڈ کلفٹن کی طرف دیکھ کر کہا۔

'' ہم ہوٹل چل رہے ہیں، مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''

'' لیکن تم قاتل کو کب پکڑو گے اور کیسے پکڑو گے؟''

'' قاتل پر ڈورے ڈال کر گرفتار کروں گا۔'' ذوحان

موسیقی کا تیز ریکارڈ لگا کر چند لمحوں تک جھومتا رہا لیکن پھر سنجیدہ ہوگیا۔ ''جس وقت ہم ریحانہ خاتون کے گھر میں داخل ہوئے تھے، قاتل بنگلے میں موجود تھا۔ وہ غالباً ریحانہ خاتون کی دولت تلاش کر رہا تھا لیکن ہماری مداخلت کی وجہ سے ناکام ہوکر بھاگ گیا۔ تاہم کچھ رات گزرنے پر وہ پھر تلاشی لینے بنگلے میں داخل ہوگا لیکن اس بار وہ فرار نہیں ہوسکے گا۔ میرے آدمیوں نے اس بنگلے کو گھیر لیا ہے۔''

''اوہ۔'' شکیلہ حیرت زدہ سی ہوکر ذوحان کی شکل دیکھنے لگی۔ ''تم ایک انٹیلی جنٹ آدمی ہو۔''

''شکریہ مس......'' ذوحان نے ہوٹل کی پارکنگ میں گاڑی روکی اور کھانا کھا کر فریش ہوئے۔

''اگر تم قاتل کو پہچان گئے ہو تو مجھے بتا کیوں نہیں دیتے؟'' ہوٹل میں دو گھنٹے گزارنے کے بعد دوبارہ ریحانہ خاتون کے بنگلے کی طرف جاتے ہوئے شکیلہ کے چہرے پر الجھنیں تھیں۔ ذوحان سوچ میں ڈوبا رہا اور کوئی جواب نہیں دیا۔

ریحانہ خاتون کے بنگلے پر پہنچ کر ذوحان خاموشی سے گاڑی سے اترا۔ شکیلہ نے بھی تقلید کی۔ ذوحان نے آگے بڑھ کر ڈوربیل کا بٹن دبا دیا۔

چند ہی لمحوں بعد اندر سے دروازہ کھول دیا گیا۔ دروازہ کھولنے والا ایک صحت مند اور طویل قامت شخص تھا۔ ذوحان کو سامنے دیکھتے ہی اس شخص کا ہاتھ سیلیوٹ کے لیے بلند ہوگیا۔ اس کے بعد شکیلہ کو ذوحان سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ دروازہ کھولنے والا شخص کون تھا؟

''کیا رپورٹ ہے؟'' ذوحان نے سیلیوٹ کرنے والے شخص سے افسرانہ لہجے میں پوچھا۔

''مجرم گرفتار کرلیا گیا ہے سر۔'' ماتحت، سیلیوٹ کرکے ایک طرف ہٹ گیا۔

''گڈ۔'' ذوحان اسے شاباش دے کر اندر بڑھ گیا۔ شکیلہ بھی ساتھ تھی لیکن ریحانہ خاتون کے بیڈروم میں قدم رکھتے ہی وہ ٹھٹک گئی۔ بیڈروم کے اندر چار افراد موجود تھے اور ان کے درمیان ریحانہ خاتون کا پڑوسی لیاقت علی سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا۔

''ہیلو مسٹر لیاقت۔'' ذوحان نے تلخ لہجے میں لیاقت کو مخاطب کیا۔ ''میں تمہاری بیوی کی زبانی سن کر کہ تم کیمیکل فیکٹری میں کام کرتے ہو، سمجھ گیا تھا کہ ریحانہ خاتون کے قتل کے پس پردہ تمہارا ہاتھ ہے......'' لیاقت علی مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا۔ ذوحان کا لب ولہجہ مزید کرخت ہوگیا۔

''دونوں لاشیں یقیناً تم نے ضائع کردیں لیکن لاشیں غائب کرنے کے باوجود تم سزا سے نہیں بچ سکو گے۔'' ذوحان توقف کرتا ہوا اپنے ماتحت افسروں سے مخاطب ہوا۔ ''اس کی بیوی کو یہاں بلوا کر اس کی اصل شکل دکھا دو۔ ممکن ہے کہ آج کے بعد اس ذلیل انسان کی اپنی بیوی سے ملاقات نہ ہوسکے۔''

''خدا کے لیے اسے یہاں مت بلوائیں۔ وہ معصوم اور بے گناہ ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' ذوحان نے جواب دیا۔ ''تمہاری بیوی ایک اچھی عورت ہے۔ جبھی تو ریحانہ خاتون نے اس کو اپنے بنگلے کی چابی دے رکھی تھی جس کا تم نے غلط استعمال کیا......اور جس مقصد کے لیے تم نے دونوں عورتوں کی جان لی، وہ بھی پورا نہیں ہوا۔'' ذوحان اپنی بات مکمل کرکے بیڈروم میں بستر کے نزدیک رکھے ہوئے ایک شیلف کی طرف بڑھا اور کتابوں کے درمیان سے چند موٹی موٹی کتابیں نکال کر لیاقت علی کے سامنے پٹخ دیں اور کرخت لہجے میں بولا۔

''جس دولت کو حاصل کرنے کے لیے تم نے قتل جیسا بھیانک جرم کیا وہ دولت ان کتابوں میں دفن ہے۔'' ذوحان کی اس بات پر ایک ماتحت نے حیرت زدہ ہوکر ایک کتاب کھول کر دیکھی۔

کتاب کے درمیان میں صفحات کاٹ کر اتنی جگہ بنائی گئی تھی کہ اس کے اندر ایک ہزار والے نوٹوں کی ایک گڈی آسانی سے سما سکے۔ ہر کتاب کے اندر ایک ہزار والے نوٹوں کی ایک ایک گڈی موجود تھی، جو ماتحت برآمد کرکے بستر پر ڈھیر کرتا گیا۔

''اس رقم کو فرقان کے پاس ہوٹل بھجوا دو۔'' ذوحان نے ماتحت افسر کو حکم دیا۔ ''اور صبح اس ذلیل انسان کا چالان پیش کرو۔'' اپنی بات مکمل کرکے ذوحان تیز تیز چلتا ہوا بنگلے سے باہر نکل گیا۔ شکیلہ نے بھی اس کی تقلید کی۔

''بس ایک سوال اور!'' شکیلہ نے التجا کی۔ ''آخر تمہیں قاتل کی گرفتاری کا اتنا یقین کیوں تھا۔ کیا تم نے لیاقت کو پہچان لیا تھا؟''

''ایک معصوم اور بے زبان بلی کا سر کچل کر اس نے خود ہی اس قتل کا معاملہ حل کر دیا تھا۔'' ذوحان نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''فرزانہ بلیوں سے محبت کرتی تھی وہ اس قسم کی گھناؤنی حرکت نہیں کرسکتی تھی۔''



یکتارا

عبدالرب بھٹی

اس جہانِ رنگ و بو میں ہر روز ہزاروں پھول کھلتے ہیں... کچھ پھول سہروں میں سج جاتے ہیں اور چھ مزاروں پر مرجھا جاتے ہیں اسی طرح ہزاروں چہرے ملتے ہیں مگر کچھ چہروں پر ملن کی شنی محبت بن کر چمکتی ہے کچھ پر نارسائی اور جدائی کی ایسی داستان رقم ہوجاتی ہے جو ہاں سے نہیں بلکہ آنکھوں سے جب جب پڑھی جاتی ہے تب تب دل خون کے آنسو روتا ہے۔ وہ بھی آسمان کا تارا بن کر چمکی تھی اور زمین پر رہنے والے اسے اپنی دسترس میں لانے سے لاچار تھے کہ مقدر کی بازی نے پلٹا کھایا اور زمیں والے مائل بہ بلند پرواز ہوئے جبکہ وہ ٹوٹا تارا بن کر زمیں بوس ہوئی اور سازِ غم میں ڈھل کر یکتارا کی لے پر اپنے وجود کے بکھر جانے کا نوحہ سناتی رہی مگر... وہاں ایسا کون تھا جو اس کے بکھرے وجود کو سمیٹنے کی کوشش کرتا۔

دلوں میں پھانس بن کر اتر جانے والی...... ایک ایسی

داستان محبت جس کی ہر سطر سوچنے پر مجبور کردے



ناری اور املتاس کے درختوں میں گھری ہالا کی مخصوص نیلی ٹائلوں سے مزین ایک مشہور عمارت ''سندھیالوجی میوزیم'' میں اس وقت خاصی گہما گہمی دیکھنے میں آرہی تھی۔

جامشورو میں سپر ہائی وے سے سیہون شریف کو جانے والی سڑک کے کنارے، یہ مشہور عمارت ''سندھیالوجی میوزیم'' واقع ہے۔ سپر ہائی وے سے اس کا فاصلہ بہ مشکل پانچ کلومیٹر اور کراچی سے ایک 160 کلومیٹر ہے۔

اس عجائب گھر میں وادیِ مہران کی تہذیب کے حوالے سے تصاویر، تحاریر اور مجسموں کے علاوہ آڈیو ویڈیو مواد بھی موجود ہے۔

یہاں آج اس وقت معمول سے ہٹ کر جو گہما گہمی دکھائی دے رہی تھی، وہ سندھ یونیورسٹی کے طلبا و طالبات کی آمد و موجودگی کی وجہ سے تھی۔ نوجوان لڑکے لڑکیوں کا یہ گروپ خاصا پُرجوش اور ترنگ میں نظر آرہا تھا۔ ان پر جوانی کی بہار آئی ہوئی تھی۔ ان کے احساسات و جذبات عروج پر تھے۔ جوانی کا نشہ دماغ تک محدود رہے تو اکثر بے خودی میں بیہودگی کی طرف مائل کرتا ہے اور اگر یہی نشہ خمار بن کر دل میں اتر جائے تو جذبہ دل کی صورت ایک ''جذب'' کی کیفیت کو جنم دیتا ہے اور بے خودی و مستی کو شعور بخشتا ہے۔

ان نوجوان طلبا و طالبات کو دیکھ کر لگتا تو یہی تھا کہ یہ جوانی کے دماغی نشے کے زیر اثر تھے۔ دماغ میں جوانی کا نشہ تھا مگر دل میں خمار کی بے خودی نہ تھی۔ وہ بھی انہی میں شامل تھی...... عمر اس کی انیس، بیس کے ہی پیٹے میں... لڑکی سروقد، کھلتا چہرہ، رنگت ایسی کہ جیسے دودھ میں گلاب کے پھول کی نکہت و نور سمیت گھول دیا گیا ہو۔ خوشبو گلاب کی صورت اس کے انگ انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی اور نور حسن، ہالۂ حلقۂ اثر کی طرح اس کے نرم و گداز اور شاخِ گل جیسے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا...... وہ محبوب صورت تو تھی ہی مگر اس کی آنکھوں کی بناوٹ دیکھ کر لگتا تھا جیسے کسی ماہر دست کار نے اپنے کار چوب سے جو پیاری گڑیا بنائی تھی، اس نے اس کی آنکھوں کی بناوٹ پر خاص توجہ دی ہو اور اسے ایک صورت مصنوعی پن دے کر حقیقت کے رنگ میں بھر دیا ہو۔ اس کے لیے صرف یہی کہا جاتا ہے کہ ایسا بے داغ اور حسن صرف تصور میں ہی ممکن ہوتا ہے، حقیقت میں اس کا ہونا بھی ناممکن حد تک مشکل ہو۔ اس کے بال ہلکا شہد رنگ لیے ہوئے تھے، وہ لمبے بھی تھے اور گھنے بھی محسوس ہوتے تھے مگر اس نے اس وقت اس کی چٹیا بنا رکھی تھی۔ وہ ہر لحاظ سے ماڈرن بلکہ الٹرا ماڈرن تھی۔ ہلکے نیلے رنگ کی فراک نما قمیص کے نیچے مہین سا سیاہ رنگ کا چست ٹراؤزر پہن رکھا تھا اور گورے پاؤں میں اونچی ہیل کے سینڈل تھے۔ ایک ہاتھ میں اس نے ہینڈ بیگ تھام رکھا تھا۔ وہ بھی بہ ظاہر انہی کھلنڈرے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی طرح ہی دکھائی پڑتی تھی۔ وہ ہنس رہی تھی، اپنی فیلوز کے ساتھ قہقہے لگا رہی تھی اور باتیں بھی کررہی تھی۔ کوئی فرق نہیں تھا اس کی حرکات و سکنات میں، جیسے کہ دوسرے طلبا و طالبات کررہے تھے، یعنی ہنسی مذاق اور انجوائے، ماسوائے اس کے حسن کے...... ہاں! وہ اپنے بے مثل حسن میں یکتا تو تھی...... یہی شے اسے اپنے دیگر ساتھیوں میں ممتاز کیے ہوئے تھی۔ اس کا نام مہرزادی تھا، یہ جامشورو کے ایک دور افتادہ گوٹھ ستی ڈیرا کے بااثر جاگیردار وڈیرے رئیس ہنگل خان کی اکلوتی لاڈلی بیٹی تھی۔ اسی لاڈلے پن نے اس کے باپ کو اس کی ضد کے آگے مجبور کردیا تھا کہ وہ اپنے شوقِ تعلیم کو جاری رکھے۔

گوٹھ ستی ڈیرا میں وڈیرے رئیس ہنگل خان کی بلند و بالا حویلی تو تھی ہی لیکن یہاں شہر (حیدرآباد) میں بھی اس نے ایک عظیم الشان کوٹھی ''بھٹائی نگر'' کے نام سے بنوا رکھی تھی اور مہرزادی ادھر ہی رہائش پذیر تھی اگرچہ اس نے یونیورسٹی کیمپس میں بھی رہائش اختیار کررکھی تھی اور امتحانات کے دنوں میں وہ وہیں اپنی روم میٹ سہیلیوں کے ساتھ رہتی تھی کہ اسے ''سیلف اسٹڈی'' کے ساتھ ساتھ ''کمبائن اسٹڈی'' کی ضرورت بہرحال پڑتی تھی۔

''بھٹائی نگر''...... میں بھی ملازموں اور مسلح گارڈز کی پوری فوج ظفر موج ہر وقت موجود رہتی تھی۔ انتخابات کے دنوں میں، فصلی بٹیروں کی طرح جہاں دوسرے جاگیردار ٹائپ سیاست داں شہر کا رخ کرتے تھے تو ہنگل خان بھی اس ''موسم'' میں مستقل یہاں ڈیرا ڈال لیا کرتا تھا، ورنہ تو یہ کوٹھی برسوں نوکروں چاکروں کا مسکن بنی رہتی تھی یا پھر ہنگل خان کا بڑا بیٹا مراد خان آتا جاتا رہتا تھا۔

عام روایتی جاگیرداروں کے برخلاف رئیس ہنگل خان نے ایک ہی بیوی پر اکتفا کررکھا تھا، ورنہ ایسوں کے لیے دوسری اور تیسری شادیاں کسی پُرتعیش مشغلے سے کم نہیں ہوتیں۔

سندھیالوجی میوزیم کی اس عمارت کے گراؤنڈ فلور پر مختلف اسٹیج بنے نظر آرہے تھے، جن میں گندھارا تہذیب سے لے کر موئن جو دڑو اور سندھ کے رہن سہن، تہذیب و ثقافت سے متعلق ماڈل ''ڈسپلے'' کیے گئے تھے۔ انہی میں سندھ کے عظیم صوفی شاعر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی اور حضرت سچل سرمست کی درگاہوں کے ماڈل اور ان کے تصوراتی خاکے بھی

تھے۔ ان کے صوفیانہ و عاشقانہ کلام کی سطریں بھی کندہ تھیں۔

"اری مہرو! وہ تو دیکھو ذرا......" اس کی ایک سہیلی نے اسے کہنی کا ٹھوکا مارا۔

"کہاں......؟" مہرزادی نے بھی ہنسی کے انداز میں کہا تو اس کے ساتھ کھڑی ایک دوسری کلاس میٹ شبانہ چہک کر بولی۔

"یہ بھی ایک جیتا جاگتا ماڈل ہی لگتا ہے......" شبانہ کی بات پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ مہرزادی کی نقرئی ہنسی بھی اس میں شامل تھی۔ ایسے میں لڑکوں کے گروپ نے ہانک لگائی۔

"ماڈل نہیں، عشق ناکام کی ایک تصویر کہو......"

اس پر لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک مشترکہ قہقہہ پڑا۔ مہرزادی بھی اس طنز سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"دیسے ہے شاہکار......! آؤ ذرا اس طرف چلیں۔"

کسی منچلے نے شرارت بھری تحریک دی اور سب اسی طرف بڑھے۔ ابھی یہ سب پرشوخ چہلیں کرتے اس طرف بڑھ ہی رہے تھے کہ ایک پرسوز آواز ہال میں ابھری......

تکسی ایسی پریت نہ کر جیسی لمبی کھجور،
دھوپ لگے تو چھاؤں نہیں...... بھوک لگے پھل دور......

مگر کوئی اس پرسوز آواز کی پردرد شاعری کے بول کو نہ سمجھ سکا، اسی طرح وہ اس "ماڈل" کو ستانے کی غرض سے وہیں جا کھڑے ہوئے۔

ان سب کا انداز تمسخر اڑانے والا تھا۔ وہ سب اس عجیب ماڈل کو تکنے لگے۔ وہ واقعی ایک جیتا جاگتا ماڈل ہی تھا جو سندھ کی مشہور لوک رومانوی داستان کے کردار میں ڈھلے ایک مشترکہ "ڈیلے" کے پاس ایک اسٹول پر چپ چاپ اور اپنے حال میں مست الست بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں یکتارا ......تھا۔ (ایک بڑے سے کدو کو خشک کر کے اس کے دو ٹکڑے کر دیے جاتے ہیں۔ پھر ایک پر باریک تار کھینچ دیتے ہیں، بانس پر اسے لگا کر انگوٹھے پر نیش چڑھا کر اسے بجایا جاتا ہے، یہ آج کے گٹار کی قدیم شکل ہے)۔ اس نوجوان کا سوز و گداز جاری تھا۔

اس بار سب اس کی شاعری پر مبہوت سے ہو گئے تھے۔ اس بار اشعار نے ان کو جھنجوڑ ڈالا تھا۔ "واہ...... شاعری تو زوردار ہے اس کی......" انہی میں سے ایک نے کہا۔

وہ سب پورے اشتیاق اور محویت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ تھے۔

"مجھ پر مت ہنسو لوگو!
کہ میں تو خود اپنی ہی تقدیر کی لاش پر
ہوں ماتم کناں...... کچھ اس طور
کہ میں اب وہ، وہ نہیں رہا، جسے ناز تھا کبھی
اپنی قسمت پر......
آہ...... کوئی جذبہ تو مجھ بدنصیب سے روا رکھ......
الفت نا سہی، نفرت ہی رکھ......"

اس بار اس جیتے جاگتے شاہکار نے جیسے کسی کھلنڈرے، شوخ اور غیر سنجیدہ دل و دماغ پر بجلی گرا دی...... اور وہ تھی مہرزادی......

وہ اسے اب یک ٹک تکے جا رہی تھی، اس قدر محویت اور انہماک سے کہ...... اسے پتا ہی نہ چل سکا اس کے ہم جولی کسی اور طرف جا چکے تھے۔

وہ نوجوان جو بظاہر ایک دیہاتی ہی نظر آتا تھا، عمر اس کی مہرزادی سے دو، تین سال ہی بڑی لگتی تھی۔ سانولا رنگ، روشن آنکھیں مگر ان آنکھوں کی چمک بڑی تاثراتی تھی۔ اس میں اداسی کا ایک نامعلوم سا شائبہ دیتی رمق تھی، جہاں کسی گم گشتہ درد کی پرچھائیاں سمٹی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ چہرہ مردانہ وجاہت کا غماز نظر آتا تھا۔ آنکھوں کے اوپر بھوؤں کا رنگ گاڑھا تھا جو ناک کی جڑ کے ساتھ ملی ہوئی اس کی آتش مزاجی کا پتا دیتی تھیں۔ یہ اس کی ماں حاکم زادی نے اسے بتایا تھا کہ جن مردوں کی بھویں گاڑھی اور آپس میں ملی ہوتی ہیں، وہ بڑے جی دار، عشق میں آتش مزاج اور دلیر ہوتے ہیں۔ ہونٹ اس کے موٹے تھے جس پر باریک مونچھیں خوب جچتی تھیں۔ اس نے سادہ سی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ اسٹول پر بس، ٹک کر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کسی مجذوب فقیر جیسا ہی نظر آتا تھا۔ سر کے بال بھی اس کے مجذوب فقیروں کی طرح دراز اور گھنے تھے۔ چہرے پر ہلکی ڈاڑھی بھی تھی۔ گلے میں رنگین منکوں کی مالائیں جھول رہی تھیں۔ ایک کشکول بھی اس کی گود میں دھرا پڑا تھا۔

اس نوجوان کو نہیں معلوم تھا کہ کوئی اسے یک ٹک اور گہری نگاہوں کے سیاہ کشکول میں لیے ہوئے تھا۔ وہ بس، اپنے حال میں مست الست گنگنا رہا تھا اور تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو جاتا تھا، جیسے اپنے اندر کوئی درد، زہر کی طرح گھونٹ گھونٹ اتار رہا ہو...... جیسے سچ کے زہر کا پیالہ پی رہا ہو۔

اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ مہرزادی نے دیکھا، اس کی آنکھوں کے گاڑھے گاڑھے گوشے نمناک ہو رہے تھے۔

"بہت خوب...... بہت اعلیٰ......"

وہ لمحہ...... شاید بے اختیاری کا ہی تھا کہ جس نے

مبہوت سی کھڑی مہرزادی کے دلنشیں لبوں سے یہ الفاظ اس کے دل کی گیرائیوں سے نکال کر باہر دھکیل دیے تھے۔ ان الفاظ پر نوجوان نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور ایک ذرا گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ جیسے دو دلوں کے یکتارے ایک ساتھ ہی بجے ہوں۔ جیسے سازِ غم کی پُردرد لے پر جذبات نومیدہ کی کونپلیں ایک ساتھ ہی کھلی ہوں...... اور جیسے...... بے نام سے تعلق کو مستعار لمحات نے کسی گم گشتہ یادوں سے تشبیہ دے ڈالی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نوجوان، مہرزادی کو دیکھتے ہی عجیب انداز میں ٹھٹکا تھا۔ عجیب اس لیے کہ اس کی رنجور اور مغموم سی آنکھوں کی اداس شام میں آشنائی کا جگنو چمکا تھا۔ یہی جگنو مہرزادی کو بھی ایک حیرت آمیز الجھن میں مبتلا کر گیا تھا۔ کیونکہ وہ اس نوجوان کے اس طرح دیکھنے اور چونک پڑنے کو کسی عامیانہ پن کے تناظر میں دیکھنے کے بجائے، کچھ اخذ کرنے پر محمول کیے ہوئے تھی۔

پھر اس نے دیکھا کہ اس نوجوان کے چہرے پہ وہ اداسی، وہ بیراگ پن ایکا ایکی ہوا ہو گیا، اس کی جگہ شوقِ دید اور بشاشت دوڑ گئی، بالکل اسی طرح جیسے کسی کی کوئی بھولی بھٹکی اور ٹوٹی ہوئی امید بر آئی ہو...... وہ یک ٹک مہرزادی کو تکتا رہ گیا۔ وہ بھی اسے کچھ حیران کن اور الجھن آمیز نگاہوں سے دیکھتی رہ گئی۔

''وہی آنکھیں، وہی چہرہ اور وہی ہونٹ، ایسے ہی بولنے کا اندازِ دلبرانہ...... تم وڈے رئیس کی بیٹی ہو نا...... مہرزادی...... مہرو!''

معاً نوجوان نے اسے یہ کہہ کر چونکا دیا۔ اس کے بولنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اسے عرصے سے جانتا ہو۔

''تت...... تم مجھے کیسے جانتے ہو؟'' مہرو کی حیرت الفاظ بن کر نوکِ زباں پر آ گئی۔

ایک گہرے دکھ کا شائبہ دیتی اس کی مسکراہٹ نے مہرو کی نامعلوم سی الجھن کو فزوں کر ڈالا۔ وہ اپنا جواب سننے کے لیے بے چین ہو گئی۔ وہ اسی لہجے میں بولا۔

''آپ کو بھلا کون نہیں جانتا ہو گا، اتنے بڑے باپ کی بیٹی ہو آپ......'' نوجوان نے کہا، کچھ اس طرح کہ اس میں مہرو کو میٹھا سا طنز بھی لگا اور کسی کے غمِ نہاں کا درد بھی محسوس ہوا۔

''لل...... لیکن......'' وہ کچھ بولتے بولتے رک گئی۔ پھر جیسے اس لاینحل موضوع کو چھوڑ کر چہکتے لہجے میں بولی۔

''تم بہت اچھا گنگناتے ہو، شاعری بھی اچھی کرتے ہو، کہاں سے سیکھا تم نے یہ سب؟''

''تم سے......'' نوجوان جیسے اس کے یہ بولنے کا منتظر تھا۔ مہرو کو اس کا ایک دم یوں کہنا عامیانہ سا لگا اور ناگواری کی شکن اس کی شفاف پیشانی پر ابھری مگر جانے کیا ہوا کہ وہ اسی تیزی سے غائب بھی ہو گئی۔ وہ نوجوان یہ کہہ کر...... اپنی آنکھیں موندے سر دھننے لگا۔

مہرو کو اس کا موضوع کیا ہوا...... ''لمبی کھجور......'' والا شعر پسند آیا تھا۔ بولی۔

''مجھے تمہارا وہ لمبی کھجور والا شعر پسند آیا تھا۔ کیا تم اسے دوبارہ سنا سکتے ہو مجھے......؟''

''وہ شعر آپ ہی کے لیے تو موضوع کیا تھا میں نے......'' سانول نے اس پر اک دیدۂ پُرشوق سی ڈالتے ہوئے کہا اور وہی شعر مکرر کیا۔

تلسی ایسی پریت نہ کر جیسی لمبی کھجور......
دھوپ لگے تو چھاؤں نہیں، بھوک لگے پھل دور......

''واؤ گریٹ......'' بے اختیار مہرو کے نرم و گداز لبوں سے نکلا پھر وہ بولی۔

''اس کی تشریح بھی اس سے زیادہ اچھی ہو گی۔''

وہ مجذوب سا نوجوان اس کا مطلب سمجھ گیا، اس شعر کی تشریح بتانے لگا۔

''اس شعر میں ایک ایسے شخص کا درد سمویا ہوا ہے، جو نارسائی کا عذاب سہے ہوئے ہے۔ جس کے باعث وہ اپنے محبوب سے یک طرفہ الفت رکھنے پر مجبور ہے، اظہارِ محبت کرنا بھی اسے عامیانہ لگتا ہے۔ اس کا محبوب شان اور مرتبے میں بھی اس سے اونچا ہے، اب وہ اسے صرف دیکھ سکتا ہے مگر پا نہیں سکتا۔ وہ اپنی محبت کے تناور درخت تلے بیٹھ تو سکتا ہے مگر اس کی چھاؤں نہیں لے سکتا۔ وہ اس پر لگے پھل کو دیکھ سکتا ہے مگر توڑ کر کھا نہیں سکتا۔ اس کے لیے اسے بلندی پر چڑھنا ہو گا مگر وہ اس کی استطاعت نہیں رکھتا۔ بس! وہ اپنے اندر کی آتشِ عشق کو دبائے مست مدام رہتا ہے۔''

''اوہ...... سو سیڈ......'' مہرزادی کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ تب ہی اس نے محسوس کیا کہ اس نوجوان مجذوب کی کشادہ روشن آنکھوں میں نمی چمکنے لگی تھی۔

اچانک وہ نوجوان۔ اپنا یکتارا سنبھال کر اٹھا اور ہال کے دروازے کی طرف یہ گنگناتا ہوا چل دیا۔

''سادل مستون مست مدام...... سادل مستون مست مدام...... سادل مستون مست مدام......''

مہرو اس کی طرف ایک جذب کی سی کیفیت سے تکتی رہ گئی۔ کچھ تو تھا اس کے لہجے میں ایسا جس نے مہرو کو بھی مست

سا کر دیا۔ وہ اس کے پیچھے لپکی، بولی۔
''ٹھہرو...... کیا نام ہے تمہارا......؟''
وہ رک گیا۔ آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ بہت گہری نظریں تھیں اس کی...... وجود میں اترتی ہوئیں، پھر وہ اسی لہجے میں جواباً بولا۔
''سانول......''
''سانول!'' مہرو نے زیرلب دہرایا۔ ''تمہارا نام بھی نغماتی سا ہے۔''
''یہ نام تمہیں یاد نہیں رہا......؟'' سانول نامی اس نوجوان نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں ایک دکھ آمیز حیرت تھی۔ مہرو کی پیشانی پر پھر شکنیں نمودار ہوگئیں۔
''مہرو......! کیا اس مجہول سے نوجوان پر دل آ گیا ہے تمہارا......؟ آ جاؤ، ہم جا رہے ہیں۔''
اچانک اس کی سہیلی ریحانہ نے اسے پکارا...... وہ ہنسی بھی تھی۔ مہرو چونکی اور پھر ایک الوداعی سی نگاہ سانول نامی اس مجذوب سے نوجوان کے چہرے پر ڈالتے ہوئے کچھ کہنا چاہا مگر نہ کہہ پائی اور پلٹ گئی۔
جب وہ میوزیم کے شیشے والے دروازے سے گزرنے لگی تو اس نے یونہی پلٹ کر دیکھا، سانول ایک ہاتھ میں یکتارا پکڑے ہوئے اپنے دوسرے ہاتھ کو ہلا کر اسے الوداع کہہ رہا تھا۔
''کیا اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں ہال سے باہر نکلتے نکلتے اس کی طرف ایک آخری نگاہ ضرور ڈالوں گی؟ یا پھر یہ یونہی ہاتھ ہلا رہا تھا؟''
اس نے عمارت سے باہر نکلتے نکلتے سوچا پھر سر جھٹک کر اپنے گروپ کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

مہرو...... بھٹائی نگر والی کوٹھی میں پہنچی تو شام کے سائے جامشورو (حیدرآباد) کے مغربی افق پر اترنے لگے تھے۔ کوٹھی سفید اور ہلکے سبز رنگ کی تھی اور خاصے وسیع رقبۂ اراضی پر پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے بڑا سا لان تھا، جہاں گھنے درخت لگے ہوئے تھے۔ مخصوص مخروطی شکل کے کٹائی والے لمبے پیڑ بھی تھے۔ لان کیا تھا گویا ایک سبزہ زار میدان سا تھا، جہاں نوبنوع گل بوٹے اور مہکتی ہوئی کیاریوں کی باڑیں اور ایک طرف مختلف قسم کے موسمی پھلوں کا باغ بھی بنا ہوا تھا۔ کار پورچ میں دو لمبی لمبی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک نئے ماڈل کی ٹویوٹا کرولا اور ایک ڈائی ہاتسو کی۔ انٹر کولر بھی تھی۔
مہرو اپنی کار میں آئی تھی۔ ہاسٹل وہ اپنی کار میں ہی گئی

ایک ہی لیکچر

باپ نے بیٹے سے کہا۔ ''مجھے یہ جان کر بہت افسوس ہوا ہے کہ تم کو کلاس میں سب سے پیچھے بٹھایا جاتا ہے۔''
بیٹے نے جواب دیا۔ ''ابا جان! آپ ٹینشن نہ لیں ہماری کلاس میں طالب علم چاہے سب سے آگے بیٹھے یا سب سے پیچھے، انہیں ایک ہی لیکچر سننا پڑتا ہے۔''
(مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ)

تھی، وہیں سے ان سب کا پروگرام سندھیالوجی میوزیم گھومنے کا بن گیا تھا۔ مہرو اس وقت اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہاسٹل روم میں ہی تھی، وہاں سے وہ بھی ان کے ساتھ ہی یونیورسٹی کے پوائنٹ پر سندھیالوجی میوزیم چلی آئی تھی اور اپنی سیاہ رنگ کی کلٹس کار ہاسٹل کی پارکنگ میں ہی چھوڑ دی تھی۔ اس کے بعد جب وہ ہاسٹل لوٹی تو وہاں تھوڑی دیر رکنے کے بعد وہ اپنی کلٹس میں بھٹائی نگر لوٹ آئی تھی۔
''اوہ...... اداسائیں آئے ہوئے ہیں۔ شامت ہی آ گئی اب تو میری......''
وہ کار سے اترتے ہوئے بڑبڑائی۔ اس نے اپنے بڑے بھائی مراد خان المعروف ''چھوٹے رئیس'' کی میرون کلر انٹر کولر پہچان لی تھی۔ مہرو اپنی ماں کے ساتھ یہاں رہتی تھی۔ جبکہ رئیس ہنگل خان اور مراد خان، دونوں باپ بیٹا، اپنی جاگیر گوٹھ ستی ڈیرا میں رہتے تھے۔ زمینوں اور دیگر راجواڑی معاملات انہیں وہیں جکڑے رکھتے تھے۔ یہاں ان کا آنا کم ہی ہوتا تھا۔ ماں عالم زادی، یعنی ''وڈے رئیس'' کی بیوی اپنی بیٹی کی وجہ سے بھٹائی نگر ہی میں رہتی تھی۔ یہاں بھی نوکروں اور محافظوں کی کوئی کمی نہ تھی۔
مہرو آرٹس کی طالب علم تھی۔ اسے یہ مضمون بے حد پسند تھا۔ اسے تصویریں اور اسکیچ بنانے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے بڑے خوبصورت نغماتی اور لوک داستانوں کے اسکیچ بنا کر اپنے کمروں میں فریم کر کے لگائے ہوئے تھے۔ ان میں سسی پنوں اور نوری جام تماچی کے اسکیچ بھی شامل تھے۔
بڑا بھائی آیا ہوا تھا اور ادب کا ایک روایتی تقاضا تھا کہ وہ اسے سلام کر کے اپنے کمرے کا رخ کرتی۔ اس وقت اسے تنہائی درکار تھی۔ وہ اکیلے بیٹھ کر کچھ سوچنا چاہتی تھی۔ اس فقیر منش نوجوان سے متعلق نہیں بلکہ اس کی ان باتوں سے

متعلق جو اس نے اس سے کہی تھیں۔ آخر کس برتے پر اس نے اپنا لاحقہ اور تعلق اس سے جوڑنے کی کوشش کی تھی؟ وہ آخر کون تھا اور وہ اسے کس حوالے اور کس حیثیت سے جانتا تھا؟ کیا اس سانول...... نامی نوجوان کی اس ''جان کاری'' میں اجتماعیت کا دخل تھا یا انفرادیت کا؟ جانتے تو اسے سبھی تھے مگر ایک بڑے جاگیردار کی لاڈلی بیٹی کی حیثیت سے مگر اس نوجوان کی باتوں سے اندازہ یہی ہوتا تھا کہ اس کی جان کاری کی حیثیت وہ نہیں جو اوروں سے متعلق ہے۔

کسی ملازم نے اسے بتایا کہ ''چھوٹے رئیس'' نشست گاہ میں ''سروارنی جی'' کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ اس کی ماں کو ''سروارنی جی'' کہا جاتا تھا۔

مہرو نے سیدھے وہیں کا رخ کیا۔ کمرے میں اے سی اان تھا۔ وہ اس بیش قیمت اشیا سے سجی سجائی نشست گاہ میں داخل ہوئی تو اس نے ماں اور بھائی کو آپس میں باتیں کرتے پایا۔ اس پرتعیش نشست گاہ کی دیواروں پر خاندان کے بزرگوں کی رعونت آمیز تصاویر بڑے بڑے فریم کے ساتھ آویزاں نظر آتی تھیں۔ مہرو نے اندر داخل ہوتے ہی بھائی کو سلام کیا۔

مراد خان ایک ستائیس اٹھائیس سالہ لمبا چوڑا جوان تھا۔ جسم کسرتی تھا اور چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں۔ رنگ گورا اور آنکھیں بڑی تھیں۔ سر کے بال گھنے اور سیاہ تھے، جنہیں تیل چپڑ کر خوب جمایا گیا تھا۔ چہرے پر اپنے باپ ہی کی طرح کا رعب اور دبدبہ نظر آتا تھا۔ بہ قول لوگوں کے وہ اپنے باپ رئیس ہنگل خان کی ''ٹرو کاپی'' تھا۔ چہرے اور آنکھوں سے روایتی سخت گیری مترشح تھی۔ اس نے بیش قیمت بوسکی شلوار قمیص زیب تن کر رکھی تھی جس کی شلوار کھلے گھیر والی تھی۔ کاندھوں پر اجرک اور سر پر جامہ وٹ طرز کی سندھی ٹوپی تھی۔ بغل سے ہولسٹر جھول رہا تھا، جہاں سے سیاہ پستول کے دستے کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔

اس کے سامنے والے صوفے پر ایک دبنگ قسم کی خاتون براجمان تھی۔ جسم بھاری، رنگ گورا، چہرہ بیضوی، آنکھیں گہری تھیں۔ اس کا قد دراز تھا، اس نے بھی سندھی بلوچی کڑھائی والا بیش قیمت لباس پہن رکھا تھا اور مجموعی طور پر اس کی شخصیت میں ایک مردانہ وار رعب سا پایا جاتا تھا۔ اس کی عمر تو چالیس پینتالیس سے متجاوز ہی تھی مگر اس کو دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ وہ دو نوجوان بچوں کی ماں بھی ہے۔ یہ رئیس ہنگل خان کی بیوی اور مہرو کی ماں حاکم زادی تھی۔

مراد نے بہن کے سلام پر کچھ کھردری سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر روایتی انداز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کے سلام کا جواب دیا اور دوبارہ صوفے پر بیٹھ کر ماں سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ اس کے رویے سے صاف جھلکتا تھا کہ اس نے بہن کو نظرانداز کر دیا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ یہاں زیادہ دیر نہ رکے۔ اسے اپنی بہن سے چڑ تھی، وجہ یہی تھی کہ وہ اس کے تعلیم جاری رکھنے اور شہر آ کر پڑھنے کے حق میں ہی نہ تھا مگر چونکہ مہرو کو اپنے باپ کی طرف سے اجازت مل گئی تھی اسی لیے وہ بہن کی زیادہ مخالفت نہیں کر سکا تھا مگر اس وقت وہ اپنے کسی اور ہی مطلب سے ماں کے پاس بیٹھا تھا۔ بولا۔

''بابا سائیں...... کو تھوڑا سمجھانے کی کوشش تو کریں اماں سائیں! ایک بنجر زمین کے بدلے میں ہمیں آباد اور قیمتی زمین مل رہی ہے۔'' مراد نے ماں سے کہا۔

''پٹ (بیٹے)! وہ پھر بھی نہیں مانیں گے، میں ان کا مزاج جانتی ہوں۔'' حاکم زادی بیٹے سے بولی۔ ''چاہے زمین کو سیم و تھور کھا جائے، رئیس سائیں، اس پر دوگنا پیسا لگا کر بھی اسے بارآور کرنے کی کوشش کریں گے مگر ایک ٹکڑا تک زمین کا نہیں بیچیں گے، وہ اسے اپنی اور خاندان کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔''

''اماں سائیں! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی......'' مراد منہ پھلا کر بولا۔

''تم کیوں اس زمین کو بیچنے کے پیچھے پڑے ہو؟ پیسا لے کر جو زمین خریدنا چاہتے ہو، خرید لو۔'' ماں نے تجویز دی۔ مہرو خاموشی سے ماں کے قریب بیٹھ گئی تھی۔ اسے اس گفتگو سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ تو بس میل ملاقات کی ایک خانہ پُری کر کے جلد سے جلد اپنے کمرے میں جانا چاہتی تھی۔

''یہی تو مصیبت ہے کہ بابا جانی پیسا بھی دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں اس وقت......'' مراد بولا۔

''ہاں تو ٹھہر جاؤ کچھ دن، فصل اترنے والی ہے، پھر کیا پروا ہو گی۔'' ماں نے کہا۔

''مگر تب تک وہ پلاٹ بک جائے گا۔ موقعے کا پلاٹ ہے، ہاتھ سے نکل گیا تو گیا۔''

''کتنی قیمت کا ہے؟'' ماں نے کچھ سوچنے کے انداز میں استفسار کیا تو مراد بولا۔

''نو کروڑ......''

''یہ تو خاصی رقم ہے۔'' حاکم زادی نے بھویں اچکائیں۔

''اسی لیے تو کہہ رہا تھا کہ درگاہ جلیل شاہ والی زمین بک

جائے تو بہ آسانی یہ سودا ہو جائے گا۔ زمیندار اللہ ورایو تو تیار بیٹھا ہے اس زمین کو خریدنے کے لیے کیونکہ یہ اس کی جاگیر کے بہت قریب ہے جہاں اس نے حال ہی میں ایک بڑا واٹر کورس بھی بنایا ہوا ہے۔ اس کے لیے اس بنجر زمین کو سرسبز کرنا مشکل نہ ہوگا۔''

''اچھا تو تُو اس درگاہ والی زمین کی بات تو نہیں کر رہا جہاں کچھ غریب لوگوں نے جھونپڑیاں ڈال رکھی ہیں؟'' حاکم زادی نے پوچھا تو مراد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد حاکم زادی کچھ سوچتے ہوئے بیٹے سے بولی۔

''اچھا ٹھیک ہے، میں رئیس سائیں سے بات کرنے کی کوشش کروں گی مگر زیادہ امید نہ رکھنا ان سے۔''

''اماں سائیں! آپ کوشش تو کر کے دیکھیں، وہ آپ کی بات نہیں ٹالتے۔'' مراد پُرامید لہجے میں بولا۔

مہرو اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ دروازہ بند کیا اور آرام دہ بیڈ پر دراز ہو گئی۔ بڑا سا مخملی تکیہ اس نے اپنے سر کے نیچے کر لیا اور سامنے دیوار پر نگاہیں جما دیں جدھر اسی کے ہاتھ کی بنائی ہوئی تصویر فریم کے ساتھ آویزاں تھی۔ اس میں سسّی کو ریت میں دفن ہوتے اور پنوں کو صحرا بہ صحرا اسے مجنوں وار تلاشتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔

''کون ہے وہ؟'' اس کے سوچتے ذہن نے جیسے خود سے سوال کیا۔

''کیوں اپنا تعلق مجھ سے جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا؟'' دل میں الجھن ایک پھانس کی صورت ابھری۔

''اور پھر یوں مجھ سے بے خبر اور لاتعلق بھی ہو گیا جیسے اس نے کوئی مذاق کیا ہو۔''

''ہاں! شاید اس نے کوئی مذاق ہی کیا تھا میرے ساتھ..... جس طرح ہم اس کا تمسخر اڑا رہے تھے۔''

''ہوں! اگر یہ بات ہے تو پھر.....''

تاویلیں اور توجیہات دیتے دیتے اس کے اندر بھی روایتی سی رعونت بیدار ہوئی۔ آخر کو اس کی رگوں میں ایک جاگیر دار گھرانے کا خون گردش کر رہا تھا۔

مگر ''تو پھر.....'' کے بعد وہ کچھ نہ سوچ پائی۔ تاہم اس نے تہیہ ضرور کر لیا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو وہ اس مجذوب سے نوجوان کو اس مذاق کا مزہ چکھا کر رہے گی۔

اسے ضد سی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

ہال خالی ہو گیا تھا۔

سانول نے اپنا یکتارا سنبھالا اور سر جھکائے

گرھن

سورج گرہن: جب چاند سورج اور زمین کے درمیان آ جاتا ہے تو سورج کی شعاعیں آزادانہ زمین پر نہیں آ سکتیں، اس صورتِ حال کو سورج گرہن کہتے ہیں۔

چاند گرہن: جب زمین سورج اور چاند کے درمیان آتی ہے زمین کے درمیان میں آنے سے چاند سورج کی کم شعاعیں لگنے سے متاثر ہوتا ہے، اس کو چاند گرہن کہتے ہیں۔

اسلامی نقطہ نظر: سورج گرہن اور چاند گرہن کے وقت ہم مسلمان نماز ادا کرتے ہیں۔ سورج گرہن میں صلوۃ الکسوف اور چاند گرہن کے وقت صلوۃ الخسوف پڑھی جاتی ہیں۔ ان دونوں نمازوں میں دو رکعت پڑھی جاتی ہیں۔ نئے دور کے لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ چاند اور سورج گرہن تو طبعی امور ہیں۔ ڈرنے اور نماز پڑھنے کی کیا تک بنتی ہے؟

اس بات کے جواب میں مولانا تقی عثمانی کہتے ہیں: بے شک یہ طبعی امور ہیں لیکن یہ اس وقت (قیامت) کی چھوٹی سی جھلک دکھاتے ہیں جس روز تمام اجرامِ فلکی بے نور ہو جائیں گے۔ نمبر 2: جدید سائنس کی تحقیق کے مطابق سورج اور چاند گرہن کے لمحات بڑے نازک ہوتے ہیں کیونکہ سورج اور زمین دونوں میں کششِ ثقل ہوتی ہے۔ اس طرح دونوں چاند کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اس دوران اگر ایک جانب کششِ ثقل غالب آ جائے تو اجرامِ فلکیہ کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے تو پھر ایسے نازک وقت میں اللہ تعالیٰ سے رجوع نہ کیا جائے تو پھر کیا کیا جائے۔

(مرسلہ: بلقیس خان۔ مانسہرہ)

دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے فقیر منش دراز گیسو، جھکے ہوئے سر کی وجہ سے اس کے کاندھوں اور سینے تک کسی ثنادار درخت کی شاخوں کی طرح جھول گئے تھے۔ وہ اب بھی زیرلب سندھ کے مشہور صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی کوئی کافی گنگنا رہا تھا۔

وہی بھید بقا کا پائیں
ہو گئے جو نابود
وہی پہنچے در پہ تیرے
بھولے جو بھی وجود
کرم ہو تیرا گمراہوں پر
آن کرے وہ سجود
(شاہ سائیںؒ)

سندھیالوجی کی عمارت سے نکل کر سانول، جب سڑک پر پہنچا تو اس کے کانوں میں چنگ چی اور رکشے والوں کا شور پڑا......

''لطیف آباد...... ٹھوڑی پھاٹک...... قاسم آباد...... گاڑی کھاتہ...... حیدرآباد...... کوٹھ ستی ڈیرا۔''

وہ کوٹھ ستی ڈیرا جانے والی ایک چنگ چی کی طرف بڑھنے لگا تو کلینر ٹائپ چھوکرے نے اسے سوار کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ شاید اسے جانتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اس فقیر لڑکے سے اسے کرایہ ملنے کی کوئی امید نہ تھی۔ عجیب بات تو یہ تھی خود سانول بھی جانتا تھا کہ اسے کوئی رکشا یا چنگ چی والا سوار کرنے پر رضامند نہیں ہوگا، پھر بھی جانے کیوں وہ ہمیشہ اس میں سوار ہونے کی کوشش ضرور کرتا تھا۔

انکار پر وہ ہمیشہ کی طرح مسکرا کر وہیں سڑک کنارے تپتی دھوپ کے نیچے کھڑا رہ جاتا۔

ایسے میں کوئی خداترس چنگ چی والے سے کہتا۔

''اڑے او...... چھوکرا! بٹھالے اس گریب فقیر کو...... ثواب ہی ملے گا تیرے کو......''

اس پر وہ چھوکرا یہ کہہ کر اس خداترس مسافر کا منہ بند کر دیتا۔

''اڑے بابا! تجھے ثواب کی اتنی فکر ہے تو بھر دے اس کا بھی کرایہ...... بٹھالوں گا میں اسے......''

''گھوڑا گھاس سے دوستی کرے گا تو کھائے گا کیا۔'' کوئی منچلا مسافر جملہ بھی کس ڈالتا۔ کچھ قہقہے اُڈتے۔ چنگ چی فل ہو کر آگے بڑھ جاتی۔ اس پر وہ مجذوب سانو جوان زیرلب بڑبڑا کر رہ جاتا۔

''افسوس......! دنیا کے نفع میں غرق یہ لوگ، کیسے خود گزیدہ ہیں......؟''

سانول اسی طرح دھوپ میں کھڑا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ اب ہمیشہ کی طرح مسافر بس کے پیچھے لٹک کر ہی کوٹھ ستی ڈیرا جانا پڑے گا۔ وہ اسی بس کا انتظار کرنے لگا۔

پچھلے کئی روز سے اس کا یہی معمول تھا۔ تھوڑی دیر گزری ایک مسافر بس کھڑکھڑاتی ہوئی وہاں آن پہنچی۔ لوگ باگ چڑھنے اترنے لگے۔ اس نے بھی آگے بڑھ کر بس میں سوار ہونا چاہا تھا کہ سخت دل کلینر نے اسے بری طرح دھتکارتے ہوئے کہا۔

''اڑے ادھر کہاں آتا پڑا ہے بابا! جا ادھر پیچھے لگ۔''

اس کا اشارہ بس کے پیچھے لگے اس جنگلے کی طرف تھا جہاں پاؤں ٹکا کر فقط کھڑے ہونے کی جگہ ہوتی تھی۔

''دھوپ کی وجہ سے لوہے کا وہ جنگلا بڑا تپ رہا ہوتا ہے...... اسے پکڑ کر کھڑا ہونے سے میرے ہاتھ جلتے ہیں...... مجھے اندر آنے دو، میں کسی سیٹ پر نہیں بیٹھوں گا، کھڑا رہوں گا۔'' سانول نے اس سخت دل کلینر سے التجا کی مگر اس کا دل نرم نہ ہوا اور اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ وہ بھی جانتا تھا کہ اس فقیر سے کوئی کرایہ نہیں ملے گا۔

مسافر بس چلنے لگی۔ سانول بھاگ کر جنگلے میں پاؤں ٹکا کر سوار ہو گیا۔ لوہے کے اس زنگ آلود جنگلے پر ٹک کر کھڑے ہونے کے لیے ضروری تھا کہ اس پر دونوں ہاتھوں کی گرفت بھی مضبوط کی جاتی۔ جب سانول نے ایسا کیا تو لوہے کے، دھوپ میں تپتے ہوئے گرم سریے اس کے ہاتھوں کو جلانے لگے۔ مجبوری تھی۔ اپنے ٹھکانے پر پہنچنا تھا۔ وہ اسی طرح جما کھڑا رہا۔

تھوڑی دیر بعد بس سڑک کا ایک قوسی موڑ کاٹ کر رک گئی۔ سانول اتر گیا۔

اس کے سامنے بنجر سا تپتا ہوا ویرانہ پھیلا ہوا تھا جہاں کہیں کہیں بھربھری مٹی والا میدان اور کچھ ٹنڈ منڈ سے درخت بھی نظر آتے تھے۔ سڑک کے ایک طرف کھیت پھیلے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس کے پار گارے مٹی والے بختہ و نیم پختہ گھروں کی بے ترتیب قطاروں کی جھلک سی نظر آتی تھی۔

''اللہ سائیں! تیرا شکر ہے، خیریت سے اپنے ٹھکانے پر پہنچا دیا اس فقیر کو......'' سانول نے زیرلب کہا۔

''بہت خوب!''

اچانک عقب سے ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ سانول نے قدرے چونک کر اپنے عقب میں دیکھا۔

ایک چھریرے جسم کا قدرے دراز قد آدمی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دھوپ کا سیاہ چشمہ لگا ہوا تھا۔ وہ کلین شیو اور بیش قیمت سوٹ میں ملبوس تھا۔ عمر اس کی پینتیس، چالیس کے درمیان ہی رہی ہوگی۔ سانول نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر اس کے اطراف میں دیکھنے لگا۔ کچھ سوچ کر اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ وہ سوچنے لگا، کیا یہ آدمی اسی کھچا کھچ بھری بس سے اترا تھا؟ مگر اس کا قیمتی اور بے شکن لباس اس کی نفی کرتا نظر آتا تھا۔ وہ خوش پوشاک شخص بھی کوئی زیرک دماغ تھا۔ وہ سانول کی گردشی نظروں میں ہلکورے لیتی الجھن کا مطلب سمجھ گیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''میں اس بس میں سوار نہیں تھا مگر اس کے پیچھے ضرور چلا آرہا تھا......'' پھر اس نے اس طرف اشارہ کیا، جہاں قوسی موڑ پر اس کی نئے ماڈل کی کار کھڑی تھی۔ ''اس طرف میری گاڑی کھڑی ہے۔ آؤ، اسی طرف چلتے ہیں۔''

سانول حیران حیران سا اس کے ساتھ چل دیا۔ چند قدموں کے فاصلے پر ہی وہ اس کار کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ وہ اجنبی شخص کار کا دروازہ کھول کر اس سے مسکرا کر بولا۔

''آجاؤ، اندر بیٹھتے ہیں۔ باہر سخت دھوپ اور گرمی ہو رہی ہے۔ میری کار ایئر کنڈیشن ہے۔''

سانول اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''صاحب! میں اس جلتی سلگتی دھوپ اور گرمی کو برداشت کرنے کا عادی ہو چکا ہوں، اس کے لیے کسی ایئر کنڈیشن کا مصنوعی سہارا نہیں لیتا...... بس! ایک تصور کر لیتا ہوں اور پھر مجھے یہ جلتی دھوپ اور سلگتی گرمی بالکل اثر نہیں کرتی۔''

''اچھا!'' وہ شخص ہنوز کار کا دروازہ کھولے اس کی طرف دلچسپ نظروں سے دیکھتے ہوئے ہلکی مسکراہٹ سے بولا۔ ''کیا تصور کرتے ہو تم؟''

''جہنم کی آگ کا......'' سانول نے اپنی آنکھیں موندنے کے انداز میں کہا اور بے اختیار اس اجنبی آدمی کے منہ سے نکلا۔

''واہ...... سبحان اللہ......''

''میرا خیال ہے تم مجھے ثواب کمانے کی توفیق سے محروم نہیں کرو گے۔ آؤ، کار میں بیٹھ جاؤ، میں تمہیں تمہارے ٹھکانے تک چھوڑ آتا ہوں۔''

آدمی ذہین تھا۔ اس نے اسی کے انداز میں کہا تھا۔

سانول سوچنے لگا پھر بولا۔

دعا

دعا روح اور آرزو کی ہم آہنگی کا نام ہے۔ دینے والے اور لینے والے کے مابین ایک مس...... ایسے لمحے کی تخلیق کا پیش لفظ ہے جس سے خواہشوں کی تکمیل موجزن رہتی ہے۔ دعا نہ مانگنے والے ہاتھ ریگستان کی طرح خالی رہتے ہیں جن پر پانی کی ایک بوند برسائے بغیر بادل تیزی سے گزر جاتے ہیں۔

(مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ)

خلیل جبران کی مادرِ وطن

پیدائش اور موت دو ایسے حادثے ہیں جن کے سامنے انسان خود کو بے بس پاتا ہے۔ نہ تو پیدائش کے وقت اس سے مشورہ کیا جاتا ہے اور نہ موت کے وقت اس کی رضا پوچھی جاتی ہے کہ وہ کس مقام اور کس ملک میں پیدا ہونا یا مرنا پسند کرے گا۔ چنانچہ انسان پیدائش کے وقت چیخ کر اپنی جبری آمد پر صدائے احتجاج بلند کرتا ہے اور موت کے خوف میں مبتلا ہو کے اس دنیا کو چھوڑ دیتا ہے۔

خلیل جبران نے جمہوریہ لبنان کے قصبے بشریٰ میں 1883ء میں اپنی پہلی احتجاجی چیخ بلند کر کے اس دنیا میں آنکھ کھولی، اس روز دسمبر کی چھ تاریخ تھی۔

بشریٰ وادی قادیشا کی ایک چھوٹی سی سطح مرتفع کی ایک پہاڑی کے عین کنارے پر اپنے بازو پھیلائے کھڑی ہے۔ آج وہاں تک جانے کے لیے ایک پختہ سڑک بھی موجود ہے لیکن جبران کے زمانے میں یہاں صرف ایک چھوٹی سی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی تھی۔ جو سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی پہاڑی کی چوٹی پر چڑھتی چلی جاتی اور پھر شہر کے پہلو کو چھوتی ہوئی یک لخت اپنا رخ پیچھے کی طرف موڑ لیتی اور سفید پتھروں اور سرخ ٹائلوں والے مکانوں کے شہر کے عین دروازے میں جا داخل ہوتی۔ یہ شہر قدرتی طور پر قلعہ بند تھا۔

خلیل جبران کی تصنیف ''روح کے آئینے'' سے اقتباس

محمد آذین رضوان کے قلمی تعاون کا شکریہ

"اگر تم میری خاطر کوئی زحمت کرنے لگے ہو تو...... یہ ثواب کہیں مجھ پر بھاری نہ پڑ جائے کیونکہ ثواب اگر احسان کے ترازو میں آجائے تو ثواب کم اور احسان کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے۔ احسان بہت جلد حساب کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور حساب چکتا کرنے کی مجھ غریب میں نہ طاقت ہے نہ اوقات...... اسی لیے مجھے اب باقی کا راستہ پیدل ہی طے کرنے دو تو زیادہ بہتر ہے۔"

یہ کہہ کر سانول واپسی کے لیے مڑا تو اس آدمی نے اسے پکارا۔

"سنو...... اے...... لڑکے!"

سانول رک گیا اور اس کی طرف دیکھنے لگا پھر بولا۔

"میرا نام سانول ہے۔"

"ہاں سانول......! میں...... تمہارا مہمان ہوں...... تم سے ہی ملنے کے لیے یہاں آیا تھا۔"

"مجھ سے ملنے؟" سانول کو حیرت ہوئی۔

"ہاں! میں کافی روز سے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ سندھیالوجی میوزیم میں اور اس کے باہر آتے جاتے۔ اسٹاپ پر کھڑے ہوتے ہوئے بھی اور...... خود سے، لوگوں سے بڑبڑاتے اور باتیں کرتے ہوئے بھی۔ میں تمہارے قریب بھی کھڑا رہا ہوں، ایک عام راہ گیر کے روپ میں......" وہ شخص کہتا چلا گیا۔ سانول کو یہ آدمی پُراسرار سا محسوس ہونے لگا۔

"مگر کیوں؟ تمہیں بھلا مجھ غریب فقیر سے کیا لینا دینا......؟" سانول نے بدستور حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم تو ایک امیر اور کاروباری آدمی نظر آتے ہو مجھے؟"

جواباً وہ آدمی گہری مسکراہٹ سے بولا۔

"تم ایک اچھے انسان ہو اور میرے دل میں ایسے انسان کی بہت قدر ہے، بلکہ احترام ہے۔ آؤ چلتے ہیں......"

سانول حیران و پریشان سا اس کی کار میں سوار ہو گیا۔ وہ ایئرکنڈیشن کار کی فضا میں سکون اور آرام کے بجائے ایک عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

وہ اپنی اور صفدر کی فریم شدہ تصویر پر بڑی حسرت سے ہاتھ پھیر رہی تھی۔ وہ ان کی شادی کی تصویر تھی۔ آج ان کی شادی کو نو برس بیت چکے تھے مگر ابھی تک اس کے گلشن میں کوئی ایسا پھول نہیں کھلا تھا جو ان کی محبت کی نشانی قرار پاتا۔ صفدر اور حیا کی شادی اگرچہ ارینج میرج سہی مگر بعض محبتیں شادی کے بعد ہی پروان چڑھتی ہیں اور بڑی بوڑھیوں کے مطابق یہی محبتیں اصل اور پائیدار کہلاتی ہیں مگر حیا جانتی تھی کہ صفدر اور اس نے شادی کے چند دن کے بعد سے ہی بچوں سے متعلق کیا کیا کچھ نہیں سوچنا شروع کر دیا تھا، حتیٰ کہ نام تک رکھ دیا گیا تھا۔ بیٹے کا نام حیا نے اور بیٹی کا نام صفدر نے رکھا تھا مگر ہنوز نہ بیٹا دنیا میں آسکا تھا نہ ہی بیٹی۔

دونوں دلی طور پر غمگین ہی رہتے تھے، تاہم صفدر تو اپنا دکھ ظاہر نہیں کرتا تھا کہ اس طرح کہیں اس کی محبوب بیوی کو مزید دکھ نہ پہنچے مگر حیا اس دکھ اور احساسِ محرومی کو پوشیدہ رکھنے کی شاید سکت نہیں رکھ سکتی تھی۔

حیا کی نمناک آنکھوں کے گوشوں میں جرعہ جرعہ جمع ہونے والا آبِ استادہ جب آنسو کا ایک موٹا قطرہ بن کر فریم کے شیشے پر گرا تو اس نے خود کو سنبھالا اور اپنے مہین آنچل سے فریم کے شیشے پر پھیلی ہوئی آنسو کی نمی کو پونچھنے لگی۔ اس کی عمر تیس کے قریب تھی۔

وقت دن کا تھا اور باہر سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ تیز اور چلچلاتی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ کراچی سے جامشورو (حیدرآباد) آئے ہوئے انہیں چند ہی ماہ ہوئے تھے۔ کراچی کے مقابلے میں یہاں کا موسم زیادہ گرم تھا۔ صفدر ایک پرائیویٹ کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔ کمپنی نے ایک برانچ آفس حیدرآباد میں کھولا تھا اور اس کی ترقی کرکے اسے یہاں منیجر بنا کر بھیجا تھا۔

وہ صبح دفتر جانے کے لیے حیدرآباد نکل جاتا تھا۔ راولپنڈی اور اسلام آباد کی طرح حیدرآباد اور جامشورو بھی ایک طرح سے جڑواں شہر ہی کہلاتے تھے۔ بس، درمیان میں ایک برج کا فاصلہ تھا۔ اس پار جامشورو اور اس پار حیدرآباد تھا۔ یہ گھر کمپنی کی طرف سے انہیں ملا تھا۔

جامشورو کا موسم گرم و خشک تھا۔ دن میں بلا کی گرمی پڑتی تھی البتہ شام اور راتیں قدرے ٹھنڈی ہوتی تھیں اور تیز ہوائیں چلا کرتی تھیں۔

صفدر صبح جاتا تو شام گئے گھر لوٹتا۔ کبھی تو رات گئے اس کی واپسی ہوتی تھی۔ یہ سارا دن حیا تنہا اور بہت بوریت کے ساتھ کاٹتی تھی۔ اس کے اکیلے پن کو دیکھتے ہوئے، صفدر نے ایک مقامی ادھیڑ عمر عورت کو "ماسی" کے طور پر رکھ دیا تھا۔ کام کیا ہوتا، بس وہ حیا کے ساتھ باتیں کرتی تھی اور صفدر کے آنے تک اس کا دل بہلایا کرتی تھی۔ وہ قریب کے ایک گوٹھ ستی ڈیرا سے آتی تھی۔ اسے اچھی تنخواہ ملتی تھی اور کام کچھ خاص نہ کرنا پڑتا تھا، سو وہ بھی خوش تھی۔ اس کا نام مائی بخشاں تھا۔ اس کی ایک ہی بیٹی تھی، وہ شادی شدہ تھی۔ اس کا شوہر رئیس ہنگل خان کی زمینوں میں ہاری (کھیت مزدوری) کرتا تھا۔ اس کی

شادی کو چار سال ہو چکے تھے۔ اولاد تو ابھی تک نہیں ہوئی تھی تاہم وہ اب پچھلے چند ماہ سے امید سے تھی۔ وہ اسی کے پاس رہتی تھی۔ ان تینوں کا دنیا میں اور کوئی نہ تھا اسی لیے دکھ سکھ میں وہ تینوں ہی ہمیشہ ساتھ رہتے تھے۔

اس وقت مائی بخشاں نے ہی اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی تھی۔

''آجاؤ......'' اس نے فریم بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور جلدی سے اپنی آنکھوں کے گوشے پونچھ ڈالے۔

وہ بیڈ پر ہی بیٹھی تھی۔ دروازہ کھلا اور ایک فربہی ادھیڑ عمر دیہاتی عورت اندر داخل ہوئی۔ اس نے حیا کو سلام کیا۔ وہ آج دیر سے آئی تھی۔

''خیریت تو ہے اماں! آج تُو نے آنے میں دیر لگا دی؟'' حیا نے پوچھا۔

مائی بخشاں قالین پر چند قدم چلتی ہوئی اس کے قریب آگئی اور بولی۔

''بی بی جی! وہ بشیراں کی طبیعت خراب تھی نا...... آپ کو تو پتا ہی ہے آج کل میں وہ ماں بننے والی ہے...... بس، اسی کی فکر رہتی ہے۔ دعا کرو بی بی! اللہ سائیں خیر خیریت سے یہ مشکل وقت نکال دے۔''

اس غریب عورت کا چہرہ اترا اترا سا تھا۔ حیا کو یہ بات معلوم تھی، وہ قدرے خوش ہو کر بولی۔ ''ارے تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ ان شاء اللہ اچھا ہی ہوگا جو ہوگا۔ اللہ نے خوش خبری دی ہے تو اسے پورا بھی وہی کرے گا۔''

''اللہ سائیں آپ کی زبان مبارک کرے بی بی! آمین......'' وہ خوش ہو کر بولی۔

''اماں! تم سے ایک بات کہوں؟'' حیا نے آخر میں اس سے کہا۔

''جی بی جی! کہو، کیا بات ہے؟'' وہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

''تم میرے لیے بھی دعا کیا کرو......''

''ہائے بی بی جی! کیوں نہیں، میں تو اٹھتے بیٹھتے آپ کے لیے بھی دعائیں کرتی ہوں کہ اللہ سائیں آپ کی بھی گود اللہ ہری کر دے۔'' مائی بخشاں بولی پھر ایک ذرا توقف کے بعد اس نے کچھ کہنا چاہا مگر کہتے کہتے رک گئی جبکہ حیا نے فوراً بھانپ لیا، وہ بولی۔

''ہاں...... کہو، تم کچھ کہنا چاہتی تھیں اماں؟''

اس کے اکسانے پر مائی بخشاں کچھ گومگو سے لہجے میں بولی۔

''بی بی جی! ہوتا تو یہ سب کچھ اللہ کی مرضی سے ہی ہے مگر بی بی جی! آپ کی شادی کو بھی کئی سال بیت گئے ہیں۔ انسان کو اپنی سی بھی تو کوشش کر کے دیکھنی چاہیے۔''

''کیا مطلب؟'' حیا نے کچھ الجھن آمیز سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے آگے بولی۔

''آپ نے ...... میرا مطلب ہے، آپ اور صاحب جی نے کبھی کسی ڈاکٹر سے رجوع نہیں کیا؟ یعنی کوئی مشورہ وغیرہ اس سلسلے میں؟''

حیا اس کی بات سن کر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔ بولی۔

''میں تو کب سے یہ چاہتی آرہی ہوں...... مگر......''

''مگر کیا بی بی جی؟'' بخشاں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اللہ سائیں کا دیا آپ کے پاس سب کچھ ہے، آپ تو ایک سے ایک وڈے ڈاکٹر یا ڈاکٹرنی کو دکھا سکتے ہیں۔ اس سے فائدہ ہوتا ہے بی بی جی! میں تو رہی نری جاہل اور ان پڑھ مگر میں جس بنگلے میں پہلے کام کرتی تھی، وہاں ایک بے اولاد جوڑا رہتا تھا۔ ان کی شادی کو بھی بہت عرصہ بیت چکا تھا مگر انہوں نے ڈاکٹروں سے رابطے میں خود کو رکھا تھا اور ایک دن اللہ نے انہیں ایک نہیں دو بچے دے دیے۔ علاج کا تو حکم ہے نا بی بی جی! باقی دعا......''

''تم ٹھیک کہتی ہو بخشاں!'' حیا نے کہا۔ ''مگر تمہارے صاحب جی نہیں مانتے، کہتے ہیں کہ اللہ نے جب دینا ہوگا ایسے ہی دے دے گا۔''

''ان کی بات بھی ٹھیک ہے مگر بی بی جی......!'' مائی بخشاں کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''ہاں ...... ہاں، بولو۔ تم خاموش کیوں ہو گئیں؟'' حیا نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''پتا نہیں بی بی جی! آپ یقین کریں یا نہیں مگر سنا تو ہے اور دیکھا بھی ہے ایک حد تک کہ اگر کوئی بے اولاد جوڑا کسی ایسے غریب اور یتیم لڑکے کو جو نیک اور پرہیزگار بھی ہو، اس کی کفالت اپنے ذمے لے لے تو اللہ سائیں ایسے بے اولاد جوڑے کی مراد ضرور پوری کرتا ہے......''

''اچھا......!'' حیا نے دلچسپی لیتے ہوئے اس کی بات کو بڑے دھیان سے سنا تھا۔

''جی بی بی جی! ہمارے گوٹھ میں بھی ایک زمیندارنی تھی۔'' بخشاں آگے بولی۔ ''اس بے چاری کے بھی اولاد نہیں تھی۔ کسی نے انہیں یہی مشورہ دیا تھا۔ اس کا شوہر تو نہیں مانتا تھا مگر اس کی بیوی نے چوری چھپے ایک غریب اور یتیم

لڑکے کی کفالت اپنے ذمے لے لی تھی۔ بس پھر کیا تھا، سال دو سال میں ہی اس کے آنگن میں پھول کھل اٹھا تھا۔''

''کیا ایسے لڑکے کو ساتھ رکھا جاتا ہے؟'' حیا نے پوچھا۔

''نہیں بی بی جی! یہ ضروری نہیں ہوتا۔ بس، اس کے لیے کہیں بھی ایک مستقل ٹھکانے اور کھانے پینے کا بندوبست کر دیا جاتا ہے۔ چاہے ایک چھپر ہی کیوں نہ ہو......''

''اچھا!'' حیا گومگو سے لہجے میں بولی اور سوچتی رہ گئی۔

تاہم اس نے مائی بخشاں کی یہ بات اپنے پلے سے باندھ لی تھی اور اس نے اپنے شوہر صفدر سے بھی اس سلسلے میں بات کرنے کا پورا تہیہ کرلیا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ وہ اس کی بات رد نہیں کرے گا۔ مگر ایسا لڑکا جو نیک اور شریف، عبادت گزار بھی ہو، کہاں تلاش کیا جاسکتا ہے......؟

تاہم اس نے اسی دن یہ بات صفدر کے بھی ذہن میں ڈال دی اور اس نے حیا سے وعدہ کرلیا تھا کہ وہ اس کی یہ خواہش بہت جلد پوری کرنے کی کوشش کرے گا......

☆☆☆

وہ نئے ماڈل کی کرولا کار کچے اور دھول اڑاتے بل کھاتے راستے پر مناسب رفتار سے دوڑتی ہوئی چند ہی منٹ میں ایک ایسی جگہ پہنچی جہاں ایک خالی پلاٹ پر گھر نما جھگیاں بنی ہوئی تھیں۔ گارے مٹی کے لیپ زدہ دیواروں اور کھجی کی چٹائیوں سے بنی چھتیں تھیں ان پر......

سانول کار میں اس آدمی کے برابر والی سیٹ پر گم صم سا بیٹھا تھا۔ آبادی آتے ہی اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''بس سائیں! یہاں روک دیں گاڑی۔''

''ارے! یہ تو کوئی درگاہ لگتی ہے۔ تمہارا کوئی گھر نہیں ہے؟'' اس آدمی نے قدرے حیرت سے پوچھا۔ کار ایک گارے مٹی کی چہار دیواری کے سال خوردہ سے پھاٹک کے سامنے پہنچ کر رک گئی تھی۔ اندر مڑھی سی بنی ہوئی تھی جس کی کھلی چوکھٹ سے رنگین اور ریشمی چادریں چڑھی ہوئی ایک قبر کی جھلک نظر آتی تھی۔ پھاٹک کی پیشانی پر کڑھائی کی ہوئی چادر پر سنہری تاروں سے لکھے الفاظ میں ''سائیں جلیل شاہ درگاہ'' لکھا ہوا تھا۔ درگاہ کی جنوبی دیوار کی جانب کچی دیواروں کی مسجد بھی بنی ہوئی تھی۔

''میری جھونپڑی اس کے پیچھے بنی ہوئی ہے۔'' سانول نے مختصر جواب دیا۔ ''میں اب اتروں گا یہاں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ ڈور پاور لاکڈ تھے۔

''تم برا نہ مانو تو میں بھی نیچے اتر کر ذرا اس کی زیارت کرلوں؟'' اس آدمی نے کہا۔

''ضرور سائیں! کیوں نہیں، یہ دروازہ نہیں کھل رہا'' سانول نے دروازے پر زور آزمائی کرتے ہوئے کہا تو آدمی نے ہاتھ بڑھا کر بٹن دبایا اور دروازہ کھول دیا۔

تھوڑی دیر میں دونوں کار سے اتر آئے اور پھاٹک سے اندر کچے احاطے سے گزر کر صحن میں آگئے۔ وسط میں پیپل کا چھتنار پیڑ تھا۔ ایک جانب چھوٹا سا حجرہ نما کمرہ بنا ہوا تھا، وہاں اس آدمی کو ایک عمر رسیدہ شخص بیٹھا دکھائی دیا۔ اندر تمباکو کا دھواں سا پھیلا ہوا تھا۔ یہ یہاں کا مجاور لعل سخی تھا۔ وہ سانول کے ساتھ ایک خوش پوشاک آدمی کو دیکھ کر باہر آگیا۔ جبکہ وہاں اور لوگ بھی موجود تھے۔ مرد عورت، بوڑھے بھی تھے ان میں...... وہ سب پیپل کے اطراف میں بچھی میلی سی دری پر بیٹھے تھے۔ سانول پر ان کی نظر پڑتے ہی وہ سب اس کے آگے ہاتھ جوڑنے لگے اور بہ آوازِ بلند کورس میں ''سائیں شاہ آیا...... سائیں شاہ آیا......'' پکارنے لگے۔ خوش پوشاک بڑے غور اور پرسوچ نظروں سے یہ سب دیکھ رہا تھا اور ہولے ہولے اپنا سر بھی دھن رہا تھا جبکہ سانول کے چہرے پر کچھ ناگواریت اور پریشانی کے تاثرات ابھرے تھے۔

خوش پوشاک آدمی نے مختصر سے مقبرے کے اندر تنگ سی چوکھٹ کو سر جھکا کر پار کیا اور قبر کے پاس کھڑے ہو کر اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا پڑھی پھر باہر آگیا۔

سانول کے ساتھ وہ مجاور نما آدمی کھسر پھسر کر رہا تھا اور اس آدمی کی طرف اشارہ بھی کیے جا رہا تھا جبکہ سانول اس سے برہمی کے انداز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کا اشارہ وہاں موجود ان لوگوں کی طرف تھا جو اسی گوٹھ سے تعلق رکھتے تھے۔ جب وہ خوش پوشاک ان کے قریب آیا تو اس نے سانول کو اس ادھیڑ عمر مجاور لعل سخی سے کہتے سنا۔

''تو ان کو یہاں آنے سے منع کیوں نہیں کرتا، کیوں لگا رکھا ہے تو نے یہ دھندا؟ میں یہ باتیں پسند نہیں کرتا۔''

''سلام بابو سائیں!'' ادھیڑ عمر مجاور لعل سخی نے خوش پوشاک کو قریب آتے دیکھ کر فوراً سلام کیا۔ وہ خاصا موٹا سا تھا۔ رنگ خاکستری اور جسم پر صرف ایک میلی کچیلی سی صدری اور نیچے لاک (لنگی) باندھی ہوئی تھی۔ ناک موٹی تھی اور آنکھیں متورم سی نظر آتی تھیں۔

اس آدمی نے اس کے سلام کا جواب دیا اور پھر اپنی جیب سے ایک بڑا نوٹ نکال کر صحن میں ایک طرف رکھے ٹین کے ڈبے میں ڈال دیا۔ مجاور لعل سخی کی متورم سی آنکھوں میں

لہک سی ابھری۔ وہ خوش پوشاک آدمی بڑے غور سے اطراف کا جائزہ لیتا رہا، تب ہی اسے حجرے نما کوٹھری کی کھلی چوکھٹ سے اندر کچھ کتابوں کی جھلک نظر آئی۔ اس نے سانول سے کہا۔

''کیا میں اس کوٹھری کے اندر جا سکتا ہوں؟''

''ضرور بابو سائیں! کیوں نہیں، آئیں میرے ساتھ۔'' سانول نے کہا اور پھر اسے لیے اندر آ گیا۔

خوش پوشاک آدمی بڑی دلچسپی سے اس کچی اور مختصر سی کوٹھری کا جائزہ لینے لگا۔

ناپختہ فرش پر کھجی کی میلی سی چٹائی تھی...... اس پر رلیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف دیوار کی مٹی کھود کر کتابوں کی شیلف سی بنائی گئی تھی۔ اس میں سندھ کے مشہور صوفی شاعروں کے صوفیانہ اور اللہ کی محبت میں کہے گئے کلاموں کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ دیگر شاعری اور فلسفے کی کتابیں بھی وہاں رکھی نظر آئیں، جنہیں دیکھ کر خوش پوشاک کو یقین ہی نہیں آیا کہ ایسی خاک پسر جگہ میں علم و ادب کا یہ خزانہ بھی اسے دیکھنے کو ملے گا۔

''حیرت ہے، یہ کتابیں کس کی ہیں اور کون انہیں پڑھتا ہے؟'' اس نے پوچھا تو وہ خود اس کی حیرت پر حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''کیوں بابو سائیں! آپ کو کیوں حیرت ہوئی یہ کتابیں دیکھ کر؟ یہ عام سی کتابیں ہیں جن کا ہر کوئی مطالعہ کر سکتا ہے۔''

''ہاں! تم صحیح کہتے ہو۔'' خوش پوشاک کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ صاد کرتے ہوئے بولا۔ ''بس یونہی، میں نے سوچا کہ یہاں کون پڑھا لکھا ہوگا۔''

''میں زیادہ تو پڑھا لکھا نہیں ہوں بابو سائیں! پر دس جماعتیں میں نے پڑھ رکھی ہیں۔ یہ کتابیں پہلے سے ہی یہاں موجود تھیں۔ اب میں انہیں پڑھتا ہوں، بلکہ بار بار پڑھتا ہوں۔'' سانول نے جواب دیا۔ ایسے میں وہ متورم آنکھوں والا مجاور بھی اندر آ گیا تھا۔ خوش پوشاک بولا۔

''اچھی بات ہے، میں اب چلوں گا......''

''بابو سائیں! کوئی لسی پاڑیں پیو؟'' مجاور لعل سخی نے اس آدمی سے کہا تو اس خوش پوشاک آدمی نے ایک پُرغور سی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی اور بولا۔

''نہیں، شکریہ...... شاید میں یہاں دوبارہ آؤں، ابھی چلتا ہوں......''

وہ یہ کہہ کر باہر آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنی کار میں واپس لوٹ رہا تھا۔ سارے راستے وہ اپنے ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا۔ اس کے بعد ایک گہری سانس خارج کر کے اس نے کار کی رفتار بڑھا دی۔

پکی سڑک پر آتے ہی رفتار مزید تیز کر دی۔ اب وہ کار دوڑاتا ہوا اپنی رہائش گاہ کی طرف چلا جا رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کی کار جامشورو کی ایک بڑی سی رہائشی کالونی میں داخل ہو گئی۔

سندھ یونیورسٹی ہاؤسنگ سوسائٹی کے فیز نمبر آٹھ میں ''کاشانۂ حیا'' کے نام سے موجود بنگلا تقریباً تین سو گز کی قطعۂ اراضی پر بنا ہوا تھا جس کے گیٹ کے سامنے اس خوش پوشاک شخص نے کار روک دی تھی۔ یہ ایک منزلہ بنگلا تھا اور حال ہی میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ فیز مکمل طور پر رہائشی پروجیکٹ تھا مگر یہاں اب بھی تعمیراتی کام زیر تکمیل ہی نظر آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بیشتر پلاٹ اب بھی خالی تھے اور کچھ میں مکانوں کے ڈھانچے استادہ نظر آتے تھے، کچھ کی بنیادیں کھدی ہوئی تھیں۔

مذکورہ بنگلے ''کاشانۂ حیا'' کے اردگرد کی زمین بھی خالی تھی۔ چند پلاٹ چھوڑ کر کچھ مکانات نظر آتے تھے۔

یہاں شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ بنگلے پر ویرانی سی اترنے لگی تھی۔ چوکیدار نے ''صاحب'' کی کار پہچانتے ہی فوراً گیٹ کھول دیا۔

کار پورچ میں روکنے کے بعد وہ خوش پوشاک نیچے اترا اور اندر داخل ہو گیا۔ سامنے ہی اسے اپنی بیوی حیا کا اداس چہرہ نظر آ گیا۔ اس کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔

''صفدر! آپ آ گئے......'' حیا نے شوہر کو دیکھ کر ہولے سے کہا اور صفدر نامی اس خوش پوشاک آدمی نے محبت بھرے انداز میں اپنے دونوں بازو پھیلا دیے۔

☆☆☆

رات ہو چکی تھی۔ آبادی میں سناٹا طاری تھا۔ جھگیوں اور جھونپڑیوں پر مشتمل یہ آبادی پناہ گزین کا تاثر پیش کرتی تھی۔ جلیل شاہ کی اس مختصر سی سال خوردہ درگاہ کے ناپختہ احاطے میں ہلکی روشنی متحرک تھی جو اندر قبر کے سرہانے رکھے چراغ سے آ رہی تھی۔

احاطے میں بنی ایک کوٹھری میں فرش پر میلی کچیلی سی بچھی دری پر وہ موٹا سا متورم آنکھوں والا مجاور پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سانول لیٹا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آج نیند کوسوں دور تھی۔ وہ آج بہت بے چین سا ہو رہا تھا۔ اسے کسی طور بھی قرار نہیں مل رہا تھا۔ جب بے چینی بڑھ گئی تو وہ اٹھا اور کچے صحن میں آ گیا جہاں پیپل کے درخت پر سوگواری

طاری تھی۔ ہلکی ہوا میں اس کے پتے سرسراتے تو یوں لگتا جیسے آہیں بھر رہے ہوں۔ اس کے سر پر کھلا تاروں بھرا آسمان تھا۔ وہ چوکھٹ نما کھلے پھاٹک سے باہر نکلا۔ دور کہیں آوارہ جانوروں کا شور ابھر رہا تھا۔ سانول درگاہ کی کچی دیوار کے ساتھ ساتھ تاریکی میں چلتا ہوا، عقب میں بنی مسجد میں داخل ہوگیا۔ اندر کھجی کی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ یہاں بھی ایک طاقچے میں چراغ روشن تھا۔ مسجد میں سناٹا تھا۔ اس نے ایک طرف احاطے کے کونے میں لگے نلکے سے وضو کیا اور کھجی کی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ پہلے دو نفل نماز پڑھی۔ اس کے بعد دعائیہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ بلند کر دیے۔

”اللہ سائیں! میں تیرا گناہ گار اور ایک عاجز بندہ ہوں۔ میرے مقدر میں کیا لکھا ہے یہ تو ہی بہتر جانتا ہے۔ دنیا کی محبت میں بے چینی اور پریشانی کے سوا کچھ نہیں، لیکن تیری مخلوق سے محبت بھی تو ایک عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ مگر جب یہ محبت کسی فردِ واحد کی ذات تک محدود ہونے لگے تو انسان خود سے بھی بے خود ہونے لگتا ہے۔ وہ اپنی ذات کو بھلانے لگتا ہے۔ اسے محبوب کا درجہ دیتا ہے اور پھر بس وہ ہوتا ہے اور اس کا محبوب...... جو جسمانی طور پر نہیں تو روحانی طور پر ضرور ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے۔ اللہ سائیں! تیری عبادت کا جب سے مزہ چکھا ہے، ایک بات کا مجھ پر بھی انکشاف ہوا ہے کہ...... کبھی کبھی انسان اور اللہ کا معاملہ بہت ذاتی ہوجاتا ہے...... ایک بندہ اپنے رب سے وہ سب بلا جھجک کہہ ڈالتا ہے، جو وہ کسی بشر کے سامنے نہیں کہہ سکتا۔ میں بھی اپنے محبوب سے وہ سب نہیں کہہ سکا، اس لیے کہ میری اور اس کی حیثیت میں بہت فرق تھا۔ میرا منہ چھوٹا تھا اور بات بڑی مگر اللہ سائیں! یہ صرف تیری ذات ہے جو جتنی بڑی ہے، اتنا ہی چھوٹا بشر بھی تجھ سے بلا جھجک اپنے دل کی بات کہہ ڈالتا ہے اور تو اس کی سنتا بھی ہے۔ یہی وہ...... امید ہے چاہے کتنا ہی گناہ گار انسان ہو، توبہ کی امید پر تجھ سے ہمکلام ہوکر اپنا اور تیرا معاملہ ذاتی بنا ڈالتا ہے۔ میں بھی ایک ایسا ہی گناہ گار انسان ہوں اور اسی امید پر تجھے پکارتا ہوں کہ بس! مجھے ثابت قدم رکھ کہ میں تیری رسی کو پکڑے رکھوں، آمین!“

سانول عبادت اور دعا سے فارغ ہوا۔ ایک بار پھر دو رکعت نفل نماز پڑھی۔ اس کے دل کو از حد سکون پہنچا۔

☆☆☆

مہرو نے اپنے دل و دماغ پر بہت زور دیا تھا۔ حتیٰ کہ اپنے بچپن تک کی یادوں کو کھنگالا تھا مگر اسے کچھ یاد نہیں آسکا تھا کہ وہ کس حوالے سے اس نوجوان فقیر سانول کو جانتی رہی ہے یا وہ اسے جانتا تھا۔

”شاید میری موروثی امارت نے میری بچپن کی یادوں کو ”ری فریش“ ہونے نہیں دیا۔“ وہ سوچنے لگتی۔

”یا پھر شاید میری یادوں کی پٹاری میں ایسا کچھ خاص تھا ہی نہیں کہ مجھے اسے یاد کرنے کی ضرورت پڑتی لیکن نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا کہ میری یادوں کی خاموش جھیل میں کوئی کنکر پڑا ہو۔ ایسا کچھ ضرور ہوا ہے، جس نے یادِ رفتگاں کے دل میں کسی ہلچل کی گونج پیدا کی ہے۔ کچھ تو ہے پردۂ زرنگار کے پیچھے۔ ورنہ یہ بازگشت کیسی ہے؟“

پھر اچانک ہی یہ سب سوچتے ہوئے اس کے دل میں ایک خیال ابھرا...... کسی اپنے کے ساتھ بچپن کی یادوں کو کریدا جائے اور کچھ یاد نہ بھی آئے تو وہ اپنا اسے تھوڑا بہت کچھ نہ کچھ تو یاد دلا ہی دیتا ہے۔ اگر خود سے کچھ یاد نہ بھی آئے...... وہ اپنا کون تھا...... جو اس کے ساتھ بچپن کی باتوں کو شیئر کرسکتا تھا اور کچھ بتاسکتا تھا تو...... وہ فی زمانہ اس کی سب سے پرانی، گہری اور وفادار سہیلی، کوئی اور نہیں اس کی ماں ہی تھی کیونکہ ہر ماں اپنی بیٹی کی ”سہیلی“ بھی ہوتی ہے۔

حاکم زادی ابھی ادھر ہی تھی۔ وہ اس کے کمرے میں جا پہنچی۔

”اماں کی جان...... کیا بات ہے، تیرا چہرہ کچھ پریشان پریشان سا نظر آتا ہے؟“ حاکم زادی کی کھوگ نگاہوں نے بیٹی کے چہرے کو دیکھتے ہی پوچھا تو مہرو نے خود کو سنبھالا۔ اپنی ”سہیلی“ سے کچھ ایسا چاہتی تھی کہ اس سے اپنے مطلب کی بات بھی پوچھ لے اور اسے شک بھی نہ ہو۔ چنانچہ اس نے فوراً اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجالی اور ماں کے قریب آکر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں تو ماں نے بھی ممتا بھرے انداز میں اسے خود سے لپٹا لیا اور اسی لہجے میں بولی۔

”میری وٹی راڑیں! (میری رانی بیٹی)...... کیا بات ہے، اتنا پیار آرہا ہے ماں پر......؟“

”اماں جانی! ایک بات پوچھوں......؟“ مہرو نے فوراً کہا۔

”ہاں...... ہاں! پوچھ راڑیں...... ؟ کیوں نہیں......؟“ حاکم زادی اپنی بیٹی کو پیار سے ”رانی“ ہی کہتی تھی۔ ”مگر اب آگے پڑھنے کی ضد مت منوانا مجھ سے، میں نے تیرے پیو (باپ) کو جتنا راضی کرنا تھا کرلیا...... اب بس یہ آخری سال گزار لے، اس کے بعد ہم بھی تیرے فرض سے آزاد ہوجائیں۔“ حاکم زادی نے اپنی بیٹی کے دلار کو اور ہی معنی دیے تھے۔

''اماں سائیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے، میرا یہاں آخری سال ہے۔ اس کے بعد جو آپ کے اور بابا جانی کے دل میں آئے کیجیے گا......'' مہرو بولی۔ ''مگر میں آپ سے کچھ اور پوچھنا چاہتی ہوں۔''

''اچھا ٹھیک ہے، پوچھو......؟''

''اماں سائیں! میرا بچپن زیادہ تر کہاں بیتا تھا؟'' اس کی بات سن کر حاکم زادی ہنس پڑی۔

''یہ تجھے ایک دم کہاں کی سوجھی...... کیا کچھ کھو گیا ہے میرا بچپن میں......؟'' ماں نے تو مذاق جان کر یونہی ازراہ تفنن کہہ ڈالا تھا مگر اس نے مہرو کو آپوں آپ ہی کچھ اگلنے پر مجبور کر ڈالا۔

''ہاں، اماں سائیں! میرا شاید بچپن میں واقعی کچھ کھو گیا ہے...... مگر میں اسے مل گئی ہوں، وہ مجھے نہیں مل رہا۔''

''کیا مطلب......؟'' حاکم زادی چونکی۔

''کک...... کچھ نہیں اماں سائیں!'' وہ یک دم سنبھلی پھر بات رکھنے کے لیے مسکرا کر ماں سے بولی۔ ''بتاؤ نا اماں! میرا بچپن کہاں اور کیسے گزرا؟ کیا گوٹھ میں ہی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے یا پھر یہاں شہر میں......؟''

ماں کو پھر ہنسی آگئی۔ ''تیرا بچپنا نہیں گیا ابھی تک، وہی بچوں والی ضد کرلی نا......! اچھا بتاتی ہوں۔ تیرا بچپن شہر میں اتنا نہیں مگر گوٹھ میں حویلی کے اندر ہی گزرا ہے۔''

''اس وقت حویلی کے اندر اور کون تھا بھلا میری عمر کا...... جس کے ساتھ میں کھیلتی تھی؟''

''تیرا بھائی، مراد......''

''اور......؟'' مہرو نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''اور...... اور......'' ماں جیسے یاد کرنے لگی، پھر یک دم بولی۔

''اور...... مائی وزیراں کا بیٹا...... ہوتا تھا......''

''اچھا......!'' مہرو نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''کک...... کیا نام تھا اس کا......؟''

''نام...... نام......'' حاکم زادی سوچنے لگی۔

''ہاں......! سجاول تھا...... نام اس کا......''

''سجاول......؟'' مہرو الجھن آمیز انداز میں بڑبڑائی۔

''پر...... مائی وزیراں اسے پیار سے سانول کہہ کر پکارتی تھی۔''

اس نام پر مہرو کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔

''سانول بہت شریف تھا، پر تیرا بھائی مراد بڑا شرارتی۔ سانول تیرا دل بہلانے کی بہت کوشش کرتا تھا۔ مراد جانے کیوں اس سے چڑتی۔ وہ اسے مارتا تھا، تو اسے روکتی تھی۔ سانول بھی عجیب بچہ تھا۔ تیرے بھائی سے خاموشی کے ساتھ مار کھالیتا تھا۔ تھا تو وہ نوکرانی کا بیٹا، اس کی ماں وزیراں میری خاص خدمت گار تھی۔ شاید بے چارہ اسی لیے دبا دبا رہتا تھا۔ ایک دن مراد نے اسے اپنے ساتھ کھیلنے سے منع کردیا مگر وہ مراد کی غیرموجودگی میں تمہارے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ ایک دن جانے کیا ہوا کہ مراد نے تیرے باپ رئیس سے سانول کی کوئی جھوٹی سچی شکایت کردی۔ رئیس نے اس بے چارے کو بہت مارا...... وزیراں ماں تھی، اسے یہ بات بری لگی اور پھر وہ اپنے بیٹے سانول کے ساتھ ناراض ہو کے جانے کہاں چلی گئی۔'' حاکم زادی بتاتے بتاتے بیٹی کا چہرہ دیکھتی رہی تو چونک سی پڑی۔ مہرو اس کی بات اس قدر ڈوب کر سن رہی تھی جیسے وہ اسے کوئی سبق یاد کرا رہی ہو۔ ایک دم اپنی بھویں سکیڑ کر بیٹی سے بولی۔

''پر یہ سب تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''بس! ایسے ہی پوچھ رہی تھی اماں جانی!'' وہ مسکرا کر بات بناتے ہوئے بولی۔ ''میری یونیورسٹی کی سہیلیاں ہیں نا...... اپنے اپنے بچپن کی باتیں شیئر کرتی ہیں مگر مجھے اپنے بچپن سے متعلق ایسا کچھ معلوم ہی نہ تھا۔ پھر وہ کہتی ہیں کہ تمہارے جیسے بڑے اور جاگیردار گھرانوں کے بچے اپنی امارت کی وجہ سے چہار دیواری سے باہر نکلتے ہی نہیں...... تو میں ان کا یہ خیال غلط ثابت کرنا چاہتی تھی۔'' مہرو نے بڑی خوبصورتی سے بات ٹالی تو ماں بولی۔

''تیری سہیلیاں غلط نہیں کہتیں۔ تیرا بچپن واقعی حویلی کی چہار دیواری کے اندر ہی بیتا ہے۔''

☆☆☆

اگلے دن صبح یونیورسٹی کا ایک لیکچر ''گول'' کر کے وہ سندھیالوجی جا پہنچی۔ اس لمحے اس کے دل و دماغ کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ وہ خود ایک رئیس زادی تھی۔ اسی سبب اپنے آپ پر اسے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ ایک فقیر منش نوجوان میں کیوں دلچسپی لینے لگی تھی؟ شاید وہ اس سے اسی لیے متاثر ہونے لگی تھی کہ وہ اس کا بچپن کا چاہنے والا تھا؟ اس بات کو بھی اگر ہنسی اور مذاق میں اڑا دیا جاتا تو پھر یہ سوال ایک نامعلوم سے جذبے کو ابھارتے ہوئے اپنی یہ جگہ بناتا تھا کہ...... مائی وزیراں کے بچے سجاول (سانول) نے اسے اب تک یاد رکھا تھا تو وہ بچگانہ جذبہ دل آج ایک تناور درخت کیسے بن گیا تھا؟ کیا بچپن اتنا پختہ ہوسکتا ہے؟ اس نے خود سے سوال کیا، جس کا جواب دماغ نے فوراً ہی رد کردیا۔

''ہرگز نہیں، ہاں! ایسا تب ہوسکتا تھا جب بچپن کا یہ

ساتھ لڑکپنے تک اکٹھے رہتا تو اور بات تھی۔ وہ اسے یونہی متاثر کرنے کی کوشش کررہا ہے، تاکہ وہ (مہرو) اس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہوجائے۔"

"یہ کوئی دل دلچسپی تھوڑی ہے۔" اس کے دماغ نے تاویل پیش کرنا چاہی۔ کچھ انا نے بھی اسے کھدیڑا تھا۔

"میں تو فقط یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آخر اس انوکھے اور مجذوب نوجوان نے اپنا لاحقہ میرے ساتھ جوڑنے کی کیوں جرأت کی ہے؟ یہ تو محض ایک کھوجنا ہے...... اور بس......"

دل نے معنی خیز مسکراہٹ سے توجیہہ پیش کی۔

"اچھا......! تو رئیس زادی تم کیوں اس بات کو اتنی اہمیت دینے لگیں؟ نہ جانے یہاں کتنے ہی لوگ کتنی ہی بے پر کی اڑاتے ہی رہتے ہیں، کون اس پردھیان یا توجہ دیتا ہے، تو پھر تم کیوں اس قدر سنجیدہ ہوگئیں بی بی؟ مت جھٹلاؤ اس حقیقت کو کہ تمہارے دل کے خانۂ نہاں میں کوئی جذبہ گھر کرنے لگا ہے۔"

دل کے اس سوال پر انا نے غلبہ کیا۔

"یہ کسی قسم کی کوئی سنجیدگی نہیں ہے۔ محض ایک تجسس ہے اور تجسس انسان کی فطرت کا حصہ ہے۔"

اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب اس کے پاؤں سندھیالوجی میوزیم کے چکنے اور رنیلے ٹائلوں والے فرش پر پڑے۔ وہ چونکی اس وقت جب اس کے کانوں سے وہی صوفیانہ کلام گنگنانے والی آواز ٹکرائی۔

سیپ سمندر میں ہوتی ہے...... مگر اس کا سہارا بادل ہے۔
اسے سچا موتی تب ہی نصیب ہوتا ہے......
جب وہ گہرے پانیوں میں بھی پیاس سہتی ہے......
(شاہ سائیںؒ)

آہ...... کیا ہے اس آواز میں، کیسا جادو ہے، کیا فسوں ہے کہ یہ مجھے بے اختیار اس کی جانب کھینچے جانے پر مجبور کرتی رہتی ہے۔ اس کے دل کے نہاں خانے میں یہ سوال ابھرا۔ پھر اس کی متلاشی سی نگاہیں اسی آواز کی جانب اٹھتی چلی گئیں۔ وہ مجذوب سا فقیر منش نوجوان اسے نظر آگیا۔ اسی طرح یکتارا سنبھالے چوبی اسٹول پر بیٹھا تھا وہ اور سندھ کے صوفی شاعروں کی کافیاں...... گنگنائے جارہا تھا۔

"اسے اتنی اچھی شاعری آتی ہے، ذوق بھی اعلیٰ درجے کا رکھتا ہے...... پھر تو یہ پڑھا لکھا بھی ہوگا۔ اس کا تو نام بھی شاعرانہ سا ہے، سانول......" مہرو نے اس نوجوان کے متعلق سوچا اور پھر کشاں کشاں اس کے قدم اسی کی طرف اٹھنے لگے۔

جن کا تن تسبیح، من تسبیح کا دانہ ہوتا ہے اور دل یکتارا......
ان کی طلب کی تاریں وحدت کے سر پر بجتی ہیں
رگوں سے وحدہٗ لاشریک کا راگ سنائی دیتا ہے۔
جن کی نیندیں عبادت ہوتی ہیں، وہ سو کر بھی جاگتے ہیں۔
(شاہ لطیفؒ)

"واہ...... تم اتنی اچھی اور بیک وقت عشقیہ اور صوفیانہ شاعری کیسے کرلیتے ہو؟ جس میں اللہ سائیں کی وحدانیت کے ساتھ محبوب سے پیار کی جھلک بھی نظر آتی ہے؟"

مہرو کے لبوں سے بے اختیار ہی الفاظ اُمڈے تھے۔ اس پر سانول نے اپنی موندی موندی سی آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ نارسائی کے ایک جاں گسل و کربناک احساس تلے سانول کا دل اسی کے صاعقہ بار وجود کے محور کا ارتکاز بن گیا۔ نیم باز سی آنکھوں سے بے نام سی اداسی کی جھلک ابھری۔ دل میں شوقِ دید بھی ابھری اور اپنی کم مائیگی کا احساس بھی جاگا تو اس نے کچھ کہے بغیر ہی اپنی آنکھیں دوبارہ سے موندلیں۔ اس کے بائیں ہاتھ میں یکتارا تھما ہوا تھا...... جس کا ایک سرا اس کی گود میں ٹکا ہوا تھا اور سیدھے ہاتھ کی شہادت والی انگلی پر نیش چڑھا ہوا تھا۔ جب وہ تار بجاتا تو اسے یوں لگتا جیسے وہ اس نکیلے نیش سے تار نہیں اپنے دل کے ان کہے سنگیت کے زخم کو چھیل رہا ہو۔

وہ پھر اسی جذب اور بے خودی کے عالم میں حضرت سچل سرمستؒ کی شاعری گنگنانے لگا۔

ہے غنیمت مجھ کو یارو، دوستی دلدار کی
کیوں نہ بیگانہ رہوں جب یہ جہاں فانی ہوا
سیکھے گا عشق جو بھی، جھیلے گا وہ مصیبت

"کیا تم عشق میں مصیبت سے ڈرتے ہو؟"

مہرو نے شاعری کے بول کو سمجھے بنا ہی اس سے کہا تو سانول نے اپنی آنکھیں دوبارہ کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ اب اس کے لیے جواب دینا ضروری قرار پایا تھا۔

اس نے بہ غور اپنے سامنے کھڑی مہرو کو گہری گہری آنکھوں سے دیکھا اور بولا۔

"عشق تو خود مصیبت کی نفی کرتا ہے۔ اس لیے کہ سچا عشق بڑی سے بڑی مصیبت کی بھی پروا نہیں کرتا...... مگر"

"مگر کیا......؟" مہرو نے اسے نکلنے کا موقع نہیں دیا۔ اسے ابھی اپنا سوال وہیں پر ہی اٹکا ہوا محسوس ہورہا تھا۔

"مگر...... یہ کہ محبت کرنے والا انتہائے عشق کی اس منزل پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ نہیں چاہتا اپنے محبوب کے لیے اعلیٰ محبت کو مصیبت بنائے جسے وہ عشق کے نام پر جھیلتا رہے۔ اس

لیے کہ وہ اپنے محبوب کو خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے عشق کو اس کے لیے مصیبت نہیں بنانا چاہتا۔'' سانول نے لطیف سائیںؒ کے ایک عشقیہ فلسفے کی کتاب سے کچھ لفظوں کا استعارہ استعمال کیا۔ یہ جواب سن کر مہرو کے سوچتے ذہن میں ایک جھما کا ہوا۔'' کیا یہ اسے کسی مصیبت کا شکار نہیں ہونے دینا چاہتا؟'

''تم مجھے کافی پڑھے لکھے لگتے ہو۔'' اس کا سانول سے باتیں کرنے کو جی چاہا۔

''دس جماعتیں پاس ہوں۔'' سانول نے بڑے دھیان سے جواب دیا۔ اسے بھی اس سے گفتگو اچھی لگ رہی تھی۔

''تم نے ادب اور شاعری کافی اچھی پڑھ رکھی ہے۔ گنگناتے بھی اچھا ہو، یہ شوق تمہیں کیسے ہوا؟''

''آپ سے......'' سانول نے بے اختیار کہا۔

''مجھ سے؟'' مہرو کے لہجے میں حیرت تھی۔ ایسے میں مہرو کے دل و دماغ میں اپنی ماں سے کی ہوئی باتیں گردش کرنے لگیں۔ تاہم ابھی وہ اس بارے میں چپ تھی مگر وہ چاہتی یہی تھی کہ پہلی ملاقات کی طرح اس بار بھی وہ ضرور کسی نہ کسی حوالے سے اس کا ذکر چھیڑے گا تو پھر وہ اس سے ضرور پوچھ کر رہے گی۔ سو اس نے موقع ملتے ہی پوچھ لیا۔

''ایک بات بتاؤ، تم یہ ہمیشہ میرے ماضی کا حوالہ دے کر خود کو زبردستی میرے ساتھ جوڑنے کی کوشش کیوں کرتے ہو؟ کیا سمجھتے ہو تم کہ میں تمہاری اس حرکت سے متاثر ہو جاؤں گی؟'' مہرو کی بات میں طنز کا پہلو ہو سکتا تھا مگر انداز مستفسرانہ ایسا نہیں تھا، بلکہ اس میں ایک ''کھوجنا'' تھی۔ سانول نے بھی یہ بھانپ لیا تھا۔ خفیف سی مسکراہٹ سے بولا۔

''تعلق رہا ہے تو تعلق جوڑا بھی جاتا ہے اور مہرو بی بی! مجھے آپ کو متاثر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ میں اس تعلق سے بے تعلقی میں ہی زیادہ پُرسکون اور خوش ہوں۔''

سانول کی اس بات نے مہرو کو اندر سے چٹخا کر رکھ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کے طنز کو محسوس کر کے مایوس ہو جائے گا اور مزید ڈھیٹ پنے اور عامیانہ پن کا مظاہرہ کرے گا لیکن اس نے اس کی بات کے طنز کا کوئی اثر لیے الٹا ہی جس قدر طمانیت بھری مسکراہٹ اور نہایت پُرسکون انداز میں جواب دیا تھا، اس سے صاف عیاں ہوتا تھا کہ اسے کوئی پروا نہ تھی۔ پھر بھی مہرو کے اندر ایک موہوم سے خیال نے سر ابھارا اور گویا وہ بھی اس کی بے پروائی کا بہ ظاہر کوئی اثر لیے بغیر مسکرا کر بے نیازی سے بولی۔

''اچھا! تو پھر تم بار بار ہر بات پر میرا ذکر کیوں کرتے ہو......؟''

اپنا جملہ مکمل کرتے ہی اس نے تیکھی سی نگاہیں اس کے چہرے پر جما دیں۔ اسے بیک وقت سانول کے چہرے سے بے نیازی مگر بڑی بڑی روشن آنکھوں میں نامعلوم سی اداسی کی جھلک محسوس ہوئی تھی۔

''فکر و ذکر میں صرف اللہ سائیں کا کرنا پسند کرتا ہوں۔ جس ذکر کی آپ بات کر رہی ہیں وہ ایک حوالہ ہے، ایک گم گشتہ حوالہ...... اللہ بس، باقی ہوس......''

''اچھا ایک بات بتاؤ...... تمہارا اصل نام سجاول ہے نا......؟''

اس نے جیسے دھما کا کیا۔ کم از کم سانول کے لیے یہ سوال دھماکے سے کیا کم ہی تھا۔ اس کے ہاتھ سے یکتارا گرتے گرتے بچا۔

''اور...... تم مائی وزیراں کے بیٹے ہو......؟'' مہرو کہتی چلی گئی۔ وہ اب بھی یہی چاہتی تھی کہ سانول کو اس طرح جوش دلا کر اسے ''ڈھا'' دے۔ وہ جذباتی ہو جائے۔ پتا نہیں کیوں وہ اس میں عامیانہ پن دیکھنا چاہ رہی تھی یا پھر اس جذبۂ جنوں کی حقیقت بے نقاب کرنے کے لیے کوشاں تھی۔

''تمہیں یہ سب خود ہی یاد آیا ہے یا کسی نے بتایا ہے تمہیں......؟'' سانول نے اپنے یکتارے پر گرفت مضبوط رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''تمہارا دل کیا کہتا ہے؟ مجھے یہ سب یاد آیا ہو گا یا کسی نے بتایا ہو گا مجھے؟'' وہ ہر طرح سے اس کا امتحان لینے پر تلی ہوئی تھی۔

''میرا دل کہتا ہے، تمہیں بتایا گیا ہے۔ یاد تمہیں نہیں آسکتا...... کبھی نہیں......'' سانول نے پورے یقین سے کہا تو مہرو اس کی سچائی پر ششدر رہ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ڈینگیں مارنا شروع کر دے گا کہ...... ''دیکھا مہرو! میری محبت سچی تھی نا...... بالآخر اس کی طاقت نے تمہیں اپنا بچپنا یاد دلا ہی دیا۔''

مگر...... وائے افسوس کہ مہرو کے سارے ہی اندازے قریب ترین ہونے کے باوصف غلط اور باطل ہی ثابت ہو رہے تھے لیکن...... مہرو کے پاس ابھی ٹرپ کا ایک پتا باقی بچا تھا، بولی۔

''تم نے ٹھیک کہا ہے۔ مجھے میری اماں جانی نے ہی تمہارے بارے میں مختصراً بتایا تھا۔''

''میرا بھی یہی خیال تھا۔'' سانول نے ہولے سے کہا۔

''لیکن...... ایک آخری بات بتا دو۔''

''پوچھو......''

''جب مجھے وہ بچپنے کا ایک قلیل ترین عرصہ یاد نہیں رہ

کا تو پھر تمہیں کیسے یاد رہا؟ کیونکہ میری اماں جانی کے مطابق میرے بھائی ادا مراد نے بابا جانی سے تمہاری شکایت کر دی تھی اور پھر تم حویلی سے دور کر دیے گئے تھے، تمہاری ماں نے بھی احتجاجاً حویلی آنا چھوڑ دیا تھا۔ بولو...... پھر کیسے تم نے اپنے دل و دماغ میں میرا خیال...... میرا تصور پالے رکھا تھا؟''

یہ سب کہتے ہوئے مہرو کو یوں لگا جیسے وہ کسی غیر مرئی ٹرانس میں آنے لگی تھی۔ کوئی لہر تھی انجانی، جو اسے بہا دینا چاہتی تھی، زورِ محبت کی ایسی زور آوری کہ...... مہرو کو اپنا وجود چھوٹتا ہوا سا محسوس ہونے لگتا تھا۔

سانول نے جواب میں یکتارا بجا کر...... ایک شعر گنگنا دیا۔

گھڑا ٹوٹا تو یہ آواز آئی......
نہیں رہی، اب دونوں میں کوئی جدائی......
دل ہے وابستہ غم محبوب
عالم جذب وشوق لامحدود
ہے گرانبارِ عشق کی زنجیر
جنبش ہائے ناتواں سے سود
ہر تمنا جراحت صد چاک......
آرزو ایک شعلہ بے دود
بحرِ غم اور سیلِ اشک رواں
موج در موج گوہرِ مقصود
(شاہ لطیفؒ)

شاعری کے بول اور اس کے معنی...... مہرو کے دل و دماغ...... کو تہ و بالا کیے دے رہے تھے لیکن اسے اب بھی اپنے سوال کا جواب نہ ملا یا پھر شاید اسے سمجھ نہ آیا۔ وہ یک ٹک سانول کے اتھاہ گہرائی لیے چہرے کو تکتی رہ گئی تو سانول خود ہی آگے بول پڑا۔

''مجھے حویلی سے تو نکال دیا گیا تھا اور شاید تم سے بھی دور کر دیا گیا تھا مگر بحر سیل اشک رواں میں مجھے اپنا گوہر مقصود موج در موج نظر آ رہا تھا۔ بے زنجیر عشق گراں بار ہے مگر میں بھی گریباں اپنا صد چاک کیے رہا۔'' اتنا کہہ کر وہ جانے کے مڑا اور آخر میں بولا۔

''اب ذرا اپنی اماں جانی کے بجائے...... اپنے بابا جانی سے پوچھ لینا کہ ان کے بارے میں گھوڑوں کی رکھوالی کے لیے کیسے رکھا تھا۔ بس! تم سے قریب رہنے کا جو بہانہ اس سر پھرے عاشق کو سوجھا وہ ہی اختیار کر لیا۔ تو مجھ سے بے خبر سہی پر میری پیاسی آنکھوں کے کشکول میں تیری دید کی بھیک تو پڑ ہی جاتی تھی۔ اس ملنگ کے لیے یہی بہت تھا...... چلتا ہوں......''

''سادل مستوں مست مدام...... سادل مستوں مست مدام......''

کہتے ہوئے سانول نے اپنا یکتارا سنبھالا اور کوئی صوفیانہ کلام کا ورد کرتا ہوا ہال کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ مہرو یک ٹک اسے دیکھتی رہ گئی۔

وہ اس مکر و فریب کے ریا کار سماج میں جو گوہر مقصود تلاشنا چاہ رہی تھی، وہ اس کے قریب پہنچ رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ کی دنیا پوری شد و مد کے ساتھ زیر و زبر ہو رہی تھی۔

نہ جانے پھر کیا ہوا...... وہ کسی انجانی ڈور سے بندھی اس نوجوان مجذوب کے پیچھے چل پڑی۔ وہ دروازے سے باہر نکلا تو وہ بھی اس کے پیچھے باہر آ گئی۔ سانول شاہ سڑک کی طرف جاتا دکھائی دیا تو وہ بھی کار میں آ کر بیٹھ گئی۔ سانول سڑک کے کنارے جا پہنچا تھا، وہاں اس کے ساتھ وہی کچھ ہوا جو ہر روز ہی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ یعنی نہ اسے کوئی چنگ چی والا بٹھاتا نہ ہی لاری والا...... مہرو بغور یہ سب دیکھتی اور سوچتی رہی تھی۔ گرمی اور دھوپ سے لوگوں کا برا حال ہو رہا تھا۔ ''العطش...... العطش'' کی سی پکار مچی ہوئی تھی۔ اس کی کار ٹریفک کی بھیڑ بھاڑ میں کھڑی تھی، جس کی وجہ سے وہ اس کے قریب ہونے کے باوجود...... اسے دیکھ نہیں پایا تھا۔ ایک خیال آیا تھا مہرو کو کہ وہاں سے اپنی کار میں چھوڑ دے مگر پھر جانے کیوں وہ ایسا نہ کر سکی، بس خاموشی سے یہ تماشا دیکھتی رہی۔ اس کے بعد جب اس نے اسے ایک بھری پری مسافر لاری کے پچھلے جنگلے پر لٹکتے دیکھا تو اس نے پرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس کے جی میں تو آئی کہ وہ آگے بڑھ کر اسے اپنی کار میں بٹھا لے مگر کچھ سوچ کر وہ ایسا نہ کر سکی۔ وہ خود سے پوچھنے لگی کہ وہ آخر اسے کیوں پرکھنا چاہتی ہے؟ وہ اس میں کیا دیکھنے کی متمنی ہے؟ سچائی یا کوئی ریا......؟ مگر کیوں؟ کیا وہ خود کہیں کسی بڑے فیصلے کے مقام سے تو نہیں گزر رہی ہے؟ یا پھر وہ ابھی تک اس ڈرامے کا ڈراپ سین کرنے کو تیار بیٹھی تھی؟ کیا ابھی تک وہ اس کی سچائی سے سیر نہیں ہوئی تھی اور کیا دیکھنا چاہتی تھی؟

لاری روانہ ہوئی تو اس نے بھی اس کے تعاقب میں اپنی کار آگے بڑھا لی۔ حتیٰ کہ وہ اس کے تعاقب میں بابا جھیل شاہ کی درگاہ تک جا پہنچی۔ سانول کو ابھی تک اس کا نہیں پتا چلا تھا کہ وہ اس کے پیچھے یہاں تک چلی آئی تھی۔ سانول درگاہ کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ مہرو کی کار درگاہ کے دروازے سے ذرا پرے کھڑی تھی۔ اس کی کار میں ائر کنڈیشن آن تھا، وہ کار سے باہر چلچلاتی دھوپ اور گرمی کے سوا کچھ نہ تھا، ہاں

اس کے وہ کار سے نیچے اتر آئی تھی۔

گرم لو کے تھپیڑوں نے اس کا استقبال کیا اور اسے اپنا نازک سا کومل چہرہ اس بادِ سموم میں بری طرح جھلستا ہوا محسوس ہونے لگا...... مگر اس نے کوئی پروا نہ کی، کار سے اترنے کے بعد تو اس کی متلاشی نگاہیں درگاہ کے اس دروازے پر جمی رہ گئی تھیں جس سے گزر کر سانول اندر داخل ہوا تھا۔ مہرو چند ثانیے کھڑی سوتی بن گئی۔ وہ یہاں کیوں چلی آئی تھی؟ وہ بھی محض ایک عام سے فقیر منش لڑکے کے تعاقب میں...... کیا رشتہ تھا اس کا سانول کے ساتھ؟ مہرو کو اپنی حیثیت کا بھی لحاظ کالگا، وہ ایک بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ ایک جاگیردار اور معتبر گھرانے سے تعلق تھا اس کا۔ پھر جانے کیا ہوا۔ اس کے قدم کشاں کشاں درگاہ کے دروازے کی طرف اٹھنے لگے۔

قریب پہنچی تو ٹھٹک کر رک گئی۔ درگاہ کے دروازے کی کھلی چوکھٹ سے ہی اسے اندر کھلے صحن کا منظر نظر آنے لگا تھا، جس کے وسط میں پیپل کے ایک گھنے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں تلے دری پر بہت سے لوگ بیٹھے تھے اور سانول کی طرف دیکھ کر اپنے ہاتھ جوڑے اسے ”سائیں شاہ آیا...... سائیں شاہ آیا......“ کہہ کر پکار رہے تھے۔ اس نے سانول کو ان سے بہ آوازِ بلند یہ کہتے سنا۔

”میں یہاں کا ایک عام فقیر ہوں۔ ایک مجاور...... اور ایک گناہ گار بھی...... اللہ سائیں کی عبادت کرتا ہوں۔ یہاں مجھے روحانی سکون ملتا ہے، اسی لیے میں یہاں رہتا ہوں اور بس...... تم بھی یہی کیا کرو اور ایک دوسرے کا دل مت دکھایا کرو...... ہمارے مرشد سائیں جلیل شاہ کا بھی یہی فرمان تھا۔ اللہ سائیں بڑا مسبب الاسباب ہے اور وہی سب کا حاجت روا ہے۔“

ایک مجہول سے خستہ حال شخص نے اس سے بڑی لجاجت سے کہا۔ ”سائیں! اللہ ہمیں بھی عبادت کی توفیق دے۔ پر آپ لوگوں کی بات تو اور ہوتی ہے نا...... ہمارے لیے بھی دعا کیا کرو سائیں! ہمارے بیڑے پار ہو جائیں...... ہماری مصیبتیں، پریشانیاں اور دکھ درد دور ہو جائیں۔“

”ایک انسان ہونے کے ناتے ہم سب کا فرض ہے کہ کسی کو دکھ اور پریشانی میں دیکھیں تو اس کے لیے اللہ سائیں سے بہتری کی دعا کیا کریں۔ آخر کو ہم ایک دوسرے کو بھی دعا کے لیے کہتے ہیں، ہیں نا...... پھر ہمیں اپنے لیے دعا مانگنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔ میں بھی تم لوگوں کے لیے دعائیں کرتا ہوں اور اپنے لیے بھی......“

سانول نے ایک جذب کی سی کیفیت میں کہا۔ ایک دوسرا بولا۔ ”سائیں! کیسی عجیب بات ہے کہ ہم یہاں آتے ہیں اور آپ ہمیں دھتکار دیتے ہو۔ ہم مایوس لوٹ جاتے ہیں مگر حیرت انگیز طور پر تھوڑے دنوں بعد ہی ہماری تمام حاجتیں پوری ہو چکی ہوتی ہیں۔“ اس آدمی کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ درگاہ کے پیپل والے صحن میں سائیں شاہ زندہ باد کے نعرے گونجنے لگے مگر سانول نے سختی کے ساتھ انہیں ایسا بولنے سے روک دیا۔ دروازے پر کھڑی مہرو کے چہرے پر ہی نہیں بلکہ لبوں پر بھی عجیب سا ارتعاش امڈ آیا تھا۔

شور ایک دم تھم گیا تھا۔ مہرو ہنوز دروازے پر کھڑی تھی، ابھی تک کسی کی اس پر نگاہ نہیں پڑی تھی۔ درگاہ کا بڑا مجاور سخی لعل بھی وہاں موجود تھا مگر وہ ایک طرف خاموش کھڑا تھا۔ سانول اپنے حجرے کی طرف بڑھ گیا تو سخی لعل نے سب کو وہاں سے جانے کا کہا۔ لوگ نذر و نیاز ڈال کر جانے لگے۔ مہرو ایک طرف کھڑی ہو گئی تھی۔ جو لوگ مہرو کو گوٹھ کے جاگیردار رئیس ہنگل خان کی بیٹی کی حیثیت سے جانتے تھے، انہوں نے فوراً اپنا سر جھکا کر اسے سلام پیش کیا تھا اور آگے نکلتے چلے گئے تھے۔

صحن اب دھوپ اور گرمی سے تپ رہا تھا۔ وہاں اب کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ مہرو کو اس حجرے سے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ کچھ اور آگے بڑھی۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ سخی لعل اس سے کہہ رہا تھا۔

”یہ لوگ تم سے عقیدت رکھتے ہیں چھوکرا! تمہیں ان کی باتیں سن لینی چاہئیں۔“

”ایک انسان ہونے کے ناتے یہ مجھ سے محبت کریں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا مگر یہ مجھ سے عقیدت کس بات کی رکھتے ہیں؟“

”تم اللہ والے اور نیک بندے ہو، کوئی تمہیں تکلیف پہنچائے بھی تو تم اس کے لیے دعائیہ کلمات منہ سے نکالتے ہو۔ آج کے دور میں تو کوئی کسی کو ذرا سا تیوری چڑھا کر بھی گھور لے تو دوسرا اسے کھانے کو دوڑ پڑتا ہے۔“

”میں وہی کرتا ہوں، جو ہر انسان کو کرنا چاہیے...... یہ تو ایک عام سی بات ہے۔“ سانول یہ کہہ کر اپنے حجرے کی طرف بڑھ گیا۔ سخی لعل اسے گھور کر رہ گیا۔ وہ یہی کر سکتا تھا، اس میں کبھی اتنی جرأت نہیں ہوئی تھی کہ وہ سانول سے زیادہ سخت زبان استعمال کرتا یا اسے برا بھلا کہتا۔ حالانکہ ابتدا میں جب سانول نے یہاں آنا شروع کیا تھا تو وہ اس کے ساتھ اس طرح برتاؤ کرتا تھا جیسے وہ اس کا نوکر ہو۔ سانول اس کی ہر اونچ نیچ اور تلخ گوئی خاموشی سے سن لیا کرتا تھا۔ سانول

یہاں جھاڑو لگاتا تھا، نماز پڑھتا تھا اور پھر صحن میں ہی پڑ کر سو جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ لوگ پہلے اسے مستانہ (پاگل) سمجھنے لگے مگر پھر اسے ایک نیک اور سادہ لوح...... اس کے بعد اسے پہنچا ہوا تصور کرنے لگے تو سخی لعل نے بھی اس کے ساتھ اپنا رویہ بدل لیا۔ اس ڈر سے کہ لوگ اس کا برا ہی نہ منالیں اور یہاں آنا چھوڑ دیں۔ آئیں گے نہیں تو نذر و نیاز کا سلسلہ بند ہو جانے کا ڈر تھا۔

دروازے کے قریب کھڑی مہرو یہ سب دیکھ رہی تھی۔ وہ اس بار بھی اس نوجوان سانول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ وہ اندر صحن میں آئی تو سخی لعل ہی کی نگاہ اس پر پڑی تھی۔ سخی لعل اسے دیکھ کر پہلے تو گنگ سا ہو کر رہ گیا، کیونکہ وہ بھی اسے رئیس بنگل خان کی بیٹی کی حیثیت سے جانتا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اتنے بڑے باپ کی بیٹی یہاں بھی آسکتی ہے۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ مہرو یہاں زیارت کے لیے آئی ہے اور اب ضرور کوئی بڑا اندرانہ دے کر ہی جائے گی۔

''بب...... بی بی جی! آ...... آپ...... بھھ...... بھلی کری آیو...... بی بی جی!''

''سانول تمہارا کیا لگتا ہے؟'' مہرو نے سرد سے لہجے میں اس سے پوچھا۔ اس کی نگاہیں بار بار اسی حجرے کی طرف اٹھ رہی تھیں جہاں سانول گیا تھا۔ اب وہاں روشنی ہوگئی تھی۔ اسے لکڑی کے ٹیڑھے میڑھے اور بدنما سے ریک بنے نظر آرہے تھے، جن میں کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس کا ذہن تیزی سے کچھ سوچنے میں بھی محو تھا۔

''وہ......وہ جی بی بی جی! ام...... میرا کچھ نہیں لگتا...... بس! ادھر رہتا ہے اور عبادت کرتا ہے۔'' سخی لعل گھبرایا ہوا تھا اور مہرو کے رعب کا بری طرح شکار تھا۔

''کیا وہ یہاں تعویذ گنڈے کرتا ہے؟'' مہرو نے اس کی طرف دیکھ کر بھویں اچکا کر پوچھا۔

سخی لعل نے فوراً سوچا۔ شاید یہ سانول کی شہرت سن کر آئی ہے، ضرور کوئی تعویذ ہی لینے آئی ہوگی اور اس کے بدلے میں بہت سا نذرانہ بھی دے سکتی ہے۔ اس نے فوراً اثبات میں جواب دے کر جھوٹ بول دیا۔

''کون ہے باہر، سخی لعل! اس طرح ڈر ڈر کے تم کس سے بات کر رہے ہو؟ یہاں تو صرف اللہ کا خوف کرنے والوں کی جگہ ہے......'' اچانک اندر سے سانول شاہ کی پر جلال سی آواز ابھری۔ جبکہ سخی لعل کے جھوٹ پر مہرو کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری تھی۔ تو آج میں نے اس کا بہروپ پکڑ لیا مگر وہ کچھ الجھی ہوئی بھی تھی۔ کیونکہ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی سانول کا رویہ آئے ہوئے سائلین سے ملاحظہ کر چکی تھی۔ اس نے کسی کو کوئی بھی تعویذ وغیرہ نہیں دیا تھا۔ یہ یاد آتے ہی اس نے بڑے مجاور...... کا جھوٹ پکڑ لیا، اس کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے بولی۔

''مگر ابھی تھوڑی دیر پہلے تو سانول نے کسی سے بات کرنا بھی گوارا نہ کیا تھا، تعویذ دینا تو دور کی بات ہے۔'' سخی لعل گڑبڑا سا گیا۔ ایک وڈیرازادی سے جھوٹ بولنا اسے مہنگا پڑ سکتا تھا مگر تھا وہ بھی چالاک، یکدم بات بناتے ہوئے بولا۔

''وہ بی بی جی! اللہ لوکی بندے ہیں، اپنے موڈ سے چلتے ہیں۔''

اثنائے راہ...... سانول بھی ان کے باتیں کرنے کی آوازوں پر اپنے حجرے سے باہر نکل آیا اور پھر صحن میں کھڑی مہرو کو دیکھ کر وہ بھی ایک لمحے کے لیے گنگ سا ہو کر رہ گیا مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس کے ہونٹوں پہ آسودہ سی مسکراہٹ ابھری اور وہ اسی لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''مہرو...... تم یہاں...... کیا مجھ سے کوئی کام ہے تمہیں؟''

ادھر سخی لعل نے جو سانول کو رئیس بنگل خان کی لاڈلی بیٹی سے اس طرح مخاطب ہوتے دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ اسے خیال تھا کہ مہرو اس انداز تخاطب پر بری طرح ناراض ہو جائے گی اور اب ان دونوں کی خیر نہیں۔

''تم سے بھلا مجھے کیا کام ہوگا؟'' اس نے روکھے طنز سے جواب دیا۔ ''میں تو یہاں عام لوگوں کی طرح اس درگاہ کی زیارت کرنے آئی ہوں۔''

''اچھی بات ہے، کرلو زیارت۔'' سانول نے کہا اور مہرو اس کے حجرے کی طرف بڑھنے لگی تو سانول نے کہا۔

''مقبرہ وہاں نہیں، یہاں ہے......'' اس نے سیدھے ہاتھ کی طرف ایک مقبرے کی جانب اشارہ کیا، جس پر رنگین چادریں اور پھول چڑھے ہوئے تھے۔

''میں اس طرف بھی آتی ہوں۔'' مہرو نے ایک ذرا گردن موڑ کر کہا اور حجرے میں داخل ہوگئی۔ سخی لعل کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا تھا؟

مہرو حجرے کے اندر آئی تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ادب، شاعری اور صوفیانہ کلام سے حجرہ بھرا پڑا تھا۔ ایک جانب بلب روشن تھا (کیونکہ اندر اندھیرا سا تھا) وہ ایک ایک کتاب کو اٹھا کر دیکھنے لگی۔ ان میں شاہ جو رسالو، سچل کی شاعری اور صوفیانہ کلام اور تصوف پر لکھی ہوئی کتابیں شامل تھیں۔

''تم نے سب پڑھ رکھی ہیں؟'' مہرو نے قدرے

حیرانی سے سانول سے پوچھا جو اس کے پیچھے چلتا ہوا اندر داخل ہو چکا تھا۔

''ہاں! اور بار بار پڑھتا ہوں۔''

''میں ایک کتاب لے جاؤں؟''

''لے جاؤ مگر پڑھ کر واپس لوٹانا ہوگی۔''

''لوٹا دوں گی، فکر نہ کرو...... ایک بات بتاؤ گے؟''

''ہاں! کیوں نہیں......'' سانول نے اس بار پُراشتیاق سی نظروں سے مہرو کے حسین و دلکش چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

''تم ہو کون......؟''

''تمہیں کسی قسم کا شک ہے مجھ پر......؟'' سانول نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں!'' مہرو نے اثبات میں سر ہلایا۔

''مجھے تمہاری صاف گوئی اچھی لگی۔'' سانول نے دھیرے سے مسکرا کر کہا۔

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟'' مہرو نے اپنا سوال دہرایا تو سانول بولا۔

''میں ایک عام سا غریب انسان ہوں...... بلکہ بیمار بھی...... یہاں میں سکون حاصل کرنے آتا ہوں۔ اللہ سائیں کی عبادت کرتا ہوں اور مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔ میں شفا پا جاتا ہوں۔''

''کیا بیماری ہے تمہیں......؟'' مہرو نے اپنی گھنیری پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

بیماری دل ہے یہ نہ پوچھ
کیا گزری اس پہ، نہ پوچھ......

سانول نے آنکھیں موند کر جیسے دل کی عمیق گہرائیوں تلے ایک شعر گنگنا دیا۔

''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے تم ناٹک کرتے ہو...... مگر میرا دل کہتا ہے کہ میں غلط سمجھ رہی ہوں تمہیں......'' مہرو اس کے شعروں کے بول کے معنی سمجھتے ہوئے بولی۔ اس کے دل میں تھرتھراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس نوجوان کے سامنے بے بس ہو جائے گی۔

''جو تمہارا دل کہتا ہے وہی سچ ہے، کیونکہ دل جھوٹ نہیں بولتا۔'' سانول نے کہا پھر فوراً ہی دوبارہ بولا۔

''مہرو......! آپ جیئل شاہ کی قبر پر دعا یا فاتحہ پڑھ کر چلی جائیں......'' معاً ہی سانول نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''جو آپ کو یاد نہیں ہے، اسے یاد کرنے کی کوشش بھی نہ کریں تو اچھا ہی ہے۔ مجھے یاد رہا وہ سب کچھ اور اب اسے بھلانے کے لیے یہاں پناہ لیے ہوئے ہوں۔ مجھ سے غلطی ہو گئی جو راز آج تک چھپا رہا تھا اسے چھپا ہی رہنا چاہیے تھا۔''

یہ کہہ کر سانول نے اپنی سیاہ گھنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور آگے بولا۔

''میری عبادت کا وقت ہو رہا ہے...... میں سامنے والی مسجد میں جا رہا ہوں......'' سانول یہ کہہ کر چلا گیا۔ مہرو کو اس کا لہجہ ہی نہیں آواز بھی شدتِ کرب سے ڈوبی ڈوبی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ کچھ سوچ کر واپس چلی آئی۔ بھٹائی نگر پہنچ کر وہ ایک بار پھر اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔

''اف میرے خدا! میں آخر کیوں اس غریب سے فقیر منش لڑکے میں اتنی دلچسپی لینے لگی ہوں؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔ اس کے سچ میں ایک کرب ناک سی حقیقت پنہاں محسوس ہوتی ہے مگر مجھے اس سے کیا لینا دینا...... میرے اور اس کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔

وہ خود کو تسلیاں دینے لگی...... ایک بات طے تھی، جس کی گواہی اس کا دل بھی دیتا تھا کہ سانول کا یہ بیراگوں والا روپ اسی کی وجہ سے ہے۔ اس کے بعد وہ سو گئی۔

☆☆☆

صفدر اور حیا، ٹیرس پر کرسیاں ڈالے شام کی چائے پی رہے تھے۔ جامشورو میں چاہے کتنی ہی گرمی پڑتی ہو مگر یہاں کی شام میں چلنے والی ٹھنڈی ہوائیں بھی مشہور ہیں۔ وہ دونوں میاں بیوی اس وقت اسی ٹھنڈی ہواؤں سے لطف اندوز ہو رہے تھے مگر صفدر نے دیکھا کہ حیا کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ اپنی خوبصورت بیوی سے بہت محبت کرتا تھا۔ اسے دکھی یا اداس نہیں دیکھ سکتا تھا، اگرچہ وہ اس کے دکھ اور اس کے اندر کے احساس محرومی سے اچھی طرح واقف تھا مگر بار بار وہ اس کا ذکر کر کے اس میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جب بھی اسے کھویا کھویا محسوس کرتا تو اس کا دھیان ادھر ادھر کی باتوں میں لگانے کی کوشش کرتا تھا۔

''لگتا ہے تمہارا یہاں دل لگ گیا ہے؟'' اس نے مسکرا کر حیا کے چہرے پر محبت پاش نظریں ڈالیں۔

''دل کا سکون سے تعلق ہوتا ہے صفدر! جگہیں یا مکانات تبدیل کرنے سے نہیں......'' حیا نے اسی طرح کھوئے کھوئے سے لہجے میں جواب دیا۔ اس کی آنکھوں کی اداسی شام کے ڈھلتے سائے کی طرح گہری ہونے لگی

تھی۔ صفدر کو اب اس کی اداسی سے کوفت بھی ہوتی تھی مگر وہ اپنی بیوی سے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کرتا تھا، جس سے غصے یا بیزاری کا اظہار ہوتا ہو...... اسی لیے وہ دل لبھانے والی مسکراہٹ سے بولا۔

''حیا جان! کیا میرے ساتھ بھی تم بے سکون رہتی ہو؟''

''ہرگز نہیں......'' وہ یکدم شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ کا ساتھ ہی تو میرا سہارا اور امید ہے مگر جب آپ نہیں ہوتے ہیں نا...... پھر اندر کی اداسی مجھے مار ڈالتی ہے۔''

''اسی لیے تو اب میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ رات گئے گھر لوٹنے کے بجائے، اب شام سے پہلے پہلے ہی گھر آجایا کروں گا۔'' صفدر نے جیسے اسے خوش خبری سنادی اور حیا کا چہرہ بھی واقعی خوشی سے کھل اٹھا اور وہ بدستور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیا سچ کہہ رہے ہیں آپ......؟ کیا واقعی آپ اب شام سے پہلے ہی گھر لوٹ آیا کریں گے؟''

''ہاں! سچ کہہ رہا ہوں، بھلا تم سے میں جھوٹ بول سکتا ہوں......'' اس نے محبت پاش نظروں سے حیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور حیا پورے دل سے، سکون کے ساتھ مسکرادی۔ صفدر کو بھی طمانیت ہوئی۔

''تمہاری ایک اور خواہش بھی میں پوری کرنے کی کوشش میں مصروف ہوں۔ ان شاء اللہ تم بہت جلد اس سلسلے میں بھی خوش خبری سنوگی۔'' صفدر نے کہا۔

''اچھا! وہ کونسی؟'' حیا بولی اور پھر جیسے اچانک اسے یاد آیا۔ ''اوہو...... ہاں! میں نے آپ سے مائی بخشاں والی بات کہی تھی...... اس کا کیا بنا؟''

''اسی کی تو بات کر رہا ہوں میں تم سے......'' صفدر نے مسکرا کر کہا اور پھر اسے اس نوجوان مجذوب لڑکے سانول کے بارے میں بتادیا۔

حیا کو صفدر کی بات پر تسلی ہوگئی۔ اسے اپنی خوش قسمتی پر ناز بھی ہوتا تھا کہ اسے صفدر جیسا محبت کرنے والا اور اس کی ہر خواہش پوری کرنے والا شوہر ملا تھا۔ بس، اپنی خالی گود دیکھ کر اسے احساسِ محرومی ستانے لگتا تھا۔ وہ خود بھی چاہتی تھی کہ صفدر اس سے اتنی بے لوث محبت کرتا ہے مگر وہ اب تک اسے اپنی محبت کی کوئی نشانی بھی نہ دے سکی تھی۔ یہی سوچ کر اس کا چہرہ پھر اداس ہو جاتا۔

''کیا ہوا حیا جان...... کیا تمہاری تسلی نہیں ہوئی یہ سن کر؟'' صفدر نے ایک دم اس کا چہرہ اترتا دیکھ کر کہا۔ وہ حیا کو پیار سے ''حیا جان'' ہی کہتا تھا۔

''یہ بات نہیں صفی!'' حیا ایک گہرا سانس لے کر بولی۔ ''بس، کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ آپ مجھ سے کس قدر بے غرض محبت کرتے ہیں اور ایک میں ہوں کہ آپ کو ایک بچے کا تحفہ تک نہ دے سکی۔''

''مجھے تم سے کسی تحفے کی غرض نہیں ہے، بس تم ہو میرے لیے یہی بہت ہے اور پھر اس میں تمہارا کیا قصور ہے بھلا؟ یہ تو تقدیر کے کھیل ہیں، اللہ جب چاہے گا ہمارے آنگن میں بھی کوئی پھول کھلا دے گا۔ نہیں، تو شکر ہے اس مولائے کریم کا کہ ہم دونوں کا ساتھ تو قائم ہے نا......! مگر پلیز تم دکھی نہ ہوا کرو......''

صفدر نے دل کی گہرائیوں اور محبت سے لبریز لہجے میں اس سے کہا اور ساتھ ہی اپنی کرسی چھوڑ کر حیا کی کرسی کے پاس آگیا اور بڑی محبت سے اس کا کاندھا تھپتھپانے لگا۔ حیا نے بھی اپنایت سے اپنا چہرہ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے اپنے نرم وگداز لبوں کا بوسہ دے دیا۔

☆☆☆

سیاہ رنگ کی ٹربوانٹر کولر حیدرآباد جانے والی مین روڈ سے دائیں جانب ایک ذیلی سڑک پر مڑی اور ایک بار پھر اس کی رفتار تیز ہوگئی۔ یہ سڑک نسبتاً چھوٹی مگر پختہ تھی اور اس کی حالت دیکھ کر لگتا تھا کہ یہ حال ہی میں پختہ کی گئی تھی اور حقیقت بھی یہی تھی کہ اس سے پہلے یہاں دھول اڑاتا بل کھاتا کچا راستہ تھا۔

مذکورہ سڑک کے موڑ پر ہی گوٹھ ستی ڈیرا کا سائن بورڈ لگا ہوا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی آبادی کے آثار بھی نمودار ہونے لگے۔ اس سڑک سے ٹیڑھے میڑھے کچے راستے آبادی کی طرف بھی نکلتے تھے، جبکہ یہ پختہ سڑک سیدھی ایک بلند وبالا اور سرخ پتھروں سے بنی حویلی کے دیوہیکل چوبی گیٹ کے سامنے اختتام پذیر ہوتی تھی۔ گاڑی کو دیکھتے ہی وہاں موجود دو مسلح اجرک پوش محافظوں نے گیٹ کھول دیا۔ گاڑی اندر داخل ہوگئی اور وسیع وعریض احاطے کے ایک طرف، جہاں ایک نئے ماڈل کی ٹویوٹا کرولا اور ایک جیپ کھڑی تھی، ان کے قریب جاکر رک گئی۔

گاڑی کے رکتے ہی اس کے اندر سے دو گن بردار اجرک پوش پھرتی سے اترے اور انہوں نے پچھلی سیٹوں کے دروازے کھول کر سر جھکا دیے۔ اندر سے دو خواتین برآمد ہوئی تھیں۔ ایک رئیس ہنگل خان کی بیوی حاکم زادی تھی اور دوسری اس کی بیٹی مہر زادی تھی۔ دونوں حویلی کے خوبصورت

محراب والے دروازے کی جانب بڑھ گئیں۔حویلی کے اندر سے بھی ایک ادھیڑعمر خداموں کا جوڑا برآمد ہوا تھا اور ہاتھ باندھے ایک طرف کھڑا ہو گیا تھا۔

دونوں ماں بیٹیاں اک شانِ بے نیازی سے چلتی ہوئی حویلی کے اندرداخل ہوگئیں اور ایک بلند چھت والے ہال کمرے سے ہوتی ہوئی ایک اور دوسرے کمرے میں آگئیں۔یہ ان کی نشست گاہ تھی، جو خاصی کشادہ اور آرام دہ تھی۔یہاں کا فرنیچر نہایت اعلیٰ لکڑی کا بنا ہوا تھا۔فرش پر دبیز قالین اور دیواروں پر خاندان کے پرکھوں کی رعونت آمیز تصاویر آویزاں نظر آتی تھیں۔ایک دیوار پر مارخور اور گورکھ ہل میں پائے جانے والے آئی بیکس کے بڑے بڑے سینگوں والے حنوط شدہ سر بھی نصب کیے ہوئے تھے۔چیتے اور شیروں کی کھالوں کو بھی ان کی کھوپڑیوں سمیت چسپاں کیا گیا تھا۔ان شکاری درندوں کے حنوط شدہ سروں کے خوفناک جبڑے چنگھاڑنے والے انداز میں کھلے رکھے گئے تھے، جہاں سے ان کے بڑے بڑے نکیلے شکاری دانت دیکھ کر ہی دلوں پر ہیبت سی طاری ہونے لگتی تھی۔

کمرے میں اے سی آن تھا۔بڑی سکون پرور فضا تھی۔ادھیڑعمر جوڑے نے ان کے لیے ٹھنڈے پانی اور مشروبات...... ایک نفیس قسم کی ٹرالی میں سجا کر ان کے آگے کھسکا دی تھی۔مہرو نے مشروب پیا اور اس کی ماں حاکم زادی پانی پینے لگی۔

”رئیس کہاں ہیں؟“

پانی پینے کے بعد کانچ کا گلاس سامنے ٹرالی پر دھرتے ہوئے حاکم زادی نے قریب کھڑی ملازمہ سے پوچھا۔لہجہ بارعب تھا۔

”وہ جی بڑے رئیس سائیں اوطاق میں ہیں۔اچانک کوئی مہمان آگئے تھے۔“ ملازمہ نے احترام سے جواب دیا۔

”کب تک فارغ ہوجائیں گے......؟“ حاکم زادی نے پوچھا تو وہ ساتھ کھڑے اپنے شوہر کی طرف دیکھنے لگی، اس کا نام پریل تھا۔وہ جھٹ سے بولا۔

”بی بی جی! سائیں بھوتاران سے باتوں میں مصروف ہیں۔آپ کہیں تو میں اوطاق کا ایک چکر لگا کر معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”نہیں، رہنے دو۔میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں، وہ فارغ ہوجائیں تو مجھے آکر بتا دینا۔“ حاکم زادی نے کہا تو پریل نے مؤدبانہ انداز میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے تعظیم پیش کی۔اس کے بعد دونوں ماں بیٹیاں وہاں

سے اٹھ گئیں اور اپنے اپنے کمروں کا رخ کیا۔

حاکم زادی اپنی شاہانہ طرز کی خواب گاہ میں آکر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ وہ ناقدانہ نظروں سے اپنے سراپا کا جائزہ لے رہی تھی۔ چالیس، پینتالیس کے پیٹے میں بھی وہ کم خوبرو نہیں تھی۔ جسم تھوڑا بھاری ہوگیا تھا مگر اس میں بھی ایک حسن انگیز کشش نمایاں تھی۔ آرام طلبی اور خوش خوراکی کے باوصف اس نے اپنے جسمانی خدوخال کا خیال رکھا تھا۔ وہ دو جوان بچوں کی ماں نہیں لگتی تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ بنگل خان سے اس کی شادی بہت چھوٹی عمر میں ہوگئی تھی۔ حاکم زادی خود بھی ایک کھاتے پیتے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور اس کا آبائی شہر نواب شاہ تھا۔ اپنی انہی جسمانی خصوصیات اور حسن دل آویز کے باعث۔ شاید رئیس بنگل خان کو ابھی تک اس نے اپنا اسیر بنا رکھا تھا اور حقیقت بھی یہی تھی کہ رئیس بنگل خان کی حاکم زادی کے ساتھ جواں سال چلی آرہی تھی۔ وہ ہر وقت بنی ٹھنی رہتی تھی، تاکہ اس کا شوہر اس کی زلفوں سے بندھا رہے اور دوسری شادی کا خیال تک دل میں نہ لائے اور ابھی تک ایسا ہی تھا۔ اسے مردوں کو قابو کرنے کے سارے گر آتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ وہ بیٹی کے بہانے اکثر تھوڑے دنوں کے لیے شہر بھٹائی نگر والی کوٹھی میں گزارا آیا کرتی تھی۔ بڑوں سے اس نے سن رکھا تھا کہ زیادہ قربت کے ساتھ تھوڑی دوری بھی مرد کو باندھے رکھتی ہے۔

قدِ آدم آئینے میں اپنا ناقدانہ جائزہ لینے اور ایک پر غرور سی مسکراہٹ سے اپنے پرکشش سراپا کو نوازنے کے بعد جب وہ پلٹی تو اسی ادھیڑ عمر خادمہ نے آکر اسے رئیس کی واپسی کی اطلاع دی۔

''تم چلو، میں آتی ہوں......'' اس نے بارعب لہجے میں کہا تو خادمہ الٹے پاؤں لوٹ گئی۔

رئیس کی آمد سے اس کے دل میں ایک خیال آیا تھا کہ وہ اس کی آمد کا سن کر یہاں کیوں نہیں آئے؟ کیا اب بھی کوئی مہمان رئیس کے ساتھ ہے؟ اس نے سر جھٹکا اور ایک بار پھر وہ ڈریسنگ ٹیبل کے قریب آئی۔ ہلکے میک اپ کا ٹچ لیا، خوشبو لگائی اور سجی سجائی خواب گاہ سے نکل کر اسی کمرے میں آگئی جہاں تھوڑی دیر پہلے وہ اپنی بیٹی کے ساتھ موجود تھی۔

وہاں پہنچی تو چونک گئی۔ خلاف توقع اس نے رئیس کو غصے میں بھرا ہوا دیکھا۔ کہاں تو وہ ہمیشہ نرم اور میٹھی مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتے تھے، بلکہ حاکم زادی کی آمد کا سنتے ہی گویا کچے دھاگے سے بندھے ان کی ''تلاش'' میں خواب گاہ تک چلے آتے تھے مگر آج بالکل الٹ ہوگیا تھا۔

مہمانوں سے بھی آج خلافِ توقع جلد فارغ ہوگئے تھے۔

''اللہ سائیں آپ کے سر کی خیر کرے...... کیا ہوا سائیں! کیا کوئی جھگڑا ہوگیا ہے کسی کے ساتھ......؟'' حاکم زادی نے اندر قدم رکھتے ہی رئیس کی طرف دیکھ کر کہا تو سامنے کے صوفے پر بڑے ٹھسے کے ساتھ ہاتھ پاؤں پھیلائے بیٹھے رئیس بنگل خان نے بیوی کی آواز سن کر تیز اور پرتپش نظروں سے اسے گھورا...... حاکم زادی کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا...... ابھی جو تھوڑی دیر پہلے اس نے اپنے دل میں جو مان بڑھایا تھا، وہ سب ہوا ہونے لگا۔ پل کے پل ہی اس نے بھانپ لیا تھا کہ رئیس کی اس ناراضگی کا تعلق اسی سے تھا۔

''ادھر آؤ......'' رئیس نے بدستور اسی طرح اس کی طرف گھورتے ہوئے بیوی سے کہا تو حاکم زادی نے تب بھی آگے بڑھتے ہوئے محبت بھری مسکراہٹ کا ہتھیار ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور صوفے پر شوہر کے قریب بیٹھتے ہوئے اسی لہجے میں بولی۔

''خیریت؟ یہ آج اس کنیز پر اتنا غصہ کس بات کا......؟ محبت بھری مسکراہٹ سے استقبال کی جگہ یہ آگ...... کہیں ہم جل ہی نہ جائیں برہمی کی اس آگ میں۔ کوئی غلطی ہوگئی ہے ہم سے؟''

''یہ تم دونوں ماں بیٹے میرے خلاف کیا کھچڑی بناتے رہے ہو؟'' رئیس بنگل خان کا غصہ پھر بھی کم نہ ہوا تو حاکم زادی نے بھانپ لیا کہ معاملہ انا سے بڑھ کر ذات تک جا پہنچا ہے۔ پل کے پل اس نے سوچنا چاہا کہ آخر اس سے یا اس کے بیٹے مراد سے کیا غلطی ہوگئی ہوگی اور تب ہی اس کے اندر ایک جھماکا سا ہوا مگر تصدیق سے پہلے وہ کچھ یقین سے نہ سوچ پائی تو بولی۔

''میں اور آپ کے خلاف کوئی کھچڑی بناؤں؟ سائیں مان وارا......! ایسا ممکن ہی نہیں، رہی بات پٹ مراد کی تو اس سے نادانی میں کوئی غلطی ہوگئی ہو تو اس کی میں آپ سے معافی مانگ لیتی ہوں۔''

''حاکما! میری طرف دیکھو...... غور سے......'' رئیس بنگل خان نے اسی طرح جلالی لہجے میں بیوی سے کہا اور حاکم زادی جس کی نگاہیں پہلے ہی سے رئیس بنگل خان کے چہرے پر ہی جمی ہوئی تھیں، اسی طرح بیٹھی رہی۔ تاہم اس کا دل اندر سے بری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ بولا۔

''حاکما! تمہاری مجھ سے شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

رئیس کے اس سوال پر حاکم زادی کو اپنا حلق سوکھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس کے اندر کوئی چیخنے لگا تھا کہ رئیس کے ایسے سوالات پوچھنے کا مطلب معاملے کی حساسیت کو ظاہر کرتا تھا۔

''ج...... جی، سائیں! خیر سے آج پورے چھبیس سال، چھ ماہ اور بارہ دن......''

''ہم نے کبھی اپنے پالتو کتے کا بھی سودا کیا ہے آج تک؟ گھوڑا بھی ہمارا کام کا نہیں ہوتا تو ہم اسے گولی مار دیا کرتے ہیں۔ تم نے اور مراد خان نے کیسے یہ سمجھ لیا کہ ہم زمین کا ایک ٹکڑا بھی فروخت کر سکتے ہیں۔ کیا رئیس اعظم کے چشم و چراغ رئیس بنگل خان کی حیثیت اب یہ ہوگئی کہ لوگ اس پر ہنسیں کہ رئیس پر ایسا برا وقت آگیا ہے کہ وہ اپنے باپ داداؤں کی نشانی کو بیچنے پر مجبور ہوگیا ہے؟ جواب دو...... حاکما!''

رئیس کا جلال اور غصہ آسمان کو چھونے لگا۔ اریب قریب کے خدمت گار اور چاکر ''وڈے رئیس'' کے تیور دیکھ کر ادھر ادھر کھسک گئے تھے۔ ماحول گرم ہوگیا تھا اور وڈے رئیس کے جاہ و جلال سے حویلی کے در و بام لرزنے لگے تھے۔

''یہ ہماری غیرت کا معاملہ ہے اور جب بات غیرت کی ہو تو ہمیں کسی کی بھی پروا نہیں رہتی۔ مراد تو چلو ہمارا پٹ ہے، پر تم تو بیوی ہو۔ تمہیں تو اتنا عرصہ ہوا ہمارے ساتھ رہتے ہوئے۔ تم نے یہ کیسے سمجھ لیا تھا کہ ہم جمیل شاہ والی زمین کا سودا کر سکتے ہیں۔ ہم مر جائیں گے مگر یہ زمین نہیں بیچیں گے۔ چاہے اسے سیم و تھور ہی کیوں نہ کھالے۔ جواب دو مجھے حاکما! تم نے بیٹے کو یہ سب سمجھانے کے بجائے اسے اس راہ پر کیوں لگایا؟''

رئیس اپنی بات ختم کر کے چپ تو ہوگیا تھا مگر اس کا غیظ و غضب، بجائے کم ہونے کے فزوں تر ہونے لگا تھا۔ حاکم زادی نے جو یہ سنا تو اس کا ماتھا ٹھنک گیا۔ پہلے تو اسے حیرت ہوئی کہ اس کے بیٹے مراد نے تو نہیں باپ سے اس زمین کے سلسلے میں کہہ ڈالا ہے؟ مگر اس نے تو ابھی صرف مجھ سے بات کی تھی اور خود باپ سے ابھی کہنے کی یہ جرأت کہاں کر پایا تھا؟ پھر...... پھر کیسے رئیس کے کانوں تک یہ بات جا پہنچی تھی؟

بہرکیف...... اس نے سنبھالا لیتے ہوئے شوہر سے کہا۔ ''میرے سر کے سائیں! تمہارے سر کی قسم ہے، مجھے اپنے سہاگ کی قسم ہے۔ میں نے تو مراد پٹ کو ایسی کوئی پٹی نہیں پڑھائی تھی بلکہ اس نے ابھی تھوڑے دنوں پہلے خود ہی مجھے یہ بتایا تھا اور ساتھ ہی مجھ سے ضد کی تھی کہ میں آپ سے بات کر کے آپ کو رضامند کروں......''

بیوی کی اس بات نے رئیس کو مزید برافروختہ کر دیا اور اس نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے پہلو میں کرتے کے اندر بندھے ہولسٹر میں ڈالا اور جب دوبارہ برآمد ہوا تو اس کے ہاتھ میں سیاہ نال والا ایک خوفناک پستول نظر آرہا تھا۔ حاکم زادی شوہر کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔

''لو حاکما! یہ پستول لو اور میرے سینے میں گولی اتار کر میری لاش کو زمین کے اس ٹکڑے کو بیچنے پر رضامند کرلو............''

''نن...... نہیں سائیں! میرے منہ میں خاک...... آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، سچ وہی ہے جو میں نے آپ سے کہا ہے۔ میں نے تو پٹ مراد کو اپنی طرف سے سمجھا دیا تھا، آپ کہیں گے تو میں مزید اسے سمجھا دوں گی مگر اللہ سائیں کا واسطہ ہے آپ کو...... یہ پستول واپس رکھ لیں، ان ہتھیاروں کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا اور جوان پٹ کے سامنے ایسا مت کرنا۔'' حاکما نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ حالانکہ حاکم زادی نے اپنے بیٹے سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اس زمین کے ٹکڑے کو بیچنے کے لیے اپنے شوہر سے بات کرے گی مگر یہاں تو معاملہ ہی ایسا بگڑا تھا کہ اب تو وہ یہ بات شوہر سے کہنے کی بالکل بھی روادار نہیں رہی تھی۔

''تو پھر اپڑیں اس جوان پٹ کو سمجھا دے مجھ سے ایسی بات بھول کر بھی نہ کرے......'' یہ کہتے ہوئے رئیس نے پستول واپس اپنے بغلی ہولسٹر میں اڑس لیا۔ حاکم زادی جلدی سے اٹھی اور قریب دھری ٹرالی پر رکھے کانچ کے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور شوہر کی طرف بڑھا دیا۔

''لو پانی پی لو سائیں! اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا۔ آپ کا بلڈ پریشر پہلے ہی ہائی رہتا ہے۔''

رئیس نے پانی کا گلاس لیا اور چند گھونٹ بھر کے گلاس دوبارہ بیوی کے حوالے کر دیا۔

''سائیں! بس اب اس بات کو بھول جائیں اور میں تو حیران ہوں کہ ابھی تو میں نے یا پٹ مراد نے آپ سے ایسی کوئی بات تک نہیں کی، پھر آپ کو کیسے پتا چلا......؟'' حاکم زادی نے تھوڑی ہمت کرتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔ اسے اسی بات کا ہی تجسس ہو رہا تھا کہ آخر وہ بات اس کے شوہر کو بتا کیسے چلی جس کے بارے میں ابھی تک اس سے بات تک بھی نہیں کی گئی تھی؟

''اچھا ہی ہوا کہ نہیں کی۔'' رئیس کا پارہ اب آہستہ آہستہ اترنے لگا تھا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے زمیندار اللہ ورایو آیا تھا میرے

پاس۔‘‘ بالآخر وہ بتانے لگا اور حاکم زادی اس کی بات پر دھیان دینے لگی۔

’’اسی جلیل شاہ والی زمین کی بات کر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے خود پر قابو پائے رکھا تھا۔ مہمان بن کر آیا تھا اور ہماری اوطاق میں اگر دشمن بھی مہمان کی حیثیت سے قدم رکھ دے تو ہم سب کچھ بھلا دیتے ہیں، بس وہ ہماری اسی کمزوری سے کھیل گیا، ورنہ..........‘‘ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ پھر جلال میں آنے لگا تو حاکم زادی نے اسے بہلانا شروع کر دیا۔

’’چھوڑیں سائیں اب اس بات کو.....اپنی لاڈلی دھی (بیٹی) سے نہیں ملو گے؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ کا انتظار کر کے ہی اپنے کمرے میں گئی ہے۔ چلیں وہیں چلتے ہیں......‘‘

وہ رئیس کو بازو سے سہارا دینے لگی۔ اس کے دو گھنٹے بعد حاکم زادی اپنے سیل فون پر بیٹے مراد خان سے بات کر رہی تھی۔

’’یہ تم نے کیا بے وقوفی کر ڈالی پٹ؟ ابھی میں نے تمہارے پیو (باپ) سے بات بھی نہیں کی اور تم نے اس پھٹیچر زمیندار اللہ ورایو کو یہاں بھیج دیا......!‘‘

’’اوہو......اماں جانی! تو پھر کیا ہو گیا؟ وہ زمین کی بات کرنے ہی تو آیا تھا، کوئی ڈاکا مارنے تو نہیں آیا تھا جو بابا جانی اتنا گرم ہو گئے۔‘‘ مراد نے منہ بسورنے کے انداز میں جواب دیا تو ماں بولی۔

’’اچھا ہی ہوا کہ ڈاکا پڑ جاتا......‘‘ کہتے ہوئے ماں نے اسے ساری بات بتا دی اور آخر میں بیٹے کو خبردار کرتے ہوئے بولی۔

’’خبردار......! اب دوبارہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ تمہارے ساتھ میری بھی شامت آ جائے گی۔‘‘

’’تو کیا آپ بابا سے بات نہیں کریں گی اماں جانی؟‘‘

’’اب کہنے کو رہ ہی کیا گیا ہے پٹ مراد!‘‘ ماں بولی۔ ’’میں بات کرتی تو طریقے سلیقے سے کرتی، یا کسی دوسری صورت پہ رضامند کر لیتی رئیس کو مگر اب تمہاری جلد بازی کی وجہ سے سارا کام پہلے ہی خراب ہو چکا ہے۔ رئیس میری طرف سے بھی غلط فہمی میں پڑ گئے تھے۔ بڑی مشکلوں سے میں نے انہیں اور ان کے غصے کو سنبھالا، گولی چلنے کی دیر باقی رہ گئی تھی۔‘‘

’’تو پھر کیا اب آپ بات نہیں کریں گی بابا جانی سے؟‘‘ مراد نے مایوس ہو کر کہا۔

’’یہ بات کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا لیکن کوشش کروں گی کہ تمہیں پیسے دلوا دوں......‘‘

’’پیسے نہیں دیں گے وہ......یہ میں کر کے دیکھ چکا ہوں......‘‘ کہتے ہوئے مراد نے رابطہ ہی منقطع کر دیا اور ماں ......’’ہیلو......ہیلو......‘‘ کرتی رہ گئی۔

☆☆☆

’’ہماری بیٹی کی پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟‘‘

رات کے کھانے پر تینوں ڈائننگ ٹیبل پر اکٹھے ہوئے تو رئیس نے اپنی بیٹی مہرو سے پرشفیق لہجے میں پوچھا۔ مہرو دراصل تھوڑا آرام کی غرض سے لیٹ گئی تھی، اسی لیے باپ، بیٹی کی بات نہیں ہو سکی تھی۔

’’بہت اچھی جا رہی ہے بابا جانی! اب آخری سال رہ گیا ہے، امتحانات کی تیاری کر رہی ہوں۔‘‘

مہرو نے باپ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

’’بس! اب جلدی جلدی پڑھائی سے فارغ ہو جاؤ تو تمہارے بارے میں بھی سوچا جائے، بلکہ سوچنا کیا ہے...... سوچ ہی لیا ہے......‘‘ رئیس نے چاولوں کی ڈش کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تو مہرو باپ کی بات کا مطلب سمجھ کر چونک سی گئی۔ اس نے پریشان سی نگاہوں سے......ساتھ بیٹھی ماں کی طرف دیکھا تو ماں نے اسے کچھ نہ کہنے کا خفیف سا اشارہ کر دیا۔ تاہم اس نے بیٹی کو ابھی چند گھنٹے پہلے ہونے والی بدمزگی کے بارے میں بتا دیا تھا کہ اس کا باپ رئیس ایک معمولی سی بات پر کس قدر برافروختہ ہو گیا تھا اور بے اختیار ایسے میں وہ فقیر لڑکا سانول اس کے چشم تصور میں گھوم گیا تھا۔

وہ خاموشی سے سر جھکائے کھانا کھاتی رہی۔ کھانے کے بعد مہرو اپنے کمرے میں آ گئی۔ تھوڑی دیر تک میوزک سے دل بہلاتی رہی مگر دل میں عجیب سی ایک بے چینی گھر کیے ہوئے تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار سانول کا تصور اس کے دل و دماغ میں سمائے جا رہا تھا۔ مہرو نے بہت کوشش کی تھی کہ اس کے دل و دماغ میں سانول کی جو شخصیت کا پرتو آنے لگا ہے، اسے کسی طرح باطل قرار دے ڈالے۔ اس کے لیے اس نے کھوجنا بھی کی تھی مگر جیسے جیسے وہ اس کی کھوجنا کرتی، سانول کی شخصیت کی سچائی اور اس کا مجذوبوں والا روپ، بہروپ لگتا ہی نہیں تھا۔

کیوں......؟ وہ اس کیوں میں اس قدر دلچسپی لینے لگی تھی۔ اس لیے کہ وہ اس سے بڑے دھڑلے کے ساتھ محبت داری کا دعوے دار تھا۔ ایسی محبت جو اس نے اب سے نہیں بچپن سے اپنے دل کے خانۂ نہاں میں جاگزیں رکھی تھی۔

’’اتنا بڑا دعویٰ کرنے کے بعد پھر وہ پیچھے کیوں ہٹ

رہا تھا؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔

''میں تو سمجھی تھی کہ وہ ایسا مجھے متاثر کرنے کے لیے کہہ رہا تھا مگر نہیں، میں نے تو اس کے پیچھے جا کر بھی اس کا اصل روپ دیکھ لیا تھا...... اور پھر اس کے بعد اس کا رویہ مجھ سے ایک دم سرد ہو گیا تھا......''

مہرو سونے کے لیے لیٹی تو بھی سانول کی ذو معنی باتیں، اس کی شاعری اسے تڑپانے لگی۔ درحقیقت سانول کی شخصیت میں مہرو کو ایک انفرادی نوعیت کی کشش محسوس ہوئی تھی۔ وہ فقیر تھا مگر مانگنے والا فقیر نہیں، بلکہ دینے والا...... فقیر۔ اس نے اسے مانگتے ہوئے دیکھا ہی نہیں تھا۔

شاید مہرو کی کسوٹی پر سانول پورا اترا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اب اس کے بارے میں دل کی انتہا گہرائیوں اور گیرائیوں سمیت اسے سنجیدگی کے ساتھ سوچنے لگی تھی۔ تمام تر جمالیاتی تصور اور نسوانی وجدان کی سوجھ بوجھ سمیت...... وہ بلا کا خوبرو بھی تھا۔ دراز قد تھا۔ سینہ چوڑا اور آنکھیں بڑی بڑی اور روشن ...... وہ گندا...... نہیں رہتا تھا۔ جیسا کہ عام طور پر فقیر ہوا کرتے ہیں۔ بالوں میں خوب تیل چپڑا ہوتا۔ ڈاڑھی اور مونچھیں سلیقے سے ترشی ہوتی تھیں۔ کپڑے میلے نہیں ہوتے تھے اس کے جو اگرچہ پرانے ضرور ہوتے تھے۔ اس نے یہ بہروپ کیوں بھر رکھا تھا؟

وہ اسے کسی کسوٹی پر پرکھنا چاہتی تھی۔ مہرو کو پھر اس کی کھوج ہونے لگی اور رات گئے آنکھ لگنے تک بڑی شدت کے ساتھ ایک بار پھر اس سے ملنے کی خواہش اس کے دلِ بے قرار میں زور پکڑنے لگی۔

☆☆☆

سانول نے اب سندھیالوجی میوزیم جانا ترک کر دیا تھا۔ وہ تھوڑی پھاٹک جاتا، لاری اڈوں کے چکر لگاتا اور پھر شام سے پہلے ہی درگاہ میں آجاتا تھا۔ کسی نے اس کے کشکول میں کچھ ڈال دیا تو ٹھیک ورنہ وہ مانگتا نہیں تھا کسی سے۔ درگاہ آکر وہ خاموشی سے کشکول ایک طرف صحن کے کونے میں رکھ دیتا یا پھر ٹین کے ڈبے میں ڈال دیتا تھا۔ وہ اس روز بھی جلد ہی درگاہ لوٹ آیا۔

بڑا مجاور سخی لعل وہاں آئے ہوئے سائلین کے ساتھ ''مصروف'' تھا۔ ان کی تعداد اگرچہ گنتی کی ہی تھی۔ جسے بڑھانے کی وہ پچھلے پانچ برس سے کوشش کر رہا تھا مگر چند لوگوں سے آگے یہ تعداد نہیں کھسکی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس میں سارا قصور سانول کا تھا۔ وہ ان پر توجہ نہیں دیتا تھا اور جو سخی لعل چاہتا تھا، وہی سانول نہیں چاہتا تھا۔ تنگ آکر سخی لعل نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ اسے حیرت بھی تھی، اس درگاہ کا وہ سب سے پرانا مجاور تھا، جبکہ سانول کو تو یہاں آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے تھے مگر لوگ اس کی جگہ سانول سے متاثر نظر آتے تھے، اس لیے کہ وہ ان سے بے پروائی برتتا تھا۔ وہ اس کی کوئی توجیہہ نہ پیش کر سکا تھا، جبکہ وجہ سامنے تھی، جو سخی لعل جیسے تجربہ کار مجاور کو بھی نہیں سمجھ آسکی تھی۔

سانول نے سیدھا اپنے حجرے کا رخ کیا۔ لوگ جا چکے تھے۔ آج نذر و نیاز کے نام پر ٹین کے ٹیڑھے میڑھے ڈبے میں چند سکوں کے سوا کچھ نہیں جمع ہو سکا تھا۔

سخی لعل نے سوچا کہ اسے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کرے مگر پھر ڈرتا بھی تھا کہ کہیں سانول پہلے کی طرح یہاں سے کسی اور جگہ نہ چلا جائے اور جو تھوڑے بہت لوگ یہاں آتے تھے، وہ بھی آنا چھوڑ دیں۔ کیونکہ اس سے پہلے سخی لعل نے سانول کے ساتھ ذرا سخت لہجہ اختیار کیا تھا تو سانول چلا گیا تھا۔ بعد میں بڑی مشکل سے وہ اسے تلاش کر کے لایا تھا۔ یہ سوچ کر وہ ہر بار کی طرح اپنا ارادہ بدل دیتا تھا۔

سانول اس وقت حجرے میں جلتے بلب کی پھیکی پھیکی سی روشنی میں کتاب پڑھ رہا تھا۔ اسی وقت درگاہ کے باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز ابھری۔ سخی لعل چونکا اور اس کی آنکھوں میں خاص سی چمک ابھری۔ وہ اٹھ کر باہر کی طرف لپکا، جبکہ سانول کتاب پڑھنے میں محو رہا تھا۔ اس نے جیسے کوئی آواز سنی ہی نہیں تھی۔

''اوئے...... ملوک! باہر وہی صاحب آیا ہے جو اس دن تجھے یہاں اپنی کار میں بٹھا کر لایا تھا، جا باہر تیرا پوچھ رہا ہے وہ......'' تھوڑی دیر میں سخی لعل نے آکر اسے بتایا۔

سانول نے کتاب سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تھی، پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔

''مجھ سے ملنے آیا ہے...... کیوں؟''

''یہ تو اب وہی بتا سکتا ہے۔ جلدی کر بابا! مل لے اس سے جا کر، باہر ہی کھڑا ہے، تجھے بلا رہا ہے۔ پتا ہے اس روز وہ پورے پانسو (پانچ سو) دے کر گیا تھا۔''

سانول کو اس کی بات بری تو لگی تھی مگر وہ اس سے کچھ کہے بغیر اٹھ کر حجرے سے نکلا اور درگاہ کے دروازے سے نکل آیا۔ سامنے وہی خوش پوشاک آدمی جو بلاشبہ صفدر ہی تھا، اپنی کار کے پاس کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ سلام کے انداز میں ہلایا۔

''جی صاحب جی! خیریت؟ کیسے آنا ہوا......؟''

سانول نے اس کے قریب آکر پوچھا تو صفدر اسی طرح مسکرا

کر اس سے بولا۔

''سانول! میرا نام صفدر ہے۔ میں اس روز یہاں آیا تھا..... پہچانے مجھے؟''

''جی صاحب جی! اچھی طرح پہچان گیا ہوں آپ کو..... بتایئے، کیسے آنا ہوا؟'' سانول نے شستہ لہجے میں دوبارہ پوچھا۔

''میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں......'' صفدر نے اس سے کہا اور ساتھ ہی جانے کیوں اس نے دزدیدہ نظروں سے درگاہ کے دروازے کی طرف بھی دیکھا تھا جدھر سخی لعل کھڑا انہی کی طرف گھورے جا رہا تھا۔

''جی بولو سائیں! کیا بات کرنی ہے آپ کو مجھ سے؟'' سانول نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہاں نہیں، گھر چلو میرے ساتھ......'' صفدر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''گھر......؟ پر میرا تو کوئی گھر نہیں ہے؟'' سانول نے جواب دیا۔

''میں تمہیں اپنے گھر لے جانا چاہتا ہوں، وہیں آرام سے بات کریں گے۔''

''لل...... لیکن...... سس...... سائیں! آپ یہاں بھی تو وہ بات کر سکتے ہیں؟''

''نہیں، میرا خیال ہے وہی جگہ بہتر رہے گی۔ آؤ میرے ساتھ، دیکھو انکار مت کرنا۔ میں بہت امید لے کر آیا ہوں یہاں......''

''امید اور مجھ سے؟ میں غریب بھلا کسی کی کیا امید بن سکتا ہوں؟'' سانول نے جواب دیا۔

''بن سکتے ہو، کیوں نہیں بن سکتے؟ آخر کو ایک انسان ہی دوسرے انسان کے کام آسکتا ہے۔'' صفدر بولا۔ ''آجاؤ میرے ساتھ، میرے گھر چلو، وہاں آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے، پھر تم کہو گے تو میں تمہیں یہاں چھوڑ جاؤں گا۔''

''جا چلا جا سانول! صاحب کو تیرے سے کچھ کام ہوگا، کسی کے کام آنا اچھی بات ہوتی ہے۔''

قریب کھڑے سخی لعل نے بھی حیران پریشان کھڑے سانول سے کہا تو کچھ سوچ کر سانول نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دے ڈالی۔ صفدر ایک دم خوش ہو گیا اور پھر اس نے اپنی جیب سے ایک پانچ سو کا نوٹ نکال کر سخی لعل کو تھمایا اور پھر مسکراتے ہوئے سانول کی طرف دیکھا وہ بے چارہ حیران پریشان سا اس کی طرف بڑھا۔ صفدر نے کار کا دروازہ کھول دیا اور پھر دونوں اس میں سوار ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد کار سندھ یونیورسٹی سوسائٹی میں داخل ہو رہی تھی اور اس کے ذرا ہی دیر بعد وہ کاشانۂ حیا کے سامنے جا کر رک گئی۔

شام کے ڈھلتے سائے رات کی تاریکی میں بدلنے لگے تھے۔ صفدر سانول کو انیکسی میں لے آیا۔

''یہاں آرام سے بیٹھو، میں تمہارے لیے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرتا ہوں۔ اس کے بعد آرام سے باتیں کرتے ہیں۔'' صفدر نے اس سے کہا تو سانول نے کچھ کہنا چاہا مگر صفدر تب تک جا چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اندر اپنی بیوی حیا سے مخاطب تھا۔

''میں اسے یہاں لے آیا ہوں...... اس کے لیے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو، اس کے بعد میں اس سے بات کرتا ہوں۔''

''کیا وہ مان جائے گا؟ میرا مطلب ہے...... آپ نے مجھے یہ بھی تو بتایا تھا کہ وہ فقیر منش آدمی ہے۔ کہیں برا نہ منا لے۔'' حیا نے کہا۔

''بہ ظاہر تو مجھے ایسی کوئی بات محسوس نہیں ہوتی، پر دیکھتے ہیں...... کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔'' صفدر نے کہا پھر اچانک اس کے دل میں ایک خیال آیا اور وہ آخر میں حیا سے بولا۔

''بلکہ تم ایک کام اور کرنا، جب وہ کھانا کھا لے تو اسے ذرا اسلام کرنے آجانا۔'' حیا نے شوہر کی بات پر ہولے سے اپنے سر کو جنبش دی۔

اس کے تھوڑی دیر بعد صفدر نے ایک ملازم کے ہاتھ سانول کے لیے کھانا بھجوا دیا۔ سانول وہاں ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے میز رکھی ہوئی تھی۔ ملازم نے کھانا وہیں اسی میز پر لگا دیا۔ سانول نے کھانا دیکھ کر بسم اللہ پڑھی اور کھانا کھانے لگا۔

کھانا ختم کیا تو اتنے میں صفدر بھی وہاں آ گیا۔

''کھانا تو خوب سیر ہو کر کھایا ہے نا آپ نے......؟'' صفدر نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں سائیں! بھلا روزی سے کیسی شرم، یہ تو اللہ کی طرف سے ہوتی ہے، جس کے نصیب میں لکھی ہو اسی کو ملتی ہے۔'' سانول نے کہا۔

''بالکل ٹھیک کہا تم نے...... سانول! رزق دینے کی عطا اور طاقت صرف اللہ کی ہے، انسان بھلا کسی کو کیا دے سکتا ہے۔'' صفدر نے کہا۔

''سائیں! میں نے وضو کرنا ہے، عشا کی نماز پڑھنا

تھی۔'' سانول نے کہا۔صفدر نے اسے باتھ روم دکھا دیا۔ سانول نے جب تک وضو کیا' صفدر اس کے لیے جائے نماز اور تسبیح لے آیا۔سانول نے نماز پڑھی، دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔صفدر ایک طرف کرسی پر خاموش بیٹھا اسے عبادت کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔زیرِلب دعا پڑھنے کے بعد سانول نے ہولے سے آمین کہہ کر دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیر لیے اور پھر وہیں مصلے پر بیٹھے بیٹھے گردن موڑے چاروں طرف دیکھنے لگا، پھر چھت کی طرف دیکھتا رہا۔صفدر ایک طرف کرسی پر بیٹھا بہ غور اسی کی طرف تکے جارہا تھا۔

اس کے بعد سانول اٹھا اور صفدر کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگا۔صفدر اس کی نظروں کا اشارہ سمجھ کر ہولے سے کھنکھار کر بولا۔

''دیکھو سانول! میں اپنے لیے نیکوکاری یا پارسائی کا دعویٰ تو نہیں کرتا مگر کوشش یہی ہوتی ہے کہ میری ذات سے نہ کسی کو نقصان پہنچے نہ ہی کسی کا دل دکھے۔پھر بھی بندہ بشر ہوں، خطا کا پتلا ہوں۔اللہ کی آزمائش پر شاکر بھی رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ ٹھہرا پھر کہنا شروع ہوا۔

''تم ایک نیک اور شریف انسان ہو مگر جب تمہیں تنگ دستی میں دیکھتا ہوں تو مجھے دکھ سا ہوتا ہے۔بس، میری یہ خواہش ہے کہ تمہارا کھانا پینا، رہن سہن سب میں اپنے ذمے لے لوں۔مجھے اس سے دلی سکون نصیب ہوگا۔مجھے یقین ہے تم انکار نہیں کرو گے۔یہی میں نے تم سے کہنا تھا۔''

سانول نے اس کی بات غور سے سنی، پھر مسکرا کر بولا۔

''سائیں! اللہ آپ کو خوشیاں دے، میں جس حال میں بھی ہوں اس میں خوش ہوں۔میرا خیال ہے مجھ سے زیادہ مستحق لوگ دنیا میں پڑے ہیں۔آپ نے ایسا کچھ کرنا ہی ہے تو ان کے لیے کردیں۔مجھ فقیر کی تو یوں بھی احتیاجات بہت محدود ہیں۔کھانا کھلانے کا شکریہ......میں اب چلوں گا۔''

یہ کہتے ہوئے سانول اٹھ کھڑا ہوا......

''بیٹھو، ابھی رات ہوگئی ہے، کل صبح میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔''

''مجھے صرف اپنے ٹھکانے پر ہی نیند آتی ہے جہاں میں کچے فرش پر کبھی کی چٹائی بچھا کر سوتا ہوں۔یہاں نرم بستر میرے لیے کانٹوں کا بچھونا نہ بن جائے...... چلتا ہوں۔''

سانول یہ کہہ کر جانے لگا۔اثنائے راہ......حیا سر پر دوپٹا رکھے وہاں آگئی۔سانول نے فوراً اپنی نظریں جھکالیں۔حیا نے اسے سلام کیا، اس نے بھی ہولے سے جواب دیا اور صفدر کی طرف دیکھا۔

''یہ میری بیوی ہے حیا......اس کے لیے دعا کی درخواست کروں گا تم سے......''صفدر نے سانول سے کہا۔

''اللہ سائیں اس کی حیا اور پردہ سلامت رکھے۔'' سانول نے دعائیہ کہا اور پوچھا۔''کیا یہ بیمار ہے؟''

''نہیں، بیمار تو نہیں ہے، پر ہماری شادی کو کئی برس بیت چکے ہیں مگر ابھی تک اس کی گود ہری نہیں ہوسکی ہے۔''صفدر نے یہ بات اس سے ذرا ڈرتے ڈرتے کہی تھی، کیونکہ اسے پتا تھا کہ اس طرح کی باتوں سے سانول ناراض ہوجاتا تھا۔تاہم ایسا کچھ نہیں ہوا اور سانول نے کہا۔

''یہ سب اللہ سائیں کی حکمتیں ہیں جسے ہم انسان سمجھنے سے قاصر ہیں۔خوش وہی لوگ رہتے ہیں جو ہر حال میں رب سائیں کا شکر ادا کرتے ہیں۔انسانیت کے ناتے میرا فرض بنتا ہے کہ میں اللہ سائیں سے آپ دونوں کی بہتری کی دعا کروں گا......''

صفدر کا یہ وعدہ تھا کہ وہ اسے چھوڑ دے گا۔اسی لیے وہ اسے اپنی کار میں بٹھا کر دوبارہ درگاہ چھوڑ گیا اور جب وہاں سے لوٹنے لگا تو رات کافی گہری ہوچکی تھی۔

ناپختہ راستے سے وہ جیسے ہی مین روڈ پر آیا اس نے کار کی رفتار بڑھادی۔وہ جلدی گھر پہنچنا چاہتا تھا۔شاید اسی جلد بازی کے سبب وہ اچانک سامنے سے آنے والے ایک ٹرک کی ٹکر سے اپنی کار کو نہیں بچاسکا۔اس نے بریک تو لگادیے تھے مگر ٹرک بالکل سامنے آچکا تھا۔ایک ساعت شکن دھماکے سے صفدر کی کار ٹرک سے ٹکرائی اور صفدر کا دماغ تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

''یا اللہ سائیں......! خیر ہووے......''

درگاہ کے حجرے میں کبھی کی چٹائی پر بیٹھے ہوئے سانول کے لبوں سے بے اختیار یہ دعائیہ کلمات برآمد ہوئے تھے۔''لگتا ہے بڑی سڑک (مین روڈ) پر کوئی خطرناک ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔''

رات کے سناٹے میں کار ایکسیڈنٹ کے دھماکے کی آواز دور دور تک سنائی دی تھی جو سانول شاہ کے کانوں تک بھی پہنچی تھی۔سخی لعل ایک طرف نیند میں بے سدھ پڑا خراٹے لے رہا تھا۔

سانول کا دل بے چینی محسوس کرنے لگا کیونکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی صفدر اسے اپنی کار میں یہاں چھوڑ کر گیا تھا اور اس کا دل کہہ رہا تھا کہ یہ حادثہ اسی کار کو پیش آیا ہوگا۔بے چینی جب حد سے بڑھنے لگی تو وہ اپنے حجرے سے نکلا اور

پھر درگاہ سے باہر تاریکی میں نکل آیا۔ آوارہ کتوں کو بھگانے کے لیے اس نے موٹی شاخ ہاتھ میں پکڑلی تھی۔ وہ تاریک اور بل کھاتے کچے راستے پر تیز تیز قدموں سے چلا جارہا تھا۔

مین روڈ بہ مشکل ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ وہ جب وہاں پہنچا تو وہاں خاصا شور مچا ہوا تھا۔ ایمبولینس اور پولیس کی دو گاڑیاں وہاں موجود تھیں۔ پتا چلا کار میں صرف ایک ہی شخص موجود تھا اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگیا تھا۔ اس کی لاش ایمبولینس میں رکھی جارہی تھی۔ سانول نے کسی طرح دھکم پیل کے دوران آگے بڑھ کر دیکھا، کار تو وہ پہچان ہی چکا تھا مگر لاش دیکھتے ہی وہ سکتے میں آگیا۔ وہ صفدر کی ہی لاش تھی۔ وہ بہت دکھی ہوگیا۔ اس نے وہاں یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ وہ اس بدنصیب مرنے والے کو جانتا ہے اور اس کا گھر بھی دیکھا ہوا ہے مگر اس کا حلیہ ہی ایسا تھا کہ کسی نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ پریشان ہوگیا۔ آخر وہ ایمبولینس کے ڈرائیور کے پاس پہنچا اور اس کی منتیں کرنے لگا۔ ڈرائیور بھی غریب سا ہی آدمی تھا۔ اس نے کچھ سوالات کیے اور پھر اپنے عملے ہی کے ایک ذمے دار آدمی سے بات کی، جس نے فوراً وہاں موجود پولیس اہلکاروں کو بتایا تو انہوں نے اس کی بات کی تصدیق کی خاطر صفدر کی لاش کی جیبوں کی تلاشی لی تو اس کے اندر سے چند دیگر کاغذوں کے علاوہ شناختی کارڈ بھی مل گیا اور یوں اس کی بات کا یقین کیا گیا۔ یوں سانول کو بھی ایمبولینس میں سوار کرادیا گیا اور وہ سائرن بجاتی ہوئی سندھ یونیورسٹی سوسائٹی کی طرف روانہ ہوگئی۔

جب ایمبولینس ''کاشانۂ حیا'' پہنچی تو وہاں کہرام مچ گیا۔ حیا تو اپنے شوہر صفدر کی خون میں لت پت لاش دیکھ کر صدمے سے غش کھا کر گر پڑی۔ شور وغیرہ کی آواز سن کر اریب قریب کے گھروں سے بھی لوگ نکل آئے تھے اور ان کی عورتیں حیا کو سنبھالنے میں لگ گئیں۔ سانول وہیں موجود رہا، حتیٰ کہ صبح ہوگئی۔

☆☆☆

مہرو امتحانات کی وجہ سے حویلی میں زیادہ دیر نہ رک سکی تھی، اسی لیے وہ ایک دو دن بعد ہی شہر آگئی تھی۔ ہاں حویلی ہی میں رہ گئی تھی۔ بھٹائی نگر میں اب صرف مہرو تھی یا اس کا بڑا بھائی مراد بھی کبھار آجاتا تھا۔ باقی نوکر چاکر اور مسلح گارڈز وہاں موجود رہتے ہی تھے۔

مہرو کا دل پڑھائی میں نہیں لگ رہا تھا۔ اگرچہ وہ پڑھائی میں نکمی نہیں تھی اور ہمیشہ اچھے ہی نمبروں سے پاس ہوتی تھی مگر اس بار جانے کیوں وہ پہلے والی یکسوئی قائم نہیں کرپارہی تھی۔ اس نے سوچا شاید ایسا کوٹھی میں رہنے کی وجہ سے ہورہا ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کچھ دن ہاسٹل میں ہی کیوں نہ قیام کرلے۔ ریحانہ اس کی گہری سہیلی ہی نہیں روم میٹ بھی تھی۔ کلاس میٹ تو تھی ہی، وہ عموماً اسی کے روم میں ٹھہرا کرتی تھی۔ باقی کھانا پینا کیمپس کی کینٹین میں مل جاتا تھا۔

لہٰذا وہ اپنا مختصر سا سامان اور کتابیں لیے ہاسٹل آگئی۔ ریحانہ اسے دیکھ کر خوش ہوگئی۔ یہاں آکر مہرو کو کچھ سکون ملا اور ریحانہ کے ساتھ اس نے کمبائن اسٹڈی بھی شروع کردی مگر باوصف اس کے وہ اچانک پڑھتے پڑھتے کہیں کھوجاتی۔

''خیریت تو ہے مہرو...... یہ تم اچانک کہاں کھوجاتی ہو؟''

ایک دن مہرو کو اسٹڈی کے دوران ریحانہ نے ٹوکا، جب وہ کتاب سامنے کھولے ہوئے تھی مگر اس کا دھیان اور نگاہیں کسی اور جگہ پر مرکوز تھیں۔

''کک...... کچھ نہیں، بس یونہی ایک ٹاپک ذہن نشین کرنے کی کوشش کررہی تھی۔'' مہرو نے فوراً بہانہ بنایا تو ریحانہ بھی آگے سے اور کچھ نہ بولی لیکن وہ بدستور اسے آبزرو کرتی رہی۔

ایک دن مہرو کا نہ چاہتے ہوئے جی چاہا کہ وہ ایک چکر سندھیالوجی میوزیم کا لگا آئے۔ اس نوجوان مجذوب سانول کی شاعری کے بول اس کے کانوں میں گونجنے لگے، جنہوں نے اسے مزید بے چین سا کرکے رکھ دیا اور پھر وہ نہیں رکی۔

سندھیالوجی میوزیم میں وہ اپنی کار میں ہی آئی تھی اور اکیلی تھی۔ وہ خود بھی کار چلاتی تھی۔ میوزیم کے اندر پہنچی تو وہ اسے کہیں نظر نہیں آیا۔ یوں وہ دوبارہ اور سہ بارہ وہاں آتی رہی مگر سانول سے پھر بھی ملاقات نہ ہوسکی۔ اس کے اندر کی بے چینی تھی کہ رفع ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی، وہ جس قدر اپنے ان خیالات کو دبانے کی کوشش کرتی جو سانول کی ذات سے وابستہ ہوتے، وہ اتنا ہی ابھرتے اور اب تو وہ اسے جیسے بے دم کیے دیتے تھے۔

''تمہیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا مہرو کہ تم سانول سے محبت کرنے لگی ہو......''

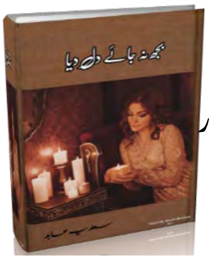
ایک رات جب اس کے اندر کی بے چینی حد سے بڑھنے لگی تو بے اختیار اس کے من میں کسی نے چلا کر کہا۔ ''تم اس مجذوب فقیر لڑکے کی محبت میں گرفتار ہوچکی ہو۔ یہ محبت ہی تو ہے کہ دل کی بے چینی ہر لمحے اسی کے لیے ہی تمہیں تڑپاتی رہتی ہے۔ تم کب تک اپنے اس جذبۂ دل کو جھٹلاتی رہوگی جو ایک بیج کی صورت تمہارے دل میں نمو پانے لگا ہے۔''

عہدِ وفا



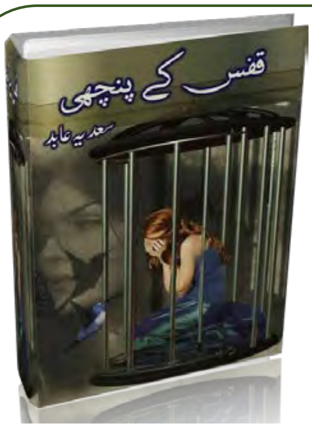
ایمان پریشے کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا مُنفرد ناول، مُحبت کی داستان جو معاشرے کے رواجوں تلے دب گئی، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

بُجھ نہ جائے دِل دیا



سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، مُحبت، نفرت، عداوت کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

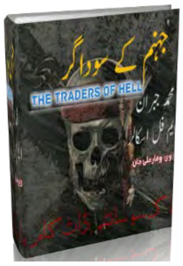
قفس کے پنچھی



سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، علم و عرفان پبلشرز لاہور کے تعاون سے جلد، **کتابی شکل** میں جلوہ افروز ہو رہا ہے۔

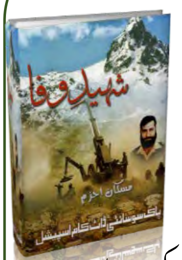
آن لائن پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

جہنم کے سوداگر



مُحمد جبران (ایم فِل) کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ایکشن ناول، پاکستان کی پہچان، دُنیا کی نمبر 1 ایجنسی آئی ایس آئی کے اسپیشل کمانڈو کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

شہیدِ وفا



مُسکان احزم کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ناول، پاک فوج سے مُحبت کی داستان، دہشت گردوں کی بُزدلانہ کاروائیاں، آرمی کے شب و روز کی داستان پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

آپ بھی لکھئے:

کیا آپ رائٹر ہیں؟؟؟۔ آپ اپنی تحاریر پاک سوسائٹی ویب سائٹ پر پبلش کروانا چاہتے ہیں؟؟؟

اگر آپکی تحریر ہمارے معیار پر پُورا اُتری تو ہم اُسکو عوام تک پہنچائیں گے۔ مزید تفصیل کے لئے یہاں کلک کریں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام، پاکستان کی سب سے زیادہ وزٹ کی جانے والی کتابوں کی ویب سائٹ، پاکستان کی ٹاپ 800 ویب سائٹس میں شُمار ہوتی ہے۔

اس نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہاں کے منتظمین اور عملے کے کچھ لوگوں سے بھی پوچھا اور باہر دکانوں اور اسٹالوں پر بھی گئی۔ پتا کرنے کی کوشش کی تھی کہ ایک نوجوان فقیر منش سالٹر کا سانول، جس کے ہاتھ میں یکتارا ہوتا تھا وہ اچانک کدھر غائب ہو گیا ہے مگر کسی کو معلوم نہ تھا۔ تاہم اسے یہ ضرور پتا چلا کہ سانول گزشتہ چند دنوں سے یہاں نہیں آتا۔ پھر کسی نے مہرو کو یہ بھی بتایا کہ اسے کچھ دنوں سے ٹھوڑی پھاٹک کی طرف دیکھا جاتا رہا ہے، نیز اس نے یہاں آنا چھوڑ دیا ہے۔ شاید میوزیم کی انتظامیہ نے اس پر پابندی لگا دی ہوگی...... وغیرہ۔

جبکہ حقیقت یہ تھی کہ سانول نے خود سے ہی یہاں آنا ترک کر رکھا تھا۔

بہرکیف ...... مہرو نے ٹھوڑی پھاٹک جا کر بھی اسے تلاشنے کی کوشش کی۔ وہاں بھی اس کا کچھ اتا پتا نہیں چلا تو...... اس نے یہی فیصلہ کیا کہ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ اسے اس کے ٹھکانے درگاہ جلیل شاہ جا کر ہی مل لے۔ اس کی ایک وجہ اس کے دل میں اچانک ابھرنے والی وہ تشویش بھی تھی کہ خدا جانے کہیں وہ بیمار تو نہیں ہو گیا۔

وہ کار دوڑاتی ہوئی درگاہ پر پہنچی تو وہاں اسے صرف بڑا امجاور سخی لعل نظر آیا۔ اس نے سانول کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا۔

''پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے؟ کل سے غائب ہے۔ میں خود اس کے لیے پریشان ہو رہا ہوں۔''

''تم نے اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی اب تک......؟'' مہرو نے پوچھا۔

''کیا تلاش کروں اسے بی بی جی! فقیر منش آدمی ہے، کبھی یہاں تو کبھی وہاں ...... آجائے گا خود ہی اور کدھر جانا ہے اس نے۔''

''پھر بھی تمہیں اس کی فکر تو کرنی چاہیے، کہیں خدا ناخواستہ اس کے ساتھ کوئی حادثہ وغیرہ نہ پیش آ گیا ہو......''

مہرو نے اس کی طرف دیکھ کر تنبیہاً کہا تو اچانک ہی جیسے سخی لعل کو کچھ یاد آ گیا اور وہ مہرو سے بولا۔

''اوہ...... ہاں بی بی جی! حادثے سے یاد آیا...... کل رات بڑی سڑک (مین روڈ) پر ایک خوفناک حادثہ پیش آیا تھا۔ شاید کسی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ بڑے زوردار دھماکے کی آواز آئی تھی۔ سانول اسی رات نکل گیا تھا، وہ حادثے کی جگہ پہنچنا چاہتا تھا......''

''کیوں؟''

''وہ جی، کوئی صاحب تھے، کار میں آیا کرتے تھے یہاں...... وہی اسے کل رات اپنے گھر بھی لے گئے تھے...... جب اسے یہاں چھوڑ کر چلے گئے تو اس کے بعد ہی دھماکے کی آواز آئی اور سانول بے چین ہو گیا کہ کہیں وہ خوفناک حادثہ اسی صاحب کی کار کے ساتھ تو نہیں پیش آ گیا، پھر وہ یہ دیکھنے جب کا گیا ہے تو ابھی تک نہیں لوٹا ہے......'' سخی لعل نے بالآخر اسے تھوڑی بہت صراحت بتا ہی دی، جسے سن کر مہرو کے چہرے پر کچھ تشویش آمیز سی الجھن تیر گئی۔ وہ چند ثانیے اسی طرح پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے کھڑی رہی، پھر اس کے بعد سخی لعل سے سوال کیا۔

''وہ صاحب کون تھے؟ کیا تم جانتے ہو اسے، کیا نام تھا اس کا......؟''

''وہی اس کے بارے میں جانتا تھا زیادہ، مجھے تو اس آدمی کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں تھی۔'' سخی لعل جواباً بولا۔ ''ہاں! اتنا ضرور اندازہ ہے مجھے کہ وہ آدمی تھا کچھ پراسرار سا...... اور پیسے والا بھی بہت دکھتا تھا، پر پتا نہیں اسے سانول کے ساتھ کیوں اتنی دلچسپی ہو گئی تھی؟''

مہرو تھوڑی دیر بعد گومگو سے انداز میں وہاں سے لوٹ آئی۔

☆☆☆

''کاشانۂ حیا'' کے سامنے ایمبولینس کھڑی تھی۔ اس کا سائرن تھوڑی دیر بجنے کے بعد بند ہو چکا تھا۔ اس کی آواز پر اندر موجود حیا کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ وہ جیسی تھی اور جس حالت میں اندر بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی اسی طرح بغیر چادر اور دوپٹے کے گھر سے نکل کر باہر گیٹ پر آ گئی اور پھر سامنے کھڑی ایمبولینس اور اطراف میں کھڑے لوگوں کو دیکھ کر یک دم دھک سے رہ گئی۔ اس کے قدم وہیں رک گئے۔ چہرہ فق اور منہ کھلا رہ گیا، آنکھیں پھیل گئیں۔ دل کو ہی نہیں اس کی روح تک کو دھچکا لگا تھا اور تب ہی اس کے حلق سے ایک ہذیانی چیخ بلند ہوئی تھی اور وہ ایمبولینس کے ساتھ جا ٹکرائی۔ شیشے کے پار اس نے اندر ایک اسٹریچر پر اپنے سہاگ کو خون میں لت پت دیکھا۔

''صص...... صفی...... مم...... میرے صفدر......!'' وہ کھڑکی کے شیشے پر مکے مار کر چلائی۔

قریب پولیس کی موبائل بھی کھڑی تھی۔ انہیں اب یہ تصدیق کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی کہ ہائی وے پر ہونے والے اس جانکاہ حادثے میں جاں بحق ہونے والے شخص کو اس کے ٹھکانے تک پہنچا دیا گیا تھا۔ ایمبولینس کا ڈرائیور اور عملے کے دو افراد بھی نیچے اتر آئے تھے۔

"تت...... تم لوگ اسے یہاں کیوں لے آئے...... دیکھتے نہیں...... مم...... میرا صفی کتنا زخمی ہے...... اسے اسپتال کیوں نہیں لے جاتے......؟" حیا نے ان سے چیخ کر کہا مگر وہ خاموشی سے اپنا سر جھکائے کھڑے رہے، تاہم عملے کے ایک آدمی نے موبائل سے اترنے والے ایک پولیس افسر کی طرف ضرور دیکھا تھا اور وہ ہی حیا سے مخاطب ہو کر بولا۔

"بی بی! اس بدنصیب کو اب اسپتال لے جانے کی ضرورت نہیں رہی۔ ادھر ہائی وے پر اس کی کار کو حادثہ پیش آگیا ہے، ہمیں افسوس ہے کہ یہ نہ جانبر...... ہوسکا......"

"نہیں......" حیا اپنے دونوں ہاتھ کنپٹیوں پہ رکھ کر ہسٹریائی انداز میں چلائی۔ "تت...... تم لوگ جھوٹ بول رہے ہو...... میں کہتی ہوں اسے جلدی اسپتال لے جاؤ...... یہ نہیں مرسکتا...... میرا صفی مجھے اس طرح اچانک چھوڑ کر نہیں جاسکتا......"

پھر وہ دوبارہ شیشے کی کھڑکی سے اندر اسٹریچر پر رکھی اپنے شوہر کی خون آلود لاش کو دیکھ کر دوبارہ پاگلوں کی طرح بولی۔

"دیکھو...... دیکھو...... میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں...... وہ زندہ ہے...... آہ......"

شدتِ غم واندوہ کے مارے اس کی آواز گھٹ گئی۔ سر چکرانے لگا۔ حواس ساتھ چھوڑنے لگے اور پھر وہ وہیں گرنے لگی تو دو ہاتھوں نے اسے گرنے سے بچانے کے لیے یک دم تھام لیا...... یہ سانول تھا۔

☆☆☆

زمیندار اللہ ورایو کی اوطاق میں یار دوستوں کی مختصر سی محفل جمی ہوئی تھی۔ یہ کل سات افراد تھے۔ ایک ٹھگنے سے قد کا نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں۔ جسم بھاری تھا۔ رنگ تیز سانولا تھا۔ اس کے بغلی ہولسٹر سے ریوالور کی جھلک نظر آتی تھی۔ اس نے شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ یہ زمیندار اللہ ورایو کا نوجوان اکلوتا بیٹا، ارباب تھا۔ تین اس کے ہتھیار بدست حواری تھے۔ ارباب کے سامنے ایک سرکنڈوں کے مونڈھے پر رئیس بنگل خان کا بیٹا مراد خان براجمان تھا۔ دونوں گہرے دوست تھے۔ باقی دو ساتھی اس کے بھی موجود تھے، جن کے ہاتھوں میں گنیں موجود تھیں۔ ان کے درمیان میں ایک تپائی پر لوازمات آوارہ دھرے پڑے تھے۔ چیوڑا اور بھنی ہوئی مونگ پھلی کے دانوں کی دو پلیٹیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔

"کمال ہے یار، مراد خان! ابھی تک تم اپنے بابا جانی کو رضامند نہیں کر سکے ہو۔" ارباب نے چمچ سے تھوڑا چیوڑا لے کر منہ میں رکھا اور پھر ادھر بھرے آبِ ارغواں کے پیگ کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ "دیکھ لو سنگت! زمین کا وہ بنجر ٹکڑا ہمارے لیے موقعے کا سودا ضرور ہے مگر اس سے زیادہ اچھا سودا اور بھی بابا سائیں کی نظروں میں ہے۔ دوستی کی وجہ سے ابھی تک میں نے بھی اپنے بابا سائیں کو منع کر رکھا ہے کہ خریدنی ہے تو تمہاری زمین...... مگر...... یار! میں بھی اپنے بابا سائیں کو زیادہ دیر تک نہیں روک سکتا۔" اس نے آخر میں دانستہ اسے جوش دلانے کو کہا تھا۔

"اڑے یار! تیری وڈی مہربانی ہے، ارباب!" مراد نے دوستانہ مسکراہٹ سے کہا۔ اس کے بھی بائیں ہاتھ میں بلوریں پیگ تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ مونگ پھلی کے بھنے ہوئے دانے ٹونگ رہا تھا۔

"بابا جانی ضد کے پکے ہیں۔ وہ اپنی زمین کا ایک ٹکڑا بھی فروخت کرنا شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ چاہے وہ بنجر ہی کیوں نہ ہو۔ سوچ رہا تھا اس کے بیچنے سے کچھ پیسے آجاتے، باقی کے میرے پاس تھے، یہ پیسے ملا کر تمہاری والی زمین خرید لیتا......"

"اڑے یار تو اماں جانی سے سفارش لگوانی تھی نا......" ارباب نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا تو مراد نے جواب دیا۔

"وہی تو کیا تھا، بابا جانی تو ایک دم چراغ پا ہوگئے تھے، ان کی بھی نہیں مانی۔"

"سوچ لے سنگت! میں کتنا انتظار کروں؟"

"تھوڑے دن صبر کرلے۔ میں کچھ کرتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، دیکھ لے...... ورنہ میں بھی مجبور ہوں، دوستی اپنی جگہ...... مگر یہ زمین کے معاملات تو تجھے پتا ہی ہے کہ کیسے ہوتے ہیں۔"

"میں سمجھ گیا، بس ان دنوں میں کچھ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بابا جانی کو اگر ضد ہوگئی ہے تو میں بھی ان کا ہی بیٹا ہوں......" مراد خان جوش سے بولا۔ ارباب مسکرانے لگا اور بولا۔

"جوش میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بڈھے ضد کے پکے ہوتے ہیں، بلاوجہ گھر میں بدمزگی ہوجائے گی۔ یہ بتا تجھے کتنے پیسوں کی ضرورت ہے؟"

"وہ شہر والا موقعے کا پلاٹ خریدنے کے لیے مجھے ضرورت تو نو کروڑ کی ہے، تین میرے پاس ہیں، چھ کی زمین بک جاتی تو...... میری ضرورت پوری ہوجاتی۔"

"تو کیا تمہارے بابا جانی کے پاس اتنی رقم بھی نہیں ہے؟"

"یار! انہوں نے ساری رقم جامشورو والے سالونٹ پلانٹ پر لگادی ہے۔ کچھ اور رقم دوسرے منصوبوں پر...... فصل اترنے میں دیر ہے مگر وہ پلاٹ اتنا زیادہ دیر نہیں رہ سکتا...... اور بھی بہت سی پارٹیاں اس کے پیچھے لگی ہوئی ہیں۔"

"تو اس پلاٹ میں کرنا کیا چاہتا ہے؟" ارباب نے پوچھا۔

"وہاں میں فائیو اسٹار طرز کا ہوٹل بنانا چاہتا ہوں اور انڈر گراؤنڈ ایک کلب بھی۔" مراد نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"ہوں۔" ارباب نے ایک معنی خیز ہنکارا بھرا۔ پھر پل سوچ کر بولا۔

"دیکھ میرے یار! دوستی کی بات ہی کروں گا میں...... تو یہ تو میں چھ کروڑ کی رقم تجھے بہ طور قرض دے سکتا ہوں ...... فصل اترنے پر لوٹا دینا مجھے......"

مراد خان اس کی بات پر چونکا اور پھر اس کے چہرے پر مسرت انگیز سی مسکراہٹ ابھری اور وہ ممنون بھرے لہجے میں بولا۔

"یہ کی نا اب تو نے یاروں والی بات...... نیکی اور پوچھ پوچھ...... یار ارباب! تیرا یہ احسان میں ساری عمر نہیں بھولوں گا۔"

"بات احسان کی ہے تو پھر تجھے بھی مجھ پر ایک احسان کرنا ہوگا۔" ارباب نے مکاری سے کہا۔

"وحکم کر تو...... میرے یار! ایسے یاروں کے لیے تو سر بھی قربان ہے۔" مراد خوشی سے بولا۔ اس کی ایک بڑی خواہش پوری ہو رہی تھی۔ ارباب نے ایک نظر اپنے تینوں حواریوں کی طرف دیکھا، وہ اس کا اشارہ بھانپ کر خاموشی کے ساتھ اوطاق سے باہر چلے گئے۔ مراد بھی اس حرکت کا مطلب سمجھ گیا اور اس نے بھی اپنے دونوں حواریوں کو اوطاق سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ اب اوطاق میں صرف یہ دونوں دوست باقی رہ گئے۔

"کوئی خاص بات ہے؟" مراد نے سوالیہ نظروں سے ارباب کی طرف دیکھا۔

"خاص ہی سمجھ مگر ایسی باتیں نوکروں چاکروں کے سامنے کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔" ارباب نے جواب دیا۔

"اچھی بات ہے، بول کیا راز کرنا چاہتا ہے؟" مراد نے پوچھا۔

ارباب نے کہا۔ "دیکھ یار! یہ بات کرنا مجھے اچھا تو نہیں لگتا، پر اپنے ماں پیو (ماں باپ) کو تیرے ہاں بھیجنے سے پہلے تم سے عندیہ لینا میں زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔ آخر کو ہم اچھے دوست ہیں، ہم پلہ اور ہم کفو ہیں۔ قوم ذات برادری بھی ایک ہی ہے، کیوں نہ اس دوستی کو اور مضبوط بھی کرلیں اور تیرا کام بھی ہو جائے۔ ناراض مت ہونا یار! میری بات بری لگے تو یہ سر حاضر ہے۔ ایسی کوئی غلط بات میں بھی منہ سے نہیں...... نکالوں گا جو میرے یار کو مجھ سے دور کر دے۔ انکار بھی کر دے گا تو میرا دوست ہی رہے گا۔ قرضہ بھی دے دوں گا۔ اس کی فکر نہ کر......"

"تو آخر کہنا کیا چاہتا ہے ارباب؟ اب کھل کر کہہ دے۔" مراد نے اس کی طرف دیکھ کر بے چینی سے کہا تو ارباب بولا۔

"تو اجازت دے تو...... میں اپڑیں ماں پیو کو اپنے رشتے کے لیے تمہاری طرف بھیج دوں؟ تیری بہن ...... مہرزادی کے لیے...... چھ کروڑ قرضے کی صورت میں دی ہوئی رقم بھی تو عوضے کے طور پر رکھ لینا۔ لوٹانے کی ضرورت نہ ہوگی۔"

مراد اس کی بات پر ایک لمحے کو گنگ سا رہ گیا۔ سمجھ گیا معاملہ سودے بازی کا ہی تھا۔ ارباب نے چھ کروڑ کا قرضہ...... انکار کرنے کے باوجود دینے کا وعدہ کیا ضرور تھا مگر وہ اتنا سیدھا بھی نہ تھا کہ انکار کے بعد اسے دے بھی دیتا، تاہم عوضے کی صورت میں یہ قرض معاف کرنے کا بھی عندیہ دیا جا چکا تھا۔ مراد نے ٹھنڈے دل سے تھوڑا غور کیا اور اسے یہ تجویز بری نہیں لگی۔ فائیو اسٹار ہوٹل کھولنا اس کا سب سے بڑا خواب ہی نہیں کمزوری بھی تھی اور خواہش بھی۔ اس نے کہا۔

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں...... پر بات وہی ہے کہ میرے بابا جانی یہ رشتہ مانتے ہیں یا ٹھکراتے ہیں۔"

"وہ مان جائیں گے۔" ارباب جلدی سے بولا۔

"کیونکہ میں اپنے ماں پیو کو تمہاری حویلی بھیجنے سے پہلے سردار وسایو خان کے ذریعے یہ بات تمہارے بابا جانی کے کانوں میں ڈلوا دوں گا۔ وہ ان کا کہا ٹال نہیں سکتے، ورنہ بھلا ہمارے اور تمہارے رتبے میں کیا فرق ہے۔"

"پھر بھی یار ارباب! زمین بیچنے کے معاملے میں تیرے باپ سے بابا جانی کی تھوڑی تو تو میں میں ہو گئی تھی۔"

"اڑے اس کی کیا فکر کرتا ہے، میرے بابا سائیں نے کون سا بھینس ماردی تھی۔ ایک بات ہی تو کہی تھی تمہارے بابا جانی سے...... زمینوں کی باتیں زمیندار نہیں کریں گے تو اور کس سے کریں گے۔ کوئی زبردستی تھوڑی کی تھی میرے بابا سائیں نے۔ رئیس نے انکار کر دیا، بات ختم ہو گئی۔ ایسی باتیں کہاں دلوں میں رکھنے والی ہوتی ہیں، جس کا صرف تذکرہ ہو مگر کوئی تنازع نہ ہو۔ بے فکر رہ، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔"

"ہوں......" مراد کے پرسوچ اور بھینچے ہوئے ہونٹوں سے یہ برآمد ہوا اور بولا۔

"پھر میری طرف سے بھی ابھی سے ہی ہاں سمجھ لو......"

مگر کام جلدی ہو جانا چاہیے، مجھے پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔"

ارباب خوش ہو کر بولا۔ "تو نے میرا ڈر ختم کر دیا دوست! دراصل اس طرح کی رشتے داری کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ خاندان کی مرضی ایک ہو۔ تمہارے بابا جانی مان جاتے تو مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم یا تمہاری اماں جانی نہ اس رشتے سے انکار کر دیتے۔ اس معاملے میں ماں اور جوان بیٹے سے مشورہ کرنا گھر کا ہر سربراہ نہ صرف ضروری سمجھتا ہے بلکہ اس کی مجبوری بھی ہوتی ہے۔ باقی پیسوں کی تو پروا نہ کر، دو دن کی مہلت کافی ہوگی۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں، اماں جانی بھی میری مرضی پر ہی چلیں گی۔ باقی میرے بابا جانی کو رضامند کرنے کی وجہ ڈھونڈ ہی لی تو دیر کس بات کی ہے، کل ہی اپڑیں ماں پیو کو بھیج دے۔"

"بے فکر رہ......" ارباب نے کہا اور پھر دونوں دوست کھڑے ہو کر ایک دوسرے کے گلے ملے اور مراد وہاں سے رخصت ہو گیا۔

پیسا چیز ہی ایسی ہے، جس کی ضرورت صرف عام آدمیوں کو ہی نہیں پڑتی، وقت پڑنے پر یہ امراء کی بھی ضرورت بن جایا کرتا ہے۔

ارباب نے مہرو کو دیکھ رکھا تھا۔ اپنی ماں کے علاوہ اس نے دیگر لوگوں سے بھی اس کے حسن و شباب کے چرچے سن رکھے تھے۔ یوں بھی وہ فطرتاً حسن پرست تھا۔ ہر اچھی چیز کو فوراً پا لینے کی آرزو کر لیا کرتا تھا۔ اپنے حصول و مفاد کے لیے وہ ذرا سا بھی دقیقہ فروگزاشت کرنے کا قائل نہ تھا۔ کوئی کمی بھی نہ رہنے دیتا تھا، یہی وجہ تھی کہ اس نے احتیاط کے پیش نظر ایک طرف اس رشتے کے لیے رئیس بنگل خان کو راضی کرنے کے لیے سردار وسایو خان کو بھی بیچ میں ڈالا تھا تو دوسری جانب مراد کو بھی رام کر لیا تھا مگر پھر بھی وہ ایک کمی کر گیا تھا، وہ بھول گیا تھا کہ صرف انسانوں کو ہی نہیں، بلکہ تقدیر کو رضامند کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

☆☆☆

سچی لعل سے اس شخص کے بارے میں مہرو کو معلوم نہ ہو سکا تھا کہ وہ کون تھا اور کیوں سانول میں دلچسپی لے رہا تھا۔ پھر مہرو کو اس بات پر بھی حیرت تھی کہ سانول بھلا اس آدمی کے پیچھے کیوں لگ گیا تھا؟ آخر اس آدمی نے اس پر ایسا کیا جادو کر دیا تھا؟ پھر اس نے سوچا۔ "مجھے اس آدمی سے کیا لینا دینا اور سانول بھی بھلا کہاں جا سکتا ہے، پھر کبھی سہی۔"

وہ لوٹ آئی۔ ہاسٹل پہنچی تو اس کے دل کو عجیب سی بے قراری نے جکڑ لیا۔ سانول بار بار اس کے دھیان میں آتا، وہ اسے جھٹکنے کی کوشش کرتی تو آکٹوپس کی طرح وہ اس کے دل و دماغ میں گھر کرنے لگتا۔

"وہ سچا ہے......وہ اپنی محبت میں سچا ہے......" اس کے اندر کوئی گردان کرنے لگا۔

اس نے اب تک یک طرفہ بحرالفت میں اپنی ایسی ناؤ ڈال رکھی تھی، جو بے پتوار تھی۔ آج اتنے عرصے بعد اس کی ناؤ امید کے ساحل پر پہنچی تھی مگر لب منزل ہی وہ کشتی شاید بھنور میں پھنستی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔

مہرو سوچے جا رہی تھی۔ ہر جواں دل امنگوں سے بھرا ہوتا ہے اور پھر مہرو بھی ایسی ہی عمر کی لڑکی تھی۔ جس کے دل دماغ کے...کسی گوشۂ بے نام میں یہ آرزو چھپی ہوتی ہے کہ کوئی اسے چاہے اور پھر سانول کی اس انوکھی محبت نے اسے انفرادی جذبے سے ہی آشکار کیا تھا۔

وہ یہ سب سوچ کر بے اختیار سی ہونے لگی، تب ہی کوئی چیخا۔

"مہرو......! جو ایک طرفہ محبت کے ساتھ ساتھ عذاب نارسائی اور اتنا انتظار سہتا ہے نا......تو پھر وہ عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف جانے لگتا ہے پھر......وہ کسی اور دنیا کا باسی ہو جاتا ہے۔ عشق مجازی کی محبت تو اس کے دل سے نہیں نکلتی مگر وہ عشق حقیقی میں پناہ لینے کے بعد ذہنی و قلبی سکون محسوس کرتا ہے۔ تھام لے اس کا ہاتھ مہرو پگلی......"

وہ دہل گئی۔ "سانول......سانول......!"

بے اختیار دل کے خانۂ صنم سے ایک صدا ابھری اور اس کے لبوں سے اس کا نام برآمد ہونے لگا۔ وہ آنکھیں موندے بستر پر موجود تھی۔ اسے پتا بھی نہیں چلا تھا کہ اس کی روم میٹ ریحانہ، جو ذرا دیر پہلے ہی کمرے میں داخل ہوئی تھی اور ٹیبل پر اپنی کتابیں درست کرنے میں مصروف تھی، یک دم چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

مہرو اٹھ بیٹھی۔

"کیا ہوا......مہرو......؟" ریحانہ نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"ک......کچھ نہیں......" مہرو نے بات بنائی اور ریحانہ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے گھور کر رہ گئی۔

☆☆☆

جگنو کی طرح ٹمٹماتا احساس جسے وہ مسلسل جھٹلانے کی کوشش میں تھی، وہ اب پوری آب و تاب کے ساتھ اس کے دل میں بھی محبت بن کر روشن ہو چکا تھا۔ مہرو کا دل بے قرار......ہر گھڑی اب سانول......سانول پکار رہا تھا مگر وہ نہ

جانے کہاں تھا؟ کل سارا دن اس نے اسے تلاش کیا تھا۔ فائنل ایگزام تھے اور ایک یا دو ہی اسپیشل لیکچرز ہوتے تھے۔ بارہ بجے تک اسٹوڈنٹس لائبریری آ کر بیٹھ جاتے اور ''سیلف اسٹڈی'' میں مصروف ہوجاتے تھے۔ دو بجے ہاسٹل جاتے کینٹین سے کھانا کھاتے کمرے میں جا کر ایک گھنٹا قیلولہ کرکے پھر پڑھنے بیٹھ جاتے تھے۔ لوکل شہر میں رہنے والے طلبہ بھی یکسوئی کے ساتھ پڑھنے کے لیے گھر کے بجائے ہاسٹل کو ہی ترجیح دیتے تھے، جیسا کہ مہرزادی بھی آج کل اپنی کلاس میٹ ریحانہ کے ساتھ ہاسٹل میں ہی مقیم تھی۔ ورنہ تو مہرو کا شہر میں عالیشان ٹھکانا بھی تھا۔

مہرو نے پڑھائی میں بہت دل لگانے کی کوشش کی تھی مگر کتاب میں سر جھکاتی تو اس کی نگاہوں کے سامنے سانول کا چہرہ رقص کرنے لگتا۔ وہ آنکھیں بند کرلیتی تو وہ پھر بھی سامنے آجاتا، وہاں بھی اسے سانول کی شبیہہ کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔ اس کا پڑھائی میں بالکل بھی دل نہیں لگا۔

''مجھے کون سا پوزیشن لینی ہے۔ پاس ہی ہوجاؤں کافی ہے۔ فائن آرٹس ہی تو ہے۔'' وہ سوچتی۔ تاہم حقیقت یہی تھی کہ وہ بنیادی طور پر ''شارپ مائنڈ'' تھی۔ اسٹڈی کور کرہی لیتی تھی۔ یوں بھی سارا سال اسی طرح ہی پڑھا کرتی تھی جیسے کچھ ہی دنوں بعد ایگزامز ہونے والے ہوں۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کتابیں بند کیں، بیگ میں ڈالیں اور لائبریری سے باہر نکل آئی۔ بارہ بج رہے تھے۔ گرمی اور چلچلاتی دھوپ نے ہر طرف ''العطش...... العطش'' کی پکار مچا رکھی تھی۔

اس کی کار ہاسٹل کی پارکنگ میں کھڑی تھی۔ وہ اس میں بیٹھ کر سندھیالوجی میوزیم آگئی۔ دھڑکتے دل سے اس نے اندر نیلی ٹائلوں والے ہال میں قدم رکھا اور پیاسی نگاہوں نے دیدار محبوب کی تمنا چاہتے ہوئے تیزی سے گردش کی مگر وہ اسے کہیں نظر نہ آیا۔ وہ تڑپ گئی۔

''کہاں چلا گیا ہے وہ......؟ کل بھی نہیں آیا تھا۔'' اس نے سوچا۔ پھر وہ باہر نکلی اور کار میں روانہ ہوگئی۔ اب اس کا رخ جھلیل شاہ والی درگاہ کی طرف تھا۔

☆☆☆

تدفین ہوچکی تھی۔ جیسا کہ مذکور ہوچکا، صفدر اور حیا کا دنیا میں ایک دوسرے کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ لہٰذا شوہر کے مرنے کے بعد حیا اکیلی رہ گئی تھی۔ پاس پڑوس میں پرسے کے لیے عورتیں کب تک ساتھ رہتیں۔ آجا کر مائی بختاں رہ گئی۔ حیا نے سفید جوڑا پہن رکھا تھا۔ اپنے محبوب شوہر کی دائمی جدائی کا ستم رسیدہ دکھ اس کے سوگوار چہرے پر ثبت ہوکر رہ گیا تھا۔ مائی بختاں اس کے پاس بیٹھی، اسے تسلیاں اور اس کا دل بہلانے کی کوشش کررہی تھی۔

''اماں!'' معاً ہی کمرے کی محدود اور دکھ بھری فضا میں حیا کی رنجور سی آواز ابھری۔ وہ اسے بختاں کی جگہ اکثر اماں بھی کہہ دیا کرتی تھی۔

''جی، بی بی جی!'' وہ فوراً اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

''اتنے پیار کرنے والے...... اتنی جلدی اور اچانک کیوں بچھڑ جایا کرتے ہیں؟''

حیا نے خلاؤں میں غیر مرئی نقطے پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔

''بی بی جی! اتنے پیارے لوگ اللہ سائیں کو بھی تو بہت پیارے ہوتے ہیں۔ وہ شاید اسی لیے اتنی جلدی انہیں بلا لیتے ہیں اپنے پاس...... دنیا فانی ہے بی بی جی! ایک دن سب کو جانا ہے۔'' وہ اسے حوصلہ اور تسلی دینے کی کوشش کرتی۔

''اماں! اب میرا کون رہا ہے اس دنیا میں؟ اور تھا بھی کون صفدر کے سوا...... تقدیر کو مجھ پر رحم بھی نہیں آیا؟''

''نہ نہ بی بی جی نہ...... ایسا مت بولو...... تقدیر کو مت کوسو، یہ سب اس مقدر بنانے والے کے کھیل ہیں اور وہی ان کے بھید جانتا ہے۔ وہی مصلحت رکھتا ہے، اپنے بندے کی بہتری کے لیے۔ اس کی رضا میں راضی رہنے کی کوشش کریں جو سرخ رو رہتے ہیں، وہی فلاح پاتے ہیں۔'' بختاں نے سمجھایا۔ حیا سسک پڑی۔ صفدر اسے نہیں بھولتا تھا۔

''بی بی! کچھ کھالو...... تم نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔ پاس کے ایک مکان سے ناشتا اور کھانا بھی آیا تھا۔ فریج میں رکھا ہے، میں گرم کرکے لاتی ہوں۔'' کہتے ہوئے بختاں اٹھنے لگی تو حیا کو اچانک کچھ یاد آیا، بولی۔

''اماں...... وہ...... چلا گیا، یا ابھی تک ادھر ہی ہے؟''

اس کی بات پر بختاں کچھ یاد کرکے بولی۔ ''جی ہاں بی بی جی! وہ فقیر تو بے چارہ کب کا جاچکا۔''

''اچھا!'' حیا کے لبوں سے ہولے سے نکلا، بختاں کچھ سوچتی بن کر پھر دروازے کی طرف پلٹی اور کچن میں آگئی۔ کھانا گرم کیا اور ٹرے میں رکھے کمرے میں ہی لے آئی پھر حیا کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

''بی بی جی! صاحب کے گزر جانے (فوت ہوجانے) کا اس بے چارے کو بھی بڑا دکھ تھا۔ آپ نے بتایا تھا نا کہ صاحب جی اسے بہت تلاش کے بعد اور مشکلوں سے راضی کرکے یہاں لائے تھے ایک دن......؟''

”ہاں!“ حیا نے آہستگی سے کہا۔ ”وہ بالکل ویسا ہی نوجوان ہے جیسا کہ میں اور صفدر چاہتے تھے اور جیسا تم نے مجھے مشورہ دیا تھا مگر...... اب اس کا کیا فائدہ؟“

”پر بی بی جی! وہ واقعی اللہ والا بندہ ہے۔ آج کی ریاکار دنیا میں بالکل سچا اور انسانوں کے لیے ایک درد رکھنے والا......“ بخشاں بولی۔ ”وہ مجھ سے آپ کا حال پوچھنے کے بعد چلا گیا تھا، پر اس کی باتوں سے مجھے کچھ ایسا لگا ضرور تھا جیسے اس کے اندر کوئی پھانس سی چبھ گئی ہو......“

”پھانس......؟ کیسی پھانس؟“

”بس بی بی جی! ایسے لوگ بہت ہی حساس بھی تو ہوتے ہیں، ذرا ذرا سی بات پر خود کو دوسرے کا مجرم ٹھہرانے لگتے ہیں۔“

حیا کو اس کی کچھ بات سمجھ آئی کچھ نہیں، تاہم وہ چپ رہی۔

☆☆☆

مہرو نے کار درگاہ کے سامنے روک دی۔ اس نے اپنا جسم بڑی سی چادر میں ڈھانپ رکھا تھا اور اسی کا نقاب سا بنا کر چہرے پر لپیٹ لیا تھا۔

آج اسے درگاہ میں غیر معمولی سا سناٹا محسوس ہوا۔ اس نے دھڑکتے دل سے خستہ حال چوکھٹ پار کی اور اندر آگئی۔ صحن میں پیپل کے درخت کی چھاؤں کے باعث اندر ٹھنڈک کا احساس ہوتا تھا اور کچے صحن میں تازہ پانی کا چھڑکاؤ بھی اس کا رہین منت تھا۔ سخی لعل پانی کے مشکیزے بھرنے مسجد والے ہینڈ پمپ کی طرف گیا ہوا تھا۔ مہرو نے دائیں جانب حجرے کی طرف دیکھا اور اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ وہاں اسے سانول کی جھلک دکھلائی دی تھی۔ وہ فرش پر بچھی کی چٹائی پر بیٹھا تھا اور اس کے سامنے جزدان رکھا تھا۔ وہ شاید سیپارہ پڑھ رہا تھا۔ چوکھٹ کے پاس جا کر مہرو نے ہولے سے کھنکھارا...... تو سانول نے سر اٹھا کر دیکھا اور چونک پڑا۔ سیپارے کو آنکھوں سے لگا کر چوما، بند کیا اور جزدان کو ایک طرف رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا؟“ مہرو نے ہولے سے پوچھا۔

”نہیں۔“ سانول نے آہستہ سے جواب دیا۔ اپنے محبوب کو اس در پر دیکھ کر اس کا دل بھی بے طرح دھڑکنے لگا تھا۔ ایکا ایکی اسے یوں لگا جیسے اس کی ریاضتیں، عبادتیں بار آور ہونے لگی تھیں۔ اس نے اشک بہا بہا کر اپنے رب سے اس کے حصول کی جستجو اور دعائیں مانگی تھیں یا پھر سکونِ قلب کی التجا کی تھی۔ اس کے نصیب میں کیا آنے والا تھا، محبوب یا روحانی سکون...... یہ ابھی اسے معلوم نہ تھا۔ پھر وہ چونکا۔

”کہیں یہ پھر کوئی بدگمانی تو اپنے دل میں لے کر یہاں نہیں آئی ہے؟“

مگر نہیں، اسے آج مہرو کا چہرہ اور ہی رخ پر ٹھہرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی کجراری آنکھوں میں آج کسی بدگمانی کی رمق تک نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے نرم وگداز لبوں پہ کوئی طعن بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ آج وہ سانول کو سراپا حلقۂ اثر میں دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے وہ ”اپنا“...... ”آپ“ بھلا بیٹھی ہو۔

آنکھوں میں ان کہے جذبات کی آنچ سلگتی دکھائی دیتی تھی۔ نرم لبوں پہ پیاسی تمنا متحرک تھی۔ آج تو یار جبیں مثل مہتاب وآفتاب کی جھلک دیتا دکھائی دے رہا تھا۔

سانول چوکھٹ کے اس پار تھا اور وہ اس پار...... دونوں چند ثانیے اسی طرح ہی نگاہیں چار کیے رہے۔ آنکھوں ہی آنکھوں کے رستے جیسے ایک دوسرے کے دل میں اترتے رہے، ایک دوسرے کو عالم محویت میں دیکھ کر سیر ہوتے رہے۔ ایسے ہی عالم میں مہرو نے جب بے اختیار چوکھٹ پار کرنا چاہی تو اس کے قدموں کے ارتعاش نے اسے چوکھٹ پر ذرا لڑکھڑا دیا۔ وہ اندر کو گرنے لگی تھی کہ پل کے پل سانول نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور مہرو نے پورے جی جان کے ساتھ اس کے بازوؤں میں اپنا نیم تن وجود سما دیا۔ مہرو کے ریشمی گھنے بال سانول کے چہرے پر آن گرے اور ایکا ایکی اسے یوں لگا جیسے وہ اس تپتی سلگتی دھوپ میں کسی شجر چھایادار تلے آگیا ہو۔ جیسے آج دنیا کا خزانہ اس کی دسترس تلے آگیا ہو۔ مہرو کو بھی سانول کی قربت میں ایک انوکھی لذت وسرشاری کا احساس ہوا اور...... ایسا ہوا کہ اسی وقت اس کے دل سے یہ دعا ابھری کہ یہ گھڑیاں رک جائیں، فضا تھم جائے اور وہ اسی طرح اپنے محبوب کے قرب سے سیراب ہوتی رہے۔

بے خودی کا یہی عالم اس وقت تڑ خاجب جانے کس جذبے کے تحت مہرو اس کے سینے سے لگی سسک پڑی...... سانول چونکا اور پوچھا۔

”کیا ہوا مہرو......؟ تم رو کیوں پڑیں......؟“

”سوچتی ہوں، کیا یہ ہمارا ساتھ اٹوٹ رہے گا؟“ مہرو نے اپنا اشک آلود گال سانول کے فراخ سینے پر رگڑتے ہوئے مہجور سے لہجے میں کہا۔ ”مجھے اپنی عالیشان حویلی سے ڈر لگتا ہے۔“

''زور محبت کے آگے تو محلات کی دیواریں بھی لرز جاتی ہیں مہرو...... یہ حویلی کیا شے ہے۔''

''تم سچ کہتے ہو؟'' مہرو نے اس سے جدا ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں مہرو! یہ بالکل ایسا ہی سچ ہے جیسے تمہاری یہاں موجودگی ایک اٹل حقیقت ہے۔''

''لیکن ...... ہمیں جدا کرنے والے بہت طاقت در ہیں، زمین و آسمان کی ایک بڑے تفاوت کی دیوار ہمارے بیچ میں ہے۔ کیا تم اسے گرا سکو گے؟''

''پگلی! کیا تم امارت اور ان سنگی دیواروں کو کوہِ شکن اور مضبوط ارادوں سے زیادہ پختہ سمجھتی ہو؟''

''نہیں مگر...... مجھے اپنی فکر نہیں ہے، ڈرتی ہوں کہیں تم امارت اور اونچی دیواروں کے نیچے نہ دبا دیے جاؤ۔''

''اتنا بے حیثیت سمجھتی ہو تم اپنے سانول کو...... تو پھر میری محبت کا بھروسا بھی مت کرو......''

''نہیں ...... نہیں، سانول! میرا بھروسا اور میرا اٹل اعتماد تو اب صرف تم ہی ہو۔''

''بس! یہی ارادہ دل میں لیے رکھو...... ہماری محبت ایک پاکیزہ جذبے کی رہینِ منت ہے۔ اس میں کوئی ریا نہیں، کسی نفسی خواہش کا دخل نہیں...... یہ دو دلوں کا ہی نہیں روحوں کا بھی ملاپ ہے۔''

''بے شک......'' مہرو کے مرتعش لبوں سے بے اختیار نکلا۔

''مگر مہرو......!'' سانول کچھ کہتے کہتے رہ گیا۔ مہرو نے بے قراری سے پوچھ لیا۔

''مگر کیا سانول...... کیا اب بھی ہمارے بیچ اگر مگر کی کوئی دیوار ہے؟''

''میں زندگی کی بعض تلخ حقیقتوں سے ڈرتا بھی ہوں...... تم ناز و نعم میں پلی بڑھی ہو اور میں تمہیں شاید وہ سب نہ دے سکوں...... تم نے عیش و عشرت کی جو زندگی بسر کی ہے، وہ میرے پاس تمہیں کہاں ملے گی؟''

اس کی بات پر مہرو نے ایک تلخ سی مسکراہٹ سے کہا۔ ''ہونہہ...... ناز و نعم، عیش و عشرت...... یہ سب سونے کے پنجرے اور شیشے کے قفس ہیں، جن میں ہم جیسی کونجیں قید رہتی ہیں۔ جنہیں اپنی مرضی سے زندگی گزارنا تو کیا، سانس لینے کی بھی اجازت لینا پڑتی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' سانول نے حیرت سے کہا۔

''میری ایک پھوپی تھیں، کونجاں نام تھا ان کا...... جوان تھیں۔ زمین و جائداد کے معاملات کے باعث اسے کسی ادھیڑ عمر آدمی سے بیاہ دیا گیا۔ اس پر بھی پھوپی کونجاں کو کوئی اعتراض نہ تھا مگر وہ شخص بدکار اور شرابی تھا، بیوی کو کسی نوکرانی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ معاملہ داری ایسی تھی کہ اس کی شکایت پر بابا جانی بھی اپنی بہن کے لیے کچھ کرنے سے لاچار تھے۔ یوں بھی انہیں کوئی پروا نہ تھی۔ بالآخر وہ بے چاری اسی طرح سسک سسک کر ایک دن مر گئی۔''

''اوہ...... بہت دکھ ہوا تمہاری پھوپی کونجاں کے بارے میں یہ سن کر۔'' سانول تاسف بھرے لہجے میں بولا۔ وہ مہرو سے کسی اور بات کا بھی اظہار کرنا چاہتا تھا مگر چپ رہا۔

دونوں تھوڑی دیر تک حجرے کے اسی کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ دید کی پیاس بجھاتے رہے، میٹھے لہجوں کی فسوں کاری کا لطف اٹھاتے رہے۔ اس کے بعد سخی لعل کی آمد پر وہ دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے جدا ہو گئے۔

☆☆☆

دن گزرتے گئے، دو دیوانے ملتے رہے۔ ایک دوسرے کی محبت پا کر وہ اپنی اپنی تنہائیوں میں یوں سرشار رہنے لگے جیسے ان دو دیوانوں فرزانوں نے دنیا کی سب سے بڑی دولت پالی ہو۔

اس دوران سانول کا شانہ حیا بھی جاتا رہا۔ حیا ابھی عدت میں تھی۔ وہ اس سے تو نہیں ملتا تھا مگر اس کی خیر خیریت پوچھتے رہنا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ سانول ان دونوں میاں بیوی کی اس رات کی مہمان نوازی نہیں بھولا تھا۔ ان کا اخلاق، محبت اور خلوص اور وہ بات جو حیا کے مرحوم شوہر صفدر نے اس سے کہی وہ آج تک نہیں بھولا...... پھر ایسے میں جانے کیوں سانول کو صفدر کی وہ باتیں یاد آنے لگیں۔

''دیکھو سانول! میں اپنے لیے نیکوکاری یا پارسائی کا دعویٰ تو نہیں کرتا مگر کوشش یہی ہوتی ہے کہ میری ذات سے نہ کسی کو نقصان پہنچے نہ ہی کسی کا دل دکھے۔ پھر بھی بندہ بشر ہوں، خطا کا پتلا ہوں۔ اللہ کی آزمائش پر شاکر بھی رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ ٹھہرا، پھر کہنا شروع ہوا۔

''تم ایک نیک اور شریف انسان ہو مگر جب تمہیں تنگ دستی ...... میں دیکھتا ہوں تو مجھے دکھ سا ہوتا ہے۔ بس، میری یہ خواہش ہے کہ تمہارا کھانا پینا، رہن سہن سب میں اپنے ذمے لے لوں۔ مجھے اس سے دلی سکون نصیب ہوگا۔ مجھے یقین ہے تم انکار نہیں کرو گے۔ یہی میں نے تم سے کہنا تھا۔''

سانول نے اس کی بات غور سے سنی تھی، پھر مسکرا کر بولا۔

''سائیں! اللہ آپ کو خوشیاں دے، میں جس حال میں بھی ہوں اس میں خوش ہوں۔ میرا خیال ہے مجھ سے زیادہ مستحق

لوگ دنیا میں پڑے ہیں۔ آپ نے ایسا کچھ کرنا ہی ہے تو ان کے لیے کردیں۔ مجھ فقیر کی تو یوں بھی احتیاجات بہت محدود ہیں۔ کھانا کھلانے کا شکریہ...... میں اب چلوں گا۔"

یہ کہتے ہوئے سانول اٹھ کھڑا ہوا......

"بیٹھو، ابھی رات ہوگئی ہے۔ کل صبح میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

"مجھے صرف اپنے ٹھکانے پر ہی نیند آتی ہے جہاں میں کچے فرش پر بھی کی چٹائی بچھا کر سوتا ہوں۔ یہاں نرم بستر میرے لیے کانٹوں کا بچھونا نہ بن جائے۔ چلتا ہوں۔"

سانول یہ کہہ کر جانے لگا۔ اثنائے راہ...... حیا سر پر دوپٹا رکھے وہاں آ گئی۔ سانول نے فوراً اپنی نظریں جھکالیں۔ حیا نے اسے سلام کیا، اس نے بھی ہولے سے جواب دیا اور صفدر کی طرف دیکھا۔

"یہ میری بیوی ہے حیا...... اس کے لیے دعا کی درخواست کروں گا تم سے......" صفدر نے سانول سے کہا۔

"اللہ سائیں اس کی حیا اور پردہ سلامت رکھے۔" سانول نے دعائیہ کہا اور پوچھا۔

"کیا یہ بیمار ہے؟"

"نہیں، بیمار تو نہیں ہے، پر ہماری شادی کو کئی برس بیت چکے ہیں مگر ابھی تک اس کی گود ہری نہیں ہوسکی ہے۔" صفدر نے یہ بات اس سے ذرا ڈرتے ڈرتے کہی تھی، کیونکہ اسے پتا تھا کہ اس طرح کی باتوں سے سانول ناراض ہوجاتا تھا۔ تاہم ایسا کچھ نہیں ہوا اور سانول نے کہا۔

"یہ سب اللہ سائیں کی حکمتیں ہیں جسے ہم انسان سمجھنے سے قاصر ہیں۔ خوش وہی لوگ رہتے ہیں جو ہر حال میں ربّ سائیں کا شکر کرتے ہیں۔ انسانیت کے ناتے میرا فرض بنتا ہے کہ میں اللہ سائیں سے آپ دونوں کی بہتری کی دعا کروں گا......"

صفدر کی حادثاتی موت کے بعد یہی ایک پھانس کھائے جارہی تھی کہ صفدر اور اس کی بیوی حیا اس سے کیا چاہتے تھے۔ اس نے بھی انہیں کوئی تعویذ گنڈا نہیں دیا تھا، بس ایک عام انسانی... ہمدردی کے جذبے تلے ان کے لیے دعا کی تھی مگر اسی رات کو جب صفدر اسے درگاہ چھوڑ کر اپنے گھر لوٹ رہا تھا تو اس کی کار کو حادثہ پیش آ گیا اور وہ جاں بحق ہوگیا۔ سانول کے دل میں وہی رات بوجھ سی بن گئی تھی۔ وہ لاکھ خود کو سمجھانے کی کوشش کرتا کہ اس میں اس کا بھلا کیا دوش تھا۔ مگر پھر ایک سوال پھانس بن کر اس کے گلے میں اٹک جاتا تھا۔

"اگر اس رات میں اس کے ساتھ نہ جاتا اور نہ اسے مجھے چھوڑنے کے لیے .... واپس لوٹنا پڑتا تو ...... یہ حادثہ پیش نہ آتا ...... تو کیا یہ سب اس کی وجہ سے ہوا تھا؟"

میں نے ان دونوں دکھی میاں بیوی کے لیے یہ کیسی دعا مانگی تھی۔ ان کا مکین بڑھانے کے بجائے ایک کم کر دیا تھا؟

سانول ایسی باتوں پر یقین تو نہیں رکھتا تھا مگر وہ بھی ایک عام سا ہی انسان تھا۔ بعض حالات کی غیر متوقع "پرفیکشن" ایسی ہوجاتی ہے کہ انسان کا خیال نہ چاہتے ہوئے بھی ایسی باتوں کو سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ صفدر کا اخلاق اور اس کی قدر نوازی کو سانول ایک لمحے کے لیے بھی نہ بھولا تھا۔ دولت مند ہونے کے باوجود اس نے ایک غریب فقیر کے ساتھ راہ و رسم رکھی تھی، اس لیے کہ وہ اسے نیک اور اللہ والا بندہ سمجھتا تھا اور اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھنے کی بھی خواہش کا اس نے بڑے خلوص اور اصرار کے ساتھ اظہار کیا تھا مگر سانول نے مسکرا کر اس کی بات کو ٹال دیا تھا۔

سانول نے نمازوں اور سجدوں میں گر گر خدا سے دعا مانگی تھی کہ وہ صفدر کی مغفرت فرمائے اور ساتھ ہی اس کے دل کو بھی سکون عطا فرمائے۔

سانول کا دل اسی روز سے ایک نامعلوم سی بے چینی کا شکار رہنے لگا تھا اور یوں وہ اپنی بے چینی کو اسی طرح رفع کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ کاشانہ حیا جا کر مائی بختاں سے صفدر کی بیوہ کا حال پوچھ آتا تھا اور اس کے لیے دعا کرتا تھا۔

☆☆☆

ان علاقوں اور ایسی برادریوں میں زبانی کلامی طے ہوجانے والے رشتوں کو وہی اہمیت حاصل تھی جو منگنی اور نکاح کی ہوتی ہے۔ یعنی زبان دے دی تو پھر سمجھو سب کچھ بغیر لکھے پڑھے ہی طے ہوگیا اور وہ اٹل ہوگیا۔ باقی چیزوں کو تو محض خانہ پری ہی سمجھ کر کیا جاتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ چالاک ارباب نے اگلے دن ہی اپنے باپ کے ذریعے پہلے تو سردار وسایو خان کے ذریعے رئیس بنگل خان کے کانوں میں یہ بات ڈلوادی کہ زمیندار اللہ ورایو اس کی بیٹی مہرو کے لیے اپنے بیٹے ارباب کے رشتے کے لیے بات کرنے آرہا ہے۔ یوں اس نے اس کی سفارش بھی کردی۔ سرداری نظام تھا، رئیس بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ یوں بھی زمیندار اللہ ورایو اس کا ہم پلہ تھا، پھر بیٹی کی بھی شادی تو کرنا ہی تھی۔ اس نے اپنی بیوی حاکم زادی کو یہ بات بتائی۔ اسے بھی کوئی اعتراض نہ ہوا مگر ماں تھی اسی لیے اس نے ڈرتے ڈرتے شوہر سے اتنا ضرور کہا تھا۔

"سائیں! یہ ہماری رانی بیٹی مہرو کی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ ہے۔ بہتر نہ ہوتا کہ اس سے بھی پوچھ لیا جاتا......؟"

''حاکماں......'' بیوی کی بات پر رئیس تیز لہجے میں بولا۔ ''ہمارے خاندانوں میں ایسے فیصلے عورتوں کی مرضی سے نہیں، مردوں کی مرضی سے ہوتے ہیں۔ کیا ہم اپنی بیٹی کے لیے برا فیصلہ کریں گے؟ زمیندار اللہ ورایو اچھا آدمی ہے۔ ہم پلہ بھی ہے۔ دل کا صاف بھی، حالانکہ اس روز میں نے زمین کے معاملے میں اس سے سخت لہجے میں بات کی تھی مگر اس نے بالکل بھی برا نہیں منایا۔ بعد میں ہمیں بھی اپنے کیے پر شرمندگی ہوئی تھی کہ اس نے بات ہی تو کی تھی، کون سا زبردستی کررہا تھا۔''

حاکم زادی چپ رہی۔

اسی روز زمیندار اللہ ورایو اس کی حویلی آیا تو رئیس نے بڑے پُرتپاک انداز میں اس کا استقبال کیا۔ زمیندار اللہ ورایو بھی ایک بھاری بھرکم شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے پہلے دوستانہ ماحول بناتے ہوئے رئیس کے گلے ملتے ہی ہنستے ہوئے اس سے کہا تھا۔

''رئیس! پہلے کی طرح ناراض مت ہوجانا یار! میں زمین کی بات کرنے نہیں آیا تیرے سے......'' اس پر رئیس نے قہقہہ بلند کیا تھا۔

مہرو کی ارباب سے بات پکی ہوگئی اور مہرو کو پتا بھی نہ چلا۔ وہ ہاسٹل میں اپنے ایگزامز کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ ادھر ارباب نے وعدے کے مطابق مراد خان کو چھ کروڑ کی رقم پہلے بہ طور قرض دے دی، جو شادی کے بعد عوضے کی صورت میں معاف ہوجانی تھی۔ مراد کا کام بن گیا۔

ماں حاکم زادی نے بھی اس بات کو کوئی خاص اہمیت نہ دی کہ وہ بیٹی کو بتائے، وہ یہ سمجھ کر خاموش رہی کہ آخر کو جوان بیٹی کی شادی کسی سے کرنا ہی تھی، جبکہ اب تو اس کی پڑھائی بھی ختم ہونے والی تھی اور وہ اپنے سالانہ امتحان میں بھی مصروف تھی۔ پھر وہ خود بھی چاہتی تھی کہ جوان بیٹی ہے جتنی جلدی اس کے فرض سے سبکدوش ہوجائے اتنا ہی اچھا ہے۔

دن گزرتے رہے۔ ادھر مہرو اور سانول کی ملاقاتیں بھی چلتی رہیں۔ اس کے ایگزامز بھی شروع ہوگئے تھے۔

ادھر حیا بھی عدت گزار چکی تھی۔ مائی بخشاں کے ذریعے اسے یہ خبر ملتی رہتی تھی کہ وہ سانول نامی نوجوان، چاہے تھوڑی دیر کے لیے سہی مگر اس کی خیریت اماں بخشاں سے پوچھنے آتا رہتا تھا۔ دونوں یہ بات جانتی تھیں کہ یہ سادہ لوح فقیر سا لڑکا محض خداترسی اور انسانی ہمدردی کے لیے ایسا کرتا تھا اور اس میں کسی اور جذبے کا کوئی تعلق نہ تھا مگر جانے کیا بات تھی کہ عدت گزارنے کے بعد حیا نے سوچا کہ اس بار وہ خود اس سے ملے گی اور اسے اب آنے سے ہمیشہ کے لیے منع کردے گی۔

شوہر کی وفات کے بعد حیا نے اسی کمپنی میں نوکری کے لیے درخواست دے دی تھی، جہاں صفدر ایک اچھی پوسٹ پر فائز تھا مگر حیا کو معمولی پوسٹ پر رکھا گیا تھا، اس کے لیے یہی بہت تھا کہ نوکری تو مل گئی تھی۔ زندگی کی گاڑی تو کھینچنا تھی۔ طویل سفر تھا، پھر جوانی کی عمر میں بیوگی کا داغ سہتے رہنا بھی تو کسی امتحان سے کم نہ تھا۔ یوں اس نے خود کو مصروف رکھنے کا بھی طریقہ نکال لیا تھا کہ اس نے معمولی ملازمت بھی قبول کرلی تھی۔

☆☆☆

''سانول! تم سے ایک بات کہوں......؟''

اس روز مہرو دوسرا پیپر دے کر ہاسٹل لوٹی تھی اور اب تیسرے پیپر میں چند روز کا گیپ تھا۔ وہ اسی دن سہ پہر میں جلیل شاہ کی درگاہ آگئی تھی۔ یہ وقت سانول نے ہی اسے بتایا تھا۔ سخی لعل پانی وغیرہ بھرنے چلا جاتا تھا اور لوگ بھی نہیں ہوتے تھے۔ انہیں تنہائی میں تھوڑا بہت باتیں کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ وہ حجرے میں آجاتے تھے۔

''ہاں کہو۔'' سانول نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''میرا خیال ہے مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے۔ میرا مطلب ہے، ہمیں کہیں اور ملتے رہنا ہوگا۔'' مہرو نے سنجیدگی سے کہا۔

''وہ کیوں؟''

''دیکھو نا سانول! یہ ہماری جاگیر کا علاقہ ہے، لوگ آتے جاتے ہیں۔ مجھے کبھی کسی نے تمہارے ساتھ دیکھ لیا تو...... بات آگے تک نہ چلی جائے۔ میں نہیں چاہتی کہ ابھی سے ہماری کسی قسم کی تعلق داری کی بھنک بھی کسی کے کانوں میں پڑے۔''

اس کی بات سن کر سانول سوچنے لگا تو مہرو نے ہی ملائمت آمیز مسکراہٹ سے کہا۔

''ہم کہیں باہر مل لیا کریں گے، میرا مطلب ہے کسی ریسٹورنٹ میں......''

''ہاں! ٹھیک ہے لیکن......'' کہتے ہوئے سانول نے سر جھکا کر اپنے گریبان میں دیکھا۔ مہرو اس کا مطلب سمجھ کر دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

''تم میری ایک بات مانو گے سانول!''

''کہو، کیوں نہیں مانوں گا!'' وہ اس کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم اب اپنا حلیہ بدل لو...... تم ایک پڑھے لکھے نوجوان ہو۔ میٹرک پاس ہو، آگے بھی پڑھ سکتے ہو۔ ڈاڑھی اور مونچھیں

بے شک رہنے دو مگر یہ کپڑے اور...... اور یہ جگہ بدل لو......"

"میں یہاں عبادت کرتا ہوں۔"

"اللہ کی عبادت تو کہیں بھی کی جاسکتی ہے۔اس سے تمہیں کب روک رہی ہوں میں ......لیکن میں چاہتی ہوں تم آگے پڑھو، محنت کرو، کوئی کام کرو......اس طرح اللہ سائیں کی عبادت بھی کرتے رہو گے تو اور زیادہ ثواب ملے گا۔دیکھو نا......دنیاوی معاملات چلانا بھی تو انسان کی مجبوری ہے نا......تم جوان ہو، صحت مند ہو اور پہلے بھی تم کام کرتے رہے ہو......اور کام میں بھی عظمت ہے۔"

اس کی بات سن کر سانول سوچ میں پڑ گیا۔مہرو سمجھ گئی کہ وہ اس کی بات پر غور کرنے پر مجبور ہو گیا ہے تو وہ اسے اور بھی کچھ بتانے لگی۔

☆☆☆

چند دنوں میں ہی سانول کا رنگ ڈھنگ بدل گیا۔اس نے فقیر ملنگوں والا لباس اتار کر اس کی جگہ عام شلوار سوٹ پہن لیا۔باربر شاپ میں بال وغیرہ بنوائے۔یکتارا درگاہ میں ہی چھوڑ دیا۔گوٹھ میں اس کا اپنا گھر تھا جہاں اس کے دور کے رشتے دار ایک بوڑھا آدمی رحیم بخش رہتا تھا۔وہ بھی اسے دیکھ کر خوش ہوا تھا۔وہ بیل گاڑیاں مرمت کرنے کا کام کرتا تھا مگر سانول کوئی ایسا ڈھنگ کا کام کرنا چاہتا تھا کہ نوکری کے ساتھ اپنی پڑھائی بھی آگے جاری رکھ سکے۔اس کے لیے اس نے جامشورو ٹھوڑی پھاٹک میں اخبار بیچنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

حیا کی زندگی جیسے تیسے گزر رہی تھی۔اس کا خیال تھا کہ وہ نوکری کرے گی تو اس طرح مصروف ہو کر اس کی تنہائی بھی کم ہو گی مگر ایسی تنہائیوں کو کم کرنے کی جس قدر بھی کوشش کی جائے وہ اتنی ہی بڑھتی ہیں ساتھ ہی اسے ایک اور تلخ حقیقت کا بھی احساس ہوا تھا۔بہت جلد اسے احساس ہونے لگا تھا کہ جوانی میں بیوگی کا داغ کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے،اس پر بیوہ خوبصورت بھی ہو اور ایک بڑے گھر کی مالکہ بھی ہو تو کیسے کیسے لوگ شکروں اور گدوں کی طرح گرسنہ نظروں سے اسے گھورنے لگتے ہیں۔حیا کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا رہا تھا۔اس نئی صورت حال نے اسے اور بھی پریشان سا کر دیا تھا،تاہم وہ بہت لیے دیے رہنے لگی۔اسے احساس ہونے لگا تھا کہ ایک مرد کے بغیر پہاڑ سی زندگی بسر کرنا کس قدر دشوار تھا اکیلی اور جوان ......عورت کا اس معاشرے میں گزارہ کس قدر کٹھن اور کڑا امتحان ہوتا ہے،وہ اس سے گزر رہی تھی۔

اس روز وہ دفتر سے گھر پہنچی، غسل وغیرہ کر کے اس نے کھانا کھایا۔بخشاں مائی اب مستقل اس کے ساتھ رہنے لگی تھی۔حیا جس وقت کمرے میں بیٹھی چائے پی رہی تھی تو اس نے بتایا۔

"بی بی جی! وہ آیا ہے......سانول......!"

حیا چونکی، پھر بے تاثر لہجے میں بولی۔"میں نے تم سے کہا تھا کہ وہ اس بار آئے تو اسے دوبارہ آنے سے منع کر دینا۔"

"جی اچھا بی بی جی! بھول گئی تھی، جاتی ہوں......" یہ کہہ کر مائی بخشاں پلٹی تو حیا نے اسے پکارا۔

"ٹھہرو......! اسے اندر بلالو......"

"جی اچھا بی بی جی!"

حیا سوچنے لگی کہ یہ شخص کیوں آتا ہے؟ اس نے کبھی اس سے ملنے کی خواہش کا بھی اظہار نہ کیا تھا مائی بخشاں سے...... بس! اس کی خیر خیریت پوچھتا اور خاموشی سے لوٹ جاتا تھا۔ شاید فقیر منش آدمی ہے۔ صفدر نے اس کے ساتھ اچھا سلوک روا رکھا تھا یا پھر شاید اپنی گزر بسر کرنے کے لیے کچھ مانگنا چاہتا ہو...... اچھا ہے کہ میں خود ہی اس سے بات کر کے ہمیشہ کے لیے یہاں آنے سے منع کر دوں۔

مائی بخشاں جب سانول کو لے کر کمرے میں آئی تو حیا اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو حیرت زدہ سی رہ گئی۔ وہ اسے صفدر کے ساتھ ایک بار پہلے بھی دیکھ چکی تھی جب وہ یہاں آیا تھا۔ اس وقت وہ فقیروں کے حلیے میں تھا مگر اب وہ بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ڈاڑھی مونچھیں تو اپنی جگہ اب بھی موجود تھیں مگر حلیہ اور لباس اب اس کا کچھ ڈھنگ کا نظر آنے لگا تھا۔ لمبے کھچڑی بال اب ترشوا کر سیٹ کر لیے گئے تھے اور اس کے خدوخال میں اب ایک سلیقہ دیکھنے میں آ رہا تھا۔ اس نے نظر حیا پر ڈالے بغیر سر جھکا کر سلام کیا اور بولا۔

"بی بی صاحبہ! مجھے صاحب جی (صفدر) کے انتقال پر بے حد افسوس ہے، اللہ سائیں ان کی مغفرت فرمائے۔"

"آمین......" حیا نے آہستگی سے زیر لب کہا۔ پھر چند ثانیے بہ غور اس کا جائزہ لیتی رہی۔ بس، حلیہ ہی بدلا تھا، باقی انداز وہی تھا۔ سادہ، نیک اور سچا......

"تقدیر سے انسان نہیں لڑ سکتا، جو خدا کو منظور...... تم کیسے ہو؟ بیٹھ جاؤ......" حیا نے کہا۔

"نہیں بی بی جی! میں اب چلوں گا۔" وہ اسی طرح اپنا سر جھکائے ہوئے بولا۔ حیا نے دیکھا اس کے چہرے پر ایک دباؤ کی سی کیفیت کروٹیں لے رہی تھی، جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو......

"کیا بات ہے، تم کچھ پریشان سے ہو؟ کسی مدد کی ضرورت ہے؟"

"نن...... نہیں، بی بی جی! میں اس لیے نہیں آیا...... ہوں، وہ......" سانول کچھ کہتے کہتے رکا تو حیا نے اسے مہمیز کیا۔

"ہاں...... ہاں بولو...... کیا کہنا چاہتے ہو......؟"

"بی بی جی! کیا آپ ایسا سمجھتی ہیں کہ صاحب جی کی موت کا سبب میں تھا......؟"

حیا اس کی بات پر چونکی تھی۔ بولی۔ "بالکل بھی نہیں، بھلا تمہارا اس میں کیا قصور؟"

"مگر بی بی جی! میں ایسا سمجھتا ہوں......" وہ بولا۔ "اگر وہ اس رات مجھے درگاہ چھوڑنے نہ جاتے، یا مجھے لے کر یہاں نہ آتے تو...... شاید یہ سب نہ ہوتا......"

حیا کو اس کی بات پر ایک جھٹکا سا لگا، وہ بہ غور اس کا جھکا جھکا چہرہ تکنے لگی، جہاں ایک ایسے احساس کی تپش سلگتی محسوس ہو رہی تھی جیسے کوئی اندر ہی اندر پک رہا ہو۔ اسے چند ہی روز پہلے کی مائی بخشاں کی وہ بات یاد آ گئی تھی جو اس نے اس سے کہی تھی۔

"پر بی بی جی! وہ واقعی اللہ والا بندہ ہے۔ آج کی ریاکار دنیا میں بالکل سچا اور انسانوں کے لیے ایک درد رکھنے والا...... بس! کچھ ایسا لگتا ہے جیسے وہ اندر ہی اندر کسی پھانس کا شکار ہے اور شاید اپنی بے چینی دور کرنے آتا ہے۔"

حیا کو اس کا یہ انداز متاثر کرنے لگا، وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ "تم بیٹھو گے، تو میں تمہیں بتا سکتی ہوں کہ اس میں کس کا کتنا قصور تھا۔"

سانول خاموشی سے ایک صوفے پر ٹک کر بیٹھ گیا۔ حیا کو ایکا ایکی ہی اس نوجوان میں ایک نامعلوم سی دلچسپی کا احساس ہوا، آگے بولی۔

"کچھ منگواؤں تمہارے لیے......؟"

"نہیں بی بی جی! شکریہ اس کی ضرورت نہیں۔" سانول نے کہا۔

حیا دوبارہ بیٹھ گئی اور بولی۔ "جس کی جتنی اور جیسے لکھی ہوتی ہے، وہ اتنی ہی زندگی گزارتا ہے۔ باقی باتیں رہ جاتی ہیں یہ نہ ہوتا تو ایسا نہ ہوتا وغیرہ...... اس لیے تم بھی اپنے دل سے اس طرح کا بوجھ نکال پھینکو...... اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تم بھی انجان تھے اور صفدر بھی بلکہ صفدر تو خود تمہیں لینے گئے تھے۔ اس کی وجہ بھی تم جانتے ہی ہو...... میرا خیال ہے اب تمہارا ضمیر ہلکا ہو جانا چاہیے......؟"

سانول نے پہلی بار اچانک اپنا سر اٹھا کر حیا کی طرف دیکھا۔ وہ شاید اس کی بات کی سچائی کا عکس اس کے چہرے کے تاثرات سے میل کھاتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ حیا کی نگاہوں کی چمک بھی پہلی بار سر اٹھا کر اسے اپنی طرف یوں تکتا پا کر ذرا افزوں ہوئی تھی۔

کچھ ایسی ہی حقیقت بھی تھی کہ سانول ایک آخری بار حیا سے ملنے کا اسی لیے خواہشمند تھا کہ...... وہ اس سلسلے میں حیا کے خیالات جان کر اپنی پھانس دور کر لے۔ اسے کچھ تسلی ہوئی تھی۔ بولا۔

"بی بی جی! بعض حالات میں حقوق اللہ سے پہلے حقوق العباد کا درجہ مقدم پاتا ہے، یہ اللہ سائیں کا ہی حکم ہے

کہ اگر تم سے کسی بندے کو کوئی دکھ پہنچا ہے تو پہلے اس دکھی بندے سے معافی مانگو...... مجھ سے بعد میں...... اب آپ کے خیالات جان کر مجھے کافی تسلی ہوگئی۔ میں اب چلوں گا...... اللہ سائیں آپ کا حامی و ناصر ہو آمین......'' وہ یہ کہہ کر صوفے سے اٹھنے لگا تھا کہ حیا نے اچانک تڑپ کر کہا۔

''مگر...... تم نے مجھے کوئی دکھ نہیں دیا، ایسا کبھی مت سمجھنا......''

اس کی بات پر سانول گہرے لہجے میں بولا۔ ''بی بی جی! انسان کے دل میں دکھ کی شمع جلتی رہے تو دل جوئی کی پھونک مار کے بجھانا بھی تو انسانوں کا ہی فرض ہوتا ہے نا......''

حیا اس کی بات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ پائی۔ کہاں تو اس نے مائی بخشاں کو یہ کہہ رکھا تھا کہ اس بار سانول آئے تو اسے دروازے سے ہی رخصت کردے مگر اب اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ایسی سچی، پُرحقیقت اور نیک گفتگو کرنے والا یہ نوجوان اسی طرح اس کے سامنے بیٹھا رہے اور وہ اس کی روحانی باتوں کی پاکیزگی میں محو رہے۔ کچھ سوچ کر فوراً بولی۔

''اگر ایسا ہے تو میں بھی چاہوں گی کہ کوئی اللہ کا نیک بندہ اسی طرح میرا دکھ کم کرتا رہے۔'' سانول خاموش رہا تو حیا نے اچانک موضوع بدلتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''تمہارے پہلے والے حلیے کے مقابلے میں یہ حلیہ اچھا دکھائی دیتا ہے۔ تم مجھے خاصے پڑھے لکھے لگتے ہو مگر تمہاری باتوں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ تم بہت باشعور اور بالغ النظر انسان ہو...... تم نے بہت کچھ...... پڑھ ڈالا ہے تم کوئی اچھی سی نوکری کیوں نہیں کرلیتے، بلکہ تمہیں آگے بھی پڑھنا چاہیے......''

''نوکری تو میں کرنا چاہتا ہوں بی بی جی اور آگے پڑھنا بھی۔'' سانول نے مہرو کی خواہش کو سامنے رکھتے ہوئے فوراً جواب دیا۔ حیا نے اسے اپنے دفتر آنے کا پتا دے دیا۔ سانول اس کا شکریہ ادا کرکے چلا گیا۔

سانول کو حیا کی یہ نوکری کرنے والی تجویز اچھی لگی تھی کیونکہ مہرو کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ کسی اچھی جگہ پر نوکری سے لگ جائے۔

وہ ابھی مہرو کو یہ ادھوری خوش خبری نہیں سنانا چاہتا تھا مگر تاخیر بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اگلے دن ہی حیا کے بتائے ہوئے دفتر کا رخ کیا اور اس سے جا کر ملا۔ اس کے بعد کچھ ضروری اسناد وغیرہ اس سے طلب کی گئیں اور وہاں اسے فائلنگ اینڈ کمپائلنگ کے شعبے میں لگا دیا گیا۔ نیز اس جاب میں آگے ترقی کرنے کے بھی امکانات روشن تھے۔ ساتھ ہی

کاٹ کھانے کو

ایک دوست نے دوسرے دوست کو بتایا۔
''میں نے شادی اس لیے کی تھی کہ شام کو گھر پہنچنے پر اکیلا گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔''
''پھر اب کیا پریشانی ہے؟'' دوست نے پوچھا۔
''اب بیوی کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔''
اس نے جواب دیا۔
مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ

اس نے پرائیویٹ طور پر بھی تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ یوں وہ حیا کا بھی تہ دل سے شکر گزار تھا جبکہ حیا کو اس بات کی خوشی تھی کہ سانول اب عام انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

مہرو کو اپنی زندگی کے سب سے بڑے اور اہم فیصلے کے بارے میں بہت پہلے ہی سے یہ ایک نامعلوم سا خوف کسی بچے کی طرح اس کے لاشعور میں چھپا ڈراتا رہتا تھا کہ کہیں اس کے ساتھ بھی ویسا ہی نہ ہوجائے جو اس کی بدنصیب پھوپی کونجاں کے ساتھ ہوچکا تھا اور یہ خوف...... اس وقت حقیقت کا روپ دھارنے لگا تھا جب اسے ماں کے ذریعے یہ پتا چلا کہ اس کا رشتہ بھی اس کی مرضی جانے بغیر زمیندار اللہ ورایو کے بیٹے ارباب سے طے کردیا گیا تھا۔ وہ بہت روئی اور ماں کے گلے لگ کر شدید احتجاج بھی کیا مگر جانتی تھی کہ انکار کی صورت میں باپ اور بھائی اس کا کیا حشر کرڈالیں گے...... یہ حشر تو کسی ایک دن ہونا ہی تھا۔ اسے بھی بتا دیا گیا تھا کہ وہ آخری پرچہ دیتے ہی فوراً ہی حویلی کا رخ کرے مگر مہرو کو اب اس حویلی سے ہی شدید نفرت ہونے لگی تھی جہاں جابر مردوں کا قبضہ تھا۔ مہرو نے آگے تعلیم ہی اس لیے حاصل کی تھی کہ وہ اپنے علم کو ''ایکسپریس'' کرے گی مگر وہ بھول گئی تھی کہ وہ جس سماج سے تعلق رکھتی تھی وہاں ایک عورت کو ایک پنجرے سے دوسرے پنجرے میں مقید کرنا اس کا ازلی مقدر قرار پاتا ہے۔ ایسی گھٹن آمیز فضا میں اسے سانول کا ساتھ بڑا جاں فزا محسوس ہونے لگا۔ اس نے تہیہ کرلیا کہ آخری پرچہ دینے کے بعد وہ حویلی کا رخ کبھی نہیں کرے گی۔ چاہے زمین آسمان ایک ہوجائیں، وہ پھوپی کونجاں نہیں بنے گی...... کبھی نہیں۔

اس روز آخری پرچہ تھا۔ اس نے سانول کو ایک دن پہلے ہی ٹھوڑی پھاٹک والے ایک ریسٹورنٹ میں آخری پرچے والے دن آنے کا کہہ رکھا تھا۔ وہ ہاسٹل لوٹی اور وہاں

سے اس نے فوراً ہی شہر والی رہائش گاہ بھٹائی نگر کا رخ کیا تاکہ وہ اپنا کچھ ضروری سامان اٹھا کر مذکورہ ریسٹورنٹ کا رخ کرے۔ مگر جب وہ بھٹائی نگر پہنچی تو اس کا بھائی مراد خان پہلے سے ہی وہاں موجود تھا۔ ماں ساتھ نہیں تھی۔ بھائی کو دیکھ کر مہرو دھک سے رہ گئی۔

"اپنا ضروری سامان سمیٹو اور اسی وقت میرے ساتھ چلو...... میں تمہیں لینے آیا ہوں۔" مراد نے کرخت لہجے میں اس سے کہا۔

"پرادا سائیں! اتنی جلدی کیا ہے۔ ابھی تو میں آخری پرچہ دے کر آئی ہوں...... اور......"

"زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" مراد نے اسے گھر کا۔ "تمہارا رشتہ طے پا چکا ہے۔ پڑھائی کے نام پر تم نے یہاں بہت عیاشی کر لی، اب حویلی چلو......"

مہرو بہت روئی چلائی مگر بے رحم بھائی نے اس کی ایک نہ مانی اور جس وقت مہرو روتی آنکھوں سے بھائی کے ساتھ جیپ میں سوار ہو رہی تھی، اس کی آبدیدہ آنکھوں کے سامنے سانول ہی کا چہرہ رقصاں تھا۔ اس کے اندر سرکشی کا جذبہ انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا تھا۔

جیپ مراد خان ہی چلا رہا تھا اور اس کے ہمراہ ایک گن مین موجود تھا جو اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا، جبکہ مہرو عقبی سیٹ پر براجمان سسک رہی تھی۔

دن کا وقت تھا کہ اچانک ایک موڑ کاٹتے ہوئے جیپ کا اگلا ٹائر برسٹ ہوا۔ جیپ کی رفتار خاصی تیز تھی، وہ الٹ گئی۔ مہرو کو ایک زبردست جھٹکا لگا اور وہ ہوش و حواس سے...... بیگانہ ہو گئی۔

☆☆☆

اس روز سانول بھی وقت پر مذکورہ ریسٹورنٹ پہنچ گیا تھا مگر اسے حیرت ہوئی کہ مہرو ابھی وہاں نہیں پہنچی تھی۔ وہ کافی دیر تک وہاں بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا...... اسے یقین تھا کہ مہرو ضرور آئے گی، آج تو ان دونوں نے ایک اہم فیصلے کو عملی جامہ پہنانا تھا۔ مہرو اسے بتا چکی تھی کہ شادی کے نام پر اس کا سودا کیا جا چکا ہے مگر وہ اس جہنم میں قدم رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ تاہم دونوں کا ابھی کہیں بھاگنے یا فرار ہونے کا کوئی منصوبہ نہ تھا، وہ ابھی مل بیٹھ کر پہلے اس مسئلے کا کوئی حل سوچنا چاہتے تھے۔

جب مہرو کا انتظار کرتے کرتے بہت دیر ہو گئی تو سانول کو تشویش نے آن گھیرا۔ وہ ریسٹورنٹ سے نکلا اور مہرو کے ہاسٹل پہنچ گیا، وہاں اسے پتا چلا کہ مہرو کب کی اپنی شہر والی کوٹھی جا چکی تھی۔ وہ دیوانہ وہاں بھی بلاخوف جا پہنچا تو ایک جانکاہ اطلاع اس کی منتظر تھی۔ اسے کئی ثانیوں تک اپنی سماعتوں پر یقین ہی نہ آیا تھا کہ...... کیا ہو گیا تھا؟ کیا تقدیر واقعی اتنی ظالم بھی ہوتی ہے، تقدیر کو کوسنا اگرچہ کبھی بھی اس کا شیوا نہ رہا تھا مگر...... وہ پھر اپنی اس بدقسمتی پر کسے دوش دیتا؟ اس کا دل مانتا ہی نہیں تھا کہ جس محبوب کو اس نے سجدے ٹیک ٹیک کر حاصل کیا تھا، جس کے حصول کے لیے اس نے اللہ سے دن رات دعائیں مانگی تھیں، وہ اس طرح ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا تھا کہ جیسے تھا ہی نہیں بھی......؟ جیسے وہ ایک حسین خواب تھا اور جاگتی بے رحم آنکھوں نے اسے کانچ کے نازک آئینے کی طرح توڑ ڈالا تھا۔ مہرو ایک حادثے میں جان ہار چکی تھی اور ایسی ہاری تھی کہ اس کی لاش بھی باقی نہیں رہی تھی۔ انسان اپنے کسی پیارے کی لاش نہ دیکھے تو اسے اس کی موت کا یقین کب آتا ہے، شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اپنے پیارے مرنے والے کی لاش کا چہرہ ضرور دیکھ لینا چاہیے۔ بغیر لاش دیکھے اسے دفنا دیا جائے تو چہرہ نہ دیکھنے والوں کی نظروں کے سامنے وہ ساری عمر رہتا ہے۔

اسے پتا چلا تھا کہ مہرو اپنے بھائی اور ایک گارڈ کے ساتھ اپنے گوٹھ جا رہی تھی کہ ان کی جیپ کو حادثہ پیش آ گیا۔ مراد تو اس خوفناک حادثے میں زندہ بچ گیا تھا مگر مہرو جیپ کے اندر پھنسی رہنے کی وجہ سے اپنی جان ہار بیٹھی تھی۔ یہی حال گارڈ کا ہوا تھا کیونکہ جیپ نے الٹتے ہی آگ پکڑ لی تھی۔

مہرو کی ماں کے لیے یہ صدمہ اس قدر جانکاہ ثابت ہوا کہ اس غم نے اس کی بھی جان لے لی۔

سانول کی دنیا ہی اندھیر ہو گئی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ کپڑے پھاڑ ڈالے اور یکبارا سنبھال کر جنگلوں، ویرانوں اور صحراؤں کی طرف نکل جائے۔

وہ بہت دل گرفتہ ہو گیا۔ اب اس کا نوکری میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا نہ ہی پڑھائی میں۔ جی چاہا کہ وہ اب سب کچھ چھوڑ دے۔

حیا، جو اب ایک طرح سے اس کی دفتری ساتھی (کولیگ) بن چکی تھی، اس نے جو اس روز سانول کو اس قدر ملول اور آزردہ خاطر دیکھا تو پوچھے بنا نہ رہ سکی۔ تب سانول نے اسے ساری بات بتا دی۔ حیا کو ڈر ہوا کہ سانول ایک بار پھر ٹوٹنے والا ہے، وہ ایک بار پھر ہی دیوانوں فرزانوں والی روش اختیار کرنے والا ہے تو وہ اسے تھامنے...... اسے سہارا دینے کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے لگی۔

☆☆☆

وہ حادثہ آبادی سے ذرا دور ہائی وے سے ایک آدھ کلومیٹر کے فاصلے پر کچے میں ہی پیش آیا تھا۔ جیپ کا اگلا ٹائر برسٹ ہونے اور تیز رفتاری میں موڑ کاٹنے کے باعث ہی یہ خوفناک حادثہ ہوا تھا۔ جیپ الٹتے ہی سوئے اتفاق مراد زندہ بچ گیا تھا اور دروازے سے باہر جا گرا تھا مگر خاصا زخمی ہو چکا تھا۔ جبکہ مہرو اور گارڈ اندر پھنسے رہ گئے تھے۔ گارڈ کے تو سر میں کوئی سخت شے لگی تھی جس سے وہ فوراً ہی ہلاک ہو گیا تھا جبکہ مہرو زخمی حالت میں نیم بے ہوش سی کراہ رہی تھی۔ جس وقت جیپ میں آگ بھڑکی تو اسے پوری طرح ہوش آیا اور وہ جان بچانے کی تگ و دو میں جلتی بھڑکتی جیپ سے باہر نکلنے کی کوشش کرتی رہی...... یہاں تک کہ اس کا چہرہ اور جسم ہی جھلس کر رہ گیا مگر اس نے ہمت نہ ہاری اور پھنستی پھنساتی ہوئی وہ جیپ سے باہر نکل آئی۔ زخموں سے وہ پہلے ہی چور تھی اور اس پر مستزاد شدت کی دھوپ اور گرمی نے اسے بری طرح ہلکان کر دیا۔ اس نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور گرتی پڑتی، گھسٹتی ہوئی ہائی وے تک آ ہی گئی اور وہیں ایک درخت کی چھایا تلے ڈھیر ہو گئی۔ بسیں اور ٹرک وغیرہ گزرتے رہے مگر کسی کی نگاہ اس بدنصیب پر نہ پڑی۔ بالآخر کافی دیر بعد ایک کار اس درخت کے قریب آ کر رکی۔ وہ بھی اس لیے نہیں کہ کار سواروں کی نگاہ اس پر پڑی تھی، بلکہ وہ کسی اور ضرورت کے پیشِ نظر رکے تھے۔ اس میں دو میاں بیوی سوار تھے جو کراچی سے حیدرآباد جا رہے تھے۔ تب ان کی نظر زخمی اور جھلسی ہوئی مہرو پر پڑی۔ انہوں نے از راہ ہمدردی اسے اٹھا کر اپنی کار کی عقبی سیٹ پر لٹا دیا اور روانہ ہو گئے۔

حیدرآباد پہنچ کر مہرو کو فوراً اسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔ وہاں اس کا علاج شروع ہو گیا۔ دونوں خداترس میاں بیوی یہی سمجھے تھے کہ شاید اس دیہاتی خاتون کے ساتھ کچھ بااثر لوگوں نے کسی قسم کا کوئی ظلم کیا ہے۔ اس لیے ایک تو انہوں نے حفاظتی نقطۂ نظر کے تحت، فی الحال مہرو کے سلسلے میں کسی قسم کی تشہیر کرنے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی۔ مہرو کا علاج ہوتا رہا۔ وہ کبھی ہوش میں آتی تو کبھی بے ہوش ہو جاتی۔ اس کا دایاں گال، گردن تک جھلس گیا تھا۔ جسم کا کچھ حصہ بھی اس کی زد میں آ گیا تھا۔ قریباً تیس فیصد جسم کا حصہ جھلس گیا تھا۔ برنس وارڈ میں اس کی مختلف مراحل میں سرجری ہوتی رہی، تب کہیں جا کر مہرو کی حالت سنبھلی تھی۔

جب اسے پوری طرح ہوش آ گیا اور سارے واقعات کسی فلمی منظر کی طرح اس کی یادداشت کی اسکرین پر چلنے لگے تو اسے بری طرح ہول آنے لگا۔ اسے رہ رہ کر سانول یاد آنے لگا...... مگر پھر اپنی حالت دیکھی تو رنجور سی ہو گئی۔ وہ بار بار ڈاکٹروں سے پوچھتی۔

”یہ...... یہ...... میرے چہرے کا نشان کب مٹے گا؟ مم...... میرا جسم سیاہ پڑ چکا ہے، یہ کب تک ٹھیک ہو جائے گا......؟“ ڈاکٹر اسے تسلی دیتے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ہی زخم بھرے گا۔ ایسے میں وہ دونوں ہمدرد میاں بیوی جو اس کے محسن تھے، اسے بتانے لگے کہ وہ زخمی حالت میں ان کے ہاتھ لگی تھی۔ انہوں نے مہرو کو یہ بھی بتایا کہ وہ اس خدشے کی وجہ سے اس کے بارے میں کسی قسم کی کوئی تشہیر نہ کر سکے تھے، انہیں ڈر تھا کہیں وہ لوگ ادھر کا رخ نہ کرلیں اور اسے جانی نقصان نہ پہنچا دیں۔ ایک دم ہی مہرو کے دل میں یہ خیال آیا کہ وہ ایک تو اپنی حقیقت ان سب سے پوشیدہ رکھے گی اور جیسا یہ لوگ سمجھ رہے ہیں، وہ ویسی ہی کوئی فرضی داستان انہیں سنا دے گی۔ اس طرح وہ اپنی اصل شناخت کھو کر سانول کی صورت میں نئی شناخت پالے گی۔ ایک خیال اور بھی اسے سوجھا تھا کہ قدرت نے شاید اسے موقع دیا ہے، کہ کیا خبر اس حادثے کے بعد لوگ اسے مردہ سمجھ رہے ہوں۔ وہ اپنوں کے لیے مردہ قرار پائے گی مگر سانول کے لیے زندہ ہو جائے گی...... مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ ایک تو وہ اسی طرح اپنی اصل شناخت چھپا کر رکھے گی اور دوسرے یہ کہ وہ یہ جاننے کی کوشش کرے گی کہ آخر اس حادثے کے بعد اس کے بارے میں کیا خبریں تھیں؟

بہرطور...... مہرو نے ان کا شکریہ ادا کیا مگر اپنے بارے میں غلط ہی بتایا کہ وہ کون تھی اور کیسے اس حالت کو پہنچی تھی۔ وہ اسے اپنے گھر لے آئے۔ ان دونوں میاں بیوی کے دو چھوٹے بچے بھی تھے۔ عورت جس کا نام بشریٰ تھا اور اس کا شوہر ایاز، ان دونوں نے کچھ سوچ کر مہرو کو اپنے پاس رکھ لیا۔

ایک دن اس نے ان کے لینڈ لائن نمبر سے بھٹائی نگر کا فون ملایا اور آواز بدل کر مہرو کی سہیلی بن کر فون کیا اور ”مہرو“ کے بارے میں پوچھا تو اس کے کسی ملازم نے ساری حقیقت بتا ڈالی۔ وہی ہوا جس کا اسے اندازہ ہو چلا تھا یعنی وہ اسے مردہ سمجھے ہوئے تھے لیکن ساتھ ہی اسے یہ افسوس ناک خبر بھی ملی تھی کہ اس صدمے نے اس کی ماں حاکم زادی کی جان لے لی تھی۔ اسے اپنی ماں کے مرنے کا بے حد افسوس ہوا تھا۔

تاہم اب اس نے اپنا وہی فیصلہ برقرار رکھا تھا کہ وہ دنیا کی نظروں میں خود کو مردہ اور سانول کے لیے زندہ رکھے گی۔ وہ تقدیر کی اس رحم دلی پر خوشی سے گلنار ہو گئی تھی۔

مہرو کو حادثے اور اسپتال میں زیر علاج پڑے رہتے ہوئے کافی عرصہ بیت چکا تھا، وہ اب پوری طرح صحت یاب ہونے کے بعد سانول سے ملنے کے لیے بے چین ہوگئی تھی۔

ایک دن اس نے اس نیک دل خاتون بشریٰ سے جامشورو جانے کی اجازت لی کہ وہ اپنے کچھ عزیز رشتے داروں سے ملنے جارہی ہے۔ وہ ایک مسافر لاری میں جامشورو پہنچی......

اس نے عام سا لباس پہن رکھا تھا اور اپنا حلیہ بھی بدلا ہوا تھا۔ ایک معمولی سی چادر اوڑھ رکھی تھی......وہ وہاں سے تانگے میں بیٹھ کر جلیل شاہ کی درگاہ پہنچی۔ چہرہ چھپا رکھا تھا اپنا اس نے۔ درگاہ کی طرف جاتے ہوئے اس کا دل ایک عجیب سی مسرت تلے بے طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ تصور ہی تصور میں سانول کو ایک دیدنی سی خوشی کے ساتھ خود سے لپٹا ہوا دیکھ رہی تھی کیونکہ یہ یقینی امر تھا کہ اسے بھی اس کے ''مرنے'' کی خبر ہو چکی ہوگی۔ مگر اب وہ اسے اپنے سامنے زندہ دیکھے گا اور اسے یہ بھی پتا چلے گا کہ تقدیر نے بغیر کسی مصائب و آلام کے انہیں یکجا ہونے اور اپنی زندگی اپنی مرضی سے ایک ساتھ گزارنے کا کیسا شاندار موقع دیا تھا۔

مگر جب وہ درگاہ پہنچی تو وہاں سانول نہ تھا۔ سخی لعل موجود تھا، اس نے بتایا کہ سانول نے ایک عرصہ ہوا یہاں آنا چھوڑ دیا تھا۔ پتا نہیں کہاں تھا یہ اسے معلوم نہ تھا۔ مہرو کے دل میں ہول سا اٹھنے لگا۔

وہ اسے پاگلوں کی طرح ہر جگہ تلاش کرنے لگی۔ ٹھوڑی پھاٹک، ہائی وے، حتیٰ کہ سندھیالوجی میوزیم تک اس نے دیکھ ڈالا۔ وہ ہر جگہ سانول......سانول پکارتی رہی مگر سانول اسے نہیں ملا۔

تھک ہار کر اس نے درگاہ کا رخ کیا۔ وہ سانول کے بغیر اس شہر کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ پہلی بار اس کے دل میں یہ جان لیوا خیال بھی آیا کہ کہیں اس کی جھوٹی موت کی خبر پر وہ خود بھی بد دل ہو کر کسی دوسرے شہر تو نہیں چلا گیا تھا؟ مگر کہاں......؟ نہیں، وہ کہیں نہیں جاسکتا۔

وہ درگاہ آگئی اور سخی لعل سے ملتجیانہ لہجے میں بولی۔

''بابا......! میں ایک دکھیاری عورت ہوں، غموں اور نصیب کی ماری ہوں......مجھے یہاں رہنے کی اجازت دے دو......''

سخی لعل نے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور مہرو اسی حجرے میں آگئی جو کبھی سانول کا کمرا ہوتا تھا، اسے یہاں اپنے گم شدہ محبوب کی خوشبو محسوس ہونے لگی۔ وہ اس کی کتابوں میں کھوگئی۔

وہ ادھر ہی رہنے لگی، رفتہ رفتہ اس نے ملنگ فقیرنیوں والا روپ اختیار کرلیا۔ اللہ کی عبادت کرتی اور درگاہ کی جھاڑ، صفائی بھی وہی کرنے لگی۔

اس نے حجرے کے ایک کونے میں سانول کا یکتارا پڑا دیکھا تو اس کی مہجور آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یکتارا لے کر اس نے اسے چوم کر سنبھال لیا۔

☆☆☆

کچھ دن بیت چلے۔

سندھیالوجی میوزیم میں آج خلافِ معمول گہما گہمی کم ہی دیکھنے میں آرہی تھی۔

میوزیم کے مین گیٹ سے وہ دونوں ہنستے مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے......دونوں جوان اور ہم عمر تھے۔ عورت کے چہرے پر خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی جبکہ مرد......بھی خوش ہی نظر آرہا تھا مگر اس کے چہرے سے وہ رونق غائب تھی......جیسی پہلے اس کا خاصہ ہوا کرتی تھی۔ آنکھوں میں جیسے کوئی دائمی غم کی پرچھائیاں ثبت ہو کر رہ گئی تھیں۔

عورت حیا تھی اور مرد سانول......دونوں نے چند روز پہلے ہی شادی کی تھی۔ کاشانہ حیا میں رہتے تھے دونوں۔ آج یہاں میوزیم کی سیر کو نکل آئے تھے۔

ثقافتی نمونوں کے ڈسپلے سے ہوتے ہوئے، جب عمر ماروی کے ڈسپلے کے قریب سے گزرنے لگے تو......سانول نے اسٹول پر کسی کو یکتارا سنبھالے ہوئے بیٹھے پایا......اسے عجیب سی حیرت ہوئی......کھچڑی سے دراز میلے بال، گلے میں رنگین منکوں کی مالا۔ اور پر میلی......سی چادر اوڑھے ہوئے وہ اسے کوئی ملنگ فقیرنی ہی لگی تھی۔ جانے کیوں ایکا ایکی اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ اسے کچھ یاد آنے لگا۔

''آؤ نا ڈارلنگ! بہت گھوم لیا واپس چلیں، دیر ہو رہی ہے......'' حیا نے سانول کا بازو تھامتے ہوئے کہا اور سانول اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ دونوں گیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔

ہال میں یکتارے کی آواز کے ساتھ ہی ایک پُر درد اور جاں سوز سی نسوانی آواز ابھری۔

تلسی ایسی پریت نہ کر، جیسی لمبی کھجور......

دھوپ لگے تو چھاؤں نہیں، بھوک لگے، پھل دور......

یہ آواز اسی اسٹول پر بیٹھے ہوئے اسی فرد کی تھی، جسے تھوڑی دیر پہلے سانول دیکھنے کی کوشش کررہا تھا مگر اپنی بیوی حیا کے متوجہ کرنے پر وہ اس کے ساتھ گیٹ کی طرف بڑھ گیا تھا......

یہ یکتارا سنبھالے گنگنانے والی، ملنگ فقیرنی......مہرو تھی......